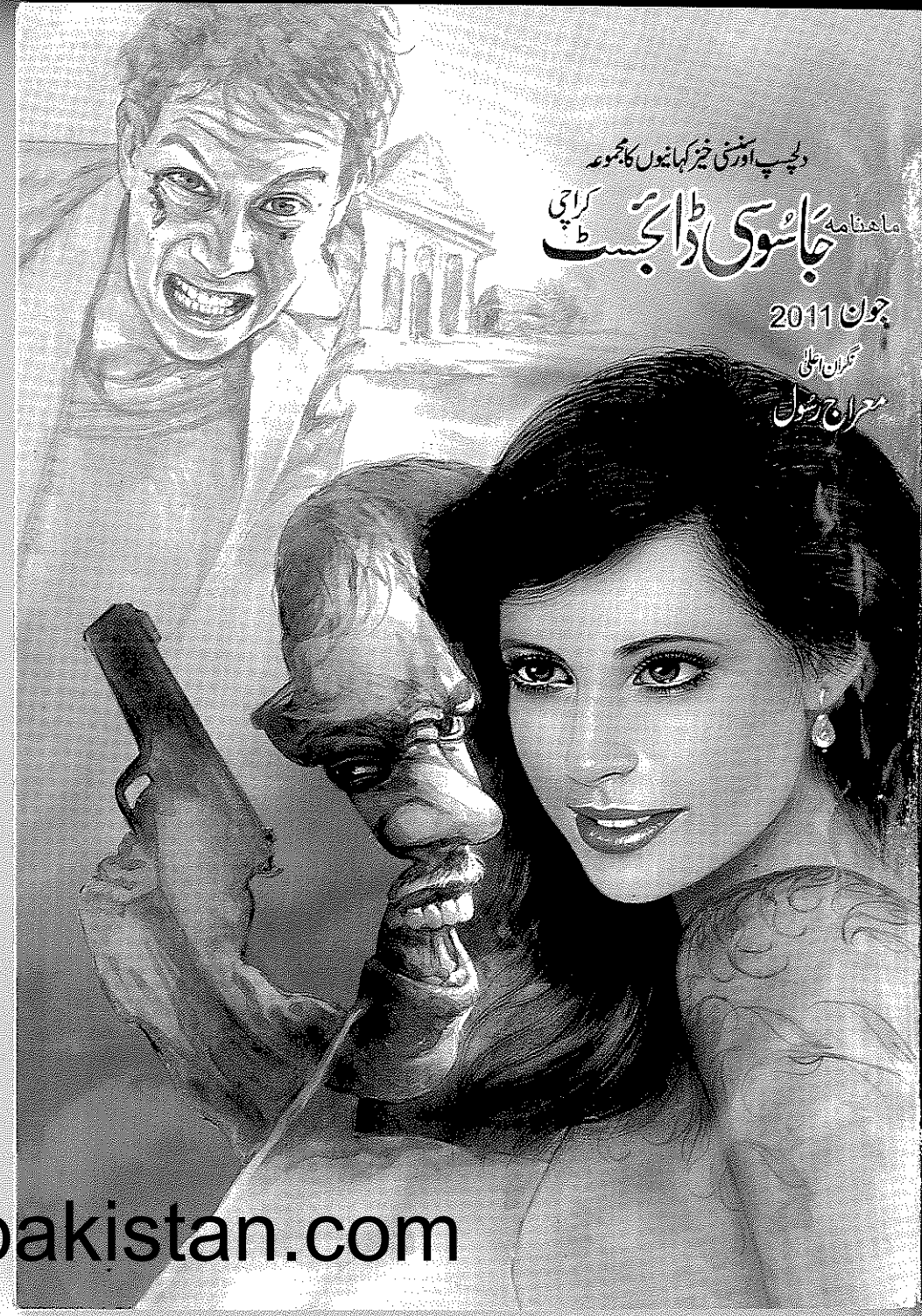

www.kahopakistan.com

www.kahopakistan.com

Jd

www.kahopakistan.com

www.kahopakistan.com

جاسوسی ڈائجسٹ

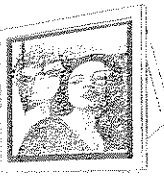

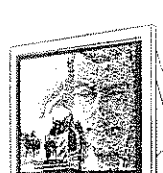

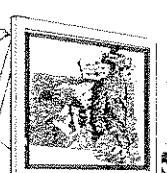

11
[illegible]
مدیر اعلیٰ
قارئین کی گلکاریاں کچھ اپنی
ناصحانہ ... عنایتیں اور ... باتیں

18
جگر خراش
اثر نعمانی
محبت دولت اور انتقام کے شعلوں میں
گھر جانے والے لیباریٹری کا سحر ناس

59
شہ زور
محمد عفان آزاد
ناتمام رہ جانے والے خوابوں کا سوداگر
جو جنگلی ارکی لپیٹ میں آچکا تھا

67
تعلق
میر محمد بلوچ
تعلق کی حقیقت کو محسوس کرنے
والے محبت گزیدہ شخص کی کھوج و جستجو

77
جوابی کارروائی
کاشف زبیر
جانے پہچانے کرداروں کی الجھن
میں ایک نئے واقعے کی رونمائی

91
اصل دشمن
تنویر ریاض
دشمنی نبھانے والے دوستی کے بھیس
میں چھپے دشمن کی حیلہ سازی

98
للکار
طاہر جاوید مغل
محبت کے محاذ پر لڑنے والے شخص کی جہد
اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سامنا تھا

141
ڈبل رول
[illegible]
ایک ہی شخصیت قالب میں ڈھلے
دو کرداروں کے ملاپ کا انوکھا کھیل

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

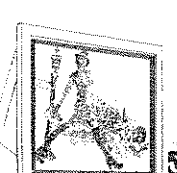

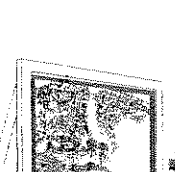

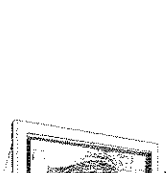

151
انجام بخیر
مختار آزاد
مالک اور نوکر کے مابین ذہنی ہم آہنگی کا
قابل ستائش نمونہ مغرب سے تازہ درآمد

167
[illegible]
سلیم انور
اس لڑکی کا فسانہ جس کا بوائے
فرینڈ کوئی اور لے اڑا تھا

170
گرداب
اسما قادری
تقدیر کی فسوں گری قسمت کی چالبازی مقدر
کا کھیل ملے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

199
گمشدہ سیاح
مریم کے خان
سرزمین افریقہ سے آمد کی خبر سنتا
ایک شخ ڈاکٹر کی ناقابل یقین کہانی

208
عام آدمی
آصف ملک
زندگی کو سنوارنے اور خاص بنانے کا
خواب دیکھنے والے قناعت پسند کا ماجرا

219
[illegible]
سلیم فاروقی
زندگی کے کچھ ایسے ذہنی الجھنوں جس
کے تانے بانے شناس عیار کے ہاتھ میں تھے

260
دو گز زمین
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
خواب دیکھنے خواب سوچنے اور خوابوں
کی تعبیر پانے والے بدنصیبوں کا احوال

000
تراش خراش
ادارہ قارئین
اقتباسات، گدگدیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے
کہ جو آپ کی تفریح طبع اور ذوق کے لیے

جلد 40 • شمارہ 06 • جون 2011 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 50 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 فیکس (021) 3502551 mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
... پرنٹنگ پریس ... اسٹیڈیم کراچی

www.kahopakistan.com

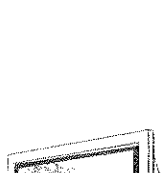

چیتی نکتہ چینی

عزیزانِ من ۔۔۔ السلام علیکم!

جون 2011ء کا شمارہ حاضر خدمت ہے۔ گرمی اپنے جوبن پر ہے۔ جون اس کے شباب کا مہینا ہے۔ یہ شباب ابھی مزید دو تین مہینے برقرار رہے گا لیکن اس بار ماہِ جون میں سیاسی جوبن بھی عین شباب پر پہنچ چکا ہے۔ ماہِ گزشتہ ہمارے دامن میں جو کچھ چھوڑ کر گیا ہے، اس کی بازگشت جاری ہے اور مزید کئی ہفتوں تک سنائی دیتی رہے گی۔ بات وہی ہے ۔۔۔ دہشت، سفاکی ۔۔۔ معیشت ۔۔۔ غیر محفوظ ملکی سرحدیں اور ۔۔۔ ان سب کے محور پر رقص کناں سیاست۔

امریکا سے تعلقات ۔۔۔ کراچی میں ایک دفاعی مرکز پر ہونے والی دہشت گردی ۔۔۔ نئے مالی سال کے لیے پیش ہونے والا وفاقی بجٹ اور مہنگائی کے بوجھ تلے دبے عوام کی سسکیاں ۔۔۔ ذرائع ابلاغ پر بحث جاری ہے، رخ بدل بدل کر۔ بازگشت ہر وقت کانوں میں گونج رہی ہے ۔۔۔ بحث ہو رہی ہے کہ سیاست کی بساط کے مہرے پٹ رہے ہیں ۔۔۔ کون جیت رہا ہے، کون ہار رہا ہے ۔۔۔ اس سے قطع نظر شاہ محفوظ ہے ۔۔۔ قیاس آرائیاں اور تجزیے بدستور کیے جا رہے ہیں، سوالات ہو رہے ہیں لیکن جواب مفقود ہیں۔ نئے نئے زاویے، نت نئی تاویلیں، مشورے، ہدایتیں، تجاویز، جائزے ۔۔۔ بھانت بھانت کی صداؤں کا ایک طوفان ہے جس میں انسان گم ہو رہا ہے۔ غریب کے مصائب، ضروریات، حاجت اور عزتِ نفس ۔۔۔ اب ان چیزوں کی کیا بات کریں کہ ان کی وقعت ہی نہیں رہی ہے ۔۔۔ کیا ہو رہا ہے، کیا ہونے والا ہے، کیا بنے گا ۔۔۔ ؟؟؟ سوالوں کے ڈھیر لگ رہے ہیں۔ ناامیدی چہروں پر جھلک رہی ہے۔ اب کیا کہیں ایسے میں ماسوائے اس دعا کے!

خدا کرے کہ مری ارضِ پاک پر اترے
وہ صبح جسے اندیشۂ زوال نہ ہو

اس امیدِ سحر کے ساتھ رخ کرتے ہیں آپ کی محفل کا ۔۔۔ جہاں شوخیاں اور شگفتگی کے رنگ و آہنگ میں معطر مکتوبات آپ کے منتظر ہیں۔

شیخ محمد سجاد ثانی کی رائے کہنہ سے ”اس مرتبہ جاسوسی 5 مئی کو ہی مل گیا۔ ٹائٹل گرل بڑے بڑے گول گول دونوں کے ساتھ بہت خوب صورت لگ رہی ہے مگر مرد کا چہرہ ٹائٹل کا بیڑا غرق کرنے کے لیے کافی ہے۔ دوستوں کی محفل میں ام ثمامہ کو بڑے غرور کے ساتھ کرسیِ صدارت پر براجمان پایا۔ سب کے تبصرے شان دار تھے۔ اول نمبر پر للکار کا مطالعہ کیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ کہانی میں کچھ نہ کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔ گرداب میں ماہ بانو کو ہر جگہ خدائی فوجدار مل ہی جاتے ہیں۔ (اپنی اپنی قسمت ہے۔ آپ کیوں جل رہے ہیں؟) جس طرح اب اسلم اس کی عزت کا محافظ بن گیا ہے۔ دوسری طرف کشور اینڈ آفتاب ایک مرتبہ پھر چوہدری کے ظلم سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو ہی گئے اور شہریار صاحب کے تو انداز نرالے ہیں۔ جرم کو جرم سے ہی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ سوت کے سائے آغاز میں تو بڑی سسپنس بھری اسٹوری تھی مگر انجام انتہائی بور اور فضول سا تھا۔ سرورق کے رنگ دونوں اچھی تحریریں تھیں۔“

ایم عزیز اسد کی فریاد چکوال سے ”شمارہ اس ماہ کافی لیٹ حاصل کر سکا کیونکہ ایک حادثے میں میرا ہاتھ شدید زخمی ہو گیا تھا۔ (اوہو ۔۔۔ بڑا افسوس ہوا) مطالعہ بھی ٹھیک سے نہیں کر سکا اس لیے کافی دیر بعد تبصرہ بھیج رہا ہوں۔ (اب کیسا ہے ہاتھ ۔۔۔ ؟) سائرہ خان کا خط پڑھا۔ آسیہ خان کا سن کر انتہائی دکھ ہوا، ان پر اللہ کی رحمتوں کا نزول ہو۔ احمد اقبال اور تعویذ گنڈے والے آغا فرید احمد خان کے تبصرے پسند آئے۔ تنویر احمد انداز تو کافی ہو گیا کہ آپ کو کتنا پیار ہے۔ کہانیوں میں للکار کا اتنا انتظار کرنا پڑتا ہے لیکن کہانی چند لمحوں میں ہی ختم ہو جاتی ہے۔ طاہر انکل کی قلم پر بہت مضبوط گرفت ہے۔ پھر کاشف زبیر کی تاوان پڑھی۔ بہت پسند آئی۔ دلدل میں بزدل کافی بہادری سے اپنے مقصد کو پا گیا اور احمد اقبال کی مرغیوں کا گلتا ہے کافی بار یکی سے آپ نے مشاہدہ کیا ہے کہ انڈا دیتے ہوئے اس کی آواز بھی سن لی، کیا بات ہے آپ کی۔ سوت کے سائے میں سلمان اور غزالہ کا بے حد افسوس ہوا۔ کہانی میں ٹیپو کا اینڈ پیارا ہوا۔“

سکھر سے آغا فرید احمد خان کی پسند ”سرورق کی حسینہ کا منہ تو ٹیڑھا ہے البتہ ہونٹ ضرورت سے زیادہ موٹے ہیں۔ پس منظر میں صنفِ وجاہت کو مچھلی کی طرح کانٹے میں پھنسا دکھایا گیا ہے جس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر ہیں۔ اشتہارات کو کراس کیا اور فہرست میں آئے۔ کہانیوں کا جائزہ لیا اور پھر آئے چٹکی دوان میں۔ محفل کی صدارت ہمارے جھنڈو کی بہن ام ثمامہ کر رہی تھیں۔ مبارک ہو ام ثمامہ۔ ام ثمامہ انکل آپ کا خط بے حد پسند آیا۔ ادھیڑا سوچتا تفسیر عباس بابر! آپ نے تکلف ذاک کی اپنے لفظوں میں خوب عکاسی کی ہے، ویسے یار! آپ بیچ میں غائب کہاں ہو جاتے ہو؟ آتے رہا کرو۔ محسن علی فوم! دل کی دھڑکن پر قابو پالے لائے۔ فہیم تبسم! اچک اچک کر کام کرنے سے غلط تاثر پڑتا ہے۔ آپ نے اچک کر ڈائجسٹ تو لے لیا، پھر قیمت ادا کی کہ نہیں؟ ایم عزیز اسد! گناہ گاروں کی لسٹ کیا خوب کہی۔ اقبال مرزا، صبا مرزا! کیا چکوال میں سب لڑکیاں آپ کی طرح ہیں؟ (وہ کس طرح کی ہوتی ہیں؟) اب آتے ہیں کہانیوں پر۔ سرورق کے دوسرے رنگ میں بزدل کی بزدلیاں پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ پہلا رنگ تاوان اچھے موضوع پر اچھی کہانی نے حصار قائم رکھا۔ للکار اس مرتبہ کچھ پیش رفت ہوئی۔ تاش کے سر سے چیپ نکل گئی۔ اب وہ آزادی سے متحرک ہو سکتا ہے۔ یہی موڑ ہے جہاں سے کہانی کا رخ موڑا جا سکتا ہے۔ (واہ بھئی! آپ تو رائٹر بن گئے ۔۔۔) گرداب اپنے تمام تر ایکشن کے ساتھ جاری و ساری ہے۔“

سونا گھاٹ کا پجاری، انکا، اقابلا ۔۔۔

جیسی یادگار اور سدا بہار داستانیں جو آج بھی قارئین کے دلوں میں زندہ ہیں

ہوش ربا، پرتحیر، پرتجسس اور سنسنی خیز کہانیوں کے خالق

انوار صدیقی

کے قلم سے
ایک نئی
سلسلے وار،
دلچسپ کہانی

کشکول

بہت جلد ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ میں پیش کی جا رہی ہے

ازل سے برسرِ پیکار خیر و شر کی متضاد قوتوں کی آویزش کی داستان

www.kahopakistan.com

جڑانوالہ سے رَسچل مائیکل کی شمولیت ''اس بار جاسوسی جلدی مل گیا۔ اسکول جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ اخبار کے ساتھ ڈائجسٹ دیکھ کر چودہ طبق روشن ہوگئے۔ سب سے پہلے ٹائٹل دیکھا۔ حسینہ پتا نہیں کیا دیکھ رہی تھی۔ (جو لگنا چاہیے تھا) لڑکی کے پیچھے خوفناک انسان حسینہ کے بجائے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ (یہ کس طرح معلوم ہوا؟) سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ نہ جانے یہ کہانی کب ختم ہوگی؟ (کیوں بھئی؟) گرداب کا بہت زیادہ ملو ہے۔ ماہ بانو تو سب کے لیے پریشانیاں کھڑی کرتی پھر رہی ہے۔ کشور اور آفتاب جہاں جاتے ہیں، کچھ بندے مار کر ہی جاتے ہیں۔ للکار پڑھی۔ کیا زبردست کہانی ہے۔ تابش کے سر سے چپ کا نکالنا امید سے زیادہ آسان ثابت ہوا۔ موت کے سائے تو بہت بورنگ لگی لیکن اس بوریت کی کمی کاشف زبیر کی تاوان نے پوری کر دی۔ کاشف زبیر تو میرے پسندیدہ مصنف ہیں۔ ان کی تاوان بہت زبردست تھی۔ آسانی تحفہ بھی اچھی کہانی ثابت ہوئی۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔''

حافظ آباد سے ماہا ایمان کی تیز رفتاری ''اس دفعہ سرورق عام سا تھا۔ بس سرورق کی آنکھوں میں انیس بیس کا فرق تھا۔ پیچھے موجود ماسک سے جھانکتی آنکھیں سانپ کی آنکھوں سے مشابہ لگیں۔ آنکھوں سے جھلکتے تاثرات نے ہمیں تو پہلے منجمد اور پھر ڈرا دیا۔ حقیقتاً ڈاکٹر انکل اپنے فن کی بلندیوں پر نظر آئے ہیں، ان سفاک تاثرات کو پیش کر کے، ویلڈن۔ محفل میں اول نمبر تبصرے کی حق دار ام ثمامہ ہی ٹھہریں۔ مادام! آپ نے خاصا کمرشل سے کام لیا ہے۔ آپ کے کئی افسانے میں نے پڑھے ہیں، بہت اچھا لکھتی ہیں آپ۔ کیپ اٹ اپ۔ فہیم تبسم صاحب! امید ہے دیر سے آنے کی نہیں، اہمیت یاد رکھنے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے والد کو جلد شفائے کاملہ عاجلہ عطا فرمائے۔ (آمین) تفسیر صاحب! کس نے آپ کی دُکھتی رگ پر چوٹ لگا دی ہے جو یوں پریشان اور سر چھپائے ہوئے گویا گاں کی طرح سب کو ٹکریں مارتے پھر رہے ہیں؟ محسن علی فرام بالاکوٹ، تھنے نظر باز اور کمزور دل ہیں آپ۔ پشاور سے سائرہ خان کا تبصرہ پڑھ کے میں بہت اپ سیٹ ہوئی۔ آسیہ ڈیئر! مایوسی گناہ ہے۔ حوصلہ جوان رکھو، انشاء اللہ تم بیماری کو شکست دینے میں کامیاب ہوگی اور تبصرہ لکھنا مت چھوڑو۔ اس سے تمہارا کتھارسس ہوگا اور تمہیں جینے کی امید نظر آئے گی۔ جوہر آباد سے احمد اعجاز اپنے بھائی بندوں سے محفل میں کچھ آگے نظر آئے بھی تو اچھا تبصرہ لکھ پائے۔ کہانیوں میں پہلی ملاقات ہمیشہ کی طرح گرداب سے کی۔ تحریر سست رفتار رہی۔ اسلم کا ماضی کچھ اسی قسم کا ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر طارق جیسے لوگ ہمیشہ ٹھوکر کھا کر سنبھلتے ہیں۔ للکار کی سولہویں قسط لاجواب رہی۔ اب لگ رہا ہے کہ یہ تحریر مغل صاحب لکھ رہے ہیں۔ (پہلے کون..... خدانخواستہ آپ لکھ رہی تھیں؟) تابش کو چپ سے میرے اندازے کے عین مطابق عمران کے مبارک ہاتھوں سے ہی نجات ملی۔ تابش کو ایکشن میں دیکھ کر گدگدی سی ہوتی ہے اور لگا چلا اس کی چال والی مثال یاد آتی ہے۔ عمران کی تابش سے محبت اچھی لگی ہے اور حماقت کی بے بسی کو ہم نے شدت سے محسوس کیا۔ مغل انکل! سلطانہ کو ثروت بنانے کی کوشش نہ کریں بلکہ ثروت کو تحریر میں واپس لائیں۔ سرورق کے دونوں رنگ اس دفعہ استاد و شاگرد کی تحریروں پر مشتمل تھے۔ پہلا رنگ کاشف زبیر کی تحریر تاوان پر مشتمل تھا۔ ٹھیک کہتے ہیں کہ قدرت کے کاموں میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ احمد اقبال صاحب عرصے بعد بزدل کے ساتھ تشریف لائے۔ (ایسا تو نہیں..... ناراض ہو جائیں گے اپنے نام سے) دلدل انسانی فطرت اور قدرت کے قائم کردہ توازن سے انحراف کرنے والوں کے درد ناک انجام پر مشتمل تھی۔ میرے خیال سے اب سائرہ اور بزدل کی شادی بھی ہو جانی چاہیے تھی۔ (ہاں..... دو کیا؟) مختصر تحریروں میں سب سے پہلے مریم کے خان کی بڑا بھائی پڑھی۔ عقل میں دونوں بھائی سیر پر سوا سیر تھے۔ آصف ملک کی تحریر فیصلے میں واقعی انوکھی محبت پڑھنے کو ملی۔ رقیب میں والش کا قاتل رابرٹ نکلا۔ امبر نے اسے خوب کوٹا اور بے چارے ٹروسیلا کو پھنسانے کی کوشش کی لیکن ٹیک کی کوششوں سے منتخبی کہانی۔ زونگ کے تعاون سے پیش کی جانے والی تحریر میں واقعی انوکھا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس سے بہتر حل دونوں ولنوں کے پاس اور کوئی نہ تھا۔ تمیم انور کا آسانی تحفہ آسمان سے گر کے رانف کے ہاتھوں میں اٹکا۔ اسی لیے کہتے ہیں، لالچ بری بلا ہے۔ انسان کو سزا دینے کے کیا کیا اور انوکھے طریقے ہو سکتے ہیں۔ پہلی خواہش تحریر ابھی مصروفیات کی وجہ سے پڑھنی باقی ہے۔''

عبدالعزیز مکلوکی کی ناپسندیدگی ..... میانوالی سے ''اس بار جاسوسی تین تاریخ کو ملا۔ اس طرح یہ دن میرے لیے دوہری خوشی کا تھا کیونکہ ایک تو پیپر ختم ہوئے اور دوسرا ہمارا پیارا جاسوسی ملا۔ سب سے پہلے سرورق کو سرسری طور پر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے کیونکہ انکل ٹائٹل گرل کی تعریفوں کا کام ہم نے دوسرے قارئین کو سونپ رکھا ہے۔ سرورق کو پھلانگتے ہوئے شوگر زدہ کام میں جا گرے جہاں وقف اسٹینڈ پر اس بار ام ثمامہ صاحبہ براجمان تھیں۔ ام ثمامہ آپ کا تبصرہ واقعی بہترین تھا۔ آپ کو اس ماہ کی صدارت مبارک ہو۔ فہیم تبسم صاحب! اللہ آپ کے والدِ محترم اور تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کو صحت کاملہ عاجلہ عطا فرمائے، آمین۔ سائرہ خان صاحبہ اللہ آپ کی دوست کو بھی شفا یاب فرمائے تاکہ وہ پھر سے زندگی کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہو سکے۔ سب سے پہلے طاہر جاوید مغل صاحب کی للکار پڑھی۔ مغل صاحب! آپ نے یہ کہانی لکھ کر پچھلی تمام کہانیوں کے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ عمران کا کردار بہت اچھا ہے۔ تابش بھی اب کچھ بندے دا پتر بن گیا ہے۔ (پہلے کیا ایسا لگتا تھا.....) گرداب بھی ابھی جاری ہے لیکن پچھلی کچھ اقساط سے گرداب کا مزا تھوڑا سا پھیکا پڑ گیا ہے۔ انکل! اس دفعہ سرورق کے رنگ بھی بس ٹھیک ٹھاک ہی پیدا کرنے والی بات تھی۔ کاشف زبیر کی تاوان بھی اس کہانی کی اور اسی موضوع پر پہلے بھی سرورق کے رنگوں میں ایک کہانی شائع ہو چکی ہے۔ (افسوس کہ اتنی اچھی کہانی آپ کو پسند نہیں آئی.....) دلدل میں احمد اقبال نے بھی کچھ خاص مزہ نہیں دیا۔ اس کے بعد ابتدائی صفحات پر منظر امام کی موت کے سائے پڑھی۔ یہ بھی بور اسٹوری تھی۔ اگر اس مہینے للکار کی قسط اور ایم اے راحت کی کہانی نہ ہوتی تو جاسوسی پر پیسے ضائع کرنے والی بات تھی۔ دوسری کہانیاں بھی گزارے لائق تھیں۔''

ڈاکا دکی سے تصویرِ الجھن کی تفتیش ''اس دفعہ ٹائٹل کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ چٹکی نکتہ چینی میں صدارت کی کرسی پر ام ثمامہ نظر آئیں۔ آپ کو بہت بہت مبارک۔ رشی خوش آمدید۔ کچھ طویل تبصرہ کرتے محسن علی فرام ... آپ ملٹی فوم کی نئی ایجاد تو نہیں۔ چٹکی نکتہ چینی پر تھوڑا تفصیل سے تبصرہ کرتے۔ فہیم تبسم! ٹائٹل گرل کو ڈرا کر ہم آنکھیں پھاڑ کر دیکھا کریں۔ لگتا ہے کہ ٹائٹل پر صرف دوشیزہ پری کو ... ہوتا ہے۔''

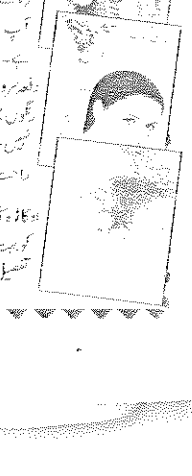

خدا آپ کے والد صاحب کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ ایم عزیر اسد محمود! آپ نے اچھا تبصرہ کیا۔ آغا فرید احمد خان! ٹائٹل دیکھ کر آپ کی بھی چوری کی کہانی بنا لیا کرتے ہیں۔ کبھی ہم بڑی باتیں کرتے سمجھ دار ہو کر جعلی پیر فقیروں کے پاس تعویذ کروانے کے لیے جاتے ہیں۔ شمیم شم سکین شمیم تو نکتہ چینی کی محفل میں آگئی یا آگیا۔ اب دیکھتے کوئی عرصہ تک تشریف لاتے ہیں۔ روبینہ امجد کیانی! مبارک ہو، امیر بخشی لائنز میں لکھنا شائع نہیں کیا اور خط شائع ہو گیا۔ حمیرا احمد! نہ جانے کیوں تمہارا خط پڑھ کر ایسا لگا کہ میٹرک یا نہم کلاس کا طالب علم خود لکھ رہا ہے۔ سائرہ خان! ہماری ساری دعائیں اور نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ ماہا ایمان! تم زیادہ شرارتی ہوتی جا رہی ہو۔ سب کی ذرا کم ٹانگ کھینچ کر رکھو۔ محی الدین اشفاق! پہلے ذرا یہ تو بتائیں کہ حسینوں کی آنکھوں سے شکوے پڑھتے کتنے سال کا پرانا تجربہ ہے؟ آپ بھی بارش میں بھیگتے ہیں۔ میں تو سمجھی تھی کہ یہ صرف ہم لڑکیوں کا شوق ہے۔ شاکنول اور مہرین کنول! ام بھی تم کو بہت پسند کرتا ہے اور تم نے ادارے بارے میں جو بولا ہم کو بہت اچھا لگا۔ یارا ہمیں تمہارا اکیست ہے اور کچھ نہیں۔ علی آتش! ہر وقت آتش ہی سے بھرے رہتے ہو۔ کبھی کبھی برف بھی چبا لیا کرو۔ آگے ویسے ہی بہت گرمی ہے۔ اعجاز احمد! آپ نے غور نہیں کیا، وہ اس لیے منہ بسور رہی تھی کہ آپ نے اس کا لال پاپ چھین لیا تھا۔ موت کے سائے منظر امام! یقین نہیں آتا کہ ایسی کہانی آپ نے لکھی ہے۔ بچپن میں عمرو عیار یا شہزادہ شہزادی کی کہانیاں پڑھتے تھے تو بالکل ویسی ہی کہانی تھی۔ جس نے اپنا دماغ تپایا ہو، وہ یہ کہانی پڑھ لے۔ شکریہ کہ بالآخر للکار میں تابش کی جان چپ سے چھوٹی اور وہ بھی آزاد ہوا۔ اس قسط میں کچھ ایکشن بھی پڑھنے کو ملا۔ گرداب میں بالآخر اسلم نے ماہ بانو کو بچا لیا۔ شہر یار کو تھی کہ ہیرو دکھایا ہے مگر جب سے اس نے ماریا سے شادی کی ہے وہ مجھے تو اچھا نہیں لگتا۔ اب شہر یار پر ماریا کی حقیقت بھی جلد ہی کھل جائے گی اور اسے بھی تیار ہی ہوں اگر شہر یار نے ماریا کو اس کی غلطی پر معاف کر دیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ دوسرا رنگ احمد اقبال کی دلدل اچھی کہانی تھی۔ خاص کر بزدل ہیرو کا رول اچھا تھا۔ تاوان پہلا رنگ بہت ہی زبردست کہانی تھی۔ تاوان اس ماہ کی بیسٹ اسٹوری تھی۔ عرصے کے بعد ایسی کہانی آئی کہ بس میں کھو گئے۔ ورنہ تو کہانی کے اسٹارٹ سے ہی اینڈ کا پتا چل جاتا ہے۔ مریم کے خان کی بڑا بھائی بھی اچھی تھی۔ ایم اے راحت کی مجسمہ کہانی تو اچھی تھی لیکن موضوع اچھا نہیں تھا یا پرانی کہانی میں کچھ کمی آیا۔''

مانسہرہ سے ایم اے انجم کی فصاحت ''رسالہ اس دفعہ 5 مئی کو ملا۔ ٹائٹل پر نظر دوڑائی۔ ویلڈن ڈاکٹر انکل! جاسوسی کی شان کے مطابق ٹائٹل بنانے کا۔ پیاری سی محفل چٹکی نکتہ چینی میں پہنچے۔ کرسی صدارت کی حق دار ام ثمامہ قرار پائیں۔ ہماری طرف سے ڈھیر ساری مبارک باد۔ رشی پاکستانی! خوش آمدید۔ تفسیر عباس بابر صاحب! پاکستان کا مستقبل تو خیر ..... لیکن اپنے خطوط کا مستقبل تو ہمیں یقیناً تاریک نظر آتا ہے، شکر ہے ڈاک کی مہربانی سے۔ محسن علی! ہم آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں، حوصلہ رکھیے۔ فہیم تبسم صاحب! ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد محترم کو شفائے کامل عطا فرمائے۔ روبینہ کیانی صاحبہ! مبارک ہو آپ کا خط شامل ہو گیا ہے۔ تحریر جہاں! آپ کی طرح ہم بھی اپنے شفیع سے اللہ تعالیٰ لکھنے والے ہیں لیکن یار اتنا نہیں لگا۔ ٹھیک کہا۔ عائشہ رانی جی! آپ کو بالکل بالکل سچ لگا۔ آپ کی طرح ہم سب یہاں محفل کی ہی بھی سوچ ہے۔ سائرہ خان کا خط پڑھ کر دلی رنج ہوا۔ آسیہ کی بیماری کا پڑھ کر۔ اللہ کائنات آسیہ باجی کو جلد از جلد شفا یاب کرے اور آسیہ باجی سے عرض ہے کہ سسٹر! آپ نے چند ماہ پہلے ہم سے اور انکل سے ایک وعدہ کیا تھا کہ ایسا سوچیں اور محفل سے ناتا جوڑے رکھیں گی ..... یار! پٹھان ہو کر بھی یہ وعدہ خلافی، پلیز جلدی سے محفل میں حاضری لگوائیے۔ باقی بات سچ کی تھی۔ ایم احمد باجی پر پڑھنے کا سایہ ہے اس لیے تھوڑا سا کملا گئے ہیں۔ محی الدین اشفاق جی! آپ کی بات دل کو لگی، شوکیس زدہ والی لیکن خیال رہے ہم سے آپ بھی ہار جائیں گے۔ باقی تبصروں میں دلشین بلوچ، احمد اعجاز کے تبصرے پسند آئے۔ ایک آسمانی تحفہ کہانی اور دوسری کی نظر نہیں آ رہے، تیر تو ہے۔ کہانیوں میں صرف قسط وار کہانیاں پڑھی ہیں۔ دونوں کہانیاں زبردست تھیں۔ باقی کہانیاں ابھی مطالعہ نہیں کر سکا، رسالہ لیٹ ملنے کی وجہ سے ..... اور موت کے سائے اور دونوں رنگ بھی اچھے ہی ہوں گے کیونکہ ان کے رائٹرز کا نام ہی کافی ہے۔''

جتوں سے پامیلا خان کی خوشی ''میں پہلی دفعہ آپ دوستوں کی محبت بھری محفل میں شرکت کر رہی ہوں۔ (خوش آمدید) جاسوسی کا اور ہمارے گھر والوں کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ میرے بڑے بھائی ہر ماہ باقاعدگی سے جاسوسی لے کر آتے ہیں۔ پہلے میں اسے نہیں پڑھتی تھی لیکن ایک دن اتفاق سے اٹھا لیا اور اتفاقاً میں نے پہلی کہانی دیوی پڑھی جو کہ مجھے اتنی زیادہ پسند آئی کہ پھر اس کے بعد میں اور جاسوسی مستقل دوست بن گئے۔ دیوی طاہر جاوید انکل کی ایک شاہکار کہانی تھی اور مجھے لگتا ہے کہ میں اس جیسی کہانی شاید ہی پڑھ سکوں۔ طاہر جاوید مغل، مریم کے خان، کاشف زبیر، احمد اقبال اور اسا قادری میرے پسندیدہ رائٹرز ہیں۔ خط لکھنے کی ہمت شاید کبھی نہ کرتی اگر میں اپنے چھوٹے سے پیارے سے شہر کے ایک فرد کو محفل میں شریک نہ دیکھتی۔ ہمایوں سعید راج آپ کو جاسوسی کی محفل میں پہلی بار دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ اس کے علاوہ دلشین بلوچ، اقبال مرزا اینڈ سیما مرزا اور آسیہ پٹھان کے تبصرے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے اپنی فیورٹ کہانی للکار کی طرف دوڑی لیکن یہ کیا؟ یہ تو صرف چار صفحات پر مشتمل تھی۔ اف مجھے بہت صدمہ ہوا لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ کسی غلطی کی وجہ سے ہوا ہے۔ شاید اس کی تلافی اگلے ماہ میں ہو جائے۔ اس کے بعد اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو تھوڑا سہارا دینے کے لیے گرداب کی طرف رخ کیا لیکن اس میں بھی نیا کچھ نہیں تھا۔ شہر یار کی پریشانیاں، آفتاب اور کشور کا ہر وقت کھٹا نے چلانا اور ماہ بانو کا اغوا ہونا یہ سب معمول بن گیا ہے۔ اس کے بعد کاشف زبیر کی تاوان پڑھی جو کہ بلاشبہ ایک اچھی کہانی تو تھی لیکن حقیقت سے تھوڑی دور لگی۔ اس کے بعد احمد اقبال کی دلدل پڑھی، اچھی کہانی تھی لیکن کیا کوئی ایسا کر سکتا ہے؟ اپنے بھائی کے ساتھ ایسا کر سکتی ہے؟ یقین نہیں آیا۔ باقی کہانیوں میں آسمانی تحفہ، چیشو، اور تحفہ اچھی تھی۔ آسیہ خان کے بارے میں پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ کوئی معجزہ دکھا کر آپ کو اس موذی بیماری سے نجات دلائے۔''

بالاکوٹ سے محسن علی کا تبصرہ ''دن منانے کی روایت بھی خوب ہے۔ مدر ڈے، فادر ڈے، ٹیچرز ڈے، ... جون میں

www.kahopakistan.com

معنویت کا ایک سمندر ہے مگر لفظ وحشی میں تفاوت کی بھی کوئی حد نہیں۔ یہ امت روایات میں کھو کر گم ہو گئی۔ حقیقت خرافات میں کھو گئی کے مصداق ہر شے کا جسم موجود ہے مگر روح موجود نہیں۔ بہر حال جاری کو جاسوسی نے دیدار دیا۔ ٹائٹل گرل نے دل اور آنکھیں بیک وقت لیں۔ دل کو اور بے قرار آنکھوں کو چین آیا۔ لیکن ساتھ موجود بھائی صاحب کو دیکھ کر چین و قرار فوراً رخصت ہو گیا۔ انکل! اتنا خوفناک نہیں منظر کچھ خیال کریں۔ کچھ قاری کمزور دل بھی ہوتے ہیں، کہیں وہ بے ہوش ہی نہ ہو جائیں۔ محفل یاراں میں وکٹری ام ثمامہ کے حصے میں آئی۔ ام ثمامہ جی مبارکاں ہی مبارکاں۔ رشی صاحب! اتنا مختصر تبصرہ بھیج کر آئے اور وزارت لے گئے۔ اپنے نام کے ساتھ قوم پڑھ کر ہم سوچ میں پڑ گئے کہ ہم کون سے قوم ہیں۔ (آپ وضاحت کر دیجیے کیونکہ محسن کے بعد ”قوم“ کچھ اسی انداز میں لکھا ہوتا ہے۔ آپ آگے ماہ لکھ دیجیے گا کہ قوم ہیں قوم ہیں یا سوم ......) سائرہ خان امیری اور سب جاسوسی پڑھنے والوں کی دعائیں آسیہ خان کے ساتھ ہیں۔ آپ انہیں بتا نہیں کہ اس طرح ہمت ہارنے سے بیماری کم نہیں ہوتی بلکہ زیادہ ہوتی ہے۔ بابا ایمان! اس عمر میں بھی آپ کی شکایتیں کم نہیں ہوتیں۔ موت کے سامنے منظر امام نے اس مرتبہ خاص کہانی دی۔ اس دور سے دو دو کہانی ختم ہو گئی۔ تحفہ اور رقیب دلچسپ کہانیاں تھیں۔ للکار میں تابش کی جان اس منحوس چپ سے تو چھوٹی، اب یقیناً کہانی میں تیزی اور بہتری آئے گی۔ گرداب واہ واہ ساتی! آپ نے تو مردوں کی دوڑیں لگوا دیں۔ رنگوں میں دونوں رنگ ہمارے فیورٹ رائٹرز کے تھے اس لیے بہت پسند آئے۔ خاص کر احمد اقبال کی کہانی بہت پسند آئی۔“

غلام شبیر سیالوی کی آمد، سیدو بیگ سنگھ سے ”تبصرہ سے واسطہ 3 مئی کو ہوا۔ سب سے پہلے ٹائٹل سے سامنا ہوا۔ ایک لڑکی سہمی ہوئی کھڑی تھی اور اس کے پیچھے سے ایک شخص خنجر ہاتھ کراتے پکڑتے ہوئے کہ خاموش سر میں چھپا لیا ہے۔ پھر ہم چٹکی نکتہ چینی میں آئے۔ یہ خاندان کی طرح لگتا ہے جس میں اہل ذوق محفل نکتہ چینی کرتے ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ شکر خدا کا کہ تابش کو چپ سے نجات مل گئی۔ للکار پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے ہم براہ راست مناظر دیکھ رہے ہیں۔ موت کے سامنے پڑھی جس میں موت کم اور سامنے زیادہ تھے۔ اس میں منظر امام نے انکشافات کا عالمی ریکارڈ قائم کرنے کی کوشش کی۔ کچھ حقائق سے پھر بھی پردہ نہیں اٹھایا گیا۔ ہر ظلم کام کی سزا ہوتی ہے اور وہ مل کر رہتی ہے چاہے پردے میں ہو یا سب کے سامنے۔ یہ یاد دہانی کرائی ہمیں عثمان آزاد نے۔ محسن نے بے حد متاثر کیا۔ عورت اگر عورت رہے تو بڑی افضل، بہتر اور رفعت ہے مگر جب وہ شوقین بننا چاہتی ہے تو اپنا مقام کھو بیٹھتی ہے۔ لو تاری داستان بڑی ہی تلخ تھی۔ خطر پسند بھی اچھی تھی۔ کارل اور ایڈرین نے اپنی صلاحیتوں سے انگریزوں کو کام کیا۔ تاوان تو دل کو لگی۔ یہ کہانی بہت پسند آئی۔ وقت سے پہلے کچھ جاننا شعور کا باعث بنتا ہے۔ یہ سعادت انہی کو نصیب ہوتی ہے جو اسے برداشت کر سکیں۔ سمیع کو اپنی بیٹی کی موت سے پہلا جھٹکا لگا۔ یہ میرا کسی بھی طرف پہلا خط ہے۔ بڑی امید سے لکھ رہا ہوں۔ یقین کریں اگر شامل ہو گیا تو میری خوشی کی انتہا ہو گی۔ نہ میری لکھائی اچھی ہے اور نہ خط لکھنے کا ڈھنگ ہے۔“

ایم اے ہاشمی کی تلملاہٹ، لاہور سے ”تبصرہ نگاری میری خاص صنف کے تاروں سے ٹائٹل پر موجود ہیں جہاں ایک عدد خوب صورت لڑکی براجمان تھی۔ ایک طرف اس کے سر پر گرداب ... دوسری طرف اس کے ابھرے ہوئے گال غضب ڈھا رہے تھے۔ نظر تو وہ خوش آرہی تھی مگر اس کی اندرونی کیفیت کے بارے میں کہانی قدرت ہے۔ لڑکی کے پیچھے ایک مکروہ چہرہ کسی ٹائل کی طرح ایک کانے میں چھپا ہوا نظر آرہا تھا۔ ٹائٹل سے نگاہ ہٹا کر فہرست تک رسائی حاصل کی اور چٹکی نکتہ چینی پر اپنی نگاہیں بے لگام چھوڑ دیں۔ (واہ ...... یہ تو آپ نے خطرناک انکشاف کر دیا) ام ثمامہ صاحبہ بڑے خوب صورت انداز میں تبصرہ سنا رہی تھیں۔ بے حد مبارک تصور الحسن! میں آپ کا ممنون ہوں۔ گرداب کے بارے میں آپ کا تنقیدی بیان بجا ہے۔ تفسیر عباس صاحب! آپ کو تبصرہ نگار کے بجائے مشورہ نگار کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ اپنے مفید مشوروں سے ہمیں بھی نوازیں۔ (کیا آپ کو بھی ضرورت ہے؟) اس شمارے کا امام ہے چٹکی ... روبینہ احمد کہانی صاحب! پیارا دل بات ہے کہ جو تبصرہ پہلے پہل چھپ جاتا ہے اسے انعام دیا جاتا ہے یا حسن تبصرہ میں حسن ہوا ہے۔ تنویر احمد صاحب! اگر مجھے پشتو آتی ہوتی تو میں اردو میں کیوں یاد ... ۔ رانی باجی تمہارا اندازہ ٹھیک لگایا۔ بابا ایمان کی امیری کچھ اللہ کے فضل سے بہت زیادہ ہے۔ اگر خدانخواستہ ختم ہو گئی تو اس کا ازالہ بھی آپ ہی کریں گی۔ کیا کہیں؟ سائرہ خان اللہ آپ کی کزن کو صحت دے۔ آمین۔ لیکن دال میں کچھ کالا ہے۔ (آپ کو کیسے معلوم؟) اب کہانیوں کی طرف۔ گرداب کی اس قسط میں جنگل کے حالات بالکل پسند نہیں آئے۔ ایک طرح کا بور پن تھا اور انداز بھی نہایت بوجھل۔ بیشتر کرداروں کو پس منظر میں دھکیل دیا گیا ہے اور نئے کرداروں سے متعارف کرا رہے ہیں۔ للکار کی یہ قسط زبردست رہی۔ چپ کے نکل جانے سے تابش کا کام بن گیا۔ راج بھون میں داخل ہوا اور وہاں تباہی پھیلاتا نہایت سنسنی خیز سین تھا۔ ابتدائی صفحات پر موت کے سامنے ایک عمدہ تحریر تھی۔ کاشف زبیر کا پہلا رنگ نہایت سنسنی خیز کہانی تھی۔ سمیع کی روحانی قوت نے حیران کر دیا۔ آئینہ پر سخت افسوس ہوا۔ سمیع کو ابھی نہیں مرنا چاہیے تھا۔ دوسرا رنگ بھی اچھا تھا۔ باقی زیر مطالعہ ہے۔“ (کیا؟)

محسن آباد سے محمد طیب کی پسندیدگی ”پہلی کہانی موت کے سامنے صحرا میں کھیلے جانے والے خونی کھیل کی داستان تھی۔ تھر کے صحرائی ماحول کی حقیقی عکاسی کی گئی۔ ایڈونچر اور مہم جوئی نے اس کہانی کی خوب صورتی میں اضافہ کیا۔ (شکریہ) للکار میں ہمیشہ کی طرح آخری صفحات تک دلچسپی برقرار رہی۔ محسن دو دوستوں کی کہانی تھی۔ ایک قانون شکن تھا تو دوسرا قانون کا محافظ۔ مگر یاروں نے دوستی بھی نبھائی اور قانون کی حرمت پر بھی آنچ نہ آنے دی۔ خطر پسند میں ایک فرض شناس پولیس آفیسر کارل نے اپنی جان داؤ پر لگا کر اسمگلروں کے ایک گروہ کو بے نقاب کیا۔ پہلا رنگ کاشف زبیر نے تحریر کیا۔ تاوان میں انہوں نے ایک انوکھے موضوع پر قلم اٹھایا۔ سمیع کو قدرت نے کچھ غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا مگر جب اس کے دل نے کسی کے لیے دھڑکنا سیکھا تو موت اس کا مقدر بن گئی۔ سرورق کا دوسرا رنگ دلدل سسپنس اور مزاح کا ایک حسین امتزاج تھا۔“

شمع عرف چھمو کی نیک تمنائیں، اٹک سے ”آپ کی پرانی قاری چھمو ایک دفعہ پھر حاضر خدمت ہے۔ چٹکی نکتہ چینی میں ام ثمامہ

کو کرسی پر براجمان پایا۔ مبارک ہو۔ باقی تبصرے بھی اچھے تھے لیکن پرانے قاری تمام غائب ہیں، کہاں ہو؟ واپس آجاؤ۔ چھمو تمہیں بلا رہی ہے۔ اشتہارات کو نظر سے کہتے ہوئے للکار پر پہنچے۔ اسحاق کے سولی چڑھنے پر بڑا دکھ ہوا۔ جارج گورا اور شمی کا بھیانک انجام ہونے والا ہے۔ چلو تابش کی منحوس چپ سے جان چھوٹی۔ رنگوں کی طرف چھلانگ لگائی تو دونوں رنگ اچھے تھے بلکہ زبردست تھے کیونکہ دونوں بار رائٹرز کے لکھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد پیچھے کی طرف جست لگائی اور منظر امام کی موت کے سامنے پڑھی جو ایک بہترین کہانی تھی۔ چھوٹی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ تمام قارئین سے التماس ہے کہ وہ گروجی کی صحت کی دعا کریں۔ ہماری پوری ٹیم رسیلی، پنکی، چنچلی، تتلی، چھمو اور گروجی کی طرف سے نیک تمنائیں۔“

نوید ساجد زیدی کے خیالات، نامعلوم جگہ سے ”اس ماہ کا جاسوسی چار تاریخ کو بڑی تگ و دو کے بعد ملا۔ بہر حال مل گیا، یہی سوچ کر خوشی سے سرشار بازار سے گھر کی جانب دوڑ لگا دی۔ ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی ساری خوشی کافور ہو گئی۔ (کیوں؟) ایک لڑکی نیم وا ہونٹوں سے اپنے دانتوں کی نمائش کر رہی تھی یا نیدی بلی کی طرح چھیچھڑوں کے خیال سے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ آنکھوں میں عجیب سا نشہ تھا مگر ہائے افسوس اس دل ناداں پر جو یہ بھی نہ کہہ سکا، ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے۔ ٹائٹل کے بعد سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ گرداب بھی اپنی نوعیت کی عجیب سی کہانی ہے۔ شاید ساتی اس کہانی کی طوالت کو خود انجوائے کر رہی ہیں۔ ساتی! کہانی کی بوریت ختم کیجیے۔ بے چاری ماہ بانو کی حالت پر ترس کھائیے۔ خیر گرداب کے بعد للکار پڑھی۔ موت کے سامنے از منظر امام زبردست رائٹر ہیں مگر یہ کہانی پڑھ کر بہت دکھ ہوا کہ کیا کہانی لکھ دی۔ اسٹوری اچھی تھی مگر کہیں اس کو پُرمزاح بنانے کی بھونڈی سی کوشش کی گئی تھی تو کہیں کہانی سنجیدگی کا عنصر لیے ہوئے تھی۔ مغرب زدہ کہانیاں اچھی تھیں۔ آخری صفحات پر بکھرے رنگ بے حد بہترین تھے۔“

رانا ادیب الرحمٰن کی تلخ باتیں، سکالنگ فیصل آباد سے ”آج حویلی غیر حاضری کے بعد آیا ہوں۔ (ہم نہیں، آپ بتایئے کیا ناراضی تھی ... کیسی خفگی تھی؟) امید ہے ناراض نہیں ہوں گے کیونکہ جیل کی زندگی بہت کرب زدہ ہوتی ہے۔ یہاں دن رات ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یہاں آنسو بھی خشک ہوتے ہیں کیونکہ آنکھیں ان کا وزن سہارنے سے قاصر ہوتی ہیں۔ ویسے بھی تنہائی میں آپ، آپ کا ادارہ ہمیں پریشان نہیں ہونے دیتے اور آنسو تو مسکراہٹ سے زیادہ خاص ہوتے ہیں کیونکہ مسکراہٹ تو سب کے لیے ہوتی ہے لیکن آنسو صرف ان کے لیے ہوتے ہیں جنہیں ہم کھونا نہیں چاہتے اور میرے لیے خاص جاسوسی ڈائجسٹ جسے میں کبھی پڑھنا نہیں بھولا۔ (شکریہ! آخر یہ اسیری کے دن کب ختم ہوں گے؟) مئی کے جاسوسی ڈائجسٹ کو 2 تاریخ کو پایا۔ سرورق ٹائٹل اپنی مثال آپ ڈاکٹر انکل نے اکٹھے 15، 16 چاند جاسوسی ڈائجسٹ کو بخشے ہوئے تھے۔ حسینہ حیرانی کے ساتھ ہی بالوں کی شکل کے نقاب کو گھیر رہی ہے جیسے کہہ رہی ہو اوئی اماں ہائے ...... مچھلی کے کانٹے میں پھنسا چہرہ سے کا نقاب اور ٹپکتے خون کے قطرے جاسوسی کے لحاظ سے اچھا ٹائٹل تھا۔ ام ثمامہ بھی مبارک ہو اول کرسی پر بیٹھنے کی۔ کیا تبصرہ لکھا ہے مسکا لگا کے ... بس تھوڑے سے مکھن کی کمی تھی، وہ نانی پاکستانی سے مانگ لیتا تھا۔ کیونکہ نانی خان کے پاس ہیروں کے حساب سے مکھن ہوتا ہے مسکا لگا کے ہاہاہا ...... تفسیر عباس جی! آپ کی کھاتہ ونا راہو لی ہے صنف نازک ادھر ادھر سے جھانک رہی ہیں آپ کو مسکا لگا کے ...... آغا فریدی! آپ کے فرمان میں اب وہ بات نہیں رہی۔ پیر سے پہ تھوڑا خشکا بھی لگائیں مسکا لگا کے ...... عائشہ رانی جی، یہ کیا آپ نے آلسی چھیا کو بندوق سمجھ رکھا ہے جس کو آگے کر رہی ہیں لیکن یہ بھی تو سوچیں اس بندوق سے کیا نکلے گا۔ (آپ کے خیال میں تو مکھن ہی نکلے گا شاید ...) مسکا لگا کے ...... ہاہاہا۔ محفل میں صرف دو پرانے دوست نظر آئے۔ باقی سب نئے دوستوں میں اپنے آپ کو بڑے مزے میں پایا مسکا لگا کے۔ کہتے ہو جہانگیر اسلم تو دل خوش ہو گا کے ... روبی اسلم، شان احمد کشکوری، شہناز مریم جو تیجو اسے بچ کہنا سلجے و دھیں آگئیں۔ آپ کے بغیر محفل سونی سونی ہے مسکا لگا کے۔ باقی تبصروں میں ایم اے ہاشمی، ثمن ولی، اسے خان، تصور الحسن کے خط اچھے تھے۔ سکوں سے بھرپور ہاہاہا ...... محفل سے بھاگ کر جاگتے کہانیوں کے قریب باغ میں۔ للکار تو نان اسٹاپ ایکشن بہت بہترین کہانی دوڑ رہی ہے۔ ظاہر جاوید مغل صاحب کی بہترین کاوش ہے۔ تابش کی چپ نکل گئی، بال تمام اب مزہ آئے گا۔ گرداب معصومہ قادری کی بدولت پوری طرح ہمیں اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ ماہ بانو کا تکلیف دہ سفر ابھی تک جاری ہے۔ شہریار عادل کی ابھی شادی نہیں ہونا چاہیے تھی۔ ماہ بانو تو محبت کے سفر میں خار دار راستوں میں الجھی ہوئی ہے۔ شہریار تک پہنچ کر اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ تنہائی میں سسپنس، ایڈونچر بھر پور سب کچھ موجود ہے۔ پہلی کہانی موت کے سامنے منظر امام کی اچھی انداز میں لکھی۔ کچھ زیادہ مزہ نہ دے سکی۔ کہانی کا انجام خوب صورت رہا۔ سرورق کے آخری رنگوں میں پہلا رنگ تاوان کاشف زبیر کی بالکل انوکھی دلچسپی سے بھرپور ایک غیر معمولی کاوش تھی۔ سرورق کا دوسرا رنگ دلدل جس میں مسکراتی آج کل کے معاشرے کی عکاسی کرتی بہترین کہانی تھی۔ چھوٹی کہانیوں کا مطالعہ ابھی جاری و ساری ہے۔“

ملتان سے عائشہ رانی کی باتیں ”جاسوسی اس مرتبہ پانچ مئی کو وصول ہوا۔ انتظار کرنے کے بعد مجھے بہت غصہ آیا تو دیا، اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا کہ جتنا تین مرتبہ اسٹال تک رسالہ لینے خود جانا پڑا۔ ٹائٹل بے چارہ پرنٹنگ۔ سب سے پہلے محفل میں پہنچے۔ ام ثمامہ واہ جی واہ کس نے کرسی صدارت ... باقی تبصرے بھی مزے کے تھے۔ تنویر احمد صاحب! جی پشتو بولی آتی ہے مگر ...... مجھے نہیں ہمارے ہمسایوں کو ...... ہاہاہا۔ آغا صاحب! اماں جی بہت بہت بہتر ہیں آپ سب کی دعاؤں کے سبب۔ تفسیر عباس صاحب! جناب ہم تو انگلیاں چٹکیاں مارتے ہی ہیں مگر آپ تو باقاعدہ مکے مارتے ہیں، دھکا ... اٹھاتے اور لطف اندوز ہونے کے ساتھ کوئی طنزیہ تبصرہ بھی کرنا لازمی سمجھتے ہیں تو خود اندازہ کر لیں کہ بھونکا کون ...... ؟ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ شکر ہے اس چپ سے ہمارے سیکنڈ ہیرو کی جان چھوٹی۔ عمران کی باتیں بہت ہی انجوائے کیں۔ اسحاق کی دردناک موت پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ ماہ بانو پھر بچ گئیں۔ بلی کا گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا، کشور کا دوبارہ زندہ بچ جانا، چودھری کا پوتا نواسہ پیدا ہونا، اتنی تبدیلیاں وہ بھی تین اقساط کے بعد اس مرتبہ کچھ دلچسپ محسوس ہوا۔ منظر امام کی موت کے سامنے جاسوسی کم اور سسپنس زیادہ تھی۔ ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی انوکھی بات پانی اشرفی کی واردات۔ نانبا پانچ پاس سے زیادہ

www.kahopakistan.com

مرتبہ لوگ اغوا ہوئے۔ صرف میرا تجربہ۔ جیالوجسٹ کا خود بخود اوپر اٹھ کر غائب ہو جانا۔ بہت حیران کن بات لگی پھر جب حقیقت پتا چلی تو...... کاشف زبیر صاحب کا پہلا رنگ، خاطر خواہ اثر چھوڑا۔ ان کی اکثر کہانیاں مذہب کے بہت قریب اور مافوق الفطرت واقعات سے بھری ہوتی ہیں مگر اس میں انہوں نے بہت اچھا پیغام لوگوں تک پہنچایا کہ قدرت کے کاموں میں ہی بہتری ہوتی ہے۔ انسان اس معاملے میں کچھ کرے تو واقعی ہی تاوان دینا پڑتا ہے۔ چاہے وہ اس کی اپنی زندگی ہی کیوں نہ ہو۔ آسیہ آپ جلدی بی چھتی چھتی صحت یاب ہو جاؤ اور ہماری نت کھٹ سی محفل میں آ کر چار چاند لگاؤ۔ اللہ تمہاری صحت مزید بہتر کرے، آمین۔''

بنوں سے ہمایوں سعید راج کی خواہشات ''انکل جی! اس بار تو الطاف محفل کی ذہنی ہم آہنگی نے حیران کر دیا۔ سب نے مشترکہ طور پر حسب توفیق میرے بخار کے افاقے کے لیے خنجر بھرے ڈبل ڈوز انجکشن لگائے۔ الحمد للہ اب بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ آفاقی نے بغیر کسی ٹھوس وکیل کے لنگین کو پھانسی کا خطاب دیا۔ اپنے نئے دوست تنویر جذبات کی شدت سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ عاشق جی! اگر جاسوسی کرنے کے بجائے 50 روپے دل پر پتھر رکھ کے خرچ کر دیتیں تو مطلوبہ نتائج آسانی سے برآمد ہو جاتے۔ فطرتاً نرم دل ہاشمی صاحب کو اعجاز صاحب کی اداسی نے بے حال کر دیا ہے۔ سب سے زیادہ شاکنگ خط سائرہ خان کا تھا۔ سائرہ جی! ہم سب آپ کے لیے دعا گو ہیں۔ انہیں پلیز واپس لائیں۔ ہم سب انہیں بہت مس کرتے ہیں۔ ماہا جی نے بھی انسانی ہمدردی کے تحت اعجاز بھائی کو شاعر اعظم قرار دیا۔ آتش بھائی آپ نے شاید ٹرک والی لگائی ہوگی جب ہی حیرت سے تک رہی تھی۔ احمد اعجاز! شرمندہ نہ کریں۔ ہم ایسے چھوٹے موٹے کرم اور تکلیاں دریا میں ڈالتے ہی رہتے ہیں۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ مغل انکل! للکار میں ابھی تک آپ نے قلم کا وہ جادو نہیں جگایا جس کے ہم دیوانے ہیں۔ وہ لازوال رومینٹک منظر نگاری اور لاثانی مکالمے جو دل کی دھڑکن بڑھا دیتے ہیں وہ ابھی تک ناپید ہیں۔ (دل کا زیادہ دھڑکنا صحیح نہیں ہوتا!) انکل آپ سمجھ گئے نا! ماہانی نے شہریار کی گدی پر سے کیا خارج کر دیا کہ اسامی قورا اکرم کو بطور ہیرو لے آئیں۔ ماہا بانو پر قدرت مہربان ہے جوان جنگیوں میں بھی اس کی عصمت کا رکھوالا پیدا کر دیا۔ چوہدری کی مکاری پر بے تحاشا غصہ آیا۔ راحیلہ اور اس کے بھائی کی کہانی بھی کنارے لگ گئی۔ کاشف زبیر کی تاوان ایک قابل فراموش اور لازوال کہانی ثابت ہوئی۔ بہت سالوں بعد ایسا دھماکے دار رنگ پڑھنے کو ملا۔ کاشف زبیر کا یہ کمال ہے کہ وہ شروع سے آخر تک قاری کو اپنے سحر میں جکڑے رکھتے ہیں۔ دوسرے رنگ میں بزدل کی آمد کا سن کر دل نے بے اختیار ایک نعرہ لگایا۔ جب بزدل صاحب پوری سنجیدگی سے کہتے ہیں کہ میں بزدل ہوں تو بے اختیار چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ اس بار تو اس کے کمرے کا حال سن کر ابکائیاں آنے لگیں۔ بزدل صاحب نے حسب سابق محبوبہ کی فرمائش پر پرانے پھڈے میں ٹانگ اڑائی اور ایک قتل کے کیس کی ادھر ادھر بکھری کڑیاں جوڑ دیں۔ ابتدائی صفحات پر منظر امام موت کے سائے لائے۔ اف! شروعات سے لے کر آخر تک الجھنیں ہی الجھنیں تھیں۔ کئی بار تجسس کے ساتھ ساتھ میرا سر بھی چکرانے لگا۔ ایم اے راحت نے ایک بے حد حساس اور نکیلے موضوع پر طبع آزمائی کی۔ نوشاد کی آخری خواہش اور پھر اس خواہش کے ساتھ سلوک نے بے حد اپ سیٹ کیا۔ انسانی زندگی کا ایک اور تاریک پہلو آشکار ہوا۔ خطر پسند اور بڑا بھائی مختصر کہانیوں میں دبنگ ثابت ہوئیں۔ یہ شمارہ ہر لحاظ سے شاندار رہا۔''

کرم پور سے نادیہ خان دسیر کی نصیحت ''اس بار جاسوسی آندھیوں کے موسم میں ملا۔ سرورق کچھ ڈراؤنا تھا۔ ہاں البتہ حسینہ پیاری تھی۔ آپ نے ٹھیک کہا کہ روتے ہوئے بچوں کو ہنسانا بھی عبادت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ چار ایسے فنکار تھے جو ہر بات میں مذاق کا پہلو نکال لیتے تھے۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے، آمین۔ ام ثمامہ کو کرسی صدارت مبارک۔ کہیں آپ سرورق کی حسینہ کے کان کی بالی چرانے کے چکر میں تو نہیں؟ رشی جی! خوش آمدید۔ تصویر لنگین کا تبصرہ اچھا تھا۔ تفسیر عباس! آپ کے حادثے کے بارے میں سنا، بہت دکھ ہوا۔ اللہ آپ کی لمبی عمر کرے اور آپ کو صحت دے، آمین۔ محسن علی! آپ کے دل کی دھڑکن کیسی ہے؟ اس بار تو حسینہ زیادہ پیاری ہے۔ (اب بڑھ گئی ہوگی ......) فرید بھائی! آپ جو لنگین بلوچ کو مشورہ دے رہے ہیں یا ایڈ دے اپنے پیاں کس...... آپ تعویذ گنڈے کرنے والے بابا تو نہیں؟ تنویر احمد! ہماری باتیں آپ کو پسند آئیں شکریہ۔ اس ماہ تو آپ خوش ہیں نا کہ آپ کا خط شائع ہو گیا۔ ایم احمد ہاشمی صاحب! ورنہ کیا؟ سائرہ خان! اللہ آپ کی کزن کو صحت دے۔ ماہا ایمان جی! ہم بھی یہاں سے جانا نہیں چاہتے۔ علی آتش، احمد اعجاز اور ڈبل مرزا کے تبصرے بہت عمدہ تھے۔ (ڈبل مرزا! اچھی بات ہے) منظر امام کی کہانی موت کے سائے تجسس سے بھرپور تھی۔ بے چارہ تیجو پریشان نہ ہوتا تو کیا کرتا، ہر روز نیا انکشاف۔ غزالہ کی موت کا بہت دکھ ہوا۔ ہاں البتہ مالتی کا مسلمان ہونا اچھا لگا۔ طاہر جاوید کی للکار بہت اچھی جا رہی ہے۔ اسما قادری کی گرداب بہت خوب۔ یہ کہانی معاشرے کے ہر پہلو کو اجاگر کرتی نظر آ رہی ہے۔ مریم کے خان کی کہانی بہت دکھی کر گئی۔ جمال دتی کی تحریر اچھی تھی۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ آخر میں ایک پبلک میسج ہے کہ موبائل پر رونگ نمبرز سے کبھی دوستی نہ کریں اور والدین اپنے بچوں کے موبائل وقتاً فوقتاً چیک کرتے رہیں۔ یار زندہ صحبت باقی۔''

تنویر احمد زیارت کی درخواست کا کا...... نوشہرہ سے ''مئی کا جاسوسی دو تاریخ کو مل گیا۔ حسینہ بہت غور سے کسی کو دیکھ رہی ہے۔ انکل! اس بے چارے نے کیا ظلم کیا ہے جو آتی بڑی سزا مل رہی ہے۔ کہانیوں میں للکار بہت اچھی تھی۔ گرداب صرف اچھی تھی۔ احمد اقبال کی دلدل نے دل جیت لیا۔ تعاون، خطر پسند، بڑا بھائی، آسمانی تحفہ، موت کے سائے، رقیب، تحفہ، مجسمہ سب اچھی کہانیاں تھیں۔ سائرہ خان! ہماری دعا ہے کہ آپ کی کزن کو اللہ لمبی زندگی دے، آمین۔ تمام قارئین سے گزارش ہے کہ میرے بھائی کے لیے دعا کریں کیونکہ آٹھ ماہ ہو گئے ہیں لیکن میرے بھائی کا کچھ پتا نہیں۔ پلیز! میرے بھائی کو دعاؤں میں یاد رکھیں۔ عاشقہ رانی، ایم احمد، فرید احمد خان کے خطوط اچھے تھے۔ پلیز! میرا خط ضرور شائع کریں اور میرے بھائی کو دعاؤں میں یاد رکھیں۔''

ملک عتیق مظہر کی شمولیت گجرات سے ''حسب معمول جاسوسی ڈائجسٹ ملتے ہی سب سے پہلے ان قارئین کے ناموں کو دیکھا کہ جن کے نام شائع ہو سکے، خط نہیں۔ ہلکی سی مسکراہٹ زیر لب آئی اور سوچا کہ چلو اہل قلم و محبت کی محفل میں۔ اس دفعہ طاہر جاوید مغل صاحب کی للکار چالیس منٹ کی ایک ہی نشست میں ختم ہو گئی اور پھر انتظار۔ تابش اور عمران دونوں کو ملا کر بہت اچھا اور بہت تیز کھیل رہے ہیں۔ تیزی سے کردار ڈالتے اور نکالتے ہیں۔ دشتی کا آنا اسحاق کا جانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات اٹل ہے کہ جب تک طاہر صاحب کی للکار جاری ہے، جاسوسی سے رابطہ رہے گا اور اس طرح اس کے تمام کہانی کاروں پر نگاہ پڑتی رہے گی۔ نواب صاحب اور احمد اقبال صاحب کی طرح کے تمام رائٹر پڑھنے کو ملتے رہیں گے۔ ذاکر صاحب جیسے مصور کی تصاویر بھی دیکھنے کو ملتی رہیں گی جو کہ اب لگتا ہے کہیں عالم غیب سے ...... کشیدہ کاری کرنے لگے ہیں۔ اس دفعہ کا سرورق تو دجال کی عکاسی کرتا نظر آ رہا ہے جو یقیناً جاسوسی دنیا کے لیے انتہائی موزوں سرورق ہے۔''

ضلع اٹک سے محمد اسماعیل ساگر کی ہدایات ''مئی کا شمارہ اس دفعہ دو، تین دن لیٹ ملا۔ سرورق اس دفعہ بہت پسند آیا۔ کافی عرصے کے بعد ایسا سرورق نظر آیا۔ ذاکر صاحب نے اس دفعہ واقعی محنت کی ہے۔ سرورق سسپنس پر اسراریت سے بھرپور تھا۔ بہت عمدہ شاہکار سرورق رہا اس ماہ کا۔ ایسا ہی سرورق ہونا چاہیے۔ اس کے بعد پہنچے چٹکی چٹکی کی محفل میں۔ روتوں کو ہنسانے والے بہت عظیم ہوا کرتے ہیں اور معین اختر جیسے فنکار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے بھی تھے پر کسی کی دل آزاری کا سبب تو نہیں بنے۔ یہ خلا کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پہنچے 'سرورق کے رنگوں پر' تو ان کا موضوع اچھا تھا، پر متاثر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ رنگوں کے اندر جو دلچسپی ہوتی تھی، وہ نہیں رہی۔ ایکشن، اسرار و تجسس سے بھرپور ہونی چاہیے یہ تحریریں۔ دوسرا سرورق کا تذکرہ بھی نہیں ہوتا ان کہانیوں میں۔ بہرحال آپ کو سرورق کے رنگوں پر توجہ دینی چاہیے۔ سرورق کے رنگ لکھنے میں منظر امام صاحب بہت ماسٹر ہیں۔ اولین صفحات پر منظر امام صاحب کی تحریر موت کے سائے بہت پسند آئی۔ قدم قدم پر تجسس، پراسراریت، سرورق کے رنگ ایسے ہونے چاہئیں۔ منظر صاحب نے ریکوڈک کے پس منظر میں بہت خوب صورتی سے قلم چلایا ہے اور قلم چلا کے توڑ دیا ہے۔ ایسی تحریروں سے ملک دشمن عناصر کے چہروں سے پردہ اٹھتا ہے کہ کس کس طریقے سے اس ملک کو ختم کر لیں پر ابھی اس دھرتی کے جانباز زندہ ہیں، وہ کسی صورت اس وطن کا سودا نہیں کریں گے۔ اس کے بعد انوکھا طریقہ پڑھی، پر متاثر نہ کر سکی۔ سرورق کا دوسرا رنگ بھی بور تھا۔ آسمانی تحفہ مختصر مگر دلچسپ کہانی رہی۔ مجرم بہت چالاک ہوتے ہیں۔ ان کا ہر کام منفی اثرات پر مبنی ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی نیا طریقہ، نئی واردات۔ بڑا بھائی ایک سسنی تیز تحریر، پسند آئی۔ بے وقوف لوگ ہمیشہ غلطیاں کرتے ہیں جیسا کہ جوزف کا 'بھائی' پر آخر میں عقل مندی دکھا گئے۔ فیصلے ایک بہت ہی پیاری تحریر رہی۔ مغربی لوگوں کی کامیابی کا راز یہی ہے خلوص پن اور بروقت فیصلے۔ محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ محبت کرنے والی بیوی ہو تو زندگی کامیاب ہوتی ہے۔ نہ صرف کامیاب بلکہ معاشرے میں بھی مثال بن جاتے ہیں۔ سنگی جیسے بڑے ہوں اور سارہ جیسے چھوٹے تو زندگی کا مزہ تب ہی آتا ہے۔ باقی کہانیاں بھی ٹھیک رہیں۔ ہر دفعہ کہنے کو تو بہت باتیں ہوتی ہیں پر آپ کے قیمتی وقت کے لحاظ سے قلم روک دیتے ہیں۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔''

قصور سے علی آتش کی تعریف و توصیف ''مئی کا جاسوسی ہمیں بک اسٹال کے چار چکر لگانے کے بعد دو مئی کو ملا۔ سب سے پہلے نظر سرورق پر پڑی۔ سرورق کی پینٹنگ اچھی لگی لیکن محترمہ ہمیں ذرا بھی پسند نہیں آئی۔ (ہم بھی آپ کے ہم خیال ہیں) اشتہاروں کو پھلانگتے ہوئے اپنی محفل چٹکی چٹکی میں پہنچے۔ کرسی صدارت پر اپنے بہترین تبصرے کے ساتھ ام ثمامہ براجمان تھیں۔ مبارک باد ـــ تفسیر عباس! ہمارے نام میں ایسا کیا ہے جس نے آپ کو متوجہ کیا۔ تبسم صاحب! اپنا تبصرہ پہلے نمبر پر دیکھ کر تو ہم خود حیران ہو گئے تھے۔ روبینہ امجد ہم اپنا تبصرہ انا لیٹ پوسٹ کرتے ہیں کہ ہمیں خود امید نہیں ہوتی تبصرہ شائع ہونے کی۔ عاشقہ رانی آپ کو اجازت ہے محفل میں ہمیں آگے کر دیا کریں۔ سائرہ خان! ہم آسیہ خان کے لیے خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انہیں صحت کاملہ عاجلہ عطا فرمائے۔ احمد اعجاز صاحب آپ نے تو ہمیں پتا نہیں کیا بلا بنا دیا ہے۔ مرزا اسسٹرز! آپ کو کیوں لگا کہ ہم سب کو سلامی دے رہے ہیں؟ ویسے اس دفعہ بلیک لسٹ میں بڑے بڑے تبصرہ نگار دوست پڑے تھے۔ اس دفعہ سارے تبصرے ہی ہمیں اچھے لگے۔ اس کے بعد سب سے پہلے للکار پر پہنچے۔ تابش کی چپ ٹوٹنے کی دیر تھی، اب مزہ دوبالا ہوگا۔ ایکشن سے بھرپور قسط کا اینڈ ہمیں مغموم کر گیا۔ اس کے بعد سرورق کا پہلا رنگ، تاوان پڑھا۔ اس کے بارے میں بس اتنا ہی لکھ سکتے ہیں کہ یہ ایک شاہکار تھا اور شاہکار مدتوں بعد وجود میں آتے ہیں۔ دوسرا رنگ دلدل ہمیں تو لگا کہ ہم نے پہلے بھی یہی پلاٹ، یہی کردار، یہی اسٹوری پہلے بھی پڑھی ہوئی ہے۔ پہلی کہانی موت کے سائے آہستہ تیجو کے ساتھ ہمیں کچھ خاص نہیں لگی۔ اتنے اتفاق ہوئے ہیں کہانی میں کہ اس کا نام ہی اتفاق ہونا چاہیے تھا۔ چھوٹی کہانیوں میں ہمیں سب سے اچھی مجسمہ لگی۔ اس دور میں انسان اگر جیلر فرہاد بن پائے تو وہ صرف نوشادی بن سکتا ہے۔ محمد عرفان آزاد کی پیشہ ور میں الیکس نارٹن نے مرتے مرتے بھی پیٹر کو گرفتار کروانے کا بندوبست کر ہی دیا۔ آصف ملک کی فیصلے آج کے دور میں بھی محبت کا درس دے رہی تھی۔ باقی تمام چھوٹی کہانیاں بھی ٹھیک تھیں، سب پسند آئیں۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے اس ماہ شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

طاہرہ گلزار، ساحل دعا بخاری، بصیر پور۔ اسامہ خان، اسلام پورہ جبر۔ تحریم تلوکر، خوشاب۔ ساگر تلوکر، چشمہ بیراج۔ ظفر تنہا تلوکر، بلوچستان۔ ساون علی تلوکر اینڈ شہزاد تلوکر، اٹک۔ انجم فاروق ساحلی، لاہور۔ ماہ تاب گل رانا، راجن پور۔ محمد ذوالقرنین خان، وحدت کالونی کوئٹہ۔ سونیا اقبال۔ علی آتش، قصور۔

> گجرات میں ہماری ایجنسی خالد بک اسٹال کے نگران جناب جمیل احمد صدیقی سفر عمرہ کے دوران 3 مئی 2011ء کو مکہ مکرمہ میں خالق حقیقی سے جا ملے۔۔۔ خانہ کعبہ میں نماز جنازہ کے بعد مکہ مکرمہ میں مرحوم کی تدفین ہوئی۔ ادارہ مرحوم کے پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

www.kahopakistan.com

جگر خراش

تلخیص و ترجمہ - اثر نعمانی

جیمس ہیڈلے چیس کے تحیر خیز قلم کی روانی اور اثر نعمانی کی نکتہ رس تحریر کی جولانی کا ایک خوبصورت سنگم جسے قارئین پورے انہماک سے پڑھتے ہیں۔ سطر سطر تجسس اور فتنہ انگیز حشر سامانیوں سے بنی ہوئی ایک انوکھی کہانی جس میں بے خوف حریف سازشوں کے جال سنبھالے ایک دوسرے کو بے بس و لاچار کرنے کی گھات میں لگے ہوتے ہیں، ضرب وہاں لگاتے ہیں جہاں مضروب کو آہ و فغاں تک کی مہلت نہیں ملتی۔ ہوش ربا حسن اور معصوم صورتوں کا استعمال ان کے بہترین ہتھیار تھے۔ روایتی اور غیر روایتی ہتھیاروں سے لیس دو حریف جب یوں صف آرا ہوتے ہیں تو ان میں سے سچ ایک ہی ہوتا ہے، دوسرا کذب جہنم... کبھی کبھی جھوٹ بھی طاقت اور بربریت کے سامنے سچائی پر غالب آجاتا ہے... لیکن یہ فتح عارضی ہوتی ہے...

محبت... دولت اور انتقام کے شعلوں میں گھر جانے والے جانبازوں کا معرکہ خاص

میرا نام ڈرک ویلیس ہے۔ غیر شادی شدہ ہوں... عمر چالیس سال کے قریب ہے۔ طویل قد و قامت، چہرہ اور خدوخال ایسے ہیں جسے دیکھ کر بچے بھی نہ ڈریں۔ ایلیمی ڈیٹیکٹو ایجنسی میں کام کرتا ہوں۔ ایجنسی کا دفتر ٹروٹین بلڈنگ کے ٹاپ فلور پر واقع ہے۔ پتا ہے پیراڈائز ایونیو۔ پیراڈائز سٹی، فلوریڈا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا کے مشرقی ساحل پر اس سے زیادہ بہتر اور گراں قیمت ایجنسی کوئی اور نہیں ہے۔ اس کی بنیاد کرنل وکٹر پارنل نے رکھی تھی جو کہ جنگ ویت نام کا ایک ہیرو تھا۔ ہماری ایجنسی طلاق، والدین کی مشکلات، بلیک میلنگ، استحصال بالجبر، فراڈ، دھوکا دہی وغیرہ کے کیس حل کرنے میں خصوصی شہرت رکھتی ہے۔ عام طور پر قتل کے علاوہ ہر قسم کا کیس لے لیا کرتی تھی۔ یہ بیس ماہر جن میں زیادہ تر سابقہ فوجی یا پولیس والے ہیں، دو دو کے جوڑوں کی صورت میں کام کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس اس کا اپنا آفس ہے۔ کسی ہنگامی صورت حال کے علاوہ کوئی سراغ رساں نہیں جانتا تھا کہ دوسرے سراغ رساں کس کیس پر کام کر رہے ہیں۔ اس سسٹم کا فائدہ یہ تھا کہ کسی بھی کیس کے بارے میں کوئی خبر پریس تک نہیں پہنچ سکتی اور کسی طرح پہنچ بھی جائے تو فوراً پکڑا جا سکتا ہے کہ یہ کس کی حرکت ہے۔

گزشتہ اٹھارہ ماہ سے ایجنسی میں کام کرنے کے بعد مجھے اپنے گروپ کا انچارج بنا دیا گیا۔ ایک سابقہ ڈپٹی شیرف ٹل اینڈرسن میرا معاون تھا۔ آفس میں اس کے لیے ایک الگ میز مخصوص تھی۔ اس کا قد اگرچہ چھوٹا مگر وہ بہت طاقتور تھا۔ جب وہ ڈپٹی شیرف تھا تو اس نے ایک کیس حل کرنے میں میری بہت مدد کی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ایجنسی میں کام کرے۔ چنانچہ میں نے کرنل سے اس کی سفارش کی اور اسے بھی ملازمت مل گئی۔ ٹل اینڈرسن کئی اعتبار سے میرے لیے بڑا کارآمد تھا۔ اسے کبھی یہ پروا نہیں ہوتی تھی کہ وہ کن اوقات میں اور کتنے گھنٹوں سے کام کر رہا ہے اور ہمارے کام میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ پھر وہ معلومات حاصل کرنے میں بھی بہت تیز تھا جس سے مجھے بہت مدد ملتی تھی۔ جب وہ فرصت میں ہوتا تو شہر میں گھومتا رہتا۔ چنانچہ اسے شہر کے ہر حصے اور ہر طبقے کے بارے میں اچھی خاصی معلومات تھیں۔ پستہ قد ہونے کے باوجود اس کے گھونسے میں بڑی طاقت

www.kahopakistan.com

تھی۔ اس کا پیچ خیر کو بھی ناک آؤٹ کر سکتا تھا۔

جولائی کی اس صبح ہم اپنے آفس میں بیٹھے کسی نئے کیس کے منتظر تھے۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ اس موسم میں صرف مقامی باشندے ہی شہر میں موجود ہوتے تھے، سیاحوں کی آمد ستمبر سے شروع ہو جاتی تھی۔ اینڈرسن چیونگم چباتے ہوئے اپنے گھر ایک خط لکھ رہا تھا اور میں میز پر پیر رکھے سوزی کے خیالات میں غرق تھا۔ چھ ماہ قبل اس سے میری ملاقات ہوئی تھی اور ہم دونوں پہلی نظر میں ہی ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ سوزی... جس کا پورا نام سوزی لانگ تھا، بیلی ویو ہوٹل میں استقبالیہ کاؤنٹر پر کام کرتی تھی۔ میں ایک بلیک میلر کے بارے میں جو کہ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا، معلومات حاصل کرنے گیا تھا۔ سوزی کی مدد سے میں اس کے خلاف اتنے ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ اسے گرفتار کرا سکوں۔ مقدمہ چلا تو اسے پانچ برس کی سزا ہو گئی۔ سوزی کے بال لمبے، بھورے اور ریشمی تھے۔ آنکھیں بڑی اور سلیٹی رنگ کی تھیں۔ ہونٹوں پر ایک شوخ و شریر مسکراہٹ ناچتی رہتی تھی۔ جسمانی خدوخال میں بھی نمایاں دلکشی تھی۔ بناوٹ میں ہر وہ چیز موجود تھی جو مجھے پسند تھی۔ رفتہ رفتہ ہماری پسندیدگی بڑھتی گئی اور اب ہم پابندی کے ساتھ ہر بدھ کی شام ایک دوسرے کے ساتھ گزارتے تھے بلکہ رات بھی۔ یہ معمول تین ماہ جاری رہا تو ہم نے محسوس کیا کہ ہم واقعی ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں۔ مجھے عورتوں کے حوالے سے خاصا تجربہ تھا مگر اب سوزی کسی بھی عورت سے زیادہ عزیز تھی۔ میں نے شادی کی تجویز پیش کی تو اس نے اپنی شریر مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ ”ابھی نہیں ڈرک! ویسے یہ تجویز مجھے پسند ہے لیکن میرے پاس ایک اچھی ملازمت ہے۔ تم سے شادی کروں گی تو اسے چھوڑنا پڑے گا۔ تمہارے اور میرے کام کے اوقات ساتھ نہیں چل سکیں گے۔ چنانچہ ابھی انتظار کرو۔ ہم بعد میں غور کریں گے۔“

اور مجھے اس وعدے پر اکتفا کرنا پڑا۔ آج چونکہ بدھ تھا اس لیے میں سوزی سے ملنے کے خوش آئند تصور میں کھویا ہوا تھا۔ اچانک میرا انٹرکام بجنے لگا۔ میں نے سوئچ دیا۔

”میرے آفس میں آؤ۔“ میں نے گلنڈا کیری کی سخت آواز پہچان لی۔

گلنڈا، کرنل کی سیکریٹری اور دایاں ہاتھ تھی۔ طویل قامت، خوش شکل اور خطرناک حد تک ذہین اور مستعد۔ جب وہ بلاتی تو جانا پڑتا تھا۔ میں طویل کوریڈور طے کر کے اس کے آفس میں پہنچا۔ کرنل واشنگٹن گیا ہوا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں گلنڈا انچارج تھی۔ میں دستک دے کر اندر داخل ہوا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ایک کیس آ گیا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”مسز ہنری تھورسن نے فون کیا تھا۔ اس نے ایک ماہر کو بارہ بجے اپنے گھر بلایا ہے۔ وہ اسی وقت بتائے گی کہ ہم سے کیا چاہتی ہے۔ اس نے ایک ذہین اور شریف ماہر بھیجنے کو کہا ہے۔“

”چنانچہ تمہیں فوراً میرا خیال آ گیا؟“ میں نے جلدی سے کہا۔

”مجھے تمہارا خیال اس لیے آیا کہ تمہارے علاوہ باقی سب مصروف ہیں۔“ گلنڈا نے ترشی سے جواب دیا۔ ”کیا ہنری تھورسن کا نام تمہارے نزدیک کوئی معنی رکھتا ہے؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ میں نے کندھے اچکائے۔ ”کیا وہ کوئی اہمیت رکھتا ہے؟“

”اس کا انتقال ہو چکا ہے۔“ گلنڈا نے ایک گہری سانس لی۔ ”مسز تھورسن کو بیوہ ہوئے ایک سال ہونے کو آیا۔ وہ بہت زیادہ دولت مند اور بے حد بارسوخ ہے۔ اس کے ساتھ بڑی نرمی اور ہوشیاری سے پیش آنا۔ میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ وہ ایک مشکل عورت ہے۔ جاؤ، معلوم کرو کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ یہ اس کا پتا ہے۔“ گلنڈا نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ ”ٹھیک بارہ بجے پہنچ جانا۔ ہم اس سے بھاری فیس وصول کر سکتے ہیں اس لیے اس کی مرضی کے خلاف کچھ مت کرنا۔“

”گویا میں اس سے ملنے جاؤں، اس کی باتیں سنوں اور ہر بات پر جی... جی کہتا جاؤں۔“

”یہی بات ہے اور پھر واپس آ کر مجھے رپورٹ دو۔“

میں اپنے دفتر میں واپس آیا۔ اینڈرسن کو بتایا کہ ہمیں ایک کیس مل گیا ہے۔

”مسز تھورسن کو ایک سراغرساں درکار ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم اخبار ہیرالڈ کے ریکارڈ روم جاؤ اور تھورسن کے بارے میں جو معلومات بھی حاصل کر سکتے ہو، کرو۔ میں بارہ بجے اس بوڑھی مچھلی سے ملنے جا رہا ہوں۔ ہم چار بجے یہاں آفس میں ملیں گے۔“

اینڈرسن جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ اس قسم کا کام اسے بہت پسند تھا۔ چار بجے تک واپس آنے کا وعدہ کر کے وہ چلا گیا۔ میں مسز تھورسن کی قیام گاہ پہنچا تو بارہ بجنے میں تین منٹ باقی تھے۔ دو ایکڑ زمین پر ایک بہت ہی شاندار عمارت ایستادہ تھی۔ اتنی بڑی کہ اس میں کم سے کم پندرہ بیڈ روم اور کئی رہائشی کمرے ضرور ہوں گے۔ میں نے سیڑھیاں چڑھ کر صدر دروازے کی گھنٹی بجائی۔ پانچ منٹ انتظار کے بعد دروازہ کھلا۔ میرے سامنے ایک طویل قامت نیگرو سفید کوٹ، سیاہ بو اور سیاہ پتلون پہنے کھڑا تھا۔ اس کی عمر ستر سال ضرور ہو گی۔ سفید بال گرنا شروع ہو گئے تھے۔ اس کی سرخ آنکھیں اور بہکی ہوئی حرکات یہ بتانے کے لیے کافی تھیں کہ وہ کثرت سے شراب نوشی کا عادی ہے۔ اپنے بیس سالہ تجربے کی وجہ سے میرے لیے ایسی علامات پہچان لینا کچھ مشکل نہ تھا۔

”میرا نام ڈرک ویلیس ہے۔ ایکمی ڈیٹیکٹو ایجنسی سے آیا ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”مسز تھورسن میری آمد کی متوقع ہیں۔“

وہ مجھے اندر لے گیا۔ ایک بڑی لابی سے گزرتے ہوئے ہم ایک کمرے تک پہنچے۔ اس نے دروازہ کھولا۔ ”مادام جلد ہی ملنے آ جائیں گی۔“ اس نے اندر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ ایک بہت وسیع کمرا تھا، نایاب چیزوں سے سجا ہوا۔ قیمتی تصویریں، پرانا فرنیچر۔ میں کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ شرابی بٹلر مسز تھورسن کو یہ بتانے میں کہ میں آ گیا ہوں، کتنا وقت لے گا۔ پچیس منٹ گزر گئے۔ میں قیمتی تصاویر اور پرانے فرنیچر کو دیکھتے دیکھتے عاجز آ گیا۔ تب دروازہ کھلا اور مسز تھورسن اندر داخل ہوئی۔ میں ایک موٹی بوڑھی عورت کو دیکھنے کی توقع کر رہا تھا مگر مسز ہنری تھورسن سرو قامت، چھریرے جسم کی مالک ایک خوب صورت عورت تھی۔ اس نے تیز نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ اس کا سخت چہرہ کسی بھی مسکراہٹ سے عاری تھا۔ وہ اس طرح مجھے گھور رہی تھی کہ مجھے شبہ ہوا کہ میری پتلون کے بٹن کھلے تو نہیں رہ گئے ہیں۔

”مسٹر ویلیس؟“ اس نے سرد آواز میں پوچھا۔

”درست ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے ایک کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ کمرے کا ماحول اتنا ہی دوستانہ تھا جیسے کسی مردہ گھر کا ہو سکتا ہے۔

گلنڈا نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ اس عورت کے ساتھ میرا رویہ نرم رہنا چاہیے۔ چنانچہ میں خاموشی سے ایک بے آرام کرسی پر بیٹھ گیا مگر اس نے بیٹھنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ کمرے میں اِدھر اُدھر گھومنے لگی۔ میں اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ ایک آپریٹر کی حیثیت سے میں انتظار کرنے میں ماہر تھا۔ آخر وہ میری طرف گھوم کر بولی۔

”مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہاری ایجنسی اس علاقے میں سب سے بہترین ہے۔“

”ایسا نہ ہوتا تو میں اس کے لیے کام نہ کر رہا ہوتا مسز تھورسن۔“ میں نے جواب دیا۔

”تب میرے خیال سے... مسٹر ویلیس! تم اپنے آپ کو بہت اچھا ماہر سمجھتے ہو۔“ اس کے لہجے میں طنز تھا۔

”میں سمجھتا نہیں... بلکہ ہوں۔“ میں نے اسی جیسے لہجے میں جواب دیا۔

وہ میرے قریب آئی۔ کچھ دیر تک مجھے گھورتی رہی پھر ایک قریبی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”میرے پاس یہ یقین کرنے کی معقول وجہ ہے کہ میری بیٹی کو بلیک میل کیا جا رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم لوگ ایسے معاملات حل کرنے میں بہت ہوشیار ہو۔“

”ہم سے بہتر کوئی اور نہیں ہے۔“ میں نے سپاٹ چہرے سے کہا۔

”میں چاہتی ہوں، تم معلوم کرو کہ میری بیٹی کو کیوں بلیک میل کیا جا رہا ہے اور وہ بلیک میلر کون ہے؟“

”آپ کے تعاون سے یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ وہ کیا وجوہات ہیں جن کے باعث آپ کو یہ خیال ہوا کہ آپ کی بیٹی کو بلیک میل کیا جا رہا ہے؟“

”میری بیٹی ہر ماہ اپنے اکاؤنٹ سے دس ہزار ڈالرز نکال رہی ہے اور یہ حرکت وہ گزشتہ دس ماہ سے برابر کر رہی ہے۔ مسٹر آکلینڈ بہت فکرمند ہیں۔ اتنے زیادہ کہ انہوں نے مجھے بتانا ضروری سمجھا۔“

”یہ مسٹر آکلینڈ کون ہیں؟“

”وہ ہمارے خاندانی بینکار ہیں۔ دی پیسفک اینڈ نیشنل بینک کے جنرل منیجر۔ وہ اور میرے مرحوم شوہر گہرے دوست تھے۔“

”کیا آپ کی بیٹی کی اپنی آمدنی اور اپنا اکاؤنٹ ہے؟“

”بدقسمتی سے ایسا ہی ہے۔ میرے مرحوم شوہر انجیلا سے... یہ ہماری بیٹی کا نام ہے، بہت محبت کرتے تھے۔ وہ ایک بہت بڑی رقم ٹرسٹ کی صورت میں اس کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ ٹرسٹ سے ماہانہ پندرہ ہزار ڈالرز آمدنی ہوتی ہے جو کہ اس جیسی لڑکی کے لیے ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔“

”اس کی عمر کتنی ہے؟“

www.kahopakistan.com

''چوبیس سال۔''

''میں چوبیس سال کی ایک لڑکی کے لیے پندرہ ہزار ڈالرز ماہانہ کی آمدنی یا دس ہزار ڈالرز کا خرچ غیر معمولی خیال نہیں کرتا۔''

''یہ یقیناً غیر معمولی ہے۔'' مسز تھورسن نے تیزی سے کہا۔ ''انجیلا ایک نارمل لڑکی نہیں ہے۔ بدقسمتی سے وہ میزلس بے بی تھی۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟''

''ضرور، ایسا ہوتا ہے۔ ماں اگر دورانِ حمل چیچک کی بیماری میں مبتلا ہو تو اس کے اثرات بچے پر بھی پڑتے ہیں۔''

''یہی بات ہے۔ چنانچہ انجیلا عمومی طور پر سست ذہن اور کم عقل لڑکی ہے۔ ہم نے اس کے لیے ٹیچر رکھا پھر بھی وہ بہ مشکل تھوڑا بہت پڑھ لکھ سکی۔ بیس سال کی عمر کے بعد اس میں تھوڑی بہت عقل آئی۔ پھر میرے شوہر نے اس کے لیے یہ واہیات ٹرسٹ بنا دیا۔ ان کی موت کے دو ماہ تک انجیلا نے ماہانہ آمدنی سے کوئی دلچسپی نہیں لی مگر پھر اس نے یہ بڑی رقم نکالنا شروع کر دی۔ مسٹر آکلینڈ جو میرے بھی عزیز دوست ہیں، فکرمند رہنے لگے۔ آخر گزشتہ ہفتے انہوں نے مجھے یہ بات بتائی اور شک ظاہر کیا کہ انجیلا کو بلیک میل کیا جا رہا ہے۔''

''حالات کی وضاحت کے لیے پوچھ رہا ہوں مسز تھورسن۔'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ کے شوہر کا انتقال بارہ ماہ پہلے ہوا تھا... اس کے بعد آپ کی بیٹی اس ٹرسٹ کی مالک ہوئی؟ اور پچھلے دس ماہ سے وہ ہر مہینے دس ہزار ڈالرز نکال رہی ہے؟''

''درست ہے۔''

''لیکن پہلے دو ماہ اس نے کوئی رقم خرچ نہیں کی۔''

''مسٹر آکلینڈ کے کہنے کے مطابق وہ دو ہزار ڈالرز بینک سے نکالتی تھی تاکہ ضروری اخراجات پورے کر سکے اور اس سیاہ فام عورت کو تنخواہ دے سکے جو گھر کا کام کرتی ہے اور اس کا خیال رکھتی ہے۔''

''آپ کی بیٹی آپ کے ساتھ رہتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ مسز تھورسن چونک سی گئی۔

''یقیناً نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہمارے تعلقات قریبی نہیں ہیں۔ اسی واہیات ٹرسٹ کے ذریعے میرے شوہر اس کے لیے ایک کاٹیج بھی چھوڑ گئے ہیں جو ہماری اسٹیٹ کے آخری حصے میں واقع ہے۔ وہ وہاں ایک سیاہ فام ملازمہ کے ساتھ رہتی ہے۔ میں نے انجیلا کو ہفتوں سے نہیں دیکھا۔ وہ میرے دوست احباب کے... معیار کے مطابق نہیں ہے۔ بدقسمتی سے بدصورت بھی ہے۔ گفتگو کرنے کے فن سے بالکل ناواقف۔''

''کیا اس کے کچھ اپنے دوست ہیں؟''

''مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ وہ اپنی زندگی بسر کرتی ہے اور میں اپنی۔'' مسز تھورسن نے جواب دیا۔

''ممکن ہے اس کا کوئی خاص دوست یا بوائے فرینڈ ہو۔'' میں نے پوچھا۔

''اس کی توقع نہیں۔'' مسز تھورسن نے بیزاری سے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ کوئی شریف باذوق لڑکا انجیلا میں دلچسپی لے سکتا ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا، وہ بدصورت ہے۔''

''مگر وہ دولت مند ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بہت سے مرد ایک بدصورت عورت میں دلچسپی لے سکتے ہیں بشرطیکہ عورت امیر ہو۔''

''مجھے اور مسٹر آکلینڈ کو اس کا خیال آیا تھا۔ یہ معلوم کرنا تمہارا کام ہے۔''

''میں ضرور معلوم کروں گا لیکن میں آپ کی بیٹی کے بارے میں مزید معلومات چاہتا ہوں۔ کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ وہ اپنا وقت کیسے گزارتی ہے؟ کیا وہ تیراکی کرتی ہے؟ ٹینس کھیلتی ہے یا ڈانس کرنے جاتی ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔'' مسز تھورسن نے شانے اچکائے۔ ''جیسا کہ میں نے بتایا، ہماری ملاقات بہت کم ہوتی ہے۔''

میرے دل میں اس عورت کے لیے ناپسندیدگی کا جذبہ ابھرا۔ ایک ماں کی حیثیت سے آسکر ایوارڈ کے لیے اس کا نام کبھی زیرِ غور نہیں آ سکتا تھا۔

''کیا آپ کی وہی ایک اولاد ہے؟'' میں نے پوچھا۔ مسز تھورسن چونک پڑی۔ آنکھوں میں غصہ ظاہر ہوا۔

''میرا ایک بیٹا بھی تھا مگر اسے زیرِ بحث لانے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بارے میں یہی بتانا کافی ہے کہ کچھ عرصے پہلے وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا اور مجھے خوشی ہے کہ جب سے میں نے نہ اسے دیکھا ہے اور نہ اس کے بارے میں کچھ سنا ہے۔ انجیلا کے موجودہ مسئلے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔''

''اگر میں مسٹر آکلینڈ سے ملنا چاہوں تو آپ کو کوئی اعتراض ہوگا؟''

''بالکل نہیں۔ مسٹر آکلینڈ کو میرا مکمل اعتماد حاصل ہے... بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ہی مجھے تم لوگوں کی مدد حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ جب چاہو، ان سے ملاقات کر سکتے ہو۔''

''اور آپ کی بیٹی؟ میں اسے بھی دیکھنا چاہوں گا۔''

''ضرور۔ کل مہینے کی پہلی تاریخ ہے۔ وہ یقیناً بینک جائے گی۔ مسٹر آکلینڈ ایسا انتظام کر دیں گے کہ تم اسے دیکھ سکو۔ لیکن کسی بھی صورت میں تم اس سے ملنے یا بات کرنے کی کوشش مت کرنا۔ میں نہیں چاہتی کہ انجیلا کو معلوم ہو کہ اس کے بارے میں تحقیقات کی جا رہی ہیں۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ مسٹر آکلینڈ کے علاوہ کسی اور کو اس بات کا علم ہو۔''

''اطمینان رکھیں مسز تھورسن... ایسا نہیں ہوگا۔'' میں کھڑا ہو گیا۔ ''میں مسٹر آکلینڈ سے آج سہ پہر ہی ملوں گا۔ ہم جلد سے جلد آپ کو وہ معلومات دینے کی کوشش کریں گے جو آپ چاہتی ہیں۔''

''جب تمہیں یہ معلومات حاصل ہو جائیں تو فون کر کے ملاقات کا وقت لینا۔ میں بہت مصروف زندگی گزارتی ہوں۔'' مسز تھورسن نے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ ''خود ہی باہر چلے جاؤ۔ اسمڈ لے... میرا بٹلر... شراب کا عادی ہے۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ اسے کم سے کم پریشان کروں۔''

''کیا آپ اسے ملازمت سے الگ کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اسمڈ لے تیس سال سے زیادہ عرصے سے ہمارے خاندان کی خدمت کر رہا ہے۔'' مسز تھورسن نے سرد نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''وہ میری عادتوں سے واقف ہے۔ میرے دوستوں کی دلچسپی کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔ جب تک اس کی حالت بہت ہی زیادہ خراب نہ ہو جائے، میں اسے نکالنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ گڈ ڈے مسٹر ویلیس۔''

میں گہری خاموشی میں لپٹے ہوئے اس گھر سے باہر نکلا اور تیز بارش میں اپنی کار کی طرف دوڑا۔

☆☆☆

مختصر سا لنچ کرنے کے بعد جب میں پیسفک اینڈ نیشنل بینک پہنچا تو سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ گیٹ پر دو سیکیورٹی گارڈ ڈیوٹی دے رہے تھے۔ ان کی گھورتی نظروں سے گزر کر میں ایک میز تک پہنچا جس پر استقبالیہ کی تختی لگی ہوئی تھی۔ میز کے دوسری جانب ایک ادھیڑ عمر بنی سنوری عورت بیٹھی تھی جس نے بیزار نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے دولت کی خوشبو سونگھنے کی تربیت دی گئی ہے۔ ظاہر ہے مجھ سے ایسی کوئی خوشبو نہیں آ رہی تھی۔

''کیا ہے؟''

''مسٹر آکلینڈ۔''

نظریات پختگی

مجھے یہاں کے لوگوں میں ایک قابلِ تعریف چیز ان کا اپنے نظریے میں پختہ ہونا بھی لگی۔ ان کے دلوں میں برائی کے لیے شدید نفرت اور نیکی کے لیے محبت ہی محبت موجزن ہے۔ ایک اسمگلر سے میری ملاقات ہوئی، میں جتنی دیر اس کے پاس بیٹھا رہا، وہ مسلسل اس امر پر نوحہ کناں رہا کہ لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ ایک نائٹ کلب کی بیلے ڈانسر نے میرے سامنے معاشرے میں بڑھتی ہوئی جنسی انارکی سے اظہار بیزاری کیا۔ ایک گراں فروش تاجر نے کہا کہ رزق حلال سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ ہر نئی حکومت کے قیام پر پارٹیاں بدلنے والا ایک سیاسی رہنما اس امر پر زور دے رہا تھا کہ اصولوں پر کسی صورت ''کمپرومائز'' نہیں ہو سکتا۔ ایک بڑا جاگیردار اپنے ہی مزارعین کی حالت پر آنسو بہا رہا تھا۔ میرے لیے یہ سب کچھ بہت خوشگوار تھا۔ ہم یورپین لوگ جو کرتے ہیں، اسے درست سمجھتے ہیں لیکن پاکستانی عوام گو برائی کو برائی سمجھتے ہیں اور کرتے ہیں تاہم نیکی کے لیے ان کے دل میں تیر سگالی کے گہرے جذبات موجود ہیں۔ برائی کو ختم کرنے کے لیے اپنی اصلاح کوئی بڑا کام نہیں، اصل کام موقع بہ موقع نیکی کا جھنڈا بلند کرنا ہے اور یہاں کے عوام اس فریضے سے بخوبی عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی کتاب سے انتخاب

تعاون: عدنان احمد، کراچی

''تم نے اپائنٹمنٹ لیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے دیا۔

''یہ مسٹر آکلینڈ کو دے دو۔'' میں نے کہا۔ عورت نے کارڈ کو دیکھا اور پھر مجھے۔

''وہ بہت مصروف ہیں۔ تمہیں کام کیا ہے؟''

''تم اتنی ہی متجسس ہو تو مسز ہنری تھورسن کو فون کرو۔'' میں نے کہا۔ ''وہ تمہیں سب کچھ بتا دیں گی۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ پھر تمہاری مستقبل کی زندگی پریشان کن بن جائے۔ یہ

www.kahopakistan.com

چانس لینا چاہتی ہو تو فون کر کے دیکھ لو۔"

مسز ہنری تھورسن کا نام سن کر غالباً اس کے دماغ میں کوئی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے میرا کارڈ اٹھایا اور تیز قدموں سے ایک طرف چل دی۔ ایک سیکیورٹی گارڈ میری طرف گھورنے لگا۔ میں نے اسے آنکھ ماری تو وہ جلدی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ چند منٹ کے بعد وہ عورت واپس آئی۔

"مسٹر آکلینڈ تم سے ملاقات کر لیں گے۔" اس کی آواز اتنی سرد تھی کہ وہاں لگے ائرکنڈیشنر کو ماند کر رہی تھی۔ "اس طرف جاؤ۔ دائیں ہاتھ پر پہلا دروازہ ان کا ہے۔"

میں آگے بڑھ گیا۔ داہنے ہاتھ کے ایک دروازے پر ہوریس آکلینڈ، جنرل منیجر سنہری حروف میں لکھا نظر آیا۔ دروازے پر آہستہ سے دستک دے کر میں اندر داخل ہو گیا۔ ایک بڑی میز کے پیچھے آکلینڈ بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک چھوٹے قد کا موٹا اور گنجا آدمی تھا۔ چوکنا، ذہین اور بھوری آنکھوں والا۔ اس نے تیز نظروں سے... جو لیزر شعاعوں کا مقابلہ کر رہی تھیں... میرا جائزہ لیا اور ہاتھ سے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"مسز تھورسن نے مجھے فون کیا تھا کہ تم ملنے آؤ گے مسٹر ویلیس۔" اس کی آواز غیر متوقع طور پر گہری تھی۔ "تمہیں کچھ سوالات پوچھنے ہیں؟"

"مسٹر آکلینڈ۔" میں نے آرام دہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم انجیلا کے بارے میں اپنی رائے بتاؤ گے۔ اس کی ماں کا کہنا ہے کہ وہ بیمار ذہن اور کم عقل لڑکی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"سچ یہ ہے کہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" آکلینڈ نے جواب دیا۔ "ایسا لگتا ہے کہ اب اس نے اپنی خامی پر قابو پا لیا ہے۔ بظاہر وہ ہر طرح نارمل معلوم ہوتی ہے لیکن یہ بات تبھی ہے کہ مجھے اسے چند منٹ سے زیادہ دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ وہ چیک کیش کرانے آتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ عجیب طرح کا لباس پہنتی ہے مگر ایسا تو آج کل کے بیشتر نوجوان لڑکے لڑکیاں کرتے ہیں۔ میں اس کے بارے میں اپنی رائے نہیں دے سکتا۔"

"میں نے سنا ہے کہ اس کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم ہے۔ وہ صرف اس کی آمدنی لے سکتی ہے جو کہ پندرہ ہزار ڈالرز ہے۔ اگر اس کا انتقال ہو جائے تب کیا ہو گا؟"

"لیکن اس کی عمر ابھی صرف چوبیس سال ہے۔"

"حادثے میں نوجوان بھی مر سکتے ہیں۔"

"اگر اس کا انتقال ہو جائے تو ٹرسٹ ختم ہو جائے گا اور تمام دولت اس کے باپ کی جائداد میں واپس چلی جائے گی۔"

"کتنی دولت ہو گی؟"

"مسٹر تھورسن دنیا کے امیر ترین افراد میں سے ایک تھے مگر میں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ ٹرسٹ کی کتنی دولت ہے۔"

"مسز تھورسن کی تمام دولت اور جائداد ان کی بیوی کو ملی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور انجیلا مر جائے تو انہیں ٹرسٹ کی دولت بھی مل جائے گی۔"

"درست ہے کیونکہ کوئی اور وارث نہیں ہے۔"

"ایک بیٹا بھی تو ہے؟"

"ضرور ہے۔ نیرانس تھورسن... مگر جب وہ گھر چھوڑ کر گیا تو اسے وراثت سے عاق کر دیا گیا۔ یہ دو سال قبل کی بات ہے۔ وہ جائداد پر کوئی مطالبہ نہیں کر سکتا۔"

"کوئی اور بھی نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔ آکلینڈ نے اپنی کرسی پر اس طرح پہلو بدلا جیسے میرے سوالات اسے بور کر رہے ہوں۔

"وارث تو کوئی نہیں مگر وصیت میں کچھ دوسرے افراد کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً بٹلر اسمڈلے کے نام پانچ ہزار ڈالرز اس تاکید کے ساتھ لکھے گئے تھے کہ فوراً ادا کر دیے جائیں۔"

"تمہارا خیال ہے کہ انجیلا پابندی سے ہر ماہ دس ہزار ڈالرز نکالتی ہے تو اس سے شبہ ہوتا ہے کہ کوئی اسے بلیک میل کر رہا ہے؟"

"مجھے بینکاری کا پینتیس سالہ تجربہ ہے مسٹر ویلیس۔" آکلینڈ نے جواب دیا۔ "انجیلا کی عمر چوبیس سال ہے اور کم سے کم مجھے وہ نارمل معلوم ہوتی ہے۔ اسے یہ حق حاصل ہے کہ اپنی دولت جس طرح چاہے خرچ کرے۔ لیکن ہنری تھورسن اور میں بہت قریبی دوست تھے۔ ایک دوسرے پر اعتماد کرتے تھے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں انجیلا کا پورا خیال رکھوں گا۔ اب مسز تھورسن بھی میری عزیز دوست ہیں اور مالی امور میں میرے مشوروں پر بھروسا کرتی ہیں۔ ان مخصوص حالات میں، میں انہیں انجیلا کے بارے میں بتاتے ہوئے بہت ہچکچایا کیونکہ پیشہ ورانہ اخلاق وضوابط کے تحت ہر اکاؤنٹ ہولڈر کے بارے میں رازداری سے کام لینا میری ذمے داری ہے۔ اسی ہچکچاہٹ کی وجہ سے میں دس ماہ خاموش رہا۔ مگر رقم برابر نکالی جاتی رہی تو میں نے اپنا فرض سمجھا کہ مسز تھورسن کو ہوشیار کر دوں اور انہیں مشورہ دوں کہ بلیک میلنگ کے خدشے کے پیش نظر اس بات کی تحقیقات کرانا ضروری ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔" میں نے سر ہلایا۔

"یہ ذہن میں رکھنا کہ جو کچھ میں نے بتایا ہے، اسے پوشیدہ رہنا چاہیے۔"

"ایسا ہی ہو گا۔" میں نے جواب دیا۔ "اس کی ماں نے کہا ہے کہ انجیلا سے کسی حال میں بھی نہ ملوں، نہ اس سے بات کروں۔ لیکن میرا اس سے صورت آشنا ہونا ضروری ہے۔ پھر اسے کیسے دیکھوں؟"

"بہت آسان بات ہے۔" آکلینڈ نے کہا۔ "کل وہ رقم نکلوانے آئے گی۔ میں ایسا انتظام کر دوں گا کہ جب وہ آئے تو تمہیں اس کی نشان دہی کر دی جائے۔"

"بہت مناسب ہے۔ تو میں کس وقت آؤں؟"

"وہ ہمیشہ دس بجے آتی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم پونے دس بجے آ جانا اور لابی میں انتظار کرنا۔ میں مس کرچ سے کہہ دوں گا کہ جب وہ آئے تو تمہیں اشارہ کر دے۔"

آکلینڈ کی میز پر رکھا انٹرکام بجنے لگا۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ بات سنی اور کہا کہ تین منٹ کے بعد بھیج دینا پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

"مجھے افسوس ہے مسٹر ویلیس مگر میں تمہیں مزید وقت نہیں دے سکتا... اگر کوئی اور بات ہو تو..."

"ممکن ہے دوبارہ بات کرنے کی ضرورت پڑے۔" میں کھڑا ہو گیا۔ "مگر سر دست میں اور وقت نہیں لوں گا۔ کل میں پونے دس بجے آ جاؤں گا۔"

"مجھے امید ہے کہ تم یہ مسئلہ جلد حل کر لو گے۔" آکلینڈ نے کھڑے ہو کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "میں نے تمہاری ایجنسی کی بہت تعریف سنی ہے۔"

'کل کی صبح ضرور دلچسپ ثابت ہو گی۔' میں نے سوچا۔ میں انجیلا تھورسن کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔

☆☆☆

میں نے اپنی رپورٹ گلینڈا کو سنائی۔ وہ درمیان میں گاہے گاہے کچھ لکھتی رہی۔

"مسز تھورسن چاہتی ہیں کہ تحقیقات میں زیادہ وقت نہ لیا جائے۔" میں نے آخر میں کہا۔ "شاید ان کا خیال ہے کہ ہماری فیس بہت زیادہ ہے۔"

"سب کو یہی گلہ ہوتا ہے مگر وہ پھر بھی ہمارے پاس آتے ہیں۔" گلینڈا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اب تمہارا اگلا قدم کیا ہو گا؟"

"بینک جانا، انجیلا کا تعاقب کرنا، یہ دیکھنا کہ وہ رقم کسے دیتی ہے اور قسمت نے ساتھ دیا تو عمومی حالات معلوم کرنا۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے اینڈرسن کو تاکید کی ہے کہ وہ مسٹر تھورسن کے بارے میں معلومات فراہم کرے۔"

گلینڈا سے رخصت ہو کر اپنے آفس آیا تو اینڈرسن کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ میں نے اسے مسز تھورسن اور آکلینڈ سے اپنی ملاقات کا حال بتایا۔

"یہ ہے اب تک کی روداد۔" میں نے آخر میں کہا۔ "لیکن یہ بات مجھے الجھا رہی ہے کہ مسز تھورسن اپنی بیٹی کی کچھ پروا نہیں کرتیں اور نہ انجیلا ان کی کرتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایک بڑی فیس ادا کر کے ہم سے یہ تحقیقات کرانا چاہتی ہیں کہ انجیلا کو بلیک میل کیا جا رہا ہے یا نہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں ایسا کیوں ہے؟ اس معاملے میں کوئی بات ایسی ہے جو مجھے پریشان کر رہی ہے۔"

"تو کیا یہ ہمارا دردِ سر ہے؟" اینڈرسن نے پوچھا۔ "ہمیں تو صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ اس کی بیٹی کو بلیک میل کیا جا رہا ہے یا نہیں اور کیا جا رہا ہے تو کیوں... مسز تھورسن کے مقصد سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ بات اس کیس کو بہت دلچسپ بنا سکتی ہے۔ یوں ہم بہت احتیاط سے کام لیں گے۔ میں بینک جاؤں گا اور آکلینڈ کے اشارے کا منتظر رہوں گا۔ تم باہر انتظار کرنا۔ میں تمہیں اشارہ کر دوں گا۔ تم انجیلا کا تعاقب کرنا۔ ہم دونوں کے پاس کار ہے۔ میں بھی پیچھے لگا رہوں گا۔ ہمیں کسی صورت اسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا۔ وہ بلیک میلر تک ہماری راہنمائی کر سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ممکن ہے یہ اتنا ہی آسان ثابت ہو۔"

"اب تم بتاؤ۔ تم نے کیا معلوم کیا؟"

"میں نے تھورسن کے بارے میں ہیرالڈ کا تمام ریکارڈ دیکھا۔" اینڈرسن نے بتایا۔ "تھورسن بہت بڑا آدمی تھا۔ تھورسن اینڈ جارنیر یز نامی کمپنی کا سینئر پارٹنر تھا۔ شہر کا سب سے بڑا اسٹاک ہولڈر تھا۔ اس کمپنی کی ایک برانچ نیویارک میں بھی ہے لیکن اس کا زیادہ بزنس اس شہر کے امیروں سے ہوتا ہے۔ تھورسن اسٹاک بیچنے اور خریدنے میں بڑا ٹھکہ رکھتا تھا۔ جیسے اسے معلوم ہو جاتا ہو کہ کب خریدنا ہے اور کب بیچنا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے موکلوں کے لیے بلکہ خود اپنے لیے بھی بڑے بڑے سودے کرتا تھا۔ پینتیس سال کی عمر میں اس نے کیتھرائن لونگ اسٹون سے شادی کی۔

www.kahopakistan.com

کیتھرائن کا باپ جوئی لونگ اسٹون پیٹرول کا بزنس کرتا تھا مگر شادی کے تین ماہ بعد یکے بعد دیگرے کئی خشک کنوؤں کی کھدائی نے اسے دیوالیا کر دیا۔ کیتھرائن کے لیے یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ وہ تھورسن کی بیوی تھی۔ ان کے دو بچے ہوئے۔ ٹیرانس اور انجیلا۔ ان دونوں کے بارے میں دلچسپی کی کوئی بات ریکارڈ میں نہیں تھی لیکن اس بارے میں بہت کچھ تھا کہ مسز تھورسن کس طرح اپنے شوہر کی دولت بے دریغ پارٹیوں اور اپنے بناؤ سنگار پر خرچ کرتی ہے۔ اسے اب بھی معاشرتی حلقوں میں بہت فیاض میزبان سمجھا جاتا ہے۔

گزشتہ سال جبکہ تھورسن کی عمر باسٹھ سال تھی، وہ اپنی لائبریری میں مردہ پایا گیا۔ یوں تو وہ دل کا مریض تھا۔ اس کا ڈاکٹر دس سال سے اس مرض کا علاج کر رہا تھا۔ تھورسن پر کام کا بہت دباؤ تھا چنانچہ مسز تھورسن یا اس کے ڈاکٹر کے لیے اس کی موت حیرت کا باعث نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے قدرتی موت کا سرٹیفکیٹ دے دیا مگر کارونر ہربرٹ ڈاڈسن نے یہ سوال ضرور اٹھایا کہ تھورسن کی کنپٹی پر ایک گہرا زخم کیسے آیا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ یہ زخم اس کو ہارٹ اٹیک کے بعد لگا تھا۔ ہارٹ اٹیک سے وہ گرا تو اس کا سر میز کے کونے سے ٹکرا گیا۔ اس کے دیرینہ ملازم بٹلر جوش اسمڈ لے نے گواہی دیتے ہوئے بتایا کہ اس نے کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز سنی۔ وہ جلدی سے لائبریری میں گیا تو اس کا مالک مر چکا تھا۔ اس نے ایک آئینے کی مدد سے اس کی سانس کی بھاپ دیکھنے کی کوشش کی مگر بیکار۔ چنانچہ تھورسن کی موت قدرتی قرار دے دی گئی۔ کارونر ڈاڈسن نے جو مسز تھورسن کا اچھا دوست بھی تھا، اس کے ساتھ بڑی ہمدردی اور تعزیت کا اظہار کیا۔ اب مسز تھورسن تمام دولت و جائداد کی مالک ہے اور اسی دھڑلے سے پارٹیاں دے رہی ہے۔ وصیت کے مطابق انجیلا کو دس ہزار ڈالرز سالانہ ملیں گے۔ یہ رقم ٹرسٹ کی آمدنی کے علاوہ ہے۔ مسٹر ٹیرانس کو کچھ نہیں ملے گا۔''

''بہت خوب۔'' میں نے کہا۔ ''جیسا کہ تم نے کہا، ہمارا کام صرف یہ ہے کہ معلوم کریں انجیلا کو بلیک میل کیا جا رہا ہے یا نہیں۔ میں ٹیرانس کے بارے میں بھی سوچ رہا ہوں اور اس شرابی بٹلر کے متعلق بھی۔ اب ہمیں اس کیس کی ایک فائل بنا لینا چاہیے۔ تم کرنل کو تو جانتے ہی ہو۔ جب وہ واپس آئے گا تو فائل دیکھنا چاہے گا۔''

ساڑھے چھ بجے تک ہم نے اپنا کام ختم کر لیا اور میں سوزی لانگ کے بارے میں سوچنے لگا۔ آج ہی کی رات ہم لوبسٹر اینڈ کریب ریسٹورنٹ میں ملا کرتے تھے جو کہ ساحلِ سمندر پر واقع تھا۔ وہاں اور بھی ریسٹورنٹ تھے مگر اس کی قیمتیں مناسب تھیں اور اس کا مالک فریڈی کورٹل اچھے کھانے تیار کراتا تھا۔

''آج رات تمہاری کیا مصروفیت ہے؟'' میں نے اینڈرسن سے پوچھا۔

''کچھ نہیں، گھر جاؤں گا۔ کھانا تیار کروں گا پھر رات کو سونے کے وقت تک ٹی وی دیکھتا رہوں گا۔''

''یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ تمہیں میری طرح کوئی اچھی سی لڑکی تلاش کر لینا چاہیے۔''

''مگر یہ بھی تو دیکھو کہ اس طرح میں کتنی رقم بچاتا ہوں۔'' اینڈرسن مسکرایا۔ ''اچھا، اب کل ملاقات ہوگی۔''

میرا دو کمروں کا اپارٹمنٹ سی کومب کے آغاز میں واقع تھا۔ سی کومب ملازم اور مزدور پیشہ لوگوں کی بستی تھی۔ میں نے اپنی کار پارک کی اور لفٹ کے ذریعے چوتھی منزل پر گیا جہاں میرا اپارٹمنٹ تھا۔ سوزی کے ملنے سے پہلے اپارٹمنٹ کی حالت ویسی ہی تھی جیسی ایک کنوارے کے گھر کی ہو سکتی ہے لیکن سوزی نے بہت کچھ تبدیل کر دیا تھا۔ وہ بیلی ویو ہوٹل میں کام کرتی تھی۔ وہاں سے دو پینٹرز بلا کر اس نے نیا رنگ و روغن کرایا۔ ہوٹل ہی سے کچھ اچھا سیکنڈ ہینڈ سستی قیمت میں سامان خرید کر اپارٹمنٹ کے دونوں کمروں کو مناسب طور پر آراستہ کر دیا اور اپارٹمنٹ کی صورت ہی کچھ اور ہو گئی۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہی ایک دیوار نظر آتی تھی۔ ابھی تک ہم دونوں یہ طے نہیں کر سکے تھے کہ اس دیوار کے ساتھ کیا کیا جائے۔ میرا خیال تھا کہ کتابوں کی ایک دو الماریاں لگوا دی جائیں جبکہ سوزی وہاں کچھ اچھی تصاویر آویزاں کرنا چاہتی تھی۔

لیکن اس دن میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو سامنے کی دیوار خالی نہیں تھی۔ کسی نے اس پر سیاہ رنگ سے چھ انچ بڑے حروف میں ایک پیغام لکھ دیا تھا۔

''انجیلا سے دور رہو ورنہ...''

وہ ضرور دروازے کی آڑ میں چھپا میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ میرے اندر آتے ہی بڑے پھرتیلے ماہرانہ انداز میں حملہ آور ہوا۔ میں نے سر پر ایک شدید ضرب محسوس کی۔ آنکھوں کے سامنے روشنی کا جھماکا ہوا اور پھر مکمل تاریکی چھا گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح پونے دس بجے قدرے نڈھال کیفیت میں، میں پیسیفک اینڈ نیشنل بینک میں داخل ہوا۔ بوڑھی استقبالیہ کلرک مس کرچ نے ایک سرد نگاہ سے میرا استقبال کیا۔

''میں مسٹر آکلینڈ کو اطلاع کر دوں گی۔'' وہ بولی۔ ''تم مسٹر ویلیس ہی ہو نا؟'' میں اس عورت سے بور ہو چکا تھا۔

''بڑی ذہانت سے کام لیتی ہو تم۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم مس کرچ ہی ہو نا؟''

''مسٹر ویلیس آ گئے ہیں۔'' اس نے ہونٹ بھینچ کر بٹن دباتے ہوئے کہا۔

آکلینڈ اپنے آفس سے باہر نکل آیا۔ مجھ سے ہاتھ ملایا۔

''تم وہاں بیٹھ کر انتظار کرو۔'' اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔ ''میں نے مس کرچ سے کہہ دیا ہے کہ انجیلا آئے تو ہمیں اشارے سے بتا دے۔''

میں استقبالیہ میز سے تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اگرچہ صبح سوزی نے مجھے درد کش گولیاں کھلا دی تھیں جن سے درد کم ضرور ہو گیا لیکن ختم نہیں ہوا۔ میں گزشتہ شام کے بارے میں سوچنے لگا۔ جب سوزی مجھے لینے آئی تو اس نے بیرونی دروازہ کھلا پایا۔ سامنے کی دیوار پر وہ عبارت لکھی تھی اور میں نیم بے ہوشی کے عالم میں فرش سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے مجھے سہارا دے کر صوفے پر لٹایا۔ دائیں کان کے قریب سر کے پچھلے حصے میں انڈے کے برابر گومڑا نمودار ہو چکا تھا۔ وہ کچن میں گئی۔ تولیا میں برف لپیٹ کر لائی اور سکائی کرنے لگی۔ دس منٹ کے بعد میری کیفیت خاصی بہتر ہو گئی۔

''مجھے اس حادثے پر افسوس ہے۔'' میں نے ایک ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ ''دراصل ایک غیر متوقع مہمان آ گیا تھا۔''

''باتیں مت کرو۔ بستر پر لیٹو اور سو جاؤ۔''

مجھے بھی یہ مشورہ مناسب معلوم ہوا۔ چنانچہ اس کی مدد سے لباس تبدیل کیا اور بستر میں گھس گیا۔ سوزی نے میرے اصرار پر مجبور ہو کر ایک گلاس میں اسکاچ وہسکی لا کر دی۔ ڈاکٹر کو فون کرنے کے لیے پوچھا مگر میں نے منع کر دیا کہ ہم لوگوں کی ایسی خاطر مدارات تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ میں کل صبح تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔

''تمہیں دیکھ کر تو میں ڈر ہی گئی تھی۔'' سوزی نے کہا۔ ''آخر یہ معاملہ کیا ہے؟''

''کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ تم بلاوجہ خود کو پریشان کرو۔'' میں نے اسے اطمینان دلایا۔

اب تک سوزی جان چکی تھی کہ میں اپنے کام کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں بتاتا۔

''کیا میں یہ بھی نہیں پوچھ سکتی کہ انجیلا کون ہے؟''

''نہیں۔''

''اچھی بات ہے۔ میں تمہیں نیند کی تین گولیاں دے کر چلی جاؤں گی۔''

سوزی نے مجھے نیند کی گولیاں کھلائیں اور کہا کہ وہ پینٹر کو بلا کر دیوار پر دوبارہ رنگ کرا دے گی اور چونکہ صاف ظاہر تھا کہ جو بھی تھا، بیرونی دروازے کا قفل کھول کر اپارٹمنٹ میں آیا تھا اس لیے اس نے یہ بھی کہا کہ وہ دروازے پر ایسا تالا لگوا دے گی جسے کوئی نہ کھول سکے۔

میں رات کو گہری نیند سویا۔ اٹھا تو حالت کافی بہتر تھی لیکن سر میں درد موجود تھا۔ میں حسبِ وعدہ ساڑھے نو بجے اینڈرسن کے گھر گیا اور ہم اپنی اپنی کاروں میں بینک پہنچے۔ میں نے اسے گزشتہ رات کا واقعہ بتایا۔

''اس مصیبت کا تعلق ہمارے کیس سے تو نہیں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''شک تو یہی ہوتا ہے لیکن ہم تو ایسی مصیبتوں کے عادی ہیں۔''

''کسی نہ کسی نے ان لوگوں کو بتایا ہوگا کہ ہم انجیلا کے بارے میں تحقیقات کر رہے ہیں۔ مگر وہ کون ہو سکتا ہے؟''

''یہیں یہ بھی معلوم کرنا ہے۔'' میں نے جواب دیا اور کار سے اتر کر بینک کی طرف چل دیا۔

میں کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ گاہے بگاہے مس کرچ کو بھی دیکھ لیتا تھا جو اپنے کام میں مصروف تھی۔ تب اچانک وہ سرد مسکراہٹ کے ساتھ اٹھی۔ اس کی نگاہ دروازے کی طرف تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی بینک میں داخل ہوئی، گارڈ نے اسے سلام کیا۔ میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ یہ ایک ماچس کی تیلی تھی۔ اس نے تنکوں کا بنا بڑا سا ہیٹ پہن رکھا تھا اور آنکھوں پر کم سے کم چار انچ بڑے شیشوں کا دھوپ کا چشمہ تھا۔ ان دونوں چیزوں نے اس کے چہرے کو تقریباً پورا چھپا لیا تھا۔ اس نے گہرے رنگ کی ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی اور ساتھ میں وہی نیلے رنگ کی جینز تھی جو آج کل ساری دنیا کی بیشتر لڑکیاں استعمال کرتی ہیں۔ بظاہر وہ کوئی سیاح لڑکی معلوم ہوتی تھی جو چھٹیاں گزارنے آئی ہو۔ مس کرچ اسے آکلینڈ کے آفس میں لے گئی۔ میں جلدی سے باہر نکلا اور اینڈرسن کو انجیلا کے بارے میں بتایا۔ وہ پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا۔ اس نے وہ کار دکھائی

www.kahopakistan.com

جس میں انجیلا آئی تھی۔ کار ایک پرانی واکس ویگن تھی۔ اس کے لباس اور کار سے ہرگز یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی دولت مند لڑکی ہے۔ میں نے اینڈرسن سے کہا کہ میں اپنی کار یہیں چھوڑ جاؤں گا اور اس کی کار میں ہم دونوں انجیلا کا تعاقب کریں گے۔

تقریباً دس منٹ کے بعد انجیلا بینک سے باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پلاسٹک کا بریف کیس بھی تھا۔ بلاشبہ یہ اسے آکلینڈ نے دیا ہوگا اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا کہ دس ہزار ڈالرز بھی اسی میں رکھے ہوں گے۔

اس کا تعاقب کرنے میں ہمیں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ مناسب رفتار سے چلتی ہوئی وہ ساحلی علاقے کی طرف جا رہی تھی۔ دائیں بائیں مڑتی مختلف سڑکوں گلیوں سے ہوتی وہ اس جگہ پہنچی جہاں مچھیرے اپنی کشتیاں کھڑی کرتے تھے۔ اس نے اپنی کار ایک پارکنگ لاٹ پر روکی۔ اینڈرسن آگے نکلتا چلا گیا اور ایک دوسرے پارکنگ لاٹ پر رک گیا۔ انجیلا کار سے اتر کر ایک کلب بار کی جانب چلی جس پر دی بلیک کیسٹ کا بورڈ لگا تھا۔ وہ اندر چلی گئی تو میں بھی کلب کی طرف بڑھا۔ دیکھا کہ بورڈ پر نمایاں طور سے تحریر ہے۔ ''صرف سیاہ فام بھائیوں کے لیے۔ یہاں گوروں کا داخلہ منع ہے۔'' میں نے اندر جانا مناسب نہیں سمجھا اور واپس لوٹ گیا۔ اینڈرسن سے کہا کہ وہ کلب پر نگاہ رکھے، میں گھوم پھر کر معلومات حاصل کرتا ہوں۔

پُرہجوم ساحلی علاقے میں گھومتے ہوئے میں نیپچون ٹیورن کی طرف چلا جہاں مجھے البرنی کے ملنے کا یقین تھا اور بلاشبہ وہ اپنی مخصوص جگہ بیٹھا بیئر کے ایک خالی ڈبے سے کھیل رہا تھا۔ البرنی ساحلی علاقے کی ایک مستقل نشانی تھا۔ اس کا دعویٰ تھا... اور بجا تھا... کہ وہ اپنے کان زمین سے لگائے رکھتا ہے اس لیے ساحلی علاقے اور پیراڈائز سٹی کے نمایاں افراد کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں جو اسے معلوم نہ ہو۔ معلومات جمع کرنے کے علاوہ اس کا خاص شوق بیئر پینا اور ساسیج کھانا تھا جس میں اتنی مرچیں ہوتی تھیں کہ کوئی عام آدمی اسے کھا بھی نہیں سکتا تھا۔ ایجنسی کے سراغرسانوں سے اس کے تعلقات بڑے دوستانہ تھے۔ سراغرساں اسے خوب بیئر پلاتے اور وہ انہیں مفید معلومات فراہم کرتا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو مسکراتے ہوئے بیئر کا خالی ڈبا سمندر میں پھینک دیا۔

''تمہیں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی مسٹر ویلیس۔'' اس نے کہا۔ ''میں سوچ ہی رہا تھا کہ ناشتے کا وقت ہو گیا ہے۔ ناشتا کرو گے؟''

''آؤ نیپچون بار میں چلیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تمہاری بیئر اور ناشتا میرے ذمے رہا۔''

''تم جتنے شریف آدمی ہو، اتنی ہی اچھی باتیں کیا کرتے ہو۔'' البرنی اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ اٹھا اور نیپچون ٹیورن کی جانب چل دیا۔ میں اس کے پیچھے چلا۔

بار کے نیم تاریک کمرے میں داخل ہوتے ہوئے البرنی نے بار کے نیگرو مالک سام کو اشارہ کیا۔

''سام! ناشتا لاؤ اور ذرا جلدی۔''

''ضرور مسٹر البرنی۔'' سام نے کہا اور باچھیں پھاڑ کر ہنستے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ''تم بھی کافی یا کچھ اور لینا پسند کرو گے مسٹر ویلیس؟''

''سردست نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ میں اس کی کافی کا ذائقہ چکھ چکا تھا۔ ''میں نے ابھی ناشتا کیا ہے۔''

البرنی ایک گوشے میں پڑی اپنی پسندیدہ میز پر بیٹھ چکا تھا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''کرنل کے کیا حال چال ہیں... ٹھیک تو ہے؟'' البرنی نے پوچھا۔

''کرنل تو آج کل واشنگٹن گیا ہے۔ تم کیسے ہو؟''

''ظاہر ہے، جوان تو نہیں ہو رہا ہوں مگر مجھے کوئی شکایت نہیں۔ اگلے ماہ سے سیاحوں کی آمد شروع ہو جائے گی۔ وہ میرے پاس آتے ہیں اور میں انہیں ایسے قصے سناتا ہوں کہ وہ حیران رہ جاتے ہیں۔ خوش ہو کر انعام دیتے ہیں۔''

سام نے بیئر کا ایک کین اور ساسیج کی ایک پلیٹ البرنی کے سامنے رکھ دی۔ اس نے فوراً تین ساسیج اٹھا کر منہ میں ٹھونس لیے۔ تیز مرچوں نے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری کر دیے۔ البرنی نے جلدی سے بیئر کا کین اٹھایا اور ایک ہی سانس میں نصف خالی کر دیا۔

''ہاضمے کے لیے بہت ہی عمدہ چیز ہے۔'' البرنی منہ چلاتے ہوئے بولا۔

بیئر کا گلاس خالی ہو گیا تو سام نے جلدی سے بھر دیا۔ میں صبر کے ساتھ انتظار کرتا رہا۔ آخر ساسیج کی پلیٹ خالی ہو گئی۔ بیئر کا تیسرا گلاس بھی ختم ہو گیا اور البرنی نے اطمینان کی گہری سانس لی۔

''اب بتاؤ، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' البرنی نے مجھ سے کہا۔

''تم مجھے بلیک کیسٹ کے بارے میں کیا بتا سکتے ہو؟''

''یہ سیاہ فام لوگوں کا کلب ہے۔ مگر گھٹیا کھانے اور شراب کے باوجود مقبول ہے۔'' البرنی نے بتایا۔ ''پولیس کے ساتھ کوئی چپقلش نہیں ہے، ایک سال قبل کسی نیگرو نے خریدا ہے۔ پہلے صرف بار تھا، اس نے اسے کلب بنا دیا ہے۔ ہمارے شہر میں سیاہ فام لوگوں کی زیادہ تعداد نہیں۔ ان کے مقابلے میں ویت نامی زیادہ ہیں۔ بہرحال نیگرو لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں۔ انہیں ڈانس کرنے اور مل بیٹھنے کا ایک ٹھکانا مل گیا ہے۔''

''اسے خریدا کس نے ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا نام ہینک اسمڈلے ہے۔ مگر وہ ایسا آدمی نہیں جس سے کوئی تعلق رکھا جائے۔ بڑا بدمعاش اور شرپسند ہے۔ اپنے معاملات میں مداخلت گوارا نہیں کرتا۔'' البرنی نے جواب دیا۔ میں نے اپنے چہرے پر کوئی تاثر ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''اس کے باپ کا نام کیا ہے؟'' میں نے دوسرا سوال کیا۔

''جوش اسمڈلے۔ وہ اس دولت مند چڑیل مسز ہنری تھورسن کے یہاں بطور بٹلر کام کرتا ہے۔ میں نے سنا ہے بےچارہ آج کل شراب بہت پینے لگا ہے۔ ایک ناخلف بیٹے کا باپ اور ایک جھگڑالو بیوی کا شوہر ہونے کا یہی انجام ہوتا ہے۔ بیوی اس سے جھگڑا کر کے اسے چھوڑ گئی اور مسز تھورسن ایسی عورت ہے جس کا برتاؤ اچھے خاصے آدمی کو شراب میں سکون ڈھونڈنے پر مجبور کر سکتا ہے۔''

''اس کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی؟'' میں نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، مجھے خود جوش نے بتایا تھا۔'' البرنی نے جواب دیا۔ ''وجہ یہ تھی کہ اس کی بیوی بیٹے کو برا بھلا کہتی تھی۔ بیٹا آوارہ بدمعاش تھا اور اب بھی ہے۔ مگر جوش اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان ہمیشہ ہینک کے سلسلے میں لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ آخر جب مسٹر تھورسن کا انتقال ہوا تو دونوں الگ ہو گئے۔ جوش مسز تھورسن کی خدمت کرتی ہے اور اس کی بیوی جس کا نام حنا ہے بیٹی کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ باپ کے مرنے پر بیٹی کو بڑی دولت ملی ہے مگر تمام دولت مندی کے باوجود ان کی زندگی قابلِ رشک نہیں۔ آئے دن کسی نہ کسی پریشانی میں گھرے رہتے ہیں۔ میرے پاس دولت نہیں مگر کوئی پریشانی بھی نہیں۔''

''بیٹی کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟'' میں نے سوال

حفظِ ماتقدم

میں حجام کی دکان پر اخبار پڑھنے گیا تھا۔ اس وقت ایک شخص کا شیو بنایا جا رہا تھا۔ پتا نہیں اس استرے میں خرابی تھی یا شیو کے بال کچھ زیادہ ہی سخت تھے۔ ہر دوسرے لمحے شیو بنوانے والے شخص کے گال پر چرکہ لگتا اور وہ چلّا اٹھتا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے حجام نے پندرہ چرکے لگائے پھر ادھورا شیو چھوڑ کر برابر کی الماری سے پھٹکری لینے چلا گیا۔

شیو بنوانے والے نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ذرا سامنے رکھا ہوا ایک استرا تو مجھے دینا۔''

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیوں؟ کیا خود شیو بنانے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں اپنی حفاظت کے لیے ایک استرا اپنے پاس بھی رکھنا چاہتا ہوں۔''

امتیاز احمد، کراچی

مالکِ مکان

رہنما نے ایک قلعہ دکھاتے ہوئے سیاح سے کہا۔ ''یہ پانچ سو سال پرانا قلعہ ہے، آج تک اس کے ایک پتھر کو بھی کسی نے نہیں بدلا۔ یہاں کی کسی چیز کی مرمت نہیں کی گئی... کوئی نئی چیز نہیں لگائی گئی۔ پانچ سو سال سے یہ عمارت جوں کی توں کھڑی ہے۔''

سیاح نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مالک، ہمارے مالک مکان جیسا ہی بےحس معلوم ہوتا ہے۔''

کراچی سے... محمد اقبال کی فریاد

وقت بڑا نازک ہے

دو جیب کترے بس اسٹاپ پر کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک بار بار اپنی جیبی گھڑی نکال کر دیکھتا اور پھر جیب میں رکھ لیتا۔

اسے بار بار گھڑی نکالتے اور جیب میں رکھتے ہوئے دیکھ کر دوسرے جیب کترے نے پوچھا: ''بھئی، یہ تم بار بار اپنی گھڑی نکال کر وقت کیوں دیکھتے ہو؟''

''وقت بڑا نازک ہے۔ میں صرف یہ اطمینان کر رہا ہوں کہ گھڑی ابھی تک میری جیب میں ہے۔''

اختر ملک، ساہیوال

www.kahopakistan.com

کیا۔

''کچھ زیادہ نہیں۔ سنا ہے ذہنی مریض ہے۔ یہ بھی سنا ہے کہ جب وہ سولہ سال کی تھی تو ناجائز تعلقات کی شوقین تھی مگر ماڈرن زمانے میں یہ کوئی برائی نہیں سمجھی جاتی۔ میرے لڑکپن کے دور میں حالات مختلف تھے۔ کوئی لڑکی حاصل کرنے کے لیے بڑی کوشش کرنا پڑتی تھی... مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا انجیلا سے کوئی دلچسپی ہے؟''

''میں انجیلا سے زیادہ ہینک میں دلچسپی رکھتا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''تو ہوشیار رہنا۔ وہ بہت خطرناک کمینہ فطرت آدمی ہے۔'' البرٹی نے کہا۔

''انجیلا کا ایک بھائی بھی تو تھا۔ ٹیرانس... اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

البرٹی نے خالی پلیٹ کی طرف دیکھا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ میں نے کہا کہ وہ مزید سا سیج کھانا چاہے تو منگوا لے۔ البرٹی نے سام کو اشارہ کیا۔ سام پھرتی سے دوسری پلیٹ اور بیئر کا گلاس لے آیا۔ البرٹی نے منہ چلاتے ہوئے کہا کہ اس جیسی جسامت کے آدمی کو اپنی طاقت برقرار رکھنے کے لیے زیادہ کھانا پڑتا ہے۔ جب پلیٹ اور بیئر کا گلاس خالی ہو گیا تو وہ بولا۔

''تم کیا پوچھ رہے تھے مسٹر ویلیس؟''

''ٹیرانس تھورسن کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟'' میں نے کہا۔

''ہاں کچھ نہ کچھ تو جانتا ہوں۔'' البرٹی نے جواب دیا۔ ''اس کی اپنے باپ سے نہیں بنتی تھی۔ ٹیری نے گھر چھوڑ دیا اور یہاں ساحلی علاقے میں ایک کمرا کرائے پر لے کر رہنے لگا۔ یہ کمرا ایک تھرڈ کلاس بلڈنگ میں جس کا نام بیکرز ہے، واقع ہے۔ یہ تقریباً دو سال پہلے کی بات ہے۔ وہ پیانو بہت اچھا بجاتا تھا۔ ایک کلب میں جس کا نام ڈیڈ اینڈ کلب ہے، پیانو بجانے پر ملازم ہو گیا۔ کلب کا مالک ہیری رچ ہے۔ اس نے اپنا نام بھی ٹیری زینگر رکھ لیا۔ سننے میں آیا تھا کہ اس کی وجہ سے کلب کی آمدنی بہت بڑھ گئی تھی۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں اس کے پیانو بجانے کے دیوانے تھے۔ وہ رات کے نو بجے سے دو بجے تک کلب میں کام کرتا تھا۔ کبھی کسی سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ بس اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ پھر تقریباً تین ماہ قبل وہ کہیں غائب ہو گیا، تب سے کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ میں نے افواہ سنی تھی کہ ہینک نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی کہ اسے اپنے کلب میں پیانو بجانے پر رکھ لے لیکن میرے خیال میں کامیاب نہیں ہو سکا کیونکہ اگر ٹیری بلیک کیسٹ میں پیانو بجانے لگتا تو یہ بڑی سنسنی خیز خبر ہوتی اور مجھے ضرور معلوم ہو جاتی۔''

میں نے چلنے کا ارادہ کیا۔ میں البرٹی کو یہ تاثر دینا نہیں چاہتا تھا کہ میں ہینک، انجیلا یا ٹیری کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے کس قدر بے چین ہوں۔ میں نے اپنے بٹوے سے بیس ڈالر کا نوٹ نکال کر اسے دیا جسے اس نے اس پھرتی سے جھپٹا کہ کیا کوئی چھپکلی کسی مکھی پر جھپٹتی ہو گی۔

''اپنے کان زمین سے لگائے رکھنا۔'' میں نے کہا۔ ''ہینک، ٹیری اور انجیلا کے بارے میں جتنا بھی معلوم کر سکو، اچھا ہے۔''

''ضرور مسٹر ویلیس۔'' البرٹی مسکرایا۔ ''تم جانتے ہی ہو کہ میں کہاں ملتا ہوں۔ جب چاہو آ سکتے ہو۔''

میں نے سام کو اس کا بل ادا کیا اور ٹیورن سے باہر نکل گیا۔ میں مطمئن تھا کہ میری صبح ضائع نہیں ہوئی ہے۔

☆☆☆

اینڈرسن بلیک کیسٹ سے کچھ فاصلے پر کار میں بیٹھا چیونگم چبا رہا تھا۔ میں اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''انجیلا باہر نکلی یا نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ دس منٹ پہلے جا چکی ہے۔'' اینڈرسن نے جواب دیا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا تعاقب کروں یا تمہارے انتظار میں بیٹھا رہوں۔ باہر آتے وقت اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا بریف کیس نہیں تھا اور وہ واپس شہر کی طرف گئی ہے۔''

''تم نے ٹھیک کیا۔'' میں نے کہا اور اسے البرٹی سے اپنی گفتگو کے بارے میں بتایا۔

''گویا ہم بیئر کا ایک گلاس پی کر دوسرے مقامات پر جائیں گے۔'' وہ بولا۔

''ہمارا پہلا اسٹاپ بیکرز بلڈنگ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر بیئر پینے کے بعد نہیں، بیئر پینے سے پہلے۔''

''میرا بھی یہی اندازہ تھا۔'' اینڈرسن نے چہرے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

بیکرز ایک خستہ حال عمارت تھی جس میں مزدور پیشہ لوگ رہائش پذیر تھے۔ آس پاس چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ وہ تنگ سڑک جس پر یہ عمارت واقع تھی، اس وقت بڑی پرہجوم نظر آ رہی تھی۔ اینڈرسن کو کار پارک کرنے کی جگہ بڑی مشکل سے ملی۔ ہم کار سے اتر کر بلڈنگ کے بیرونی

دروازے تک گئے۔ میں نے اس ... کرے، میں جا کر چوکیدار سے ... خانے میں جھاڑو دے رہا تھا۔ ... جیسے اس کے ہاتھ بہت نرم و نازک ... طرف دیکھا۔

''میں ٹیری زینگر کو تلاش ...'' خلیقانہ لہجے میں کہا۔

''او کے۔ ضرور تلاش ... ہے۔'' اور وہ پھر جھاڑو دینے لگا۔

''وہ مجھے کہاں ملے گا ...'' میری طرف غور سے دیکھا۔

''تمہارا تعلق پولیس ...''

''مجھے اس کی تلاش ... مالک بن گیا ہے۔'' میں ... دلچسپی کی چمک ابھری۔

''رقم بہت بڑی ہے ...''

''مجھے معلوم نہیں ...''

... کے ٹاپ ... ایک ...

گئی ہے اور میں یہ کام تب تک نہیں کر سکتا جب تک ٹیری کو تلاش نہ کر لوں۔ اب تک تو مجھے کوئی کامیابی نہیں ہوئی ہے۔''

''لیکن میری معلومات کے مطابق مسز ایکنس بڑی غریبانہ زندگی گزار رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ ٹیری کے ... ارٹمنٹ کی جھاڑ پونچھ بھی کرتی تھی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ ... کے پاس ٹیری کے لیے چھوڑنے کے قابل کوئی چیز ہو؟''

... کی جملہ چیزوں کی مالیت ایک لاکھ ڈالرز سے ... میں نے بتایا۔ ''اور وہ بھی ٹیکس وغیرہ وضع ... ایکنس بڑی کفایت شعار عورت تھی۔ ... نہیں کرتی تھی۔ رقم اپنے پاس چھپا ... اسے یہ سمجھانے میں کامیاب ... چھپا کر اپنے گھر میں نہیں ... پر آمادہ کر لیا۔ مجھے ... میں رکھوا ...

سوچ رہا تھا کہ یہ بارہا آزمایا ہوا بہانہ اب بھی لتنا کارگر ہے۔

''پتا بتانے والے کو کچھ انعام ملے گا؟''

''بیس ڈالر مل سکتے ہیں بشرطیکہ درست پتا بتایا جائے۔'' میں نے کہا۔ چوکیدار نے سر کھجایا۔ کچھ دیر سوچا پھر بولا۔

''ٹیری زینگر کے بارے میں پوچھ رہے ہو نا؟''

''ہاں۔''

''اس نے ٹاپ فلور کا اپارٹمنٹ اٹھارہ ماہ پہلے کرائے پر لیا تھا۔'' چوکیدار نے بتایا۔ ''کرایہ پابندی سے دیتا تھا۔ کوئی اور پرابلم بھی نہیں تھی۔ دن رات کام کرتا تھا۔ پھر دو مہینے پہلے اچانک چلا گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اپنی چیزیں پیک کر کے دو سوٹ کیسوں میں بھریں اور اپنی اولڈس کار میں چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔''

''اس نے یہ نہیں بتایا کہ کہاں جا رہا ہے؟''

''نہیں... اور جہاں بھی گیا ہو، مجھے کیا۔ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔''

''اس کے پاس اولڈس کار تھی... تمہیں اس کا نمبر معلوم ہے؟''

''کیوں نہیں۔ نمبر اتنا آسان تھا کہ بغیر کوشش کے یاد ... بتا سکتی تھی۔ وہ ٹیری کے سامنے والے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ بہت شریف بوڑھی عورت تھی۔ عمر کم سے کم اسی سال تھی۔ وہ ٹیری کے گھر میں جھاڑ پونچھ بھی کرتی تھی اور اکثر اسے کھانا بھی دیتی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو دوسروں کے کام آنا پسند کرتی ہیں۔ بہت باتونی تھی۔ میرے کان بھی کھاتی رہتی تھی۔ وہ ہوتی تو ضرور تمہاری مدد کرتی۔''

''تو کیا وہ چلی گئی؟'' میں نے پوچھا۔ چوکیدار کی نظریں اب بھی نوٹ پر گڑی تھیں۔ آخر میں نے نوٹ اسے دے دیا۔ اس نے نوٹ کو چوما اور اپنی گندی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔

''ہاں، مر کے چلی گئی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ ٹیری کے جانے کے تین دن بعد کی بات ہے۔''

''مر کے چلی... کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

''جب میں اس کے اپارٹمنٹ کے باہر صفائی کر رہا تھا تو میں نے اس کا دروازہ چوپٹ کھلا دیکھا۔ وہ دو دن سے مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ چنانچہ میں نے اندر جھانکا۔ مسز ایکنس فرش پر دراز تھی۔ وہ مر چکی تھی۔ میں نے پولیس کو اطلاع دی اور معاملہ ان پر چھوڑ دیا۔ مجھے پولیس سے الجھنے کا شوق نہیں تھا۔ میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی کچھ بتا سکتا تھا۔ پولیس نے فیصلہ کیا کہ مسز ایکنس کو قتل کرنے والا کوئی عادی

www.kahopakistan.com

کیا۔

''کچھ زیادہ نہیں۔ سنا ہے ذہنی مریض ہے۔ یہ بھی سنا ہے کہ جب وہ سولہ سال کی تھی تو ناجائز تعلقات کی شوقین تھی مگر ماڈرن زمانے میں یہ کوئی برائی نہیں سمجھی جاتی۔ میرے لڑکپن کے دور میں حالات مختلف تھے۔ کوئی لڑکی حاصل کرنے کے لیے بڑی کوشش کرنا پڑتی تھی... مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا انجیلا سے کوئی دلچسپی ہے؟''

''میں انجیلا سے زیادہ بینک میں دلچسپی رکھتا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''تو ہوشیار رہنا۔ وہ بہت خطرناک کمینہ فطرت آدمی ہے۔'' البرنی نے کہا۔

''انجیلا کا ایک بھائی بھی تو تھا۔ میرانس... اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

البرنی نے خالی پلیٹ کی طرف دیکھا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ میں نے کہا کہ وہ مزید سانچ کھانا چاہے تو منگوا لے۔ البرنی نے سام کو اشارہ کیا۔ سام پھرتی سے دوسری پلیٹ اور بیئر کا گلاس لے آیا۔ البرنی نے منہ چلاتے ہوئے کہا کہ اس جیسی جسامت کے آدمی کو اپنی طاقت برقرار رکھنے کے لیے زیادہ کھانا پڑتا ہے۔ جب پلیٹ اور بیئر کا گلاس خالی ہو گیا تو وہ بولا۔

''تم کیا پوچھ رہے تھے مسٹر ویلیس؟''

''میرانس تھورن کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟'' میں نے کہا۔

''ہاں کچھ نہ کچھ تو جانتا ہوں۔'' البرنی نے جواب دیا۔ ''اس کی اپنے باپ سے نہیں بنتی تھی۔ میری نے گھر چھوڑ دیا اور یہاں ساحلی علاقے میں ایک کمرا کرائے پر لے کر رہنے لگا۔ یہ کمرا ایک تھرڈ کلاس بلڈنگ میں جس کا نام بیکرز ہے، واقع ہے۔ یہ تقریباً دو سال پہلے کی بات ہے۔ وہ پیانو بہت اچھا بجاتا تھا۔ ایک کلب میں جس کا نام ڈیڈ اینڈ کلب ہے، پیانو بجانے پر ملازم ہو گیا۔ کلب کا مالک ہیری رچ ہے۔ اس نے اپنا نام بھی میری زیگلر رکھ لیا۔ پینے میں آیا تھا کہ اس کی وجہ سے کلب کی آمدنی بہت بڑھ گئی تھی۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں اس کے پیانو بجانے کے دیوانے تھے۔ وہ رات کے نو بجے سے دو بجے تک کلب میں کام کرتا تھا۔ کبھی کسی سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ بس اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ پھر تقریباً تین ماہ قبل وہ کہیں غائب ہو گیا، تب سے کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ میں نے افواہ سنی تھی کہ ہینک نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی کہ اسے اپنے کلب میں پیانو بجانے پر رکھ لے لیکن میرے خیال میں کامیاب نہیں ہو سکا کیونکہ اگر میری بلیک کیسٹ میں پیانو بجانے لگتا تو یہ بڑی سنسنی خیز خبر ہوتی اور مجھے ضرور معلوم ہو جاتی۔''

میں نے چلنے کا ارادہ کیا۔ میں البرنی کو یہ تاثر دینا نہیں چاہتا تھا کہ میں ہینک، انجیلا یا میری کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے کس قدر بے چین ہوں۔ میں نے اپنے بٹوے سے بیس ڈالر کا نوٹ نکال کر اسے دیا جسے اس نے اس پھرتی سے جھپٹا کہ کیا کوئی چھپکلی کسی مکھی پر جھپٹتی ہوگی۔

''اپنے کان زمین سے لگائے رکھنا۔'' میں نے کہا۔ ''ہینک، میری اور انجیلا کے بارے میں جتنا بھی معلوم کر سکو، اچھا ہے۔''

''ضرور مسٹر ویلیس۔'' البرنی مسکرایا۔ ''تم جانتے ہی ہو کہ میں کہاں ملتا ہوں۔ جب چاہو آ سکتے ہو۔''

میں نے سام کو اس کا بل ادا کیا اور ٹیورن سے باہر نکل گیا۔ میں مطمئن تھا کہ میری صبح ضائع نہیں ہوئی ہے۔

☆☆☆

اینڈرسن بلیک کیسٹ سے کچھ فاصلے پر کار میں بیٹھا چیونگم چبا رہا تھا۔ میں اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''انجیلا باہر نکلی یا نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ دس منٹ پہلے جا چکی ہے۔'' اینڈرسن نے جواب دیا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا تعاقب کروں یا تمہارے انتظار میں بیٹھا رہوں۔ باہر آتے وقت اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا بریف کیس نہیں تھا اور وہ واپس شہر کی طرف گئی ہے۔''

''تم نے ٹھیک کیا۔'' میں نے کہا اور اسے البرنی سے اپنی گفتگو کے بارے میں بتایا۔

''گویا ہم بیئر کا ایک گلاس پی کر دوسرے مقامات پر جائیں گے۔'' وہ بولا۔

''ہمارا پہلا اسٹاپ بیکرز بلڈنگ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر بیئر پینے کے بعد نہیں، بیئر پینے سے پہلے۔''

''میرا بھی یہی اندازہ تھا۔'' اینڈرسن نے چہرے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

بیکرز ایک خستہ حال عمارت تھی جس میں مزدور پیشہ لوگ رہائش پذیر تھے۔ آس پاس چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ وہ تنگ سڑک جس پر یہ عمارت واقع تھی، اس وقت بڑی پرہجوم نظر آ رہی تھی۔ اینڈرسن کو کار پارک کرنے کی جگہ بڑی مشکل سے ملی۔ ہم کار سے اتر کر بلڈنگ کے بیرونی دروازے تک گئے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ یہیں انتظار کرے، میں جا کر چوکیدار سے بات کرتا ہوں۔ چوکیدار تہ خانے میں جھاڑو دے رہا تھا۔ جھاڑو اس طرح پکڑ رکھی تھی جیسے اس کے ہاتھ بہت نرم و نازک ہوں۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

''میں میری زیگلر کو تلاش کر رہا ہوں۔'' میں نے خلیقانہ لہجے میں کہا۔

''اوکے۔ ضرور تلاش کرو۔'' وہ بولا۔ ''مجھے کام کرنا ہے۔'' اور وہ پھر جھاڑو دینے لگا۔

''وہ مجھے کہاں ملے گا؟'' میں نے پوچھا۔ وہ رکا۔ میری طرف غور سے دیکھا۔

''تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے اس کی تلاش اس لیے ہے کہ وہ کچھ رقم کا مالک بن گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ چوکیدار کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک ابھری۔

''رقم بہت بڑی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے معلوم نہیں۔ مجھے کوئی کچھ بتاتا ہی نہیں۔'' میں سوچ رہا تھا کہ یہ بارہا آزمایا ہوا بہانہ اب بھی کتنا کارگر ہے۔

''پتا بتانے والے کو کچھ انعام ملے گا؟''

''میں ڈالر مل سکتے ہیں بشرطیکہ درست پتا بتایا جائے۔'' میں نے کہا۔ چوکیدار نے سر کھجایا۔ کچھ دیر سوچا پھر بولا۔

''میری زیگلر کے بارے میں پوچھ رہے ہو نا؟''

''ہاں۔''

''اس نے ٹاپ فلور کا اپارٹمنٹ اٹھارہ ماہ پہلے کرائے پر لیا تھا۔'' چوکیدار نے بتایا۔ ''کرایہ پابندی سے دیتا تھا۔ کوئی اور پرابلم بھی نہیں تھی۔ دن رات کام کرتا تھا۔ پھر دو مہینے پہلے اچانک چلا گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اپنی چیزیں پیک کر کے دو سوٹ کیسوں میں بھریں اور اپنی اولڈس کار میں چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔''

''اس نے یہ نہیں بتایا کہ کہاں جا رہا ہے؟''

''نہیں... اور جہاں بھی گیا ہو، مجھے کیا۔ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔''

''اس کے پاس اولڈس کار تھی... تمہیں اس کا نمبر معلوم ہے؟''

''کیوں نہیں۔ نمبر اتنا آسان تھا کہ بغیر کوشش کے یاد رہ سکتا ہے... PC10001۔''

''کیا اس کے اپارٹمنٹ میں کوئی اور آ گیا؟''

''بالکل آ گیا۔ میری کو گئے ایک گھنٹا بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک لڑکی آ گئی۔ دو مہینے کا کرایہ بھی ایڈوانس دے دیا۔''

''وہ کون ہے؟''

''اس کا نام ڈولی گلبرٹ ہے۔ کم سے کم وہ اپنے آپ کو یہی کہتی ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ راتوں کو کام کرتی ہے۔''

چوکیدار نے کچھ بے چینی ظاہر کرنا شروع کی۔ میں نے سوچا کہ اسے کچھ دے دوں تو شاید مزید باتیں معلوم ہو سکیں۔ میں نے بٹوے سے پانچ ڈالر کا نوٹ نکالا۔ اس کی نظریں نوٹ پر جم گئیں۔

''یہ میرے لیے ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہیں مل سکتا ہے اگر تم مزید تعاون کرو۔ مجھے میری کو تلاش کرنا ضروری ہے۔ اس بلڈنگ میں کوئی ہو گا جو اس کے بارے میں بتا سکے؟''

''ہاں۔'' چوکیدار پھر اپنا سر کھجانے لگا۔ ''مجھے یاد آیا کہ مسز اینٹلس تمہاری مدد کر سکتی تھی۔ میری کے متعلق کئی باتیں بتا سکتی تھی۔ وہ میری کے سامنے والے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ بہت شریف بوڑھی عورت تھی۔ عمر کم سے کم اسی سال تھی۔ وہ میری کے گھر میں جھاڑ پونچھ بھی کرتی تھی اور اکثر اسے کھانا بھی دیتی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو دوسروں کے کام آنا پسند کرتی ہیں۔ بہت باتونی تھی۔ میرے کان بھی کھاتی رہتی تھی۔ وہ ہوتی تو ضرور تمہاری مدد کرتی۔''

''تو کیا وہ چلی گئی؟'' میں نے پوچھا۔ چوکیدار کی نظریں اب بھی نوٹ پر گڑی تھیں۔ آخر میں نے نوٹ اسے دے دیا۔ اس نے نوٹ کو چوما اور اپنی گندی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔

''ہاں، سر کے مل چلی گئی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ میری کے جانے کے تین دن بعد کی بات ہے۔''

''سر کے مل... کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

''جب میں اس کے اپارٹمنٹ کے باہر صفائی کر رہا تھا تو میں نے اس کا دروازہ چوپٹ کھلا دیکھا۔ وہ دور سے مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ چنانچہ میں نے اندر جھانکا۔ مسز اینٹلس فرش پر دراز تھی۔ وہ مر چکی تھی۔ میں نے پولیس کو اطلاع دی اور معاملہ ان پر چھوڑ دیا۔ مجھے پولیس سے الجھنے کا شوق نہیں تھا۔ میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی کچھ بتا سکتا تھا۔ پولیس نے فیصلہ کیا کہ مسز اینٹلس کو قتل کرنے والا کوئی عادی

www.kahopakistan.com

نشے باز تھا جو رقم تلاش کر رہا تھا۔ اس کے سر پر کوئی چیز مار کر اسے بے ہوش کر دیا اور سارے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی۔ ہر طرف چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ مسز اینگلس بوڑھی اور کمزور تھی۔ سر کی چوٹ برداشت نہیں کر سکی۔ بے ہوشی کے عالم میں ہی مر گئی۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ تمہیں ضرور بتا سکتی تھی کہ ٹیری کہاں ملے گا۔ وہ اکثر مجھ سے ٹیری کی تعریف کرتی رہتی تھی کہ بہت ہی شریف لڑکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ٹیری اسے اپنا پتا بتائے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔ بہر حال، مجھے اتنا ہی کچھ معلوم ہے۔''

''کیا کسی نے مسز اینگلس کا اپارٹمنٹ بھی کرائے پر لے لیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی نہیں۔ اس نے اپارٹمنٹ تین سال کے لیے لیا تھا۔'' چوکیدار نے بتایا۔ ''فرنیچر وغیرہ بھی اسی کا تھا۔ کوئی وکیل اس کے معاملات سنبھال رہا ہے۔ جیسے ہی وہ اپنا کام ختم کرے گا، اپارٹمنٹ کرائے پر اٹھا دیا جائے گا۔''

''تمہیں معلوم ہے اس کا وکیل کون ہے؟''

''کوئی نوجوان ہے۔ مجھ سے ملنے بھی آیا تھا۔''

''نام نہیں معلوم؟'' میں نے سوال کیا۔ چوکیدار اپنا سر کھجانے لگا پھر ایک دم سے بولا۔

''اس کا نام سولی لیوس ہے۔''

مجھے احساس ہوا کہ اب چوکیدار سے مزید کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

''ممکن ہے کہ میں پانچ ڈالر کے نوٹ کے ساتھ تم سے دوبارہ ملنے آؤں۔'' میں نے کہا۔

''بڑی خوشی سے۔'' چوکیدار نے سر ہلایا۔ ''جتنی مرتبہ چاہو آ سکتے ہو۔''

میں عمارت سے باہر نکلا۔ اینڈرسن کار کے پاس کھڑا چیونگم چبا رہا تھا۔

''کچھ کامیابی ہو رہی ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''سولی لیوس نامی ایک وکیل کا پتا معلوم کرو۔ میں کچھ دیر میں واپس آتا ہوں۔''

میں دوبارہ بلڈنگ میں داخل ہوا اور لفٹ سے ٹاپ فلور پر پہنچا۔ وہاں صرف دو اپارٹمنٹ تھے۔ داہنے ہاتھ کے دروازے پر گتے کا ٹکڑا چسپاں تھا جس پر مس ڈولی گلبرٹ کا نام لکھا تھا۔ میں نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ اس وقت پانچ بج کر پچاس منٹ ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ڈولی اب تک تو سو کر اٹھ گئی ہوگی۔ تین مرتبہ بٹن دبانے کے بعد دروازہ کھلا۔ میرے سامنے جو لڑکی کھڑی تھی، اس کی عمر بیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ سرخ گھنگریالے بال، چہرے پر میک اپ تھپا ہوا تھا۔ خدوخال سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے بڑی سخت زندگی گزاری ہے اور بدستور ایسے ہی حالات میں رہ رہی ہے۔ کندھے پر پڑی شال آگے سے کھلی تھی۔ ایک جانگیا کے علاوہ وہ کچھ پہنے ہوئے نہیں تھی۔ اس نے مجھے سرتاپا دیکھا اور مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ ایک طوائف کی مخصوص مسکراہٹ تھی جس سے وہ اپنے گاہک کو خوش آمدید کہتی ہے۔

''سوری جوان... ابھی نہیں، دو گھنٹے بعد آنا۔ ابھی ایک دوست موجود ہے۔''

''تو میں کیا کروں... دو گھنٹے تک انتظار؟'' میں نے کہا۔ ''میرے ایک دوست نے بتایا تھا کہ تم میری مدارات کر سکتی ہو۔''

''ضرور کر سکتی ہوں مگر دو گھنٹے بعد۔''

میں نے اس کے کندھے کے اوپر سے دیکھا۔ کمرا خاصا آراستہ تھا۔ ایک نیم وا دروازہ نظر آ رہا تھا جو غالباً بیڈروم کا تھا۔ اچانک بیڈروم سے ایک آواز گونجی۔

''اس احمق سے کہو کہ بھاگ جائے۔ تمہارا خیال ہے کہ میں سارا دن یہیں ضائع کر دوں گا۔'' لڑکی آواز سن کر چونک گئی۔

''وہ بڑا جنگلی ہے۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''تم سے پھر ملاقات ہوگی۔'' اور وہ دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

مجھے تقریباً یقین تھا کہ یہ گونجتی ہوئی آواز کسی نیگرو کی تھی۔ ڈولی نے کہا تھا کہ وہ بڑا جنگلی ہے۔ مجھے اچانک ایک خیال آیا۔ میں لفٹ سے اتر کر نیچے گیا۔ اینڈرسن موجود تھا۔

''وکیل کا پتا معلوم کیا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ہاں، اس کا نام و پتا ڈائریکٹری میں موجود ہے۔'' اینڈرسن نے جواب دیا۔ ''نمبر 67 سی کومب روڈ۔''

''او کے! غور سے سنو۔ کچھ دیر میں ایک سیاہ فام عمارت سے باہر نکلے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کا تعاقب کرو۔ میں کار چھوڑے جا رہا ہوں، ممکن ہے وہ کسی کار میں جائے۔ اس کے ساتھ لگے رہنا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ بینک تو نہیں ہے۔''

''اور تم؟''

''میں سولی لیوس سے بات کرنے جا رہا ہوں۔''

وہاں سے گزرتی ایک ٹیکسی کو دیکھ کر میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

سولی لیوس کا آفس ایک پرانی سی بلڈنگ کے ٹاپ فلور پر تھا۔ ایک چھوٹا سا کمرا جس کے ایک گوشے میں ایک خستہ حال میز اور اس سے بھی زیادہ خستہ حال فائلوں کی الماری کھڑی تھی۔ دوسری جانب ایک چھوٹی میز پر سیکنڈ ہینڈ ٹائپ رائٹر رکھا تھا جس سے ظاہر تھا کہ وہ اپنا ٹائپنگ کا کام بھی خود ہی کرتا تھا۔ وہ میز کی دوسری جانب ایک فائل کھولے بیٹھا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور مسکراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ قد و قامت متوسط اور عمر پینتیس سال معلوم ہوتی تھی۔ چہرے پر داڑھی تھی جس نے بیشتر چہرہ چھپا لیا تھا۔ جسم اتنا دبلا تھا جیسے وہ ہفتے میں ایک بار کھانا کھاتا ہو۔

''میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کمرے کی واحد کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے ہاتھ ملایا، اسے اپنا تعارفی کارڈ دیا۔ اس نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کارڈ پڑھا پھر میری طرف دیکھا۔

''مسٹر ویلیس! تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے تمہاری ایجنسی کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم مسز اینگلس کے وکیل ہو۔'' میں نے کہا۔ وہ قدرے چونکا۔

''درست ہے۔ مجھے اس کی وصیت پر عمل درآمد کرانا ہے۔''

''کیا ٹیرانس تھورن یا میری زیگلر کا نام تمہارے لیے کوئی معنی رکھتا ہے؟''

''ٹیری زیگلر۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''ضرور رکھتا ہے۔''

''میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ چونکہ مسز اینگلس کے اور اس کے تعلقات بہت دوستانہ تھے، اس لیے مجھے امید تھی کہ وہ مجھے بتا سکے گی کہ ٹیری کہاں ہے مگر بدقسمتی سے اس کا انتقال ہو گیا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید کبھی اس نے تم سے ٹیری کا ذکر کیا ہو۔''

''تم اسے کیوں تلاش کر رہے ہو؟'' لیوس نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''ایکمی ایجنسی کو اس کی تلاش پر مامور کیا گیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھے موکل کا نام نہیں بتایا گیا۔ صرف یہ تاکید کی گئی ہے کہ اسے تلاش کروں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ میں اور تم ایک ہی مسئلے سے دوچار ہیں۔'' لیوس نے قدرے اطمینان سے کہا۔ ''مسز اینگلس اپنی تمام دولت اور دوسری چیزیں اس کے نام چھوڑ گئی ہے اور میں یہ کام تب تک نہیں کر سکتا جب تک ٹیری کو تلاش نہ کر لوں۔ اب تک تو مجھے کوئی کامیابی نہیں ہوئی ہے۔''

''لیکن میری معلومات کے مطابق مسز اینگلس بڑی غریبانہ زندگی گزار رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ ٹیری کے اپارٹمنٹ کی جھاڑ پونچھ بھی کرتی تھی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ اس کے پاس ٹیری کے لیے چھوڑنے کے قابل کوئی چیز ہو؟''

''اس کی جملہ چیزوں کی مالیت ایک لاکھ ڈالرز سے زیادہ ہے۔'' لیوس نے بتایا۔ ''اور وہ بھی ٹیکس وغیرہ وضع کرنے کے بعد۔ مسز اینگلس بڑی کفایت شعار عورت تھی۔ کبھی اپنی دولت صرف نہیں کرتی تھی۔ رقم اپنے پاس چھپا رکھی تھی۔ میں بڑی مشکل سے اسے یہ سمجھانے میں کامیاب ہوا کہ اتنی دولت اسے لفافوں میں چھپا کر اپنے گھر میں نہیں رکھنا چاہیے اور اسے یہ رقم بینک میں رکھنے پر آمادہ کر لیا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس نے میرے مشورے پر عمل کیا۔''

''تمہیں یقین ہے کہ اس نے ساری رقم بینک میں رکھوا دی تھی؟''

''ہاں یقیناً... میں نے بینک سے معلوم کیا تھا۔ اس نے قتل ہونے سے چار دن قبل ساری رقم پیسیفک ایند نیشنل بینک میں جمع کرا دی تھی۔ بینک کے... منیجر مسٹر آکلینڈ میرے واقف کار ہیں۔ اب بات صرف ٹیری کو تلاش کرنے کی ہے۔''

''تم نے اب تک اسے تلاش کرنے کے لیے کیا کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''جو عام طور پر کیا جا سکتا تھا۔'' لیوس نے پھیکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ''اشتہار دیا، پولیس میں رپورٹ کی، گمشدہ افراد کے ادارے سے رجوع کیا۔ غرض جو کچھ کر سکتا تھا کیا... مگر دو ماہ ہو گئے ہیں اب تک تو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔''

اس نے پُرامید نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''لیکن اب جبکہ تم بھی اسے تلاش کر رہے ہو تو مجھے پھر سے توقع ہو چلی ہے۔ اگر تم اسے تلاش نہیں کر سکے تو اور کون کر سکتا ہے؟''

''فرض کرو وہ مر چکا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تب پھر اس رقم کا کیا ہوگا؟''

''اگر اس کی موت مسز اینگلس کے مرنے کے بعد ہوئی ہے تو یہ رقم اس کے نزدیک ترین رشتے دار کو ملے گی۔'' لیوس نے جواب دیا۔ ''لیکن میرے پاس ٹھوس ثبوت ہونا چاہیے کہ وہ مر چکا ہے۔''

www.kahopakistan.com

ایک اور تاریک گلی... میں ٹیکسی سے اپنے آفس واپس گیا۔ باہر آتی گرمی تھی کہ دفتر کے ائرکنڈیشنر کی ٹھنڈک میں پہنچ کر سکون کی سانس لی۔ پھر اپنی رپورٹ ٹائپ کی۔ ختم ہی کر رہا تھا کہ اینڈرسن آ گیا۔

''باہر تو جیسے جہنم بنا ہوا ہے۔'' وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کیا معلوم کر کے آئے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارا اندازہ ٹھیک تھا۔'' اینڈرسن نے جواب دیا۔ ''کچھ دیر کے بعد ایک قوی ہیکل سیاہ فام باہر آیا اور ایک سفید کیڈی کار میں بیٹھ کر چل دیا۔ میں نے بلیک کیسٹ تک اس کا تعاقب کیا۔ وہ کلب کے اندر چلا گیا۔ پھر ایک نیگرو باہر نکلا اور کار کہیں لے گیا۔''

''مجھے اس قوی ہیکل آدمی کے بارے میں بتاؤ۔''

''بڑا سخت گیر آدمی معلوم ہوتا ہے۔ قد چھ فٹ، چھ انچ سے کم نہیں ہوگا۔ ایک گز چوڑے کندھوں پر چھوٹا سا سر رکھا ہوا ہے۔ کسرتی جسم ہے۔ کسی رقاص کی طرح چلتا ہے۔ اتنا ہی خطرناک نظر آتا ہے جیسے کوئی کوبرا سانپ۔ مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہی ہیک اسمڈ لے ہے۔''

میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ ڈولی گلبرٹ سے بات کیے تقریباً دو گھنٹے ہو رہے تھے۔ اس سے ملنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے اینڈرسن کو اپنی رپورٹ دی۔

''یہیں رہنا۔ میں جلد ہی واپس آؤں گا۔'' میں نے کہا۔

میں نیچے اترا، کار میں بیٹھا اور بیکرز بلڈنگ کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس بار ایک ہی مرتبہ گھنٹی بجائی تھی کہ دروازہ کھل گیا۔ ڈولی اپنی آوارہ مسکراہٹ کے ساتھ سامنے کھڑی تھی۔

''اندر آ جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''تاخیر کے لیے افسوس ہے مگر ہم لوگوں کا وقت یونہی گزرتا ہے۔''

میں رہائشی کمرے میں داخل ہوا۔ ڈولی نے دروازہ بند کر دیا۔

''دیکھو ڈارلنگ!'' وہ بولی۔ ''میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ مجھے میرا تحفہ دو۔ پچاس ڈالر... اور کام شروع کر دو۔''

میں نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے بیڈروم میں دیکھا۔ کچن میں جھانکا اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ گھر میں اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے، رہائشی کمرے میں واپس آ گیا۔ ڈولی بیڈروم میں بستر کے پاس کھڑی کچھ بے چینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''تم کسی بات سے خوف زدہ ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس رہائشی کمرے میں لے آیا۔ ''مجھے افسوس ہے مگر تم جو سمجھ رہی ہو میں اس کام سے نہیں آیا ہوں۔'' میں نے اسے اپنا تعارفی کارڈ دیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ کچھ دیر تک کارڈ کو گھورتی رہی پھر مجھے واپس کر دیا اور سخت لہجے میں بولی۔

''چلتے پھرتے نظر آؤ مسٹر۔ دفع ہو جاؤ۔''

''مجھے کچھ معلومات درکار ہیں۔'' میں مسکرایا۔ ''جن کے لیے میں تمہیں سو ڈالر دے سکتا ہوں۔ یہ مت کہنا کہ تمہیں سو ڈالر سے دلچسپی نہیں ہے۔''

''پہلے رقم دکھاؤ۔'' اس نے ہاتھ پھیلایا۔

میں نے بٹوے سے سو ڈالر کا نوٹ نکال کر اسے دکھایا مگر دیا نہیں۔

''پہلے معلومات پھر معاوضہ۔'' میں نے کہا۔

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک شال لپیٹ رکھی تھی۔ غالباً اس کے سوا کوئی اور کپڑا اس کے جسم پر نہیں تھا۔

''کیسی معلومات؟''

''مجھے ٹیری زینگر کی تلاش ہے۔'' میں نے کارڈ واپس جیب میں رکھ لیا۔ وہ کچھ چونکی۔

''تمہیں کیسے خیال ہوا کہ میں ٹیری کے بارے میں کچھ جانتی ہوں؟''

''مجھے کوئی خیال نہیں ہے۔ میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔ مجھے کسی نے بتایا کہ تم اس کے جانے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر یہاں آ گئیں۔ میں نے سوچا ممکن ہے اس نے تمہیں اشارہ کر دیا ہو کہ وہ اپارٹمنٹ خالی کر رہا ہے اور شاید تمہیں معلوم ہو کہ وہ کہاں گیا ہے۔''

''رقم کے بارے میں کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟'' ڈولی نے گہری سانس لی۔ ''مجھے اس کی بہت ضرورت ہے۔''

''تم جو کچھ جانتی ہو بتا دو گی تو رقم مل جائے گی۔ کیا ٹیری نے بتایا تھا کہ وہ جا رہا ہے؟''

''نہیں مگر میرے کان بہت تیز ہیں۔ یہاں وہاں میرے دوست بھی بہت ہیں۔ اگرچہ ٹیری سے میری کبھی نہیں بنی۔''

''تمہیں یہ معلوم نہیں کہ وہ مجھے کہاں مل سکتا ہے؟''

''کیا وہ کسی مصیبت میں ہے؟ بہت جلدی میں گیا ہے۔ شاید خوف زدہ تھا۔''

''کسی نے اس کے لیے کچھ دولت چھوڑی ہے۔ میرا کام یہ ہے کہ اسے تلاش کروں اور دولت اس کے حوالے کر دوں۔''

''کتنی دولت۔'' ڈولی کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔

''معلوم نہیں مگر جو کچھ ہے، کم نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہو تو بتا دو کہ وہ کہاں ہے۔''

''نہیں، میں نہیں جانتی۔'' ڈولی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ذرا تصور تو کرو، اس عجیب نوجوان کو دولت ملے گی۔ میری کتنی تمنا ہے کہ کاش کوئی میرے لیے بھی کچھ چھوڑ جائے۔''

کیا یہ کوئی دوسری اندھیری گلی ہے؟ میں نے سوچا۔

''تم نے یہ کیوں کہا کہ ٹیری عجیب نوجوان ہے۔''

''میں اس سے صرف دو مرتبہ ملی ہوں۔ اس نے کبھی اپنا منہ نہیں کھولا۔ بس مجھے اس طرح گھورتا رہا جیسے میں فٹ پاتھ پر گری ہوئی کوئی شے ہوں۔ لیکن وہ پیانو بہت اچھا بجاتا تھا۔ مجھ سے پوچھو تو وہ یا تو پاگل تھا یا نشے باز۔''

''تو تمہارے خیال میں وہ نشہ کرتا تھا؟''

''میں کیا بتا سکتی ہوں۔ آس پاس بہت سے نوجوان انجکشن کے عادی ہیں لیکن میں ان سے دور رہتی ہوں۔ مجھے کمائی کرنا ہے۔''

''شکریہ۔'' میں نے اسے سو ڈالر کا نوٹ دے دیا۔

''بس ایک سوال اور کیا ہیک اسمڈ لے تمہارے پاس اکثر آتا رہتا ہے؟''

وہ اس طرح گھبرا کر پیچھے ہٹی جیسے میں نے اسے تھپڑ مار دیا ہو۔ پھر اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ ''دفع ہو جاؤ۔'' وہ چیخی۔ ''میں تم سے باز آئی۔''

مجھے بطور ماہر تقریباً تیس سال گزر چکے تھے۔ میں نے بہت سے خوف زدہ چہرے دیکھے تھے مگر کوئی اتنا سہا ہوا نہیں تھا جیسے اس وقت ڈولی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اب اس سے کچھ اور معلوم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ میں اپارٹمنٹ سے باہر آ گیا۔ نیچے اترا اور اس جانب چل دیا جہاں میں نے اپنی کار پارک کی تھی۔

☆☆☆

آفس پہنچا تو اینڈرسن اپنی میز پر چیونگم چبا رہا تھا اور میری رپورٹ پڑھ رہا تھا۔ میں نے ڈولی سے جو کچھ معلوم ہوا تھا، اسے بتایا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم ٹیری میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟ میں تو...''

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''ہمارے پاس تحقیقات کرنے کے لیے کوئی واضح سراغ

www.kahopakistan.com

نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میرا دل کہہ رہا ہے کہ ٹیری سے ہمیں اہم باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔ میں اسے تلاش کرکے اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’کیا ہم ہینک اسمڈ لے پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کر سکتے؟‘‘

’’لیکن میں پہلے ٹیری کو تلاش کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’جیسی تمہاری مرضی۔ باس تم ہو۔ تو اب کیا کریں؟‘‘

’’تم گھر جاؤ اور آرام کرو۔ میں اپنی رپورٹ میں کچھ اضافہ کرکے گھر جاؤں گا۔‘‘

گھر گیا تو دیکھا کہ بیرونی دروازے میں دو نئے قفل لگا دیے گئے ہیں۔ ان کی چابیاں مجھے اپنے لیٹر بکس میں مل گئیں۔ دیوار پر نیا پینٹ کر دیا گیا تھا۔ کیا خوب لڑکی ہے... میں نے سوچا اور بیلی ویو ہوٹل فون کیا مگر مجھے بتایا گیا کہ سوزی بہت مصروف ہے، فی الحال مجھ سے بات نہیں کر سکتی۔ دو گھنٹے بعد فون کرکے دیکھ لوں۔ چنانچہ میں اس کا شکریہ بھی نہیں ادا کرسکا۔

☆☆☆

اگلی صبح میں کچھ جلدی آفس پہنچ گیا۔ رپورٹ ٹائپ کر رہا تھا کہ اینڈرسن بھی آ گیا۔

’’میں ایک اولڈس کار جس کا نمبر PC10001 کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’اچھی بات ہے۔‘‘ اینڈرسن نے جواب دیا اور چلا گیا۔ شہر میں اس کے رابطے کے ذرائع تعداد میں اتنے ہی ہو گئے تھے جتنے میرے تھے۔ اس کا ایک دوست کار رجسٹریشن آفس میں تھا۔ میں نے اپنی رپورٹ ٹائپ کرکے فائل میں لگائی اور گلنڈا سے ملنے گیا، وہ ابھی آئی تھی اور ڈاک دیکھ رہی تھی۔ میں نے اب تک جو کچھ معلوم ہوا، اسے اختصار سے بتایا۔

’’ایسا معلوم ہوتا ہے انجیلا بلیک کیسٹ کلب جاکر کسی کو رقم دے رہی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اب وہ ہینک اسمڈ لے ہے یا کوئی اور... ابھی یہ معلوم نہیں کرسکا ہوں۔ اور یہ بات انجیلا یا ہینک میں سے کسی سے پوچھے بغیر معلوم ہونا مشکل ہے۔ ایسا کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ ٹیری مفید ثابت ہوسکتا ہے بشرطیکہ میں اسے تلاش کرسکوں۔ چنانچہ اس کیس کی قابلِ اطمینان رپورٹ تیار کرنے میں وقت لگے گا۔‘‘

’’ہم مسز تھورسن سے تین ہزار ڈالرز یومیہ فیس لے رہے ہیں۔‘‘ گلنڈا نے جواب دیا۔ ’’اس لیے بہتر ہوگا کہ اس سے ملو۔ اپنی رپورٹ دو اور اس سے پوچھو وہ کیا چاہتی ہے۔ ہم تحقیقات جاری رکھیں یا ختم کر دیں۔ ممکن ہے وہ منع کر دے۔‘‘

بات مناسب تھی۔ میں اپنے آفس واپس آیا۔ اس وقت دس بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے تھورسن کے گھر فون کیا۔ ریسیور جوش اسمڈ لے نے اٹھایا۔ میں نے اس کی آواز پہچان لی۔

’’میں ویلیس بات کر رہا ہوں۔ مسز تھورسن کو بلاؤ۔‘‘

’’تم وہی ڈیٹیکٹیو ہو؟‘‘

’’ٹھیک پہچانا۔‘‘

’’مادام باہر گئی ہیں اور سہ پہر سے پہلے واپس نہیں آئیں گی۔‘‘

میں نے اس کا شکریہ ادا کرکے ریسیور رکھ دیا۔ چند لمحوں کے بعد اچانک ایک خیال آیا اور فوراً ہی اس پر عمل کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اینڈرسن کے لیے ایک پرچہ لکھ کر اس کی میز پر رکھا اور تھورسن کے بنگلے کی طرف چل دیا۔ مسز تھورسن کی عدم موجودگی میں مجھے جوش اسمڈ لے سے بات کرنے کا بہترین موقع حاصل تھا۔

دروازے پر تین مرتبہ گھنٹی بجانے اور چھ منٹ انتظار کرنے کے بعد جوش اسمڈ لے نمودار ہوا۔

’’میں نے تو کہہ دیا تھا کہ مادام گھر پر نہیں ہیں۔‘‘ وہ بولا۔

’’ضرور کہا تھا۔‘‘ میں اسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے اندر داخل ہوگیا۔ ’’مگر میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’مگر میں بہت مصروف ہوں۔‘‘

’’اپنے کمرے میں چلو۔‘‘ میں نے مضبوطی سے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ’’مجھے تم سے چند سوالات کرنے ہیں۔‘‘

جوش نے میری طرف دیکھا اور یہ محسوس کرکے میں باز آنے والا نہیں ہوں، وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔

’’کچھ پینے کے لیے لاؤ۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’میں اسکاچ پسند کرتا ہوں۔‘‘

کچھ ہچکچاتے ہوئے اس نے ایک الماری سے وھسکی کی ایک بوتل نکالی۔ دو گلاسوں میں خاصی مقدار انڈیلی۔ میں نے دیکھا کہ الماری کے ایک خانے میں بہت سی خالی بوتلیں رکھی ہیں۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے ایک گلاس مجھے دیا اور دوسرا خود لیے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے قریب دوسری کرسی پسند کی۔

’’تم کیا جاننا چاہتے ہو؟‘‘ اس نے پوچھا اور وھسکی کے کئی گھونٹ بھرے۔

’’مسز تھورسن نے میری خدمات یہ معلوم کرنے کے لیے حاصل کی تھیں کہ کوئی ان کی بیٹی کو بلیک میل کر رہا ہے یا نہیں... اور کر رہا ہے تو وہ کون ہے اور کیوں بلیک میل کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی یہ بات جانتے ہو۔‘‘ جوش نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’تم ہر وہ بات جانتے ہو جو اس گھر میں ہوتی ہے۔ درست ہے؟‘‘

’’میں یہاں تیس سال سے زیادہ مدت سے ملازمت کر رہا ہوں۔‘‘ جوش نے جواب دیا۔

’’مجھے بتاؤ مسٹر تھورسن کس قسم کے آدمی تھے؟‘‘

’’ان کا انتقال ہوگیا ہے۔‘‘

’’مجھے معلوم ہے۔ تم میرے سوال کا جواب دو۔‘‘

’’مسٹر تھورسن بڑے سخت انسان تھے۔‘‘ جوش نے بتایا۔ ’’شاید دولت مند بننے کے لیے ایسا ہونا ضروری تھا۔ مجھ پر بہت سختی کرتے تھے لیکن تنخواہ بھی اچھی دیتے تھے۔‘‘

’’وہ اپنے بچوں کے ساتھ بھی سخت تھے؟‘‘

’’مسٹر ٹیری پر تھے مگر مس انجیلا پر نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ٹیری ان کا کاروبار سنبھالے۔ انہیں ٹیری کا پیانو سے شوق رکھنا بالکل پسند نہیں تھا۔ آئے دن اسی بات پر ڈانٹتے رہتے تھے۔ آخر ٹیری گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ مجھے اس سے خوشی ہوئی۔ جب تک وہ رہا، گھر میں سکون نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کے جاتے ہی سب کچھ ٹھیک ہوگیا۔ پھر مسٹر تھورسن وفات پا گئے اور گھر میں ایک بار پھر ہنگامہ شروع ہو گیا۔ مس انجیلا اور اپ کی ماں میں جھگڑے ہونے لگے۔ ان کی آپس میں نہیں بنتی تھی۔ چنانچہ انجیلا کاٹیج میں رہنے لگی اور چونکہ میرے اور میری بیوی کے درمیان بھی بہت اختلاف رہتا تھا اس لیے وہ انجیلا کے ساتھ چلی گئی۔‘‘

’’تم نے دونوں بچوں کو بچپن سے جوان ہوتے دیکھا ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’ٹیری کے متعلق تمہاری رائے کیا ہے؟‘‘

’’ٹیری بہت اچھا لڑکا تھا۔ میری اس کی خوب بنتی تھی۔ وہ اکثر میرے کمرے میں آکر مجھ سے باتیں کرتا تھا۔ اسے اس بات پر بھی افسوس تھا کہ میرے اور میری بیوی کے درمیان بہت جھگڑے ہوتے ہیں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ زیادہ دن تک وہ اپنے باپ کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ جیسے ہی مسٹر تھورسن آفس جاتے تھے، ٹیری میوزک روم میں جاکر پیانو بجانے لگتا اور بجاتا ہی چلا جاتا۔ اس کے اندر موسیقی کی خداداد صلاحیت تھی۔ اس نے کسی سے موسیقی سیکھی نہیں تھی، نہ سروں کے بارے میں زیادہ جانتا تھا۔ اسے جاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بس ایک بار کوئی دھن سن لے تو اسے بڑی کامیابی سے بجا سکتا تھا۔ اس نے سیکھنے کی کوشش کی تو باپ نے اجازت نہیں دی۔ جب وہ جا رہا تھا اور یہ کوئی دو سال پہلے کی بات ہے تو میرے پاس آیا اور مجھے خدا حافظ کہا۔ مجھے اس کے جانے کا اتنا دکھ تھا کہ میں دیر تک روتا رہا۔‘‘

’’اور انجیلا... اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’جب تک وہ بچی رہی، ٹھیک رہی۔ جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی، بدمزاج ہوتی گئی۔ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی۔ میرا خیال ہے کہ میری بیوی نے اس کے دماغ میں میرے خلاف زہر بھر دیا تھا۔ اس کے بعد میرے اس کے روابط اچھے نہیں رہے۔‘‘

’’اپنے بھائی کے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا تھا؟‘‘

’’وہ ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ ٹیری گھر سے گیا تو انجیلا مرجھا کر رہ گئی، جیسے اس کی زندگی سے ساری خوشیاں چلی گئی ہوں پھر جب مسٹر تھورسن کا انتقال ہوا تو وہ کاٹیج میں منتقل ہوگئی۔ میری بیوی اس کے ساتھ چلی گئی، تب سے میں نے اسے پھر نہیں دیکھا۔‘‘

’’مسٹر تھورسن کی موت اچانک ہوئی تھی؟‘‘

’’ہاں مگر غیر متوقع نہیں تھی۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’وہ بہت سخت کوش زندگی بسر کرتے تھے۔ ہر وقت کام اور غصہ۔ یہ ان کے کمزور دل کے لیے مناسب نہیں تھا۔ ان کے ڈاکٹر نے کئی مرتبہ خبردار کیا مگر وہ اپنی من مانی کرنے کے عادی تھے۔‘‘

’’اس عادت سے تو تمہیں بھی مشکل پیش آتی ہوگی؟‘‘

’’نہیں، میں ان کے مزاج سے واقف تھا۔ برسوں سے انہیں دیکھتا چلا آ رہا تھا لیکن کچھ لوگ انہیں پریشان کر دیتے تھے۔‘‘

’’تو کیا وہ ان سے جھگڑا کرتے تھے؟‘‘

’’نہیں، جھگڑتے نہیں تھے کیونکہ ان سے ان کا کاروباری تعلق تھا۔ وہ مالی معاملات میں بہت ہوشیار تھے اور ان لوگوں کی دولت سے سرمایہ کاری کرتے تھے۔‘‘

’’لیکن کبھی نہ کبھی ان پر غصہ تو ہوتے ہوں گے؟‘‘

’’غصہ تو وہ سب پر کرتے تھے۔ ان پر... مجھ پر... یہاں تک کہ...‘‘

’’انجیلا پر بھی؟‘‘

www.kahopakistan.com

''ہاں لیکن ایسا صرف ایک بار ہوا تھا۔''
''یہ کب ہوا تھا؟''
''اس دن...'' جوش نے گلاس کی باقی وسکی حلق میں انڈیل لی۔
''تم نے انہیں جھگڑتے سنا تھا؟''
''سب کچھ تو نہیں سنا تھا، جھگڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے مگر میں نے انجیلا کو ٹیری کا نام لیتے ضرور سنا تھا... اس کے بعد وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔''
''کیا تم نے کارونر کو یہ بات بتائی تھی؟''
''اس نے پوچھا ہی نہیں۔ اس کے علاوہ وہ جھگڑا خاندانی معاملہ تھا۔''
''مجھے ٹیری کی تلاش ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟''
''کاش مجھے معلوم ہوتا۔ میں خود اس سے ملنا چاہتا ہوں مگر جب سے وہ گیا ہے، اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں سنی۔''
''میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میرا اس سے ملنا کیوں ضروری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ایک بوڑھی خاتون نے اس کے لیے ایک لاکھ ڈالرز چھوڑے ہیں۔ اس خاتون کا نام مسز اینکس تھا۔ اسے کسی نے قتل کر دیا۔ یہ رقم تب تک ٹیری کو نہیں مل سکتی جب تک میں اسے تلاش نہ کرلوں۔ ذرا تصور کرو ایک لاکھ ڈالرز۔''
''اسے قتل کیا گیا تھا؟'' جوش نے پوچھا۔
''قاتل کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہ اپنی دولت گھر میں چھپائے رکھتی ہے۔ وہ بیکرز بلڈنگ میں رہتی تھی۔ ٹیری بھی وہیں رہتا تھا۔ قاتل کو اسی دولت کی تلاش تھی مگر حسنِ اتفاق ہے مسز اینکس ساری رقم چار دن قبل بینک میں جمع کرا چکی تھی، وہ اب بھی بینک میں ہے۔ اس انتظار میں کہ ٹیری کب اسے طلب کرتا ہے۔''
''مجھے کچھ معلوم نہیں مسٹر ویلیس کہ ٹیری کہاں ہے۔''
میں اٹھ کر دروازے کی طرف چلا۔
''ایک بات اور۔'' میں نے رک کر کہا۔ ''تمہارا ایک بیٹا ہے ہینک جو بلیک کیسٹ کلب کا مالک ہے... ہے نا؟''
''درست ہے۔'' جوش نے نظریں نیچی کرتے ہوئے ہلکی آواز میں کہا۔
''جب میں پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا اور مسز تھورسن نے میری خدمات حاصل کی تھیں تو تم نے اپنے بیٹے کو فون کر کے میرے بارے میں بتا دیا... یہ سچ ہے نا؟''
جوش خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے ایک بار پھر ذرا سخت لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔
''میں ہر روز فون پر اپنے بیٹے سے بات کرتا ہوں۔'' جوش بڑبڑایا۔
''اور تم نے اسے میرے بارے میں بتا دیا؟''
''میرے بیٹے کو ان باتوں سے دلچسپی ہے جو یہاں ہوتی ہیں۔'' کچھ دیر کے بعد وہ بولا۔
''او کے جوش۔'' میں نے کہا۔
اب مزید گفتگو سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں جو کچھ جاننا چاہتا تھا، معلوم کر چکا تھا۔ جوش نے ہینک کو بتا دیا تھا کہ مجھے انجیلا کے بارے میں تحقیقات کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور ہینک نے فوراً مجھے دھمکانا ضروری سمجھا۔ میں کمرے سے نکلا تو جوش خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ اسے میرے جانے کا احساس بھی نہیں ہوا ہوگا۔

☆☆☆

آفس پہنچا تو میرا پرچہ بدستور اینڈرسن کی میز پر رکھا تھا۔ میں نے جوش اسمڈ لے سے اپنی گفتگو کی رپورٹ ٹائپ کی۔ فارغ ہوا تو ایک بج کر پندرہ منٹ ہو رہے تھے اور مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے رپورٹ تھورسن کی فائل میں لگائی۔ اسی وقت اینڈرسن آگیا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ بہت سی خبریں لے کر آیا ہے۔
''آؤ پہلے کھانا کھالیں۔'' میں نے کہا۔
''ٹھیک کہا۔'' اینڈرسن بولا۔ ''اس وقت مجھے اتنی بھوک لگی ہے کہ ایک ہاتھی نوشِ جان کرسکتا ہوں۔''
ہم ایک قریبی ریسٹورنٹ میں گئے۔ کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانا آیا تو بغیر کوئی بات کیے شروع ہو گئے۔ جب نصف سے زیادہ کھانا پیٹ میں اتر گیا تو میں نے پوچھا۔
''کیا خبریں ہیں؟''
''وہ اولڈس کار اب ہینک کے نام رجسٹرڈ ہے۔ تین ماہ پہلے اس نے اپنے نام ٹرانسفر کرائی ہے۔ یہ خبر کیسی ہے؟''
''پسند آئی۔'' میں نے نوالہ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ''آگے چلو۔''
''میں نے ہینک کا پتا معلوم کرلیا ہے۔ وہ نمبر 56 سی گرو ورروڈ، سی کومب میں رہتا ہے۔ میں نے جا کر دیکھا ہے، اس کا کمرا ٹاپ فلور پر ہے۔ بلڈنگ اچھی اور اسٹائلش ہے۔ اس کے بعد میں پولیس ہیڈ کوارٹر گیا اور نام لیپسکی سے بات کی۔ اسے بتایا کہ ہم لوگ ہینک اسمڈ لے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ فارغ تھا، باتیں کرنے لگا۔ ہینک کی فائل نکالی۔ اس کے مطابق پولیس ہینک کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے۔ ہینک بارہ سال کی عمر سے پولیس کی نظروں میں ہے۔ تین مرتبہ اصلاحی اسکول بھیجا جا چکا ہے۔ چوری، ڈکیتی، تشدد، لڑکوں کو مارنا پیٹنا اس کا معمول تھا پھر اچانک بڑا شریف نظر آنے لگا۔ پھر بھی لیپسکی کا خیال ہے کہ اس کے کلب میں کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے۔ مگر کیا، یہ وہ نہیں جانتا۔ وہ کلب پر چھاپا مارنے کے لیے بے چین ہے مگر بغیر ثبوت کے سرچ وارنٹ حاصل نہیں کرسکتا۔''
''اچھا کام کیا۔'' میں نے تعریف کی۔
میں نے اینڈرسن کو جوش اسمڈ لے سے اپنی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اینڈرسن نے اپنی رپورٹ ٹائپ کی۔ میں تھورسن کی فائل پڑھتا رہا۔ تب سوا چار بجے میں نے سوچا کہ شاید مسز تھورسن واپس آگئی ہو۔ معلوم کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں اس کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ بارش رک گئی تھی۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ قسمت ساتھ تھی۔ کار سے اتر کر آگے بڑھا تو مسز تھورسن کو باغ میں ایک درخت کے نیچے چائے پیتے دیکھا۔ میں قریب گیا تو اس نے سرد نگاہ سے مجھے دیکھا۔
''میرا خیال ہے مسٹر ویلیس کہ میں نے تم سے کہا تھا آنے سے پہلے فون کرلیا کرو۔'' وہ بولی۔
''کیا تھا مگر آپ باہر تھیں اس لیے چلا آیا۔'' میں نے جواب دیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
''مجھ سے کہا گیا کہ میں اب تک کی تحقیقات سے آپ کو آگاہ کروں اور پوچھوں کہ آپ اسے مزید جاری رکھنا چاہتی ہیں یا نہیں۔''
''کیسی تحقیقات؟''
''آپ نے مجھ سے یہ معلوم کرنے کے لیے کہا تھا کہ انجیلا کو بلیک میل کیا جا رہا ہے یا نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور اگر کیا جا رہا ہے تو کون کر رہا ہے اور وہ کس سلسلے میں بلیک میل کی جا رہی ہے۔ میں نے انجیلا کو بینک سے کیش نکالتے دیکھا۔ اس کا تعاقب کیا، وہ ساحلِ سمندر پر واقع ایک کلب بلیک کیسٹ میں گئی۔ یہ کلب صرف سیاہ فام لوگوں کے لیے ہے۔ وہ وہاں دس منٹ تک رہی اور جب واپس آئی تو رقم کا بریف کیس اس کے پاس نہیں تھا۔''
مسز تھورسن اس طرح ساکت بیٹھی ہوئی تھی جیسے پتھر کی بن گئی ہو۔
''تمہارا کہنا ہے کہ انجیلا اس سیاہ فام لوگوں کے کلب

...آ گئیں گے... اس سے بہتر تھا کہ میں اکیلا ہی تنا کاٹ لیتا

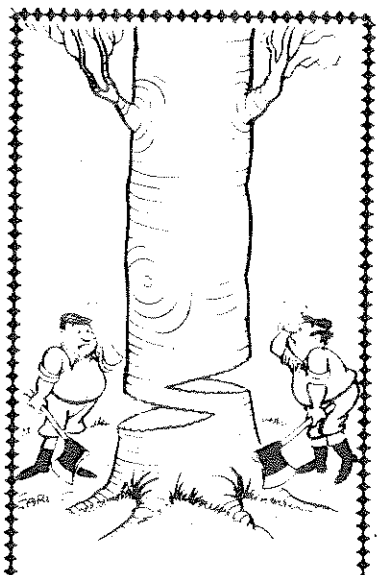

میں گئی؟'' اس نے پوچھا۔
''بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کلب میں کسی کو بلیک میل کی رقم ادا کرنے گئی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سیاہ فام لوگوں سے تعلقات رکھتی ہے۔''
''تب اس کا کیا مطلب ہے؟''
''ممکن ہے وہ سیاہ فام لوگوں کے کسی فلاحی فنڈ میں مدد دے رہی ہو۔ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اس کلب کا مالک ہینک اسمڈ لے ہے۔ یعنی آپ کے بٹلر کا بیٹا۔''
وہ ایک بار پھر جیسے پتھر بن گئی۔ مجھے اس کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اسے میری باتوں سے گہرا شاک لگا ہے لیکن وہ بڑے کمال سے ضبط کر رہی تھی۔
''ہینک اسمڈ لے۔'' اس نے آہستہ سے دہرایا۔ ''ہاں، مجھے یاد آگیا۔ وہ بھی ہمارے باغ میں کام کرتا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ میری بیٹی اس پر ضرورت سے زیادہ مہربان ہو رہی ہے۔ یہ انجیلا کے سنِ بلوغت میں قدم رکھنے کا زمانہ تھا۔ وہ احمقانہ حرکتیں کرنا پسند کرتی تھی۔ ہینک اس سے دس سال بڑا تھا اور ہر طرح اس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا،

www.kahopakistan.com

اسے اکساتا تھا۔ میں نے اپنے شوہر سے شکایت کی اور اس نے بینک کو نکال دیا۔'' مسز تھورسن نے گہری سانس لی۔'' ایسا معلوم ہوتا ہے، وہ اب بھی اس سے ملا کرتی ہے اور رقم بھی دیتی ہے۔ یہ کشتی خطرناک بات ہے۔''

''معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے مگر ممکن ہے یہ بات نہ ہو۔''

''میں اس بارے میں اپنے بٹلر سے بات کروں گی۔''

''بہتر ہوگا کہ پہلے آپ انجیلا سے بات کریں۔''

''انجیلا سے۔'' مسز تھورسن کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھری۔ وہ مجھے کچھ نہیں بتائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔''

''کئی پیچیدگیاں ہیں مسز تھورسن۔'' میں نے کہا۔ ''اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں مزید تحقیقات کروں تو آپ کہہ دیں۔ آپ کی مرضی ہوگی تو تحقیقات جاری رہے گی ورنہ بند کردی جائے گی۔''

''کیسی پیچیدگیاں؟'' مسز تھورسن نے پوچھا۔ اس موقع پر میں تیری کا ذکر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''بینک بہت خطرناک آدمی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے کلب میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ پولیس نے بھی کوشش کی تھی مگر ناکام رہی۔ اگر مجھے کلب میں غیر قانونی طور پر ہونے والی سرگرمیوں کے بارے میں ٹھوس ثبوت مل گیا تو میں بینک کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنا پسند کروں گا لیکن یہ سب کچھ آپ پر منحصر ہے۔''

''مجھے اس سے زیادہ خوشی کسی اور بات سے نہیں ہو گی۔'' مسز تھورسن کے لہجے میں بڑی سنگ دلی تھی۔'' کہ اس بدمعاش کو اپنے کیے کی سزا ملے اور وہ قید کردیا جائے۔ ٹھیک ہے۔ مجھے پروا نہیں کہ اس پر کتنی رقم خرچ ہوتی ہے، تم اپنی تحقیقات جاری رکھو۔''

''میں یہی کروں گا مسز تھورسن... مگر ایک شرط پر۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔'' کہ آپ اس بارے میں اپنے بٹلر یا اپنی بیٹی سے کوئی بات نہ کریں۔''

''میں اس بدمعاش کو قرار واقعی سزا دلانے کا کام تم پر چھوڑتی ہوں۔'' مسز تھورسن نے جیسے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اب یہ تمہاری ذمے داری ہے کہ وہ بچنے نہ پائے۔'' ان الفاظ کے بعد میں وہاں سے رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

بارش ہو رہی تھی اور میں تھورسن کے بنگلے کے باہر اپنی کار میں بیٹھا اس گفتگو پر غور کر رہا تھا جو ابھی مسز تھورسن سے ہوئی تھی۔ کم سے کم اس نے ایجنسی کو مزید تحقیقات کی اجازت دے دی تھی اور چونکہ یہ تحقیقات کافی گراں تھی اس لیے اسے اپنی رقم کا کچھ نہ کچھ نعم البدل تو ملنا چاہیے تھا۔ میں اسٹیٹ کے گرد چہار دیواری کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا اور جیسا کہ مجھے توقع تھی، جلد ہی اپنے داہنی جانب ایک گلی تک پہنچ گیا۔ مجھے امید تھی کہ یہ گلی مجھے انجیلا کے کاٹیج تک پہنچا دے گی اور میرا اندازہ درست نکلا۔ میں اپنی برساتی پہن کر باہر نکلا۔ چھوٹی سی پختہ روش طے کر کے کاٹیج پر پہنچا۔ کاٹیج زیادہ بڑا نہیں تھا۔ تین چار کمرے ہی ہوں گے۔ سامنے ہی انجیلا کی پرانی بیٹل کار کھڑی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر بیرونی دروازے پر لگا گھنٹی کا بٹن دبایا۔ جلد ہی دروازہ کھلا۔ میرے سامنے ایک لحیم شحیم سیاہ فام عورت کھڑی تھی اور اتنی طاقتور معلوم ہو رہی تھی کہ لیلیٰ کے ہومز سے مقابلہ کرسکتی تھی۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر پوچھا میں کیا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ مجھے انجیلا سے ملنا ہے۔

''اپنا راستہ ناپو مسٹر۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مس انجیلا اجنبی لوگوں سے نہیں ملتیں۔''

''مگر وہ مجھ سے ضرور ملیں گی۔'' میں نے اپنا تعارفی کارڈ دیا۔ ''تم یہ کارڈ انہیں دے دو۔ ذرا جلدی۔ میں بھیگ رہا ہوں۔''

''یہاں انتظار کرو۔'' اس نے کارڈ دیکھتے ہوئے کہا اور دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

تو یہ حتا اسمڈ لے ہے۔ میں نے دل سے کہا اور مجھے جوش اسمڈ لے پر رحم آنے لگا۔ پانچ منٹ گزر گئے۔ میں نے ایک بار پھر بٹن دبایا اور دبائے رہا۔ جلد ہی دروازہ کھلا۔

''اندر آجاؤ۔'' حتا نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ برساتی اتار دو۔ میں گھر میں کیچڑ پسند نہیں کرتی۔''

میں نے برساتی اتار کر وہیں فرش پر ڈال دی۔ اس نے کچھ آگے جا کر ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ یہ ایک بڑا سا رہائشی کمرا تھا جسے کافی آراستہ کیا گیا تھا۔ انجیلا ایک کرسی پر بیٹھی مجھے گھور رہی تھی۔ اس وقت اس نے دھوپ کا چشمہ نہیں پہنا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میں چونکا۔ میں نے اس کی ماں سے اس کے مرد دوستوں کے بارے میں پوچھا تھا اور جواب ملا تھا کہ انجیلا اتنی بدصورت ہے کہ کوئی شریف خوش مزاج لڑکا اس سے دوستی رکھنا پسند نہیں کرے گا۔ غالباً یہ ایک ماں کا حاسدانہ جذبہ تھا کیونکہ اس وقت جو لڑکی میرے سامنے تھی، وہ کسی فلم اسٹار کی طرح خوب صورت تھی۔ کچھ دبلی ضرور تھی مگر اس کا جسم بڑی کشش کا حامل تھا۔

''زحمت دینے پر معذرت خواہ ہوں مس انجیلا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن مجھے امید ہے کہ تم میری کچھ مدد کرسکو گی۔''

''بیٹھ جاؤ مسٹر ویلیس۔'' اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیا پیو گے... چائے یا کافی؟''

''شکریہ۔'' میں بیٹھ گیا۔ ''سردست کچھ نہیں۔''

''تم پرائیویٹ ڈیٹیکٹو ہو؟'' اس نے کارڈ دیکھا۔

''درست ہے۔''

''تمہاری زندگی تو بڑی سنسنی خیز ہوگی۔ میں نے پرائیویٹ جاسوسوں کے بارے میں بہت سی کہانیاں پڑھی ہیں۔''

''ایسا صرف کہانیوں میں ہی ہوتا ہے۔ میرا زیادہ وقت تو کار میں انتظار کرتے یا لوگوں سے پوچھ گچھ کرتے گزرتا ہے۔''

''تو تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟''

''میری خدمات تمہارے بھائی کو تلاش کرنے کے لیے حاصل کی گئی ہیں۔'' میں نے کہا۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا مگر اس کے چہرے پر دلچسپی کے علاوہ کوئی تاثر نمایاں نہیں ہوا۔

''تیری کو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، ایک بوڑھی خاتون نے اس کے لیے کچھ رقم چھوڑی ہے۔ جب تک تیری کو تلاش نہ کرلیا جائے، رقم بینک میں ہی رہے گی۔''

''ایک بوڑھی عورت نے تیری کے لیے رقم چھوڑی ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کون ہے وہ؟''

''اسی وجہ سے میرا کام بہت بور ہے۔'' میں نے منہ بنایا۔ ''میرے باس نے مجھے صرف اتنا بتایا کہ تیری کو تلاش کرو کیونکہ اس کے لیے کس بوڑھی خاتون نے اپنی وصیت میں رقم چھوڑی ہے۔ اس نے مجھے عورت کا نام نہیں بتایا، البتہ یہ ضرور کہا کہ رقم ایک لاکھ ڈالرز ہے۔ چنانچہ میں معلومات حاصل کر رہا ہوں۔''

''کیا... ایک لاکھ ڈالرز....''

''جی ہاں مس انجیلا۔'' میں بولا۔ ''یہ تیری کے لیے بہت اچھی بات ہے نا... مگر اسے تلاش پھر بھی کرنا پڑے گا۔ تم کچھ مدد کرسکتی ہو؟''

''کاش کرسکتی۔ میں نے تو مہینوں سے اپنے بھائی کی صورت نہیں دیکھی۔''

''اس نے تمہیں خط بھی نہیں بھیجا... فون بھی نہیں کیا؟'' ''نہیں۔'' انجیلا کے چہرے سے افسردگی ظاہر ہوئی۔ ''اور یہ میرے لیے بڑے دکھ کی بات ہے۔ ایک وقت تھا کہ میں اور تیری بہت قریب تھے۔''

میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے یا نہیں۔ اگر بول رہی تھی تو بڑی مہارت سے بول رہی تھی۔

''ممکن ہے تم اس کے کسی دوست کو جانتی ہو جو مجھے اس کے بارے میں بتا سکے۔''

''نہیں، میں اس کے کسی دوست کو بھی نہیں جانتی۔'' انجیلا نے نفی میں سر ہلایا۔

''تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ وہ... کلب میں پیانو بجایا کرتا تھا اور پھر اچانک چلا گیا؟''

''مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا۔'' اس کے چہرے سے حیرت کا اظہار ہوا۔

''گویا تم میری کوئی مدد نہیں کرسکتیں۔''

''کاش میں کرسکتی مگر تمہارا کارڈ میرے پاس ہے۔ اگر مجھے تیری کی کوئی خبر ملی تو تمہیں فون کردوں گی۔''

''مجھے اس سے خوشی ہوگی۔'' میں کھڑا ہوگیا۔ ''افسوس کی بات ہے کہ بینک میں اس کے لیے اتنی بڑی رقم رکھی ہے اور اسے اس کی خبر تک نہیں ہے۔''

جارج اتوار کے روز ہمیشہ کرکٹ کھیلتا تھا۔ اس کی بیوی اس کے اس معمول سے عاجز آچکی تھی۔ تنگ آکر اس نے اپنے پادری سے رجوع کیا۔ ''فادر! اتوار کے روز کرکٹ کھیلنا گناہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''گناہ تو نہیں ہے۔'' پادری نے جواب دیا۔ ''البتہ جارج جس طرح کھیلتا ہے، اس کی وجہ سے تو اُسے جرم قرار دینا چاہیے۔''

باؤلر کے لیے وہ میچ بہت خراب ثابت ہوا۔ اس کی خراب باؤلنگ کی وجہ سے اس کی ٹیم ہار گئی۔ اگلے ہفتے اس نے مسلسل پریکٹس کی تاکہ گزشتہ میچ کی تلافی کرسکے۔ اگلے میچ کے بعد اس نے کپتان سے پوچھا۔ ''آپ کو کچھ فرق محسوس ہوا؟''

کپتان اُسے غور سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''ہاں، فرق تو محسوس ہوتا ہے، شاید تم نے بال چھوٹے کرالیے ہیں۔''

www.kahopakistan.com

''واقعی بڑے افسوس کی بات ہے۔'' وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

تب میں نے وہ سوال کیا جس کا جواب یہ بتا سکتا تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے یا بڑی مہارت سے جھوٹ۔ ''کیا تم بتا سکتی ہو کہ میں چینک اسمڈلے سے کہاں مل سکتا ہوں؟'' میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اگر میں اسے اتنے غور سے نہ دیکھ رہا ہوتا تو شاید اس کی پلکوں کے معمولی سے جھپکنے کو نوٹ نہیں کر سکتا تھا۔ ساتھ ہی اس کی مسکراہٹ میں تھوڑی سی کمی کو بھی۔ میں سمجھ گیا کہ میرے سوال نے اسے بے خیالی میں چونکا دیا ہے۔ ایک لمحہ توقف کے بعد وہ پھر مسکرانے لگی۔

''چینک اسمڈلے... تمہارا مطلب ہے وہ سیاہ فام لڑکا جو کبھی ہمارے باغ میں کام کرتا تھا؟''

''جی ہاں، وہی چینک جو مسز اسمڈلے کا بیٹا ہے۔ تمہیں معلوم ہے وہ مجھے کہاں مل سکتا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ میں نے تو اسے مدت سے نہیں دیکھا، نہ ہی اس کی ماں نے دیکھا ہے۔''

تب میں جان گیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے اور وہ بھی بڑے تجربہ کارانہ انداز میں۔ اب تک میں نے ایسی مہارت سے جھوٹ بولتے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ اگر میں نے اسے بلیک کیٹ کلب میں جاتے نہ دیکھا ہوتا تو شاید وہ مجھے احمق بنانے میں کامیاب ہو جاتی۔ جوابی طور پر میں نے بھی اداکاری کرتے ہوئے کندھے اچکائے۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے بھائی کو تلاش کرنا بہت مشکل ثابت ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''مگر ہم برابر تحقیقات کرتے رہیں گے۔ جب ہماری ایجنسی کے سپرد کوئی کام کیا جاتا ہے تو ہم اسے انجام دے کر ہی دم لیتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جب ہم اسے تلاش کر لیں گے تو تمہیں بھی اس کے بارے میں جاننے سے دلچسپی ہوگی۔'' میں مسکرایا۔ ''ایسا ہوا تو میں تمہیں اطلاع کر دوں گا۔''

اسے ساکت کھڑا چھوڑ کر... جبکہ اس کی مسکراہٹ بھی غائب ہو چکی تھی، میں باہر نکلا۔ میں نے لابی کے فرش سے اپنی برساتی اٹھائی اور اپنی کار کی طرف چل دیا۔ اس کی ماں نے کہا تھا کہ وہ کند ذہن اور بدصورت ہے مگر یہ چوبیس سالہ لڑکی بڑی مہارت سے جھوٹ بول رہی تھی۔ اگر میں نے اس سے چینک کے بارے میں سوال نہ کیا ہوتا تو جو کچھ اس نے کہا تھا، اس پر سو فیصد یقین کر لیتا۔ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے میں نے سوچا اب وہ کیا کرے گی؟ کیا اپنے بھائی کو ہوشیار کر دے گی یا چینک کو بتا دے گی؟ یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ نہ کرے۔

☆☆☆

میں آفس میں داخل ہوا تو اینڈرسن ٹائپ رائٹر کھڑکھڑا رہا تھا۔ میں نے اسے انجیلا سے اپنے انٹرویو کے بارے میں بتایا اور آخر میں کہا۔

''وہ بڑی خوب صورتی سے جھوٹ بولتی ہے۔ اس کے اعصاب بڑے مضبوط ہیں۔ جسمانی کشش سے بھرپور ہے۔ ظاہر کرتی ہے کہ اسے اپنے بھائی کے بارے میں کچھ پتا نہیں... اور بہت روکھے لہجے میں جواب دیتی ہے کہ اس نے مدتوں سے چینک کو نہیں دیکھا۔''

''میں اب بھی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم اس کے بھائی کو کیوں تلاش کرنا چاہتے ہو؟'' اینڈرسن نے کہا۔ ''مجھے تو اس کیس میں چینک سب سے زیادہ مشتبہ لگتا ہے۔''

''ممکن ہے، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن میرا دل کہتا ہے کہ میری اس مسئلے کی چابی ہے۔ خیر، اسے چھوڑو... آؤ اپنی اپنی رپورٹ تیار کر لیں۔'' میں بھی اپنا ٹائپ رائٹر سامنے گھسیٹ کر رپورٹ ٹائپ کرنے لگا۔

ہم رپورٹ ٹائپ کر کے فارغ ہوئے تو سات بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' اینڈرسن نے پوچھا۔

''ہم پہلے کھانا کھائیں گے، اس کے بعد میں چینک سے بات کرنے جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' اینڈرسن نے کہا۔

میں نے اپنی میز کی نچلی دراز کھول کر اعشاریہ تین آٹھ بور کا ریوالور نکالا۔ کھول کر چیک کیا اور اپنی پتلون کی پیٹی میں اڑس لیا۔

''اپنا ریوالور بھی لے لو۔'' میں نے کہا۔ ''ہم کسی مصیبت سے دوچار ہو سکتے ہیں۔''

اس نے اپنی میز کی دراز کھولی اور انگلیوں میں پہننے والے دو جستی کے پنجے نکالے۔ انہیں انگلیوں میں چڑھایا اور بڑی پسندیدگی سے انہیں دیکھا۔

''اگر تمہارے پاس ریوالور ہے تو مجھے ریوالور کی ضرورت نہیں ہے۔''

''یہ غیر قانونی چیز ہے۔'' میں نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، یہ غیر قانونی ہیں۔'' اینڈرسن نے پنجے

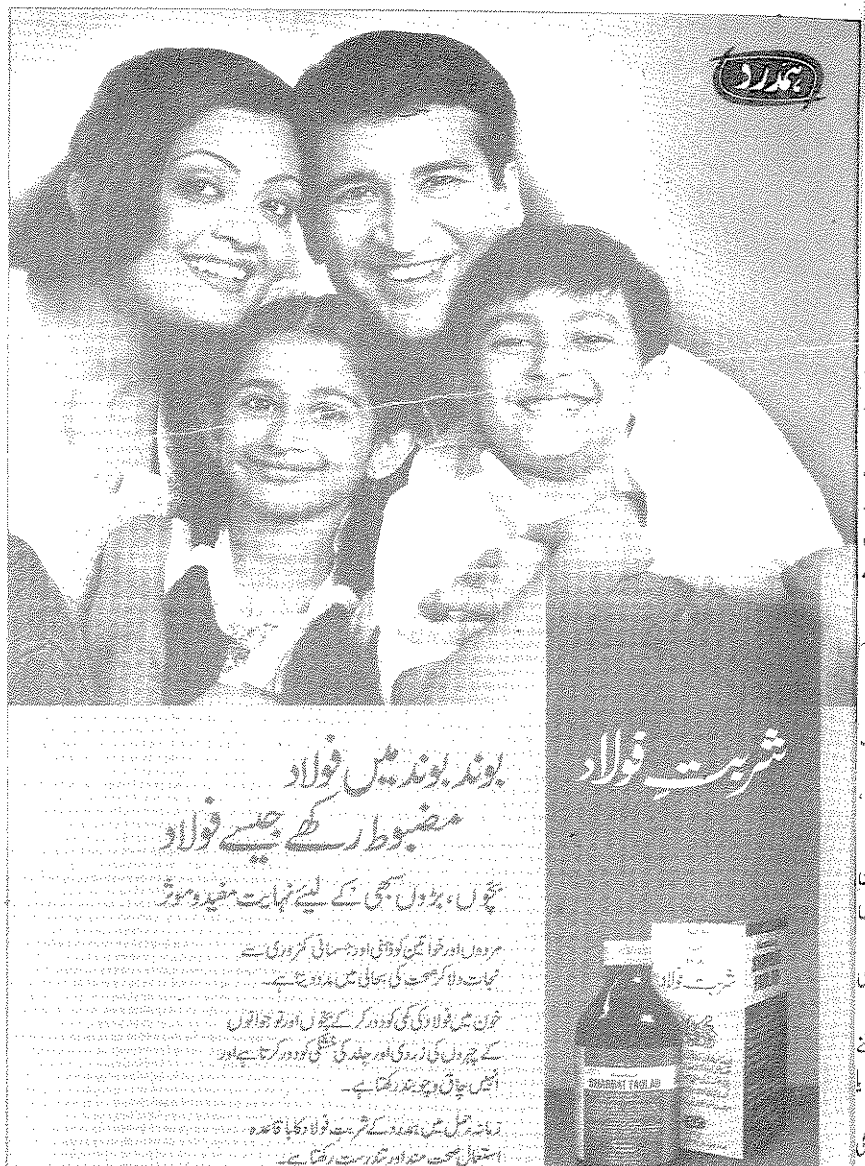

www.kahopakistan.com

اتار کر جیب میں رکھ لیے۔ ''لیکن کسی سیاہ فام سے آمنا سامنا ہونے پر بہترین ہتھیار ثابت ہوتے ہیں۔''

میں کندھے اچکا کر خاموش ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا ایک پنچ خنجر کو سلا سکتا ہے اور اگر یہ پنجہ بھی انگلیوں پر چڑھا ہو تب تو ہاتھی کے اوسان بھی خطا ہو جائیں گے۔

''مجھے ایک فون کرنا ہے، اس کے بعد ہم روانہ ہو جائیں گے۔'' میں نے کہا اور بیلی ویو ہوٹل کا نمبر ڈائل کیا۔ خوش قسمتی سے سوزی سے بات ہو گئی۔

''بس ایک بات کہنا ہے۔'' میں بولا۔ ''دیوار پر رنگ اور دروازے میں نئے قفل لگوانے کا شکریہ۔ تم بہت اچھی ہو۔''

''اس طرح ہم دو ہو گئے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مصیبت سے دور رہنا۔ اگلے بدھ کو ملاقات ہوگی۔'' اور اس نے ریسیور رکھ دیا۔

میں اور اینڈرسن باہر نکلے۔ بوندا باندی اب بھی ہو رہی تھی۔ پہلے ہم نے لوسینو ریسٹورنٹ جا کر کھانا کھایا، میں اکثر یہاں آتا تھا۔ ریسٹورنٹ کے مالک لوسینو سے خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ اس نے ہمیں اس دن کا اسپیشل کھانا کھلایا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو سوا آٹھ بجے تھے۔ بلیک کیسٹ کی سرگرمیاں شروع ہونے میں ابھی دیر تھی۔ ہم ساحلی علاقے میں پہنچے۔ کار پارک کی اور پیدل کلب کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ یہ کافی بڑا کمرا تھا۔ چھوٹی چھوٹی میزیں پڑی تھیں۔ درمیان میں فرش کو پالش کر کے ڈانس فلور بنا دیا گیا تھا۔ فضا میں منشیات کے دھوئیں کی بو پھیلی ہوئی تھی... جیسا کہ میرا خیال تھا کہ ابھی بہت کم لوگ آئے تھے۔ ایک جانب چبوترے پر تین آدمیوں کا بینڈ کوئی دھن بجا رہا تھا۔ ہمارے اندر قدم رکھتے ہی خاموشی چھا گئی۔ ایک قوی ہیکل نیگرو نے آگے بڑھ کر ہمارا راستہ روک لیا۔

''کیا تمہیں پڑھنا نہیں آتا؟'' اس نے کہا۔

''مجھے ہینک سے بات کرنی ہے۔'' میں بولا اور اپنا تعارفی کارڈ نکالا۔ ''اور اگر تمہیں پڑھنا آتا ہے تو اسے پڑھ لو۔''

''کیا تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟'' اس نے کارڈ دیکھ کر پوچھا۔

''یہ کارڈ ہینک کو دو اور اس سے کہو مجھے اس سے بات کرنی ہے۔''

وہ کارڈ لے کر ایک دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔

کمرے میں بیٹھے سیاہ فام ہمیں گھور رہے تھے۔ غالباً وہ ہمیں پولیس کا آدمی سمجھ رہے تھے۔ میں نے انتظار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اینڈرسن کو ساتھ لے کر اسی دروازے کی طرف چل دیا جہاں وہ نیگرو گیا تھا۔ دروازے کے دوسری جانب ایک کوریڈور تھا۔ سامنے ایک اور دروازہ تھا۔ اچانک وہ دروازہ کھلا اور ہینک اسمڈ لے باہر نکلا۔ اینڈرسن نے اگرچہ اس کا حلیہ مجھے بتایا تھا مگر اسے اپنے سامنے دیکھنے سے پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنا لمبا چوڑا اور تنومند ہوگا۔ اس کا قد کم سے کم چھ فٹ سات انچ تھا۔ اس کے کندھوں کی چوڑائی غیر معمولی تھی۔ جسم کے مقابلے میں اس کا سر کافی چھوٹا تھا۔ بدصورت چہرہ، پھیلی ناک، موٹے ہونٹ اور سرخ آنکھیں۔ وہ کسی خوفناک فلم کا کردار نظر آ رہا تھا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' وہ غرایا۔

''مسٹر ہینک اسمڈ لے۔'' میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

اور اس غیر متوقع تخاطب نے اسے چونکا دیا۔ شاید اب تک کسی گورے آدمی نے اسے مسٹر نہیں کہا تھا۔

''ہاں، کیا چاہتے ہو؟'' اس مرتبہ آواز میں وہ غراہٹ نہیں تھی۔

''میں ایکمی ڈیٹیکٹو ایجنسی سے آیا ہوں مسٹر ہینک!'' میں نے کہا۔ ''اور مجھے امید ہے کہ تم میری مدد کر سکتے ہو۔''

''مدد... میں کسی گورے آدمی کی مدد نہیں کرتا۔ الٹے قدم لوٹ جاؤ۔''

''گورے آدمی اور کالے آدمی کی بات مت کرو۔ میرا نام ویلیس ہے اور تمہارا ہینک۔ ہم ایک دوسرے کو نام سے مخاطب کریں گے۔ اسی طرح شاید ہم کوئی مہذب گفتگو کر سکیں۔''

وہ گفتگو کے اس انداز کا عادی نہیں تھا اس لیے اس کے رویے سے ہچکچاہٹ ظاہر تھی۔

''میں ٹیری زینگلر کو تلاش کر رہا ہوں۔'' میں نے بات جاری رکھی۔ ''تم اس کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟''

اس کا فوری ردعمل ہوا۔ اس نے کچھ آگے جھک کر مجھے غور سے دیکھا۔ وہ اس وقت بالکل کنگ کانگ معلوم ہو رہا تھا۔

''تم اسے کیوں تلاش کر رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اس نیگرو کی طرف دیکھا جسے کارڈ دیا تھا۔

''اپنے آدمی سے کہو باہر جائے۔'' میں نے کہا۔ ''میں جو کچھ کہنے والا ہوں، اس کا پوشیدہ رہنا ضروری ہے۔''

ہینک نے نیگرو کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ میرے قریب سے گزرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

''مجھے اس لیے ٹیری کی تلاش ہے کیونکہ کسی نے اس کے نام ایک بڑی رقم چھوڑی ہے۔''

''کتنی رقم؟'' ہینک نے دلچسپی سے پوچھا۔

''یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر ایک لاکھ ڈالرز سے زیادہ ہے۔''

''ایک لاکھ ڈالرز۔'' ہینک نے حیرت سے دہرایا۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے دولت سے گہری دلچسپی تھی۔

''مجھے یہی بتایا گیا ہے۔ تم بتاؤ کہ ٹیری مجھے کہاں مل سکتا ہے؟''

''اگر وہ تمہیں مل جائے تو کیا ہوگا؟'' ہینک نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

''میں اسے بینک لے جاؤں گا۔ وہ کچھ کاغذات پر دستخط کرے گا اور اسے رقم مل جائے گی۔''

''مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔'' ہینک نے جواب دیا۔ ''مگر ممکن ہے میں اسے تلاش کر لوں۔ میں معلوم کروں گا۔ وہ یہاں بھی ہو سکتا ہے اور کہیں اور بھی۔''

مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے مگر یہ صبر اور انتظار کا کھیل تھا۔

''اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میرا کارڈ اپنے پاس رکھو، ٹیری سے رابطہ قائم ہو جائے اور وہ رقم لینے کا خواہش مند ہو تو مجھے فون کر دینا۔''

''اچھا۔'' ہینک نے کہا اور نگاہ اٹھا کر میرے پیچھے دیکھا اور شاید پہلی مرتبہ اینڈرسن کی موجودگی سے آگاہ ہوا۔

''یہ کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا باڈی گارڈ۔'' میں نے جواب دیا۔ ''جب میں کسی ایسی ویسی جگہ جاتا ہوں تو اسے ساتھ لے لیتا ہوں۔''

میں اور اینڈرسن ساحلی علاقے سے واپس لوٹے تو اس نے پوچھا۔

''اب اگلا قدم کیا ہے؟''

''ہم گھر جائیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ ٹیری اس کیس کا بنیادی سراغ ہے۔ میں نے دو جگہ چارا ڈالا ہے۔ انجیلا اور ہینک اب جانتے ہیں کہ ٹیری ایک لاکھ ڈالرز کی قیمت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں اس کا پتا معلوم ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک اسے لاکھ ڈالرز کے بارے میں بتائے گا اور اسے رقم حاصل کرنے کے لیے سامنے آنا پڑے گا۔''

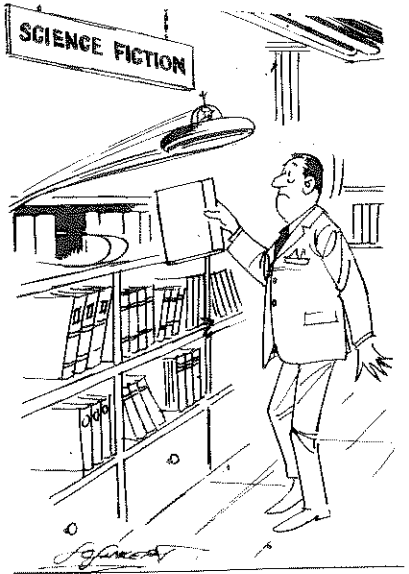

سائنس فکشن... ارے باپ رے... یہ فکشن تو کتاب چھوتے ہی شروع ہو گیا!

''فرض کرو، انہیں اس کا پتا معلوم نہ ہو تب؟'' اینڈرسن نے سوال کیا۔

''بہر حال، دیکھتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اب کل صبح آفس میں ملیں گے۔''

میں نے اسے اس کے گھر کے قریب اتار دیا اور خود بیلی ویو ہوٹل پہنچا۔ سوزی نے مجھے بڑی میٹھی مسکراہٹ سے دیکھا۔ وہ حسب معمول استقبالیہ کاؤنٹر پر مصروف تھی۔

''آج رات کسی وقت میرے ساتھ باہر چل سکتی ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''آج کی رات تو ناممکن ہے۔'' سوزی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے تین بجے سے پہلے چھٹی نہیں ملے گی اور اس وقت تھکن سے برا حال ہوگا۔ صبر سے کام لو ڈیئر۔ ہم حسب معمول بدھ کو ملیں گے۔''

میں اپنے گھر واپس آ گیا۔ ٹی وی پر کوئی اچھا پروگرام نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ میں سونے لیٹ گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح آفس میں... میں اور اینڈرسن باتیں کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔

''ویلیس!'' ایک بھاری آواز ابھری۔ میں نے

www.kahopakistan.com

اسے پہچان لیا۔ یہ ہینک کی آواز تھی۔

''ہیلو ہینک۔'' میں نے اینڈرسن کو اشارہ کیا کہ اپنے ایکسٹینشن کا ریسیور اٹھا کر وہ بھی ہماری گفتگو سنے۔ ''کیا تمہارے پاس میرے لیے کوئی خبر ہے؟''

''ہاں، میں نے اسے تلاش کر لیا ہے اور وہ رقم مانگ رہا ہے۔''

''وہ تمہیں کہاں ملا؟'' میں نے پوچھا۔ ہینک نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا۔

''اس بات کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ اسے رقم کب ملے گی؟''

''کوئی مشکل نہیں ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''بندوبست کر کے تمہیں فون کر دوں گا۔''

''بندوبست کرنے سے کیا مطلب ہے؟''

''مجھے بینک سے رابطہ قائم کر کے مسٹر آکلینڈ سے ملاقات کا وقت لینا ہوگا۔ انہیں شناختی کارروائی کی ضرورت ہوگی۔ وہ فارم تیار کرنا پڑیں گے جن پر ٹیری دستخط کرے گا۔ ان کاموں کے لیے وقت چاہیے مگر فکر کی بات نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہیں بعد میں فون کروں گا۔'' اور یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

''مجھے فریب کی بو آ رہی ہے۔'' اینڈرسن نے کہا۔

''ہو سکتا ہے۔ اب سنو، تمہیں کیا کرنا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ڈیڈ اینڈ کلب کے مالک ہیری رچ سے ملو اور کہو کہ کیا وہ بینک میں ٹیری کو شناخت کرنے پر آمادہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ضرور آئے گا تاکہ ٹیری سے مل سکے۔ تم یہ کام کرو، میں آکلینڈ سے بات کرتا ہوں۔''

بیس منٹ بعد میں آکلینڈ کے آفس میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا اور ہاتھ ملایا۔

''تحقیقات کیسی چل رہی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے مناسب جواب دیا پھر پوچھا۔

''مجھے معلوم ہوا کہ آپ کے بینک میں ایک لاکھ ڈالرز جمع ہیں جن کا حق دار ٹیرانس تھورسن یا ٹیری زینگلر ہے۔ یہ رقم اس کے لیے بیکرز بلڈنگ میں رہنے والی ایک عورت مسز ہنکس نے چھوڑی ہے۔''

''درست ہے۔'' آکلینڈ نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''مگر میں کچھ سمجھا نہیں۔ مسز ہنکس کی جائداد کے سلسلے میں تو ایک وکیل جس کا نام مسٹر لیوس ہے، مکمل درآمد کا ذمے دار ہے اور جب تک وہ ٹیری کو تلاش نہ کر لے، رقم بینک میں ہی رہے گی۔ جو بات میری سمجھ میں نہیں آئی، وہ یہ ہے کہ اس کا تمہاری تحقیقات سے کیا تعلق؟''

''مجھے امید ہے کہ ٹیری اس کیس کے سلسلے میں بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے دوستوں نے اس تک یہ خبر پہنچائی ہے کہ وہ ایک بڑی رقم کا مالک بن سکتا ہے اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خبر سن کر وہ ظاہر ہو گیا ہے۔ اب تک اس کا کوئی پتا نہیں تھا لیکن ایک لاکھ ڈالرز نے اسے سامنے آنے پر اکسایا ہے۔''

''بڑی غیر معمولی بات ہے۔'' آکلینڈ بڑبڑایا۔

''کیا آپ نے کبھی ٹیری کو دیکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، اس سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔''

''تو اگر ایک آدمی آپ کے دفتر میں آ کر دعویٰ کرے کہ وہ ٹیری تھورسن ہے اور ایک لاکھ ڈالرز اس کے حوالے کیے جائیں تو کیا آپ پہچان لیں گے کہ وہ ٹیری ہے یا نہیں؟'' میں نے پوچھا۔ آکلینڈ نے نفی میں سر ہلایا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ کوئی فرضی ٹیری بن کر آ سکتا ہے؟''

''ایک لاکھ ڈالرز کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔''

''بلاشبہ مجھے شناختی کارروائی کرنے کی ضرورت ہوگی۔''

''میرا خیال ہے کہ بہترین شناختی کارروائی یہ ہو سکتی ہے کہ آپ مس انجیلا کو بینک بلائیں۔ اگر وہ اپنے بھائی کو شناخت کر لے تو پھر کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔''

''بہت ہی اچھا خیال ہے مسٹر ویلیس۔'' آکلینڈ خوش ہو کر بولا۔

''کیا یہ کام آج سہ پہر ہو سکتا ہے؟''

''ہاں، کیوں نہیں۔ تین بجے کا وقت مناسب رہے گا۔''

''تو پھر مس انجیلا کو فون کر کے معلوم کریں کہ وہ آ سکتی ہے یا نہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنے بھائی سے مل کر خوش ہو گی۔''

آکلینڈ نے آپریٹر سے انجیلا کو فون کرنے کے لیے کہا اور رابطہ قائم ہونے پر بولا۔

''ہیلو مس انجیلا! میں آکلینڈ بات کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ تم یہ بات جانتی ہو یا نہیں کہ تمہارے بھائی ٹیری کے لیے ایک خاتون نے ایک لاکھ ڈالرز کی رقم چھوڑی ہے۔'' اس نے کچھ دیر دوسری طرف ہونے والی بات سنی۔ ''ہاں، اس سلسلے میں مسٹر ویلیس نے بہت مدد کی ہے۔

میرے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ جو شخص اس رقم کا دعویٰ کر رہا ہے وہ تمہارا بھائی ہے یا نہیں۔ چونکہ میں کبھی ٹیری سے نہیں ملا اس لیے شناخت کی کارروائی ہونا ضروری ہے۔ اگر تم آج سہ پہر تین بجے آ کر اسے شناخت کر لو تو اچھا ہے۔'' اس نے پھر دوسری طرف کی بات سنی۔ ''ہاں، میں جانتا ہوں کہ تم نے طویل مدت سے اپنے بھائی کو نہیں دیکھا مگر پہچان تو سکتی ہو۔ ظاہر ہے تمہیں اس سے مل کر خوشی ہوگی۔ تو پھر میں تین بجے تمہارا انتظار کروں گا۔ بہت بہت شکریہ مس انجیلا۔'' اور اس نے ریسیور رکھ دیا۔

''مس انجیلا نے کہا ہے، وہ ضرور آئے گی۔'' اس نے مجھے بتایا۔

مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ آکلینڈ، انجیلا کو اتنا نہیں جانتا تھا جتنا کہ میں۔

''بڑی خوشی کی بات ہے۔'' میں کھڑا ہو گیا۔ ''پھر میں بھی تین بجے پہنچ جاؤں گا۔''

☆☆☆

میں دو بج کر پینتالیس منٹ پر پیسیفک اینڈ نیشنل بینک میں داخل ہوا۔ مس کرچ کو اپنی دوستانہ مسکراہٹ سے نوازا جو اسی طرح اچھل کر واپس آ گئی جیسے گولف کی بال کسی دیوار سے لگ کر واپس آتی ہے۔

''مسٹر آکلینڈ مصروف ہیں۔'' وہ بولی۔

''او کے... انہیں صرف میرے آنے کی اطلاع کر دو۔'' میں نے کہا اور لاؤنج میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ لنچ میں نے اور اینڈرسن نے ایک ساتھ کیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ نہ صرف ہیری رچ سے ملا تھا بلکہ اس کی استقبالیہ کلرک مس لیزا سے بھی بات کی تھی جو ٹیری کے غائب ہونے کے وقت اس کی گرل فرینڈ تھی۔ ہیری، ٹیری کو دوبارہ اپنے کلب میں پیانو بجانے پر آمادہ کرنا چاہتا ہے اس لیے وہ ضرور آئے گا۔ لیزا، ٹیری کے فراق میں بے چین ہے اس لیے اس کا آنا بھی لازمی ہے۔ میں نے اینڈرسن سے کہا کہ وہ ان دونوں کو ٹھیک سوا تین بجے لے کر آئے، اس سے پہلے ہرگز نہیں۔ میں انہیں ایک سرپرائز کے طور پر ٹیری کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ وہ بالکل ایسا ہی کرے گا۔ دس منٹ بعد مس کرچ نے مجھے بتایا کہ مسٹر آکلینڈ فارغ ہو چکے ہیں۔ میں ان سے مل سکتا ہوں۔

آکلینڈ نے بتایا کہ اس نے ضروری کاغذات تیار کرا لیے ہیں۔ وہ وکیل لیوس سے بھی بات کر چکا تھا۔ اب صرف اتنا ہی کرنا باقی رہ گیا تھا کہ ٹیری کی شناخت ہو جائے تو رقم اس

کیا آپ

لبوب مُقوّی اعصاب

کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مقوّی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی یونانی دواخانہ)

ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

www.kahopakistan.com

کے سپرد کردی جائے گی۔ ٹھیک تین بجے آکلینڈ کی میز پر رکھے ایک فون کی گھنٹی بجی۔ مس کرچ نے بتایا کہ ٹیری آگیا ہے۔ آکلینڈ نے جواب دیا کہ اسے اندر بھیج دیا جائے۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔ ایک آدمی جس کی عمر لگ بھگ پچیس سال معلوم ہوتی تھی، اندر داخل ہوا۔ اس نے سفید قمیص اور سیاہ پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے بال اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ کندھوں تک آرہے تھے۔ جسم دبلا پتلا تھا۔ چہرہ لمبوترا اور چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھیں جو بڑی مشکوک نظر آرہی تھیں۔ آکلینڈ نے کرسی سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔

”میرانس تھورسن؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس آدمی نے کہا اور میری طرف دیکھا۔

”یہ کون ہے؟“

”میں تمہارے مفاد کی نمائندگی کر رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرا نام ویلیس ہے۔ میں وکیل سولی لیوس کے ساتھ مل کر تمہیں تلاش کر رہا تھا۔ لیوس، مسز اینکس کی وصیت پر عمل درآمد کرانے کا ذمے دار ہے۔“

”اچھا، اب جلدی کرو۔“ اس نے آکلینڈ کی طرف دیکھا۔ ”رقم کہاں ہے؟“

”اصولی طور پر رقم تمہارے حوالے کرنے سے پہلے مجھے تمہاری شناخت درکار ہوگی۔“ آکلینڈ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اس آدمی نے ترش لہجے میں پوچھا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ مسز کرچ نے انجیلا کی آمد سے مطلع کیا۔

”تمہاری بہن آگئی ہے۔“ آکلینڈ نے اس شخص سے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ تم اس سے دوبارہ مل کر خوش ہوگے۔“

دروازہ کھلا اور انجیلا اندر داخل ہوئی۔ اس نے دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ قدرے رک کر وہ سیدھی اس آدمی کی طرف بڑھی جو میرانس تھورسن ہونے کا مدعی تھا۔

”ٹیری!“ وہ پرجوش لہجے میں بولی۔ ”تم سے اتنی مدت کے بعد مل کر بڑی مسرت ہوئی۔“

”اچھا۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”مگر ہم بعد میں بات کریں گے۔ پہلے مجھے رقم چاہیے۔“

”ضرور ٹیری۔“ انجیلا نے سر ہلایا اور آکلینڈ سے مخاطب ہوئی۔ ”یہ میرا بھائی ہے۔ پلیز اسے ادائیگی کردیں۔ مجھے اس سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“

”ضرور مس انجیلا... تو تم اسے شناخت کر رہی ہو؟“

”ابھی میں نے اسے اپنا بھائی کہا یا نہیں؟“ انجیلا کا لہجہ سخت تھا۔ ”ذرا جلدی کرو۔ مجھے اپنے بھائی سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“

آکلینڈ نے اپنی میز سے کچھ کاغذات اٹھا کر اس آدمی کی طرف بڑھائے اور کہا۔

”ان کاغذات پر دستخط کردو۔ میں رقم کی فوری ادائیگی کا انتظام کرتا ہوں۔ تمہیں رقم کس صورت میں چاہیے؟“

”نقدی کی صورت میں۔“ اس آدمی نے آکلینڈ کے ہاتھ سے قلم جھپٹ کر کاغذات پر دستخط کردیے۔

جب وہ دستخط کر رہا تھا تو میں نے دروازے پر جا کر باہر دیکھا۔ اینڈرسن ایک مرد اور ایک عورت کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں نے اینڈرسن کو اشارہ کیا کہ وہ ہیری کو آنے دے اور لیزا کو ذرا روک لے۔ ہیری اندر آیا۔ آکلینڈ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”یہ کون صاحب ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ مسٹر ہیری رچ ہیں اور ایک نائٹ کلب کے مالک ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ٹیری ان کے کلب میں پیانو بجاتا رہا ہے۔ اس وقت اس نے اپنا نام ٹیری زینگر رکھ لیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اچھا ہوگا، مسٹر ہیری بھی ٹیری کو شناخت کرلیں۔“

”مگر مس انجیلا پہلے ہی اسے شناخت کرچکی ہے۔“ آکلینڈ نے الجھتے ہوئے کہا۔ میں نے ہیری کی طرف دیکھا۔

”کیا یہ آدمی ٹیری زینگر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

ہیری نے لمبے بالوں والے آدمی کو گھور کر دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

”اس نے کپڑے بے شک ٹیری کی طرح پہن رکھے ہیں مگر یہ ٹیری نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا یہ کون ہے مگر ٹیری بہرحال نہیں ہے۔“

”تمہیں یقین ہے؟“

”بے شک مجھے یقین ہے۔ ٹیری میرے کلب میں مہینوں پیانو بجاتا رہا ہے۔ میں ہر ہفتے اس کے ہاتھ پر اس کا معاوضہ رکھتا رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ تم کیا کرنے کی کوشش کر رہے ہو مگر میرا وقت ضائع ضرور کر رہے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

آکلینڈ کو اپنی حیرت پر قابو پانے کا موقع دیے بغیر میں نے دروازے سے جھانکا اور اینڈرسن کو اشارہ کیا اور لیزا فوراً ہی اندر آگئی۔

”یہ مس لیزا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ ٹیری زینگر کے ساتھ رہتی تھی۔“

لیزا، ٹیری سے ملنے کے جوش میں آگے بڑھی مگر لمبے بالوں والے آدمی کو دیکھ کر ایک دم رک گئی۔

”یہ احمق ہرگز ٹیری نہیں ہے۔“ وہ بولی۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، مہینوں ٹیری کے ساتھ رہنے کے باوجود میں اسے دوبارہ دیکھوں گی تو نہیں پہچان سکوں گی؟“

”تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ یہ شخص ٹیری زینگر نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، کیا میں ایسے جنگلی کے ساتھ رہ سکتی ہوں۔“ لیزا کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”اوہ خدا... میں نے تو سوچا تھا کہ میں ایک مدت بعد ٹیری سے ملنے جارہی ہوں۔“ اور وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ اینڈرسن اسے تسلی دیتے ہوئے باہر لے گیا۔

آفس میں گہری خاموشی طاری تھی۔ میں نے اس آدمی کی طرف دیکھا جو خود کو ٹیری بتا رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں نظر آرہی تھیں۔ میں نے انجیلا کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ساکت کھڑی تھی۔ میں نے آکلینڈ کی جانب دیکھا۔ وہ بے جان سا ہو کر کرسی پر بیٹھا تھا۔ جیسا کہ مجھے توقع تھی سب سے پہلے انجیلا نے خود پر قابو پایا۔

”مسٹر آکلینڈ!“ اس نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ یہ آدمی میرا بھائی ہے۔ کیا تم ایک تھرڈ کلاس نائٹ کلب کے مالک اور ایک آوارہ لڑکی کے الفاظ کو میری بات سے زیادہ اہمیت دے رہے ہو؟“ شاباش... میں نے اپنے دل میں کہا۔

”ہرگز نہیں۔“ آکلینڈ نے جلدی سے کہا۔ ”ضرور کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔“

”کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔“ انجیلا نے سخت لہجے میں کہا۔ وہ دو افراد نہیں چاہتے کہ ٹیری کو اس کا حق ملے۔ وہ دانستہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ پلیز! میرے بھائی کو رقم کی ادائیگی کا انتظام کریں۔“

”مس انجیلا۔“ میں متذبذب آکلینڈ کی مدد کو آگے بڑھا۔ ”مسٹر آکلینڈ کو اس رقم کی ادائیگی کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ میں وکیل لیوس کی نمائندگی کر رہا ہوں جو کہ مسز اینکس کی وصیت پر عمل درآمد کا ذمے دار ہے اور میں مطمئن نہیں ہوں۔ تم کہتی ہو کہ یہ آدمی تمہارا بھائی ہے۔ دو افراد جو تمہارے بھائی کو اچھی طرح جانتے ہیں، کہہ رہے ہیں کہ یہ ٹیری نہیں ہے۔ مسٹر آکلینڈ کو ایک لاکھ ڈالرز ادا کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی جب تک میں مطمئن نہ ہوجاؤں کہ یہ آدمی واقعی تمہارا بھائی ہے۔“

وہ میری طرف گھومی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنا چشمہ اتار لے جس نے اس کے چہرے کا بیشتر حصہ چھپا رکھا تھا تاکہ میں اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات دیکھ سکوں۔ یہ تو یقینی بات تھی کہ وہ بے حد غصے میں ہے۔

”میں مطالبہ کرتی ہوں کہ میرے بھائی کو رقم ادا کی جائے۔“ وہ نفرت زدہ لہجے میں بولی۔

”شناخت کوئی مشکل بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”سڑک کے دوسری جانب ایڈن کلب ہے۔ ہم وہاں چلتے ہیں۔ کلب کا مالک میرا دوست ہے، میں اسے آمادہ کرلوں گا۔ اس آدمی کو صرف اتنا ہی کرنا پڑے گا کہ وہاں پیانو بجا کر دکھائے۔ اگر یہ اتنا ہی اچھا پیانو بجا سکتا ہے جتنا ٹیری بجاتا تھا، تب اسے رقم مل جائے گی۔ اس سے زیادہ انصاف کی بات کیا ہوگی؟“

وہ آدمی جو خود کو ٹیری کہہ رہا تھا، اچانک جیسے اپنے لباس میں سکڑ گیا۔

”میں نے اس حبشی سے کہا تھا کہ یہ چار سو بیسی نہیں چل سکتی۔“ وہ بولا۔ ”اور چڑیل کی بچی... تمہیں بھی بتا دیا تھا۔“

اتنا کہہ کر وہ مجھے ایک طرف ہٹاتے ہوئے... آفس سے نکل گیا۔

”یہ معاملہ تو طے پا گیا۔“ میں نے آکلینڈ سے کہا۔ ”اگر... ٹیری مل گیا تو میں تمہیں آگاہ کردوں گا۔“

میں نے انجیلا کی طرف دیکھا جو کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔

”اچھی کوشش تھی مس انجیلا... مگر اتنی اچھی نہیں کہ کامیاب ہوجاتی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں تمہیں اس کی سزا دوں گی۔“ اس نے مجھے گھورا۔ ”ایسی سزا جسے تم ساری زندگی یاد رکھوگے۔“

”ذرا سمجھنے کی کوشش کرو۔“ میں نرمی سے بولا۔ ”دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔“

میں آکلینڈ کو انجیلا سے نمٹنے کے لیے چھوڑ کر آفس سے باہر چلا گیا۔ مجھے امید تھی کہ اینڈرسن میرا انتظار کر رہا ہوگا مگر وہ موجود نہیں تھا۔ میری کار بھی غائب تھی۔ میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور آفس چل دیا۔ مجھے تھورسن کی فائل میں لگانے کے لیے کافی دلچسپ رپورٹ ٹائپ کرنا تھی۔

☆☆☆

اینڈرسن آفس میں بھی نہیں تھا۔ میں نے وکیل سولی

www.kahopakistan.com

لیوس کو فون کیا۔ اسے بینک میں ہونے والے واقعے کے بارے میں بتایا۔ اسے حیرت ہوئی کہ انجیلا نے ایک اجنبی کو اپنا بھائی کیوں بتایا۔

''میں نے آکلینڈ سے کہہ دیا ہے کہ اسے اس وقت تک رقم کی ادائیگی کا اختیار نہیں ہے جب تک تم مطمئن نہ ہو جاؤ کہ رقم کا دعوے دار واقعی تیری رینگر ہے۔'' میں نے آخر میں کہا۔ ''اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر تیری مر جائے یا کبھی تلاش نہ کیا جا سکے تو یہ رقم کسے ملے گی؟''

''مسز اسٹلس نے رقم اس کے نام چھوڑی ہے۔ اگر تیری مر جائے یا ہم اسے تلاش نہ کر سکیں تو یہ رقم نزدیک ترین رشتے دار کو ملے گی۔''

''اس کی ماں کو یا اس کی بہن کو؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کی ماں کو۔''

''او کے لیوس! میں تمہیں صورتِ حال سے آگاہ کرتا رہوں گا۔ بہتر ہوگا کہ تم بھی آکلینڈ کو فون کر کے کہہ دو کہ رقم تب تک ادا نہیں کی جائے گی جب تک تم دعوے دار کے بارے میں مطمئن نہ ہو جاؤ۔''

''ٹھیک ہے، میں ابھی فون کر دوں گا۔'' لیوس نے جواب دیا۔

اس وقت سوا چار بج چکے تھے، میں سوچ رہا تھا کہ اینڈرسن کہاں چلا گیا۔ میں نئی صورتِ حال پر اس سے تبادلہ خیال کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنی رپورٹ ٹائپ کرنے لگا۔ رپورٹ ختم کی ہی تھی کہ اینڈرسن آ گیا۔ تب چھ بج کر چالیس منٹ ہو رہے تھے۔

''کہاں چلے گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے کچھ پلاؤ پھر بتاؤں گا کہ کہاں گیا تھا۔'' اینڈرسن نے کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

میں نے بوتل نکال کر دو گلاسوں میں وسکی انڈیلی۔ ایک گلاس اسے دیا، ایک خود لیا۔

''اب بتاؤ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ آدمی جو خود کو تیری کا بھائی کہہ رہا تھا، بینک سے نکلا۔'' اینڈرسن نے جواب دیا۔ ''تو میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ بہت غصے میں تھا۔ وہ ایک ہنڈا موٹر سائیکل پر بیٹھ کر چل دیا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا۔ اس کا رخ ساحلِ سمندر کی طرف تھا اور میرا اندازہ تھا کہ وہ بلیک کیسٹ کلب جا رہا ہے مگر میرا اندازہ غلط نکلا۔ وہ کلب سے آگے نکلتا چلا گیا اور پھر اوسٹرالی کی جانب گھوم گیا۔ وہاں تین بلاک ہیں جن میں مچھیرے رہتے ہیں۔ میں نے کار کچھ پیچھے روک لی۔ میں اسے پارک کر کے گلی میں داخل ہوا تو وہ غائب ہو چکا تھا مگر ہنڈا موٹر سائیکل ایک خستہ حال عمارت کے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل کا نمبر نوٹ کر لیا اور پھر کار رجسٹریشن آفس گیا۔ وہاں پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس آدمی کا نام لیو جیرنڈو ہے اور اپارٹمنٹ نمبر 10 اوسٹرالی میں رہتا ہے۔''

اینڈرسن وسکی کا ایک گھونٹ بھرنے کے لیے رکا اور پھر بات جاری رکھی۔

''پھر میں پولیس ہیڈ کوارٹر گیا اور جو ہینگر سے بات کی۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ مجھے جیرنڈو سے کیا دلچسپی ہے۔ میں نے کہا کہ میں صرف معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں اور وہ اس آدمی کے بارے میں کچھ جانتا ہے تو بتا دے۔ ہینگر نے بتایا کہ وہ جیرنڈو سے واقف ہے مگر ابھی تک اس نے پولیس کو دخل اندازی کا موقع نہیں دیا ہے لیکن پولیس اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ اس کا باپ مافیا کے لیے کام کرتا تھا۔ پھر شاید اس سے کوئی غلطی ہو گئی اور اسے بم سے اڑا دیا گیا۔ تب جیرنڈو کی عمر پندرہ سال تھی۔ اس نے ساحلِ سمندر پر محنت مزدوری کر کے اپنی اور ماں کی کفالت کی پھر ماں بھی مر گئی۔ ہینگر، جیرنڈو سے مشکوک تھا مگر اس کے پاس جیرنڈو کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس کے بعد میں ساحلِ سمندر پر گیا اور اپنے کچھ جاننے والوں سے پوچھا مگر ان سے بھی کچھ معلوم نہیں ہوا۔ کوئی یہ نہیں جانتا کہ جیرنڈو کا ذریعہ معاش کیا ہے۔ بس یہ ہے میری تمام رپورٹ۔''

''تم نے اچھا کام کیا۔ اب میں البرٹی سے جا کر پوچھوں گا، شاید اسے کچھ معلوم ہو۔'' میں نے جواب دیا۔

اسی وقت انٹرکام بج اٹھا۔ میں نے بٹن دبایا۔ گلینڈا بول رہی تھی۔ اس نے فوراً تھورسن کی فائل لانے کو کہا۔ میں فائل لے کر گلینڈا کے آفس میں گیا اور فائل اس کی میز پر رکھ دی۔

''کرنل پارکل کل صبح واپس آ رہے ہیں۔'' گلینڈا نے بتایا۔ ''وہ فائل دیکھنا چاہیں گے۔ تحقیقات ختم ہو چکی ہے۔ مسز تھورسن کا فون آیا تھا۔ اس نے کہا کہ اب اسے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں اس لیے تحقیقات روک دی جائیں۔ اب وہ مزید فیس دینے پر آمادہ نہیں ہے۔ اس لیے اب تم اس کیس کو بھول جاؤ۔''

''گویا اب تک اس کیس پر جو کام کیا گیا، وہ ضائع ہو گیا۔'' میں نے قدرے غصے سے کہا۔

''نہیں، میں اسے ضائع ہونا تو نہیں کہہ سکتی۔'' گلینڈا ''مسٹر البرٹی؟ ہم نے مسز تھورسن سے کافی فیس وصول کی ہے۔''

''اور جب کیس میں دلچسپی پیدا ہوئی، کوئی نتیجہ نکلنے کی امید ہوئی تو تحقیقات روک دی گئیں۔'' مجھے بے حد غصہ آ رہا تھا۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔ اب اگلا کام کیا ہوگا؟''

''یہ بات تمہیں کرنل بتائیں گے۔'' گلینڈا نے جواب دیا۔ ''کل ان سے تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔''

میں نے آفس میں جا کر اینڈرسن کو بتایا۔ اسے بھی بہت برا لگا مگر کیا کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت سات بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے۔ ہم نے کھانے کے لیے جانے کا ارادہ کیا۔ تب ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ناگواری سے ریسیور اٹھایا۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ فون کال میری پوری زندگی کو بدل کر رکھ دے گی۔

''کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اوہ ویلیس۔'' ایک کانپتی زنانہ آواز ابھری۔ ''میں بیٹی اسٹوویل بات کر رہی ہوں۔''

''ہیلو بیٹی۔'' میں نے قدرے نرمی سے کہا۔ بیٹی اسٹوویل بیلی ویو ہوٹل میں کام کرنے والی تیسری استقبالیہ کلرک تھی۔ میں اس سے گاہے بگاہے ملتا رہتا تھا۔ اچھی لڑکی تھی۔ خوش مزاج اور گھریلو ٹائپ کی۔

''اوہ ویلیس! مجھے یہ خبر سنانے پر معاف کر دینا مگر کسی کو تو بتانا ہی تھا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔

''کیا سوزی کے بارے میں؟''

''ہاں... سوزی مر چکی ہے۔''

''کیا بک رہی ہو؟'' میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ ''سوزی مر چکی ہے؟''

''ہاں۔'' بیٹی سسکیوں سے رونے لگی۔ میں بے حس و حرکت رہ گیا۔ سوزی جس سے میں محبت کرتا تھا، شادی کرنے والا تھا، وہ مر گئی۔

''کیا ہوا تھا؟'' میں چیخا۔

''مجھ سے مت پوچھو۔ میں نہیں بتا سکتی۔ پولیس سب کچھ جانتی ہے۔'' اور سسکیاں بھرتے ہوئے بیٹی نے ریسیور رکھ دیا۔

میرا ذہن جیسے ماؤف ہو رہا تھا۔ میں نے اینڈرسن کی آواز سنی۔

''مجھے افسوس ہے ویلیس۔'' وہ بولا اور پھر مجھے اکیلا چھوڑ کر آفس سے نکل گیا۔

میں اس کے لیے اس کا ممنون تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری نظریں خلا میں گھور رہی تھیں۔ سوزی اور اس کی

شوہر کو اپنی حسین بیوی سے بس ایک ہی شکایت تھی کہ وہ گھر صاف نہیں رکھتی۔ ہر چیز گرد میں اٹی رہتی۔ شروع شروع میں شوہر کو بیوی کی اس عادت سے سخت تکلیف رہی۔ آخر وہ بھی عادی ہو گیا اور بیوی سے شکایت ترک کر دی۔ ایک دن جب وہ گھر میں داخل ہوا تو خلافِ معمول بیوی نے گھر جھاڑ پونچھ کر خوب صاف کر رکھا تھا۔ جب وہ لکھنے کی میز پر پہنچا تو اس نے سخت شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

''رضوبیہ، میری میز کی گرد کس نے صاف کر دی؟''

بیوی نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''میں نے، کیوں کیا ہوا؟''

شوہر نے کہا۔ ''یہ کیا غضب کر دیا، میں نے اس پر ایک اہم ٹیلی فون نمبر لکھ رکھا تھا۔''

(مرسلہ: رمیش چند بلیر، ہالٹ)

باتیں یاد آ رہی تھیں۔ تب پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ میں اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ جتنا محسوس کرتا تھا۔ کافی دیر میں اسی کیفیت میں مبتلا رہا۔ پھر اپنے آپ کو سنبھالا۔ یہ کیسے ہوا؟ میں نے ریسیور اٹھا کر پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر ڈائل کیا اور جو ہینگر سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ میرا اچھا دوست تھا۔ اس کی آواز ابھری۔ میں نے اپنا نام بتایا اور پوچھا۔

''سوزی لانگ کو کیا ہوا؟''

''اس سے تمہارا کیا واسطہ؟''

''وہ میری گرل فرینڈ تھی۔ میں اس سے شادی کرنے والا تھا۔''

''اوہ خدایا... مجھے یہ سن کر بہت دکھ ہوا۔''

''لیکن ہوا کیا تھا؟''

''آج صبح مس سوزی ہوٹل جانے کے لیے کار میں بیٹھ رہی تھی۔'' ہینگر نے بتایا۔ ''ایک کار قریب آ کر رکی۔ ایک آدمی نے سوزی سے ویسٹ بری ڈرائیور کا پتا پوچھا۔ اس وقت دو بوڑھی عورتیں قریب سے گزر رہی تھیں۔ انہوں نے یہ گفتگو سنی۔ سوزی اس کار کے قریب جا کر راستہ بتانے لگی۔ تب دوسرے آدمی نے جو پچھلی سیٹ پر تھا، اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا۔ اس کے بعد کار تیزی سے روانہ ہو گئی۔ ان دو عورتوں کا بیان ہے کہ سوزی لانگ اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپائے چیختی ہوئی سڑک کی طرف بھاگی اور

www.kahopakistan.com

دوسری سمت سے آتے ہوئے ایک ٹرک سے کچل کر ماری گئی۔''

میں بڑی خاموشی سے سن رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میرے دل و دماغ دونوں سُن ہو گئے ہیں۔ میرے جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے بیگلر دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔

''ہم لوگ اس کیس پر کام کر رہے ہیں مگر ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ دونوں گواہ عورتیں بوڑھی اور بیکار ہیں۔ ان میں سے کوئی کار کا حلیہ نہیں بتا سکتی۔ ایک عورت کا خیال ہے کہ ڈرائیور سیاہ فام تھا لیکن دوسری عورت اس سے اتفاق نہیں کرتی۔ پولیس کے آدمی گردونواح میں رہنے والے ہر فرد سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ ممکن ہے وہ کوئی مفید بات معلوم کر سکیں۔'' میں سوچ رہا تھا کہ ڈرائیور سیاہ فام تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔

''اب وہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شہر کے مردہ خانے میں۔'' بیگلر نے جواب دیا۔

''مگر تم اسے دیکھنے مت جانا۔ بیٹی اسٹوویل نے اور ہوٹل کے اسٹاف منیجر نے لاش کو شناخت کر لیا ہے۔ ہم نے اس کے والد کو اطلاع کر دی ہے اور وہ تدفین کا انتظام کرنے آ رہا ہے۔ تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ تیزاب نے اس کا چہرہ بگاڑ دیا ہے۔ تم اسے نہیں دیکھ سکو گے۔ میرا مشورہ ہے کہ اس معاملے سے الگ ہی رہنا۔''

''شکریہ بیگلر۔'' میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں اپنے تصور میں سوزی کا خوب صورت مسکراتا شگفتہ چہرہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ کوئی ایسا چہرہ نہیں جسے تیزاب نے خوفناک بنا دیا ہو۔ میں نے سوچ لیا کہ تدفین میں بھی نہیں جاؤں گا۔ میں دیر تک سگریٹ پیتا اور سوچتا رہا۔ صدمے کے اثرات کم ہونے لگے اور اس کے بجائے انتقام کی خواہش بیدار ہونے لگی اور آخر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد میں آفس بند کر کے باہر نکلا۔ اپنے گھر پہنچا۔ دروازہ کھولنے آگے بڑھا تو دروازے پر ایک کاغذ چسپاں تھا جس پر لکھا تھا۔

''احمق آدمی... تمہیں خبردار کر دیا گیا تھا۔''

☆☆☆

ساحلی علاقے میں کار پارک کی تو آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ میں نے اپنا بینک بیلنس چیک کیا تھا۔ اکاؤنٹ میں بارہ ہزار ڈالرز موجود تھے۔ میں یہ رقم سوزی سے شادی کے لیے جمع کر رہا تھا کہ اپنا ایک چھوٹا سا گھر خرید لوں گا لیکن اب سوزی نہیں تھی تو گھر بھی باقی نہیں رہا تھا۔ کار پارک کر کے میں نیپچون ٹیوران کی جانب چلا۔ اس وقت ساڑھے نو بجے تھے۔ بار کے کمرے میں کچھ مچھیرے کھانا کھا رہے تھے۔ البرنی ایک مخصوص گوشے میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اور بیئر پی رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''مجھے تمہارے آنے کی توقع تھی۔'' وہ بولا۔ ''کھانا کھاؤ گے؟''

بارمین سام نے بھی بہت اصرار کیا مگر میں نے نرمی سے انکار کر دیا اور البرنی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''تیزاب کی واردات کی خبر عام ہو چکی ہے۔'' البرنی نے افسردگی سے کہا۔ ''اور یقین کرو، یہاں ہر شخص کو بہت افسوس ہے اور مجھے کچھ زیادہ ہی صدمہ ہے۔ میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہوں؟''

سام میرے منع کرنے کے باوجود ایک موٹا سا سینڈوچ لے آیا اور چپکے سے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ اس کی قیمت نہیں لے گا۔ چنانچہ مجھے وہ سینڈوچ نگلنا ہی پڑا۔ کھانے سے فارغ ہو کر البرنی ایک بار پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

''مسٹر ویلیس! تم نے ماضی میں مجھ پر بہت احسانات کیے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''اور میں ان لوگوں کو کبھی نہیں بھولتا جو میرے محسن ہوتے ہیں۔ مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''میں ان بدمعاشوں کو سزا دینا چاہتا ہوں جو اس واردات کے ذمے دار ہیں۔ چنانچہ مجھے معلومات کی ضرورت ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''جب میں نے واردات کا حال سنا تو مجھے یہی خیال ہوا تھا کہ تم خاموش نہیں بیٹھو گے۔ کیسی معلومات چاہتے ہو؟''

''جیرنڈو کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ البرنی چونک گیا۔

''جیرنڈو'' اس نے دہرایا۔ ''تو کیا وہ اس واردات میں ملوث ہے؟''

''ممکن ہے کہ ہو۔ تم اس کے متعلق کیا جانتے ہو؟''

''وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ ویلنسکی کا چچیرا ہے۔ ویلنسکی ایک بڑی لانچ کا مالک ہے اور جب وہ شہر سے باہر ہوتو جیرنڈو لانچ کی حفاظت کرتا ہے۔ اس کا ڈرائیور ہے۔ وہ کچھ دوسرے کام بھی کرتا ہے۔''

''کیا وہ کسی بھی طرح ہینک اسمڈلے سے وابستہ ہے؟''

''ممکن ہے۔ میں نے ان دونوں کو کئی مرتبہ ایک ساتھ دیکھا ہے۔'' البرنی نے جواب دیا۔

www.kahopakistan.com

"اور یہ وِلنسکی کون ہے؟" میں نے پوچھا۔ البرنی چونکا۔

"مسٹر ویلیس! تم میرے لیے پریشانی کھڑی کر رہے ہو۔" البرنی نے جواب دیا۔ "میں وِلنسکی کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہ میری سلامتی کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔" وہ فکر مند نظر آ رہا تھا۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔

البرنی نے سام کو اشارہ کیا اور وہ جلدی سے سانچ کی ایک پلیٹ لے آیا۔ البرنی نے ایک ساتھ تین سانچ اٹھا کر منہ میں بھر لیں اور پھر میری طرف دیکھا۔

"اگر میں وِلنسکی کے بارے میں کچھ کہوں اور اسے پتا چل جائے تو سمندر میں میری لاش اس طرح ملے گی کہ میرا گلا کٹا ہوا ہوگا۔"

"اگر تم کسی کو نہ بتاؤ اور میں بھی اپنی زبان بند رکھوں، تب اسے کیسے معلوم ہوگا... اب بتاؤ وِلنسکی کون ہے؟"

"اوکے مسٹر ویلیس! میں بتاتا ہوں کہ وہ کون ہے اور یہ صرف تمہاری خاطر ہے... کوئی اور آدمی ہوتا تو میں ہرگز کچھ نہیں بتاتا۔ وہ مشرقی ساحل پر مافیا کا نمائندہ اور وصول کنندہ ہے۔ وہ ہر ماہ پہلی تاریخ کو لانچ میں آتا ہے اور ایک ہفتہ قیام کرتا ہے۔ اس ہفتے کے دوران وہ لوگوں سے بھتا وصول کرتا ہے۔ وہ رقم جو لوگ اپنی اور اپنے کاروبار کی سلامتی کے لیے مافیا کو دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بلیک میلنگ کی رقم اور کیسینو کی آمدنی بھی اسے دی جاتی ہے۔ وہ زہر سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس کے بارے میں کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ ساحلی علاقے کے تمام باشندے جانتے ہیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے مگر وہ خاموش رہتے ہیں۔ ساحلی پولیس بھی واقف ہے مگر وہ بھی کچھ نہیں کرتی۔ پہلی تاریخ کی رات کو تین بجے لوگ لانچ پر آنا شروع ہوتے ہیں اور اپنے اپنے حصے کی رقم دے کر چلے جاتے ہیں۔ ڈیوٹی پر متعین پولیس کانسٹیبل منہ پھیر لیتے ہیں۔ کوئی لانچ کے قریب نہیں جاتا سوائے ان افراد کے جو رقوم ادا کرنے آتے ہیں۔"

"لانچ کا نام کیا ہے؟"

"وی ہرسی۔ مچھلی پکڑنے کے ٹرالرز سے کچھ فاصلے پر لنگر انداز ہوتی ہے۔"

"کیا بینک بھی رقوم وصول کرنے والوں میں سے ہے؟" میں نے پوچھا۔

البرنی نے مزید سانچ منہ میں ٹھونستے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اسے اتنا فکر مند کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب اس سے مزید باتیں معلوم کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ میں چلنے کے لیے کھڑا ہو گیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا تو اس کی گرفت ہمدردانہ تھی۔

"مجھے تمہارے دکھ کا احساس ہے مسٹر ویلیس۔" وہ بولا۔ "کوئی احمقانہ قدم مت اٹھانا۔"

میں نے سام کے پاس جا کر بل ادا کرنا چاہا مگر اس نے کچھ لینے سے انکار کر دیا۔ میں باہر نکلا۔ سیاح اپنے اپنے ہوٹل واپس جا چکے تھے۔ تھوڑے تھوڑے ادھر اُدھر باتیں کرتے نظر آ رہے تھے۔ دو پولیس کانسٹیبل کھڑے خالی نظروں سے ٹرالرز کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں قریب سے دیکھا۔ یہ وِلنسکی کی آمد اور اس کے مقصد سے آگاہ تھے اور مجھے یقین تھا کہ بڑی بڑی رقوم دے کر ان کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔ اپنے آپ کو سایوں کے درمیان رکھتے ہوئے میں آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں ہرسی لانچ لنگر انداز تھی۔ میں ایک پام کے درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ لانچ کے عرشے پر ایک آدمی بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ لانچ پر کوئی روشنی نہیں تھی۔ میں نے سوچا یہ چیرنڈ ہوگا۔

بہت سی باتوں پر غور کرتا تھا۔ میں واپس گھوم کر اس طرف چل دیا جہاں میں نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔ میں بلیک کیسٹ کلب کے پاس سے گزرا۔ گندی کھڑکیوں اور پردوں کے دوسری جانب روشنی ہو رہی تھی۔ ڈانس کی دھن بھی بج رہی تھی۔ میں کار میں بیٹھ کر گھر واپس آیا۔ وہ رات کروٹیں بدلتے گزری۔ سوزی اور ان مسرت بخش لمحات کے بارے میں سوچتے ہوئے جو ہم نے ایک ساتھ گزارے تھے۔ صبح کے چار بجے اپنے خیالات کی یورش سے تنگ آ کر میں نے خواب آور دوا کی تین گولیاں کھائیں اور بالآخر چند لمحوں کے بعد سو گیا۔

☆☆☆

ساڑھے گیارہ بجے میں گیلنڈا کے آفس میں داخل ہوا۔

"بہت دیر سے آئے ہو... تمہارے بارے میں کرنل پوچھ رہے ہیں۔" اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ "کیا بات ہے، بہت پریشان لگ رہے ہو؟"

"کرنل فارغ ہیں؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

اس نے غور سے مجھے دیکھا اور ایک دروازے کی طرف اشارہ کر دیا۔

پارنل قوی ہیکل آدمی تھا۔ عمر پچپن سال سے زیادہ تھی۔ جنگ کے زمانے میں بہت جانباز افسر رہ چکا تھا۔ "گڈ مارننگ ویلیس!" اس نے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔" میں میز کے دوسری جانب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں نے تھورسن کی فائل پڑھی ہے۔ کیس دلچسپ تھا اور تم نے کام بھی اچھا کیا مگر مسز تھورسن نے تحقیقات جاری رکھنے سے منع کر دیا۔" اس نے کہا۔ "چنانچہ اس کیس کو ختم سمجھو۔ میرے پاس تمہارے اور اینڈرسن کے لیے ایک اور دلچسپ کیس ہے۔"

"میرے لیے نہیں ہے کرنل۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں ملازمت چھوڑ رہا ہوں۔"

"مجھے اندیشہ تھا کہ تم یہی کہو گے۔" کرنل نے کہا۔ "لیکن تم اپنا ذہن دوسری باتوں کی طرف متوجہ کر سکو تو اچھا ہے۔ میں سوزی کے بارے میں جانتا ہوں اور اس حادثے سے مجھے دکھ بھی بہت ہوا ہے اور مجھے تمہاری سوچ سے بھی اختلاف نہیں ہے۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا اور یہ حادثہ کسی ایسی ہستی کو پیش آتا جسے میں چاہتا ہوں تو میں بھی ان بدمعاشوں کے پیچھے پڑ جاتا۔"

"میں بھی یہی کرنے جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم چار ہفتوں کے لیے ملازمت سے معطل کیے جاتے ہو۔ تمہیں تنخواہ ملتی رہے گی۔ جب تک تم واپس آؤ گے، اینڈرسن تمہارا کام سنبھالتا رہے گا... اوکے؟" کرنل نے کہا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"اس مہربانی کا معترف ہوں کرنل مگر میں بالکل جا رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں ایک ایسی جنگ کا آغاز کرنے والا ہوں جس کے بارے میں آپ جاننا پسند نہیں کریں گے۔ میں جنگ کے نتیجے میں شہر کے مردہ خانے میں بھی پہنچ سکتا ہوں اور جیل میں بھی اس لیے آپ کو اس میں کسی طرح ملوث نہیں ہونا چاہیے۔" میں کھڑا ہو گیا۔ میری نظر تھورسن فائل پر پڑی۔ "البتہ آپ ایک آخری نوازش کر سکتے ہیں کرنل۔" میں نے میز سے فائل اٹھا لی۔ "مجھے اس کی ضرورت ہے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ تھورسن کیس کا تعلق سوزی کی موت سے ہے؟" کرنل نے پوچھا۔

"مجھے اس کا یقین ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "فائل میں سارے حقائق نہیں ہیں اور نہ آپ ان کے بارے میں جاننا چاہیں گے۔ شکریہ کرنل! آپ کے ساتھ کام کرنا بہت دلچسپ تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ ساتھ اس انداز میں ختم ہو رہا ہے۔"

کرنل نے کرسی سے کھڑے ہو کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"اگر تم اس مصیبت سے بچ نکلو۔" اس نے کہا۔ "تو ہمیشہ یاد رکھنا کہ تمہاری جگہ میرے پاس محفوظ ہے۔"

"امید نہیں کہ اس پریشانی سے بچ نکلوں گا۔" میں نے کہا۔ "میں انہیں اس مقام پر ضرب لگانے جا رہا ہوں جہاں زیادہ تکلیف دہ ہو۔"

"کوئی احمقانہ کام مت کرنا۔"

"میں انہیں ایسی جگہ چوٹ لگاؤں گا جہاں سب سے زیادہ تکلیف دے گی۔ جلد یا بدیر وہ ضرور اس کا جواب دیں گے۔ میں ابھی اپنا استعفا بھجوا دوں گا اور اینڈرسن کو آپ کے پاس بھیج دوں گا تاکہ آپ اسے وہ کیس دے سکیں جو مجھے دینا چاہتے تھے۔"

آفس آیا تو اینڈرسن اپنی میز پر موجود تھا۔

"میری جگہ تمہیں دے دی گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "کرنل جلد ہی تمہیں بلائے گا۔ میں ملازمت چھوڑ رہا ہوں۔"

"گویا ہم دو ہو گئے۔" اینڈرسن نے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے اسے گھورا۔

"تم جاؤ گے، میں بھی جاؤں گا۔ آسان سی بات

سبق

استاد نے شاگرد سے کہا۔ "اب جبکہ تم نے یہ سبق اچھی طرح پڑھ لیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ بیٹے نے باپ کے سامنے اس کا پسندیدہ درخت کاٹنے کا اعتراف کر لیا تو باپ نے اسے کیوں نہ مارا؟"

"اس لیے کہ اسے معلوم تھا کہ ابھی بیٹے کے ہاتھ میں کلہاڑا ہے۔"

کنزیٰ یونس، کراچی

فیصلہ

لڑکی نے پوچھا: "مجھ سے شادی کر کے تم سگریٹ نوشی ترک کر دو گے نا؟"

لڑکے نے یقین دلایا۔ "کر دوں گا۔"

لڑکی نے پوچھا۔ "اور آوارہ گردی سے بھی باز آ جاؤ گے؟"

"ہاں، اس سے بھی باز آ جاؤں گا۔"

"فلم بینی بھی چھوڑ دو گے؟"

لڑکے نے آہ بھری۔ "ہاں، فلم دیکھنا بھی چھوڑ دوں گا۔"

"تم کتنے اچھے ہو۔" لڑکی نے خوش ہو کر کہا۔ "میری خاطر تم اور کون کون سی چیز ترک کر دو گے؟"

لڑکے نے پیشانی پر آیا ہوا پسینا خشک کیا اور آہستہ سے جواب دیا۔ "تم سے شادی کرنے کا ارادہ؟"

[illegible]

www.kahopakistan.com

ہے۔"

"تم ملازمت کیوں چھوڑو گے احمق آدمی۔ دیکھو، میں الجھنیں پسند نہیں کرتا۔ تم میری جگہ سنبھالو۔"

"جب ایک اچھی لڑکی کی سوزی کو اس طرح مار دیا جائے، اس کا چہرہ مسخ کر دیا جائے تو میں اس کے مرتکب کو چھوڑنے والا نہیں۔ سوزی میری بھی دوست تھی۔ ممکن ہے، تمہیں میری ضرورت نہ ہو مگر مجھ سے پیچھا نہیں چھڑا سکو گے۔ ہم ایک ساتھ ان بدمعاشوں کو ٹھکانے لگائیں گے۔"

"نہیں۔"

"میں جانتا ہوں کہ ہم دونوں مارے جا سکتے ہیں لیکن مرنے سے پہلے ہم انہیں تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ اپنا استعفا لکھو۔ میں دیکھوں گا کہ تم نے کیا لکھا ہے۔ پھر اپنا استعفا بھی لکھ دوں گا۔ پھر ہم تمہارے گھر جا کر پلان بنائیں گے کہ کس طرح بدلہ لیا جا سکتا ہے۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ اینڈرسن مگر..."

"خدا کے لیے۔" اینڈرسن چیخ اٹھا۔ "تم نے سن لیا کہ میں نے کیا کہا۔ یا تو ہم ساتھ چلیں گے یا ہمیشہ کے لیے الگ ہو جائیں گے... اور میں ان بدمعاشوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے اکیلا ہی نکل پڑوں گا۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ دل میں جذبات کا ایک طوفان امڈ آیا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا تعاون میرے لیے انتہائی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ جنگ تنہا شروع کرنے سے میرے بچنے کے امکانات بہت ہی کم تھے۔

"اچھا اینڈرسن... ہم یہ لڑائی ایک ساتھ لڑیں گے۔" میں نے کہا۔

میں نے اپنا استعفا ٹائپ کیا۔ اینڈرسن کو دکھایا اور اس نے بھی اپنا استعفا ٹائپ کر دیا۔

"میں کرنل سے ملنے جا رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"میرا استعفا بھی ساتھ ہی لیتے جاؤ۔" میں نے کہا۔

اینڈرسن کرنل سے ملنے چلا گیا تو میں نے اپنی میز سے ذاتی چیزیں نکال کر ایک ہولڈ آل میں رکھ دیں۔ پھر جن کاغذات کی مجھے ضرورت پڑ سکتی تھی، وہ اکٹھے کیے۔ تھورسن فائل بھی ان میں شامل تھی اور آخر میں اسکاچ کی وہ بوتل بھی جو اب نصف خالی ہو چکی تھی۔ اینڈرسن واپس آیا تو مسکرا رہا تھا۔

"کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔" اس نے بتایا۔ "کرنل خفا تو بہت ہوا مگر اس نے میرے فیصلے کو سراہا۔ اس نے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ اگر ہم واپس آئے تو ہماری ملازمتیں بحال کر دی جائیں گی۔"

"اپنی میز خالی کرنا چاہتے ہو؟"

"اس میں خالی کرنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ چلو کھانا کھائیں۔"

"تمہیں تو ہمیشہ بھوک لگی رہتی ہے۔ بیٹھ جاؤ۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"جب کوئی آدمی بھوکا ہو تو اپنے دماغ سے کام نہیں لے سکتا۔" اینڈرسن نے کہا۔ "کھانا کھانے چلو، ساتھ میں باتیں بھی کرتے جائیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔" میں کھڑا ہو گیا۔ "مگر پہلے گلنڈا کو خدا حافظ کہہ دیں۔"

اس وقت ساڑھے سات بج چکے تھے مگر گلنڈا اپنے آفس میں موجود تھی۔ اس نے ہمارے جذبے کی تعریف کی اور کہا کہ وہ ہماری جگہ ہوتی تو وہ بھی یہی فیصلہ کرتی۔ پھر بتایا کہ کرنل نے ہمیں پورے مہینے کی تنخواہوں کی ادائیگی کر دی ہے اور دو لفافے ہماری طرف بڑھائے۔

"کرنل بہت ہمدرد انسان ہے۔" میں نے لفافے اٹھا لیے۔ "اچھا، اب ہم چلتے ہیں۔ امید رکھنا چاہیے کہ ہم دوبارہ بھی ملیں گے۔"

"ضرور ملیں گے۔" گلنڈا نے جواب دیا۔ "ایک بات اور... اگر کبھی تمہیں معلومات کی ضرورت ہو اور تمہارے خیال میں ہم تمہاری مدد کر سکتے ہوں تو مجھے ضرور فون کرنا۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ہاتھ ملایا اور ہم بلڈنگ سے باہر آ گئے۔ لوسینو کے ریسٹورنٹ گئے۔ اس نے سوزی کے حادثے پر افسوس کا اظہار کیا اور یہ ہمدردی نما تھی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں گیلی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے کہا کہ وہ آج ہمیں اپنے ریسٹورنٹ کا بہترین کھانا پیش کرے گا اور یہ اس کی طرف سے ہوگا۔ میں نے اس کی ہمدردی کا دلی شکریہ ادا کیا۔ اس کی یہ محبت دیکھ کر میرا دل بھی بھر آیا تھا۔ ہم نے کھانا آیا۔ میرا دل کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی تھوڑا بہت زہر مار کیا۔ البتہ اینڈرسن خوش ذائقہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ پھر جب میں نے دیکھا کہ اس کی پلیٹیں خالی ہو چکی ہیں تو وہ بولا۔

"اب تو تم دماغ سے کام لے سکتے ہو؟" میری بات غور سے سنو۔ میں کچھ رقم پس انداز کرتا رہا ہوں۔ ہمیں اس کی ضرورت ہوگی کیونکہ دونوں میں سے کوئی بھی کچھ کما نہیں رہا ہوگا۔ تمہارے پاس کچھ ہے یا نہیں؟"

"میرے پاس پچیس ہزار ڈالرز ہیں۔" اینڈرسن مسکرایا۔ "جو کچھ تمہارا ہے، وہ میرا ہے اور جو کچھ میرا ہے، وہ تمہارا بھی ہے۔"

میں نے اسے البرٹی سے جو کچھ معلوم ہوا تھا، بتا دیا۔

"ہم مافیا سے الجھنے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم چاہو تو اب بھی پیچھے ہٹ سکتے ہو۔"

"تو مافیا کا معاملہ ہے۔" اینڈرسن سوچتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔"

"مجھے تیزاب پھینکے جانے پر حیرت تھی۔ اس حرکت سے مافیا کی بو آتی تھی۔" اینڈرسن نے کہا۔ "کوئی بات نہیں، اب مجھے صرف یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

"تم واقعی میرا ساتھ دینا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔

"کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ہم دونوں مارے جا سکتے ہیں؟"

"تو پھر کیا ہوا؟" اینڈرسن چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔ "موت ایک ہی بار آتی ہے۔ ہم مل کر اسے ختم کر سکتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ ہمارا پہلا قدم کیا ہوگا؟"

"اب جبکہ ہم ایک ساتھ کام کریں گے تو مناسب ہوگا کہ تم میرے گھر آ جاؤ۔ میرے پاس ایک کمرا خالی ہے، وہ تم لے سکتے ہو۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"تو پھر جاؤ اور جن چیزوں کی تمہیں ضرورت ہو، لے آؤ۔"

"تمہارا پلان کیا ہے؟"

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "پہلے اپنا سامان لے آؤ۔"

کھانا ختم کر کے ہم ریسٹورنٹ سے باہر آئے۔ اینڈرسن اپنے گھر چلا گیا۔ میں اپنی کار میں تھورسن کی قیام گاہ کی طرف چل دیا۔ جیسا کہ مجھے امید تھی، ایک کمرے کے علاوہ پورے بنگلے کی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں اور وہ کمرا جوش اسمڈ لے کا تھا۔ مجھے تین مرتبہ دیر دیر تک گھنٹی بجانا پڑی، تب کہیں جا کر اس نے دروازہ کھولا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس نے شراب پی ہوئی ہے۔

"مسٹر ویلیس۔" وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے مسز تھورسن موجود نہیں۔ وہ اوبیرا گئی ہیں۔"

"میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔" میں اسے ایک طرف ہٹا کر اندر آ گیا۔ "وقت آ گیا ہے کہ کچھ تفصیلی گفتگو ہو جائے۔"

اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے نشے میں مدہوش کوئی آدمی اس وقت دیکھتا ہے جب اسے کسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑ جائے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر میں اس کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے اس کے کمرے میں لے آیا۔

"یہی وقت ہے کہ تم حقائق کا سامنا کرو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہارا بینک بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔"

"شاید تم درست کہہ رہے ہو مسٹر ویلیس۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ اس کے مافیا سے تعلقات ہیں؟"

"ہاں۔" جوش جیسے کراہا۔ "یہ بات مجھے بہت پہلے معلوم ہو گئی تھی۔ میں نے اس سے بات کی مگر بینک ماننے والا لڑکا نہیں ہے، میرا مذاق اڑاتا رہا۔ ہاں، میں جانتا ہوں کہ وہ بڑی مصیبت میں پڑنے والا ہے۔"

"پڑنے والا نہیں ہے، پڑ چکا ہے۔ اور کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ انجیلا کا تعلق مافیا سے ہے یا نہیں؟"

"مس انجیلا۔" اس نے سر ہلایا۔ "جو باتیں سننے میں آتی رہی ہیں، ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے۔ البتہ میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ بینک کی گاہک ہے۔"

"بلیک میلنگ کی گاہک۔" میں نے پوچھا۔ جوش نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مافیا والے اسے کیوں بلیک میل کر رہے ہیں... میرا مطلب ہے کس بنیاد پر؟"

"میں نہیں جانتا اور نہ جاننا چاہتا ہوں۔"

"بینک جانتا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ وہ محض رقوم جمع کرتا ہے۔"

"مسز تھورسن نے میری خدمات یہ معلوم کرنے کے لیے حاصل کی تھیں کہ ان کی بیٹی کو کون بلیک میل کر رہا ہے مگر اب انہوں نے تحقیقات روک دی ہیں۔ تم اس کی وجہ بتا سکتے ہو؟"

جوش نے وھسکی کی بوتل سے ایک گلاس بھرا۔ آدھا گلاس ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔

"اس کی وجہ جانتے ہو؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"ایک آدمی نے اسے دھمکیاں دی تھیں۔" جوش کچھ ہچکچاہٹ کے بعد بولا۔ "فون کا ایک ایکسٹینشن میرے کمرے میں لگا ہے۔ میں نے اس آدمی کو کہتے سنا کہ اگر مسز تھورسن نے تحقیقات بند نہیں کرائیں تو اس بنگلے کو نذر آتش کر دیا جائے گا۔"

"وہ آدمی کون تھا؟"

"مافیا کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ بس ایک آواز... ایسی آواز جس سے لوگ ڈر جائیں۔ مسز تھورسن نے اس کی بات سنی اور ریسیور رکھ دیا۔ اس سے زیادہ میں

www.kahopakistan.com

کچھ نہیں جانتا۔"

"لیکن یہ ضرور سمجھتے ہو کہ بلیک میلنگ کی رقم جمع کرنے کے جرم میں جینک کو پندرہ سال کی قید ہو سکتی ہے۔"

"پندرہ سال کی قید۔" جوش سہم گیا۔

"ہاں جوش... پندرہ سال کی قید۔" مجھے اس شرابی کی حالت پر رحم آرہا تھا۔

"میں نے اسے خبردار کر دیا تھا مگر وہ میرا مذاق اڑاتا رہا۔ میں کیا کر سکتا ہوں مسٹر ویلیس... مجھے اپنے بیٹے سے محبت ہے۔"

"تمہیں واقعی معلوم نہیں کہ انجیلا کو کس سلسلے میں بلیک میل کیا جارہا ہے؟"

"مجھے معلوم ہوتا تو تمہیں ضرور بتا دیتا۔"

"کیا تمہیں میری کے بارے میں کوئی خبر ہے؟"

"نہیں۔"

اب اس گفتگو کو جاری رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"میں تم سے پھر ملنے آؤں گا جوش۔" میں نے چلتے ہوئے کہا۔

مگر شاید اس نے میری بات نہیں سنی۔ وہ گلاس ہاتھ میں پکڑے خالی نظروں سے خلا میں گھورتا رہا۔

☆☆☆

میرے جیسے پیشے میں ہر قسم کی باتیں سننا اور ان میں سے مفید معلومات اخذ کرنا پڑتی ہیں۔ میں کار میں بیٹھ کر ساحلی علاقے کی خستہ حال بستی کی جانب روانہ ہو گیا۔ یہاں مختلف دکانیں، ادنیٰ درجے کے بوتیک اور کباڑیوں کی میزیں تھیں جن پر ہر قسم کی الا بلا ڈھیر رہتی تھی۔ میں نے کار پارک کی اور ایک دکان کی طرف بڑھا جس کا مالک کوئی عرب تھا یا فلسطینی۔ مجھے دونوں میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کا نام علی حسن تھا اور وہ سیاحوں کے ہاتھ ہر قسم کا کاٹھ کباڑ فروخت کیا کرتا تھا۔ وہ چرس کا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے پاس زمین پر اس کی بیوی بیٹھی تھی۔ وہ گیس کا ایسا بھرا ہوا غبارہ نظر آتی تھی جو عنقریب اڑنے والا ہو۔ حسن خود چھوٹے سے قد کا موٹا آدمی تھا۔ وہ عربی لباس پہنتا تھا۔

"مسٹر حسن۔" میں نے اس کے سامنے رکتے ہوئے کہا۔ "میرا نام ڈوئی ہے۔ مجھے تم سے ایک پرائیویٹ کام ہے جس کا تعلق دولت سے بھی ہے۔ کیا تم میرے ساتھ ایسی جگہ چل سکتے ہو جہاں ہم اطمینان سے بات کر سکیں۔"

اس نے غور سے مجھے دیکھا پھر کھڑا ہو گیا۔ اپنی موٹی بیوی سے کچھ کہا اور میرے پاس آیا۔

"ہر وہ چیز جس کا تعلق دولت سے ہو، مجھے دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔" اس نے کہا۔ "چلو کہاں چلتے ہو؟"

اس کے جسم سے اتنی بو آرہی تھی کہ وہ میری کار میں بیٹھا تو مجھے کار چلانا مشکل ہو گئی۔ میں نے کار کی تمام کھڑکیاں کھول دیں۔ بو کم تو ہوئی مگر زیادہ نہیں۔ کچھ دور جا کر میں نے کار روک دی۔

"مسٹر حسن۔" میں نے کہا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم بم بنانے میں ماہر ہو۔ مجھے ایک بم کی ضرورت ہے کیا تم دے سکتے ہو؟"

"یہ بات تمہیں کس سے معلوم ہوئی؟" اس نے چرس کے سگریٹ کا بدبودار دھواں اڑاتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں اس کی پروا ہے؟ مجھے ایک بم چاہیے۔ اگر نہیں دے سکتے تو کہہ دو۔ میں کہیں اور سے لے لوں گا۔"

"کس قسم کا بم؟"

"چھوٹا سا بم جس سے بہت زیادہ تباہی ہو لیکن آگ نہ لگے۔"

وہ اس طرح خاموش بیٹھا رہا جیسے کوئی سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہو۔ پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں، دے سکتا ہوں مگر تم کتنی قیمت دو گے؟"

"عام طور سے کیا قیمت ہوتی ہے؟"

"ایک چھوٹے بم کے لیے جس سے آگ نہ لگے مگر تباہی بہت ہو اور جسے ایک اناڑی بھی استعمال کر سکے، میں تین ہزار ڈالرز لوں گا۔"

اسے کج بحثی کی توقع تھی اور میں نے اسے مایوس نہیں کیا۔ تیس منٹ تک قیمت پر تکرار ہوتی رہی، آخر کار ایک ہزار تین سو ڈالرز پر سودا ہو گیا۔

"او کے مسٹر ڈوئی! تم کل رات اسی وقت میری دکان پر آنا، بم مل جائے گا۔"

میرے دل و دماغ پر اس وقت صرف اور صرف بلیک کیٹ کلب چھایا ہوا تھا اور لہو کا تیز دوران میرے وجود میں ٹھوکریں سی مار رہا تھا۔ اندر بس ایک ہی پکار تھی... انتقام، انتقام اور انتقام۔

سوزی کو میرے دشمنوں نے مجھ سے اتنی دور کر دیا تھا کہ وہ کبھی بھی میرے پاس نہیں آسکتی تھی۔ اس کا خون رائگاں نہیں جا سکتا تھا۔ میرے دشمنوں کو اس خون کی قیمت چکانی تھی۔ وہ وقت قریب آچکا تھا۔ نئے دن کا سورج طلوع ہوتے ہی مجھے ان سے اپنا حساب برابر کرنا تھا۔

انتقام کی آگ اور انصاف کے حصول کی
جنگ کے سنسنی خیز واقعات اگلے ماہ پڑھیں

وہ اسے سیکڑوں کے مجمع میں بھی بہ آسانی پہچان سکتا تھا۔ وہ ٹیلس سنیما کے قریب ایک معروف سڑک کے کونے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جس پر زرد رنگ کے بٹن جڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی یہی نشانی بتائی تھی۔ اس کے بال سنہری اور جسم قدرے فربہ تھا۔ اس کے گول چہرے پر لمبی ناک اور خوب صورت آنکھوں میں امید کی چمک دیکھنے والے کو دوبارہ پلٹنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس نے سوچا لڑکی وقت کی پابند ہے جبکہ لباس اور جیولری سے اس کی امارت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر ابھری۔ وہ آگے بڑھا اور اس کے قریب آکر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔

شہ زور

محمد عفان ازاد

بہت سے لوگ اس زعم میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ مردم شناس ہیں... ایک ایسے ہی نوجوان کا قصہ... جس کا خیال تھا... کہ وہ انسانوں کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرتا... لیکن اس بار وہ قطعی بے خبر تھا آگے کیا داؤ چلنے والا ہے...

ناتمام رہ جانے والے خوابوں کا سوداگر جو جواری وار کی لپیٹ میں آچکا تھا

www.kahopakistan.com

''ہیلو سارہ۔ میں آ گیا۔''

وہ اپنی جگہ سے اچھلی اور پھر اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کرسٹائن؟''

''ہاں۔''

ان دونوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا پھر وہ اسے اپنے قریب کرتے ہوئے بولا۔ ''تم بہت حسین ہو، بالکل ویسی ہی جیسا میں نے سوچا تھا۔''

لڑکی نے ایک گہری سانس لی۔ فرطِ جذبات سے اس کا پورا جسم ہل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک ابھری اور وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولی۔ ''تم... تم بھی بہت ہینڈسم ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ...''

اس کے لیے یہ الفاظ کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے کیونکہ اسے اپنی وجاہت اور مردانہ حسن کا احساس تھا اور اس طرح کے تعریفی جملے وہ پہلے بھی سادہ لوح اور محبت کی پیاسی عورتوں سے سن چکا تھا۔

''ارے نہیں۔'' وہ پیار سے اس کی لمبی ناک پکڑتے ہوئے بولا۔ ''تم کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر میری تعریف کر رہی ہو۔ حالانکہ میں تمہیں پہلے ہی اپنے گنج پن کے بارے میں بتا چکا ہوں جس کی وجہ سے مجھے خاصی شرمندگی ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم کچھ خیال نہیں کرو گی۔''

''اس کے باوجود تمہارے بال بہت خوب صورت اور چمک دار ہیں... اور تم بالکل ایک دانشور نظر آتے ہو۔''

''دانشور۔'' وہ دل ہی دل میں ہنسا۔ ''اس موٹی بھینس نے یہ لفظ کہاں سے سیکھ لیا۔''

☆☆☆

کرسٹائن نے اس کا ہاتھ پکڑا اور سڑک کے کنارے کنارے چلتے ہوئے بولا۔ ''گم آن ڈیئر! میں ایک ایسی جگہ سے واقف ہوں جہاں ہم کسی کی مداخلت کے بغیر کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کر سکتے ہیں۔''

وہ اس مقصد کے لیے ہمیشہ شہر کے مختلف مقامات کا انتخاب کرتا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک ہی جگہ پر ہر بار نئی عورت کے ساتھ نظر آئے۔ وہ اس سلسلے میں بڑی منصوبہ بندی سے کام لیتا اور چھوٹی سے چھوٹی بات پر نظر رکھتا تھا، ورنہ اب تک اس کا دھندا ختم ہو چکا ہوتا اور اس کی گزر اوقات مشکل ہو جاتی۔

وہ اسے شہر کے وسطی حصے سے باہر ایک چھوٹے سے ریستوران میں لے گیا جہاں اس کے پہچانے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ریستوران میں بہت کم لوگ تھے اس لیے انہیں ایک پُرسکون گوشہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میز پر موم بتی روشن تھی جس کی وجہ سے ماحول خاصا رومانی ہو گیا تھا۔ اسے مزید دو آتشہ بنانے کے لیے ایک واکمن نواز جذباتی دھنیں چھیڑ رہا تھا۔ بظاہر یوں لگ رہا تھا کہ یہ ریستوران رومانی جوڑوں کی سہولت کے لیے ہی مخصوص ہے۔ کرسٹائن نے اپنے پسندیدہ مشروب کا آرڈر دیا۔ اسے یقین تھا کہ لڑکی بھی اسے پسند کرے گی۔ لڑکی کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اس نے اپنا ہاتھ کرسٹائن کے ہاتھ پر رکھ دیا اور بولی۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ہم دونوں یہاں اکٹھے بیٹھے ہیں۔''

وہ اس کی سادہ لوحی پر مسکرا دیا۔ اس نے اس لڑکی کے بارے میں اخبار میں پڑھا تھا۔ وہ ایک مایوس اور محبت سے محروم..... لڑکی تھی جس کی ایک شادی ناکام ہو چکی تھی۔ اس کا تعلق ایک دولت مند گھرانے سے تھا لیکن دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی اور نہ ہی اس سے خوشیاں خریدی جا سکتی ہیں۔ وہ کسی ایسے مرد کی تلاش میں تھی جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ اپنے دکھوں کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ جو اس کا ہاتھ تھام کر زندگی کی شاہراہ پر ہمیشہ ساتھ چلتا رہے... جو اسے شوق و جذبات کی بلندیوں تک لے جائے۔ ایسی لڑکیاں بہت کم ملتی ہیں لہٰذا کرسٹائن نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر ایک خط میں اپنے کوائف اور تصویر بھیج دی۔ اسے یقین تھا کہ لڑکی کی جانب سے حوصلہ افزا جواب آئے گا اور ایسا ہی ہوا۔ لڑکی اس کی تصویر دیکھتے ہی ریجھ گئی اور فون پر ان کی ملاقات کا وقت طے ہو گیا۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر لڑکی بولی۔ ''کرسٹائن! میں تمہیں اپنے ساتھ پیش آنے والے افسوس ناک واقعے کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں تاکہ تم میرے ماضی سے واقف ہو جاؤ۔''

وہ بڑے سکون سے اس کی کہانی سنتا رہا۔ بچپن میں اسے کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ دورِ بلوغت میں کیا پیچیدگیاں پیش آئیں پھر اس کی شادی بارسا نامی شخص سے ہوئی جو بظاہر اس کی محبت کا دم بھرتی تھی لیکن شادی کے بعد بھی اس نے درپردہ اپنے پرانے عاشقوں سے تعلقات برقرار رکھے۔ انہی میں ایک اس کا کاروباری حریف بھی تھا جسے لووائس نے اس کے سارے کاروباری راز بتا دیے اور جب اس کا بزنس چوپٹ ہو گیا تو وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ بڑی محنت اور جدوجہد کے بعد وہ اپنے کاروبار کو دوبارہ جمانے میں کامیاب ہو سکا ہے۔

سارہ نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور ہمدردانہ لہجے میں بولی۔ ''کوئی عورت اتنی گھٹیا بھی ہو سکتی ہے۔ مجھ میں تھے۔ اس کا یقین تھا کہ انسان اپنی قسمت خود بناتا ہے اور اگر وہ اپنی عقل کا صحیح استعمال کرے تو کوئی اسے دھوکا نہیں دے سکتا۔ اسے اس کہانی پر بھی یقین نہیں آیا لیکن وہ اپنے تاثرات کا اظہار کر کے لڑکی کو شک میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے لڑکی کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور دوسرے ہاتھ سے اس کا گال تھپتھپایا۔ لڑکی کی آنکھوں میں چراغ جل اٹھے اور وہ جذبات کی رو میں بہہ کر اپنا غبار نکالنے لگی۔ اس نے ہر اس شخص کے بارے میں شکوہ کیا جس نے اسے دکھ دیے تھے۔ ان میں اس کی سہیلیاں، گھریلو ملازم اور سخت گیر والدین بھی شامل تھے۔ وہ بڑے صبر اور سکون کے ساتھ اس کی باتیں سنتا رہا لیکن لڑکی کسی طرح خاموش ہونے پر تیار ہی نہیں تھی۔ مجبوراً اسے موضوع بدلنا پڑا۔

''تمہارے والدین کہاں رہتے ہیں؟''

''سلور وڈ ڈیئر، وہاں ان کا بڑا خوبصورت گھر ہے۔''

سلور وڈ کا نام سن کر اس کے دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں بڑے بڑے اُمرا اُدھار کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لڑکی اس کی توقع سے کہیں زیادہ دولت مند تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ لڑکی نے اپنی ماں کے بارے میں بتایا کہ بظاہر وہ بہت سخت ہے لیکن دل کی بہت اچھی ہے۔

مشروب کی بوتل خالی ہو چکی تھی اور لڑکی کے پاس بھی کہنے کے لیے کچھ نہ بچا تھا، لہٰذا وہ بولی۔ ''کرسٹائن! اب تمہاری باری ہے۔ میں تمہارے بارے میں سب کچھ جاننا چاہوں گی۔''

کرسٹائن کے پاس ایسی بہت سی کہانیوں کا ذخیرہ تھا جنہیں وہ مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کو سنا کر ان سے ہمدردیاں سمیٹتا تھا۔ اس نے ان میں سے ایک دردناک کہانی کا انتخاب کیا کہ کس طرح اس نے بڑی محنت سے ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کیا پھر اس کی شادی لووائس سے ہوئی جو بظاہر اس کی محبت کا دم بھرتی تھی لیکن شادی کے بعد بھی اس نے درپردہ اپنے پرانے عاشقوں سے تعلقات برقرار رکھے۔ انہی میں ایک اس کا کاروباری حریف بھی تھا جسے لووائس نے اس کے سارے کاروباری راز بتا دیے اور جب اس کا بزنس چوپٹ ہو گیا تو وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ بڑی محنت اور جدوجہد کے بعد وہ اپنے کاروبار کو دوبارہ جمانے میں کامیاب ہو سکا ہے۔

سارہ نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور ہمدردانہ لہجے میں بولی۔ ''کوئی عورت اتنی گھٹیا بھی ہو سکتی ہے۔ مجھ میں نہیں آتا کہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟''

یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کرسٹائن نے جیب سے رومال نکالا اور اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ''بے وقوف عورت... پردہ گرنے والا ہے۔ اب تیسرے ایکٹ کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

☆☆☆

سب کچھ اس کی توقع کے مطابق ہو رہا تھا۔ اس کی کہانی نے سارہ کے دل کو موم کی طرح پگھلا دیا تھا۔ وہ جذباتی انداز میں بولی۔ ''کیا تم میرے ساتھ گھر چلو گے؟ میں تمہیں اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی اچھی سی کافی پلاؤں گی۔ میں نے تمہارے لیے کیک بھی بنایا ہے۔''

بیس منٹ بعد وہ اس کے اپارٹمنٹ میں تھا۔ سارہ کچن میں چلی گئی تو وہ ناقدانہ نظروں سے اپارٹمنٹ کا جائزہ لینے لگا۔ سب کچھ اس کی توقع کے مطابق تھا۔ قیمتی فرنیچر، نادر تصاویر اور مہنگی اشیا... اس کے والدین سخت گیر ہو سکتے تھے لیکن کنجوس ہرگز نہیں تھے اور انہوں نے اس اپارٹمنٹ کی تزئین و آرائش پر دل کھول کر پیسا خرچ کیا تھا۔

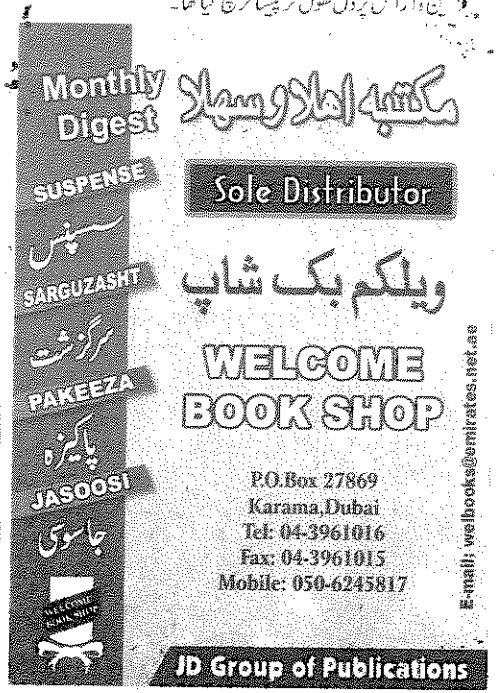

www.kahopakistan.com

کافی اور کیک دونوں ہی بہت خوش ذائقہ تھے۔ پھر اس نے فریج سے ایک بوتل نکالی اور اس کے برابر میں بیٹھ کر گلاس بنانے لگی۔ پھر جذبات سے مغلوب ہوکر اس سے لپٹ گئی۔ کرسٹائن نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اس سے پہلے کہ معاملہ حد سے گزر جاتا، وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹی اور بولی۔

”نہیں، کرسٹائن... نہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں، جب تک ہماری شادی نہیں ہوجاتی۔ میں پہلے بھی ایک زخم کھا چکی ہوں اور چاہتی ہوں کہ ہمارے درمیان معاملات درست انداز میں آگے بڑھیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

وہ بہت اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ کوئی بھی لڑکی پہلی ملاقات میں اس سے آگے نہیں جاسکتی۔ اسے بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ ٹھنڈا کر کے کھانے کا عادی تھا۔ اس نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی اور وہ دونوں اگلے دن سینما جانے پر متفق ہوگئے۔

”خدا حافظ کرسٹائن۔“ وہ اسے دروازے تک چھوڑنے آئی اور دھیمی آواز میں بولی۔ ”آئی لو یو۔“

”خدا حافظ۔“ کرسٹائن نے محبت سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا اور اسے امیدوں کے سمندر میں غوطہ کھانے کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔

☆☆☆

آنے والے ہفتوں میں وہ تقریباً ہر روز ملتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ سڑکوں پر چہل قدمی کرتا، اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے بدمزہ کھانے کھاتا اور گھنٹوں صوفے پر اس کا ہاتھ تھامے اس کی پسند کے فضول اور بے ہودہ گانے سنتا رہتا۔ اس دوران اسے اس کی پیش قدمی بھی برداشت کرنا پڑی اور جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ مکمل طور پر اس پر بھروسا کرنے لگی ہے تو اس نے موقع دیکھ کر مطلب کی بات چھیڑ دی جس کے لیے اسے اتنا عرصہ انتظار کرنا پڑا تھا۔

”سارہ! میرا خیال ہے کہ اب تمہارے والدین کو اپنے ہونے والے داماد سے ملاقات کرلینی چاہیے۔“

اس نے خوشی سے جھومتے ہوئے اپنے آپ کو کرسٹائن پر گرادیا اور بولی۔ ”کرسٹائن! کیا تم واقعی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے اس کے کانوں میں پیار بھری سرگوشی کی۔ ”مجھے یقین آگیا ہے کہ تم ہی میرے لیے مناسب ہو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“

چند دنوں بعد اس نے جذبات بھری آواز میں بتایا کہ اس کی ماں کرسٹائن سے ملنا چاہتی ہے۔ ”میرے والد کاروباری سلسلے میں جنوبی افریقا گئے ہوئے ہیں، لہٰذا وہ بعد میں مل لیں گے اور انہیں بھی بہت خوشی ہوگی۔ ہمیں شام سات بجے مام سے ملنا ہے۔“

اس اہم ملاقات کے لیے اس نے خاص طور سے اہتمام کیا۔ شہر کے بہترین ہیئر ڈریسر سے بال بنوائے اور انتہائی قیمتی سوٹ پہن کر اس کی ماں سے ملنے چلا گیا۔ سارہ کی ماں مسز ولسن نے اس کا استقبال ہال وے میں کیا۔ وہ ایک دبلی پتلی سیاہ بالوں والی نفیس عورت تھی۔ اس نے اپنی سبز آنکھوں سے کرسٹائن پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ جواب میں اس نے بھی مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اس گھر کی ہر شے سے امارت ٹپک رہی تھی۔ وہ لوگ اس کی توقع سے کہیں زیادہ دولت مند تھے۔ رسمی جملوں کا تبادلہ ہونے کے بعد وہ سب ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ مسز ولسن نے میز پر رکھی چاندی کی گھنٹی بجائی۔ ایک نوجوان اور پرکشش ملازمہ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوگئی۔

”مارتھا! کیا تم ہمیں اچھی سی کافی پلاؤ گی؟“

ملازمہ چلی گئی تو مسز ولسن نے اسے چاندی کے کیس میں سے سگریٹ پیش کیا اور خود بھی ایک سگریٹ سلگا کر ہلکے ہلکے کش لینے لگی۔ اس دوران میں اس نے سوالات کا سلسلہ شروع کردیا جو کسی بھی لڑکی کی ماں ایسے مواقع پر پوچھ سکتی ہے۔ وہ ایسے سب سوالوں کے لیے تیار ہوکر آیا تھا۔ اس کے مؤدبانہ اور جذباتی جوابات سے وہ عورت خاصی متاثر ہوئی۔

اس کے بعد پرتکلف کھانا پیش کیا گیا۔ وہ اپنے آپ کو بہت پرسکون محسوس کر رہا تھا اور اسے یقین ہوگیا تھا کہ سب کچھ پلان کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس کی تصدیق اس وقت ہوئی جب وہ اسے ایک کونے میں لے گئی اور کہنے لگی۔

”کرسٹائن! تم ایک شریف آدمی ہو اور مجھے خوشی ہے کہ تم اور سارہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ وہ کن حالات سے گزری ہے لیکن اب وہ چاند کو چھونے کی تمنا کر رہی ہے۔ بے چاری سارہ... اس کے لیے زندگی کبھی آسان نہیں رہی۔ مجھے امید ہے کہ تم میری باتوں کا برا نہیں مناؤ گے لیکن وہ باؤلی کس حد تک سیدھی اور احمق ہے۔ وہ اپنے دادا پر گئی ہے لیکن اس کا دل سونے کا ہے اور وہ تم سے ہمیشہ محبت کرتی رہے گی... اور میں تمہارے بارے میں بھی ایسا ہی سوچتی ہوں۔“

”ہاں۔“ اس نے اپنی آنکھیں ایک قیمتی اور چمک دار موم بتی کے اسٹینڈ پر جماتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی سارہ سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی وہ مجھ سے کرتی ہے۔“

مسز ولسن مسکرائی اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ ”لگتا ہے تمہیں یہ اسٹینڈ پسند آگیا ہے۔ یہ تم لے جاؤ۔“

کرسٹائن نے وہ اسٹینڈ اٹھایا اور اسے ہاتھوں میں تولتے ہوئے بولا۔ ”یہ سونے کا ہے؟“

”ہاں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”یہ ہمارے قدیم خاندانی نوادرات میں سے ایک ہے اور میں اسے شادی کا تحفہ سمجھ کر پیش کر رہی ہوں۔ ویسے بے فکر رہو۔ اس کے علاوہ بھی تمہیں بہت کچھ ملے گا۔“

☆☆☆

ایک ہفتے بعد وہ اور سارہ دوبارہ مسز ولسن سے ملنے گئے۔ وہ پہلے کی طرح مستعد اور پرعزم نظر آئی اور اس نے کرسٹائن سے اکیلے میں ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب سارہ باہر چلی گئی تو اس نے کہا۔

”میں اپنے شوہر سے رابطے میں ہوں۔ ہم دونوں تمہاری شادی اور تم دونوں کے مستقبل کے بارے میں پلان کر رہے ہیں۔ میرے شوہر بہت خوش ہیں اور انہوں نے تمہارے لیے نیک خواہشات کا پیغام بھیجا ہے۔ وہ تو تمہاری شادی سادگی سے کرنا چاہ رہے ہیں لیکن ہم دونوں اسٹرینڈ ہیم والا مکان تمہیں شادی کے تحفے کے طور پر دینا چاہ رہے ہیں۔“

”اسٹرینڈ ہیم۔“ کرسٹائن نے چونکتے ہوئے کہا۔

”ہاں، وہ بھی ہماری ملکیت تھا۔ اسی مکان میں سارہ کا بچپن گزرا۔ وہ جگہ اسے بہت پسند ہے۔ ہم سے غلطی ہوئی کہ یہ مکان اس وقت بیچ دیا جب اس کی شادی بارسا سے ہوئی اور ملک سے باہر چلے گئے۔ لیکن اب وہ تمہارے ساتھ اسی مکان میں رہنا چاہتی ہے اور اگر تم چاہو تو میرے شوہر وہاں پر واقع اپنی فیکٹری میں تمہارے لیے ملازمت کا بندوبست بھی کر سکتے ہیں۔ تم اسے کوئی احسان مت سمجھنا۔ ہمارے لیے اس سے زیادہ اہم بات کیا ہوسکتی ہے کہ تمہیں سارہ کا اتنا خیال ہے۔ تم جانتے ہو کہ اسے بچے کی کتنی خواہش ہے۔“

کرسٹائن کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ یہ سب کچھ اس کی توقع سے بہت زیادہ تھا۔ ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ چند مہینوں یا زیادہ سے زیادہ سال بھر بعد سارہ کسی حادثے کا شکار ہوسکتی تھی پھر سب کچھ اسی کا ہوتا۔

مسز ولسن نے اسے سوچ میں گم دیکھا تو بولی۔ ”شاید تم

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

جون 2011ء کے
شمارے کا ایک منفرد انداز
انجانے پہلو
ایک اور شاہکار... ولولہ انگیز
رشتوں کی آزمائش پر مشتمل ایک خوبصورت معاشرتی کہانی
تدبیر بنی تقدیر
ڈاکٹر ساجد امجد کی پراثر تحریر... تاریخ کے حوالے سے جانے پہچانے نام... اور دارالشکوہ کے درمیان بادشاہت کی رسہ کشی... وہی بساط... وہی چالیں... کسی کی جیت کسی کی ہار کا قصہ
حضرت الیسعؑ
حضرت موسیٰ اور حضرت الیاس کی شریعت کے پابند اور آپ کی طرح معجزات کے حامل ایک اور نبی کا احوال
کینہ پرور
ایکشن اور تجسس سے بھرپور ملک صفدر حیات کا ایک اور یادگار کارنامہ
مصیبت زدہ
ایک ہوس پرست کا قصہ جس کا انجام دھوپی کے کتے سے مختلف نہ تھا... مرزا امجد بیگ کراۓ عدالت میں
اور کئی حوالے
انشائیہ، محفل شعر و سخن، آپ کے خط
مزید
منظر امام، کاشف زبیر، تنویر ریاض، نجمہ صدری، سلیم انور اور ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا انداز تحریر

www.kahopakistan.com

شہر میں رہنے کو ترجیح دو گے؟''

''میری پہلی ترجیح سارہ کو خوش رکھنا ہے۔ میں اس کے ساتھ کہیں بھی رہنے کے لیے تیار ہوں۔''

مسز ولسن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ ''شکریہ کرسٹائن! تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

اس نے کچھ دیر توقف کیا پھر بولی۔ ''اس جائداد کی قیمت ساڑھے بارہ لاکھ پاؤنڈز ہے۔ میں نے اپنے کاروباری وکیل سے مشورہ کیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق فوری طور پر رقم کا انتظام مشکل ہے کیونکہ میرے شوہر ملک سے باہر ہیں اور میرے اکاؤنٹ میں دس لاکھ سے کچھ اوپر ہی ہوں گے... جبکہ مکان کا مالک فوری طور پر پوری رقم مانگ رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹا جائے۔ اچھا تو نہیں لگے گا لیکن اب تم ہمارے خاندان کے ایک فرد ہو۔ اس لیے کیا یہ ممکن ہے کہ تم بقیہ رقم کا انتظام کردو؟ ہمیں ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈز کی ضرورت ہوگی۔ اس طرح ہم آج ہی یہ سودا فائنل کرلیں گے۔''

''مسز ولسن! آپ فکر نہ کریں۔ رقم کا بندوبست ہو جائے گا۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور تعظیماً جھکنے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔ اس کی واپسی ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ اپنے ساتھ ایک بڑا سا بریف کیس لے کر آیا تھا جس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ یہ اس کی کُل جمع پونجی تھی، ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈز... اور اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ لیکن وہ مطمئن تھا کہ اس سرمایہ کاری کے نتیجے میں اسے دس گنا فائدہ ہوگا۔

مسز ولسن نے شکریہ کے ساتھ وہ بریف کیس اس سے لے لیا اور بولی۔ ''تمام کارروائی مکمل ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم فوراً اسٹرینڈ ہیم جاکر وہ مکان دیکھ لو۔ مالک مکان تمہارا انتظار کررہا ہوگا۔ وہ تمہیں اس کی مرمت اور تزئین و آرائش کے بارے میں کچھ ضروری باتیں بتانا چاہتا ہے۔''

''اوہ!'' سارہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تو بڑے زور کی بھوک ہورہی ہے۔ کیا ہمیں فوراً وہاں جانا ہوگا؟''

''ہاں، یہ بہت ضروری ہے۔ اگر آج مالک مکان سے ملاقات نہ ہوئی تو بہت سی باتیں ادھوری رہ جائیں گی جن کی وجہ سے ہمیں بعد میں مشکلات ہوسکتی ہیں۔ کرسٹائن! کیا تم اکیلے جاسکتے ہو؟ میں انہیں فون کرکے تمہاری آمد کی اطلاع دے دیتی ہوں۔''

''ہاں ہاں... کیوں نہیں، مسز ولسن۔'' کرسٹائن نے سعادت مندی کے انداز میں کہا۔ ''میں تمام معاملات دیکھ لوں گا لیکن...''

''میں سمجھ گئی کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ جانتی ہوں کہ رقم پوری کرنے کے لیے تم نے اپنی پرانی کار بھی بیچ دی ہے۔ اچھا ہی ہوا' اس کھٹارا کار میں وہاں جاتے ہوئے کیا اچھے لگتے۔ تم میری کار میں چلے جاؤ۔''

اس کے لیے اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی تھی۔ وہ مسز ولسن کی لگژری کار میں بیٹھا اور مقررہ وقت میں سوئیل کا سفر طے کرکے اسٹرینڈ ہیم پہنچ گیا۔ بالآخر اس نے وہ سب کچھ حاصل کرلیا جو وہ چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہ جگہ کافی مشہور تھی اور وہاں کا بچہ بچہ اس سے واقف تھا۔ وہ لوگوں سے پوچھتا ہوا منزلِ مقصود تک پہنچ گیا۔ اس کے سامنے ساحلِ سمندر پر ایک سفید پُرشکوہ عمارت کھڑی تھی اور اس کے اطراف میں انتہائی مہنگے مکانات تھے۔ اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور دلچسپی سے اس شان دار ولا کو دیکھنے لگا جو مستقبل قریب میں اس کی ملکیت بننے والا تھا۔ وہ اپنے گول تک پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

گھنٹی بجانے پر ایک بوڑھے آدمی نے دروازہ کھولا اور ناگواری سے بولا۔ ''کیا بات ہے؟ اگر تم کچھ بیچنے آئے ہو تو میں مشورہ دوں گا کہ سیکیورٹی گارڈ کے آنے سے پہلے چلے جاؤ۔ اس علاقے میں کسی کو کاروبار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''میرا نام کرسٹائن گراس مین ہے اور میں اس مکان کا نیا مالک ہوں۔'' اس نے اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر لاڈوک میرا انتظار کررہے ہوں گے۔''

اس بوڑھے نے اپنی بھویں اوپر اٹھائیں اور کچھ دیر تک یوں کھڑا رہا جیسے یہ جبر سن کر اسے حیرانی ہوئی ہو۔ پھر پلکیں جھپکتے ہوئے بولا۔ ''نیا مالک، اوہ اچھا... میں سمجھ گیا... ایک منٹ ٹھہرو۔''

وہ اندر چلا گیا اور چند منٹ بعد اس کی واپسی ایک اور عمر رسیدہ شخص کے ساتھ ہوئی جو ساٹھ کے پیٹے میں تھا۔ وہ ملک کا سب سے مشہور وکیل لاڈوک تھا۔ کرسٹائن نے اسے ایک نظر میں ہی پہچان لیا۔ وہ اس کی تصویریں اخبارات اور ٹی وی پر دیکھ چکا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔

''بات سنو۔'' لاڈوک نے گرج دار آواز میں کہا۔ یہ وہی آواز تھی جسے سن کر عدالت میں بڑے سے بڑے مجرم کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ ''یہ میں کیسی عجیب وغریب کہانی سن رہا ہوں۔ یہ جگہ میری ہے اور میرا... مرتے دم تک اسے بیچنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تم کون ہو... بہرحال' مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔''

کرسٹائن نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن وہ سنے بغیر تیزی سے اندر چلے گئے۔ اس کا ذہن انجانے وسوسوں سے بھر گیا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور کار میں بیٹھ کر واپس شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس بار کار کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔

''میں اس منحوس عورت کی گردن توڑ دوں گا۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا اور کار کے اسٹیئرنگ پر اس کی گرفت مزید سخت ہوگئی۔

وہ ایک بار پھر مسز ولسن کے سامنے کھڑا تھا لیکن وہ اس پر حملہ نہیں کرسکا۔ جس مسز ولسن کو وہ دیکھ رہا تھا، وہ بدل گئی تھی۔ دبلی پتلی، سیاہ بالوں والی ہوشیار عورت کی جگہ اب ایک موٹی، سنہری بالوں اور قدرے کرخت آواز والی عورت کھڑی ہوئی تھی۔

''تم کس مسز ولسن کی بات کررہے ہو؟'' وہ عورت غصے سے بولی۔ ''میں ہی مسز ولسن ہوں۔ میرے علاوہ یہاں اس نام کی کوئی عورت نہیں رہتی۔ میں اور میرا شوہر چند گھنٹے قبل ہی چھٹیاں گزار کر واپس آئے ہیں۔ ہماری کوئی بیٹی نہیں ہے بلکہ ایک لڑکا ہے۔ ٹھہرو، میں تمہیں اس سے ملواتی ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے بیٹے کو آواز دی۔ ''پیڈی! ذرا ایک منٹ کے لیے یہاں آنا۔''

ایک سنہری بالوں والا نوجوان لڑکا آیا۔ وہ کچھ الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ غصے سے بولا۔ ''لگتا ہے کہ ہماری غیر موجودگی میں یہاں کوئی آیا تھا۔ کچھ چیزیں غائب ہیں۔ یاد کریں' وہ سنہری شیخ دان جو آپ کو آنٹی مالا نے دیا تھا۔''

سرخ چہرے والی عورت نے ایک زوردار چیخ ماری اور کرسٹائن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ یہی شخص ہوسکتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ ہماری غیر موجودگی میں یہاں آیا تھا اور میری جگہ کسی دوسری عورت سے جو اپنا نام مسز ولسن بتاتی تھی، ملتا رہا ہے۔ یہی چور ہے۔ پولیس کو بلاؤ۔ اسے جانے مت دینا۔''

☆☆☆

حسنِ سادگی

ایک صاحب طوطا خرید لائے اور بیوی سے کہا کہ وہ اسے چُوری کھلائے۔ وہ سگریٹ لانا بھول گئے ہیں اور بازار جارہے ہیں۔ جب وہ لوٹے تو دیکھا کہ بیوی بلّی کو چوری کھلا رہی ہے۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" انھوں نے پوچھا۔ "میں نے بلّی کو نہیں طوطے کو چوری کھلانے کو کہا تھا۔"

سیدھی سادی بیوی نے جواب دیا۔ "طوطا بلّی کے پیٹ میں ہی تو ہے۔"

کرسٹائن نے فرار کے لیے باغ کا راستہ اختیار کیا۔ وہ تیزی سے دوڑتا ہوا بیرونی باڑھ تک پہنچا اور ایک ہی جست میں سڑک تک پہنچ گیا جہاں اس کی کار کھڑی تھی۔ وہ پسینے میں شرابور، غصے سے بے حال گاڑی دوڑاتا ہوا چلا جارہا تھا۔ اسے جس طرح بے وقوف بنایا گیا تھا، اس کے بعد اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھنا فطری امر تھا۔ اس نے قسم کھائی کہ سارہ کے سر میں سوراخ کیے بغیر وہ چین سے نہیں بیٹھے گا۔ تاہم اسے سارہ سے انتقام لینے کا موقع نہ مل سکا۔ وہ جب اس کے اپارٹمنٹ پہنچا تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ یہی وہ اپارٹمنٹ تھا جہاں اس نے سارہ کے ساتھ کئی گھنٹے گزارے تھے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کی تھی لیکن اس وقت دروازے میں جو عورت کھڑی تھی، وہ سارہ نہیں تھی بلکہ اس کے مقابلے میں کہیں جوان اور خوب صورت تھی۔ جب کرسٹائن نے اصرار کیا کہ وہ اس اپارٹمنٹ میں سارہ سے ملنا چاہتا ہے تو وہ عورت زچ ہوگئی اور اس نے اپنی ہی عمر کی دو لڑکیوں کو آواز دے کر بلایا اور کہنے لگی۔ ''دیکھو لڑکیو! یہ شریف آدمی کیا کہہ رہا ہے۔ شکل وصورت تو اچھی ہے لیکن لگتا ہے کہ اس کے دماغ پر گرمی چڑھ گئی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ اپارٹمنٹ کسی سارہ نامی لڑکی کا ہے اور یہ اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کررہا ہے کہ میں یعنی ٹینا اس اپارٹمنٹ میں رہتی ہوں۔ ہے نا دلچسپ بات؟ ممکن ہے کہ یہ بھی لڑکیوں سے دوستی کرنے کا ایک طریقہ ہو۔ آج کل کے مردوں سے ہر بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔''

www.kahopakistan.com

ان لڑکیوں کے قہقہوں اور طنز کا نشانہ بننے کے بعد اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی ہے۔ وہ ایک جانور کی طرح ان لڑکیوں پر غرایا اور اپنی کار میں جا کر بیٹھ گیا۔ غصے کے مارے اس کی حالت بُری ہو رہی تھی اور وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ گھر چلنا چاہیے۔ مزید خوار ہونے سے بہتر ہے کہ اپنے گھر میں بیٹھ کر اپنا غصہ ٹھنڈا کرے اور پُرسکون ہو کر آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچے۔

☆☆☆

وہ اپنے فلیٹ میں واپس آ گیا لیکن وہاں کا منظر بھی کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ دو ہٹے کٹے آدمی اس کے گھر پر براجمان تھے اور اسے دیکھ کر بھی وہ بالکل پریشان نہیں ہوئے۔

''کیا میں اس حرکت کا مطلب جان سکتا ہوں؟'' کرسٹائن نے کمزوری آواز میں کہا۔

ان میں سے ایک پستہ قد کا شخص جو عمر میں بڑا لگ رہا تھا، مسکراتے ہوئے بولا۔ ''پولیس مسٹر کرسٹائن۔ میرا نام انسپکٹر لین ہے اور ہمارے پاس یہاں کا سرچ وارنٹ بھی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کرسٹائن کی ناک کے سامنے ایک کاغذ لہرایا۔

''تمہاری غیر موجودگی میں ہم نے گھر کی تلاشی لی ہے اور دیکھو، ہمیں یہاں سے کیا ملا ہے۔'' اس کے ہاتھ میں ایک پلاسٹک کی تھیلی تھی جس میں کوئی سونے کی بھاری چیز رکھی ہوئی تھی۔ کرسٹائن کا دل ڈوبنے لگا۔ یہ وہی شمع دان تھا جو اسے مس ولسن نے شادی کے تحفے کے طور پر دیا تھا۔

''یقیناً اس سے پہلے تمہاری نظر اس پر نہیں گئی ہو گی؟'' انسپکٹر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''نہیں، میرا مطلب ہے... ہاں۔'' اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

انسپکٹر لین منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں سوچ سمجھ کر بیان دینا ہے کیونکہ جیرالڈ ولسن جھوٹے بیان پر کبھی یقین نہیں کرتا اور یہ تو تم جان ہی گئے ہو گے کہ وہ کتنا بااثر شخص ہے جس کے گھر سے تم نے یہ نادر شمع دان چرایا تھا۔''

دوسرا پولیس والا جو کچھ دیر پہلے باہر چلا گیا تھا، واپس آ گیا اور اس نے انسپکٹر لین کے کان میں سرگوشی کی۔ لین نے سر ہلایا پھر دانت پیستے ہوئے کرسٹائن کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''تمہاری اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ اطالوی سفارت خانے کی کار چوری کرو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ یہ کتنا سنگین جرم ہے؟ اطالوی سفیر تو آسمان سر پر اٹھا لے گا۔ وہ ویسے بھی غصے کا بہت تیز ہے۔''

کرسٹائن نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''میری بات سنو۔'' وہ نیچی آواز میں بولا۔ ''میرے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے۔''

انسپکٹر لین نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''بہت بڑا دھوکا... یہ خوب کہا تم نے۔ اس کے بجائے یوں کہنا چاہیے کہ یہ تم ہو جو لوگوں کے ساتھ دھوکا دہی کی وارداتیں کرتے پھر رہے ہو۔''

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ لین نے کرسٹائن کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے، تم بات کر سکتے ہو لیکن کوئی غلط حرکت مت کرنا۔''

کرسٹائن نے فون اٹھایا اور مُردہ سی آواز میں ہیلو کہتے ہوئے ریسیور کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے کوئی زنانہ آواز میں بول رہا تھا۔ کرسٹائن اس آواز کو ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ سارہ تھی لیکن اس وقت وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ اس کی سادگی اور معصومیت سب رخصت ہو چکی تھی اور اب وہ ایک ایسی ہیڈ مسٹریس کے انداز میں بول رہی تھی جسے شریر بچوں کو سدھارنے کا فن خوب آتا ہے۔

''مسٹر کرسٹائن! وقت آ گیا ہے کہ میں تمہیں اپنی حقیقت سے آگاہ کر دوں۔ میرا تعلق ویمن لیگ سے ہے۔ اس تنظیم کے پورے ملک میں ہزاروں ممبر ہیں اور اس کا مقصد تم جیسے لوگوں سے اپنے ممبران کو بچانا ہے۔ وہ رقم جو تم نے گزشتہ چار برسوں میں سات معصوم اور سادہ لوح عورتوں سے لوٹی تھی، اب انہیں لوٹا دی جائے گی۔ تمہیں تو شاید کافی عرصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنا پڑے لیکن جب کبھی تم باہر آئے، ہمیں اپنا منتظر پاؤ گے۔ تم ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکو گے اور نہ ہی ہم تمہیں پرانا کھیل کھیلنے کی اجازت دیں گے۔ تمہیں ایک باعزت پیشہ اختیار کرنا ہو گا اور ایمان داری سے زندگی گزارنا ہو گی۔ گڈ لک۔''

دوسری طرف سے ریسیور رکھنے کی آواز آئی۔ کرسٹائن اپنی جگہ کھڑا بن پانی کی مچھلی کی طرح ہانپ رہا تھا۔ انسپکٹر اس کی طرف بڑھا اور بولا۔ ''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ تمہاری آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ کیا تم کسی شیطان سے گفتگو کر رہے تھے؟ خیر، یہ میرا کام نہیں ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ جیل کی سلاخیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔''

تعلق

میر محمد بلوچ

زندگی میں بہت سی باتیں ادھوری... اور ان کہی رہ جاتی ہیں... ان میں ایک خاص طرح کا حسن بھی محسوس ہوتا... وہیں ان سنی رہ جانے والی باتیں... ہمیشہ کے لیے ایک چبھن... الجھن اور کسک میں مبتلا کر دیتی ہیں... ایک ایسے ہی شخص کا دل گرفتہ فسانہ... جو اپنے ساتھ منسلک ہستی سے خاص رشتہ جوڑنا چاہتا تھا...

تعلقات کی پیچیدگی کو محسوس کرنے والے محبت گزیدہ شخص کی کھوج و جستجو

برینڈن نے جولیا کی بھیجی ہوئی ای میل پڑھی تو یوں لگا جیسے دل میں پڑی گرہیں کھلتی جا رہی ہوں۔ یہ پیغام جمعے کی شام بھیجا گیا تھا لیکن طبیعت خراب ہونے کے سبب وہ چھٹیوں کے دوران میں کمپیوٹر پر اپنی میسیجز نہ دیکھ سکا۔ ویسے بھی اسے جولیا کے پیغام کی توقع نہیں تھی کیونکہ جانے سے پہلے ان دونوں کے درمیان اچھی خاصی لڑائی ہوئی تھی لیکن جولیا نے اس پیغام میں اس کا کوئی تذکرہ کیا تھا اور نہ ہی ایسا کوئی اشارہ دیا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ وہ اسے یاد کر رہی ہے۔ اس کے بجائے اس نے اپنے کام کے حوالے سے ایک رپورٹ بھیجی تھی۔ برینڈن نے اس پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور اسے آگے بڑھا دیا۔

www.kahopakistan.com

وہ کئی لمحوں تک کمپیوٹر اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ باہر بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی۔ ایسے میں دفتر سے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا چنانچہ وہ بارش تھمنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے دفتر کی تمام روشنیاں گل کر دیں اور صرف ایک بلب جلتے رہنے دیا۔ جولیا سے اس کا تعلق بہت زیادہ پرانا نہیں تھا بلکہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے بھی نہ تھے، اس کے باوجود اسے جولیا کے سپاٹ پیغام سے مایوسی ہوئی۔ وہ توقع کر رہا تھا کہ جولیا اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور کہے گی اسی لیے اس نے ایک بار پھر اس پیغام کو غور سے پڑھا شاید اس میں کوئی ایسا چھپا ہوا اشارہ مل جائے جس سے وہ اس کے جذبات کا اندازہ لگا سکے۔

''یہاں کافی گرمی ہے۔ اگست کے مہینے میں ایسے موسم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اگر دوبارہ یہاں آنے کا موقع ملا تو میں جنوری میں آنا پسند کروں گی۔ یہاں کا ائرپورٹ بھی کسی بس اسٹیشن کا منظر پیش کرتا ہے۔ یہاں سے ڈینگریگا تک کا سفر بھی بے حد دلچسپ اور ایڈونچر سے بھرپور ثابت ہوا۔ مجھے وہاں تک لے جانے کے لیے ریزورٹ والوں نے اپنا ڈرائیور بھیج دیا تھا۔ یہاں کے لوگ غریب ہونے کے باوجود مہذب اور شائستہ مزاج ہیں۔ سڑک ناہموار ہونے کی وجہ سے ہمیں ہوٹل تک پہنچنے میں تیس منٹ لگ گئے۔ میں نہیں سمجھتی کہ چھٹیاں گزارنے کے لیے یہاں آنے والے سیاح اس راستے پر سفر کرنا پسند کریں گے۔ ڈرائیور اور ہوٹل کا عملہ مقدور بھر خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتا رہا۔ یہ لوگ بہت اچھی انگریزی بولتے ہیں جبکہ کئی دوسری زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد افریقی غلام تھے جو سترھویں صدی میں سینٹ ونسینٹ کے جزیرے سے فرار ہو کر اس علاقے میں آن بسے تھے۔ انہیں اپنے ورثہ اور روایات پر بڑا ناز تھا شاید اسی لیے ہوٹل کی انتظامیہ نے مجھے متاثر کرنے کے لیے ایک شو کا اہتمام کیا جس میں موسیقاروں اور رقاصوں نے اپنا روایتی لباس پہن کر شرکت کی۔

''اب میں یہاں کی رہائشی سہولتوں کا ذکر کروں گی۔ دیکھنے میں یہ ایک افریقی گاؤں جیسا نظر آتا ہے۔ زیادہ تر کاٹیجز کافی کشادہ ہیں اور ہر ایک کے ساتھ خوب صورت پورچ بھی بنایا گیا ہے جس میں بید کی کرسیاں رکھی ہوئی ہیں کیونکہ یہاں بارشیں بہت ہوتی ہیں اس لیے یہاں بیٹھ کر سمندر کا نظارہ کیا جاسکتا ہے لیکن یہ سمندر بالکل سپاٹ اور پُرسکون ہے اور اس میں سیاحوں کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں۔ اسی طرح یہاں کا ساحل بھی کچھ زیادہ پُرکشش نہیں۔ یہاں جابجا گندگی نظر آتی ہے۔ اسے کسی طرح بھی ایک مثالی ساحلی تفریح گاہ نہیں کہا جاسکتا۔

''ریزورٹ کی لابی، گفٹ شاپ، ڈائننگ ہال اور بار سب ایک ہی چھت کے نیچے واقع ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھنے میں بہت خوب صورت اور صاف ستھرا ہے لیکن چیزوں میں بہت زیادہ ورائٹی نہیں ہے۔ ہوٹل کے دونوں مالکان اور ہمارے متوقع پارٹنر بظاہر تو بہت اچھے ہیں لیکن ان میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو مجھے بے چین کر رہی ہے۔ ان میں سے ایک ہرنانڈو فیونٹس، ہسپانوی نژاد ہے بظاہر وہ بے ضرر سا نظر آتا ہے اور زیادہ تر اپنے بیوی بچوں کے بارے میں باتیں کرتا رہتا ہے۔ البتہ وہ ڈرنک بہت کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کے پاس بیٹھنا بہت مشکل ہے۔ دوسرے کا نام کلاڈیل بیکی ہے۔ وہ ایک طویل قامت اور بھاری بھرکم شخص ہے لگتا ہے کہ یہاں کا سارا انتظام اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنے ملازمین سے بھی خوب ہنسی مذاق کرتا ہے اور وہ بھی اسے پسند کرتے ہیں۔ اس کے برعکس فیونٹس ریزرو ٹائپ بندہ ہے اور زیادہ وقت بارٹینڈر کے پاس ہی گزارتا ہے۔ مجھے تو شک ہے کہ بہت سے ملازمین اسے پہچانتے بھی نہیں ہوں گے۔

''سچ پوچھو تو میں واضح طور پر نہیں بتا سکتی کہ مجھے یہاں کیا تکلیف ہے۔ ہر چیز مکمل ہونے کے باوجود ادھوری سی لگتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہاں کی غربت ہو جس کی وجہ سے میری مایوسی بڑھ گئی ہے۔ میں رات کو ٹھیک طرح سے سو بھی نہیں سکی حالانکہ کمرا اور بستر بہت آرام دہ ہیں۔ اس کے باوجود میری آنکھ بار بار کھل جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی دروازے پر دستک دے رہا ہو لیکن میرے پوچھنے پر کوئی جواب نہیں دیتا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ شاید یہ کوئی ڈاکو ہو لیکن انتظامیہ کا کہنا ہے کہ یہاں ساری رات ایک چوکیدار کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ میرے لیے یہ بہت ہی عجیب اور تکلیف دہ صورت حال تھی لیکن اسٹاف اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں۔

''کل صبح میں آثار قدیمہ دیکھنے جاؤں گی جو یہاں آنے والے سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔ اس کے بارے میں، میں مزید تفصیلات بعد میں بھیجوں گی۔ اب مجھے نظر نہ آنے والے کیڑوں نے کاٹنا شروع کر دیا ہے لہٰذا مجھے کمرے میں محصور ہونا پڑے گا۔ سورج غروب ہو رہا ہے اور اپنے تمام اندیشوں کے باوجود یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ یہ ایک انتہائی دلکش نظارہ ہے۔ اس کے باوجود میں اپنے آپ کو یہاں اجنبی اور تنہا محسوس کر رہی ہوں۔ میری کوشش ہے کہ جلد از جلد گھر واپس آجاؤں۔ جولیا۔''

برنیڈن نے آخری سطور کو دوبارہ پڑھا۔ کیا یہ واقعی اس کے لیے لکھی گئی تھیں، کیا واقعی وہ اس کی عدم موجودگی میں تنہائی محسوس کر رہی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے دل میں امید کی شمع روشن ہوگئی۔ یقیناً جولیا کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہوگا اور واپس آنے کے بعد وہ تمام جھگڑے بھلا کر نئے سرے سے اپنا تعلق جوڑیں گے اب اس کے لیے انتظار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا اور جولیا کی میز پر اس کی واپسی کی تاریخ تلاش کرنے لگا تاکہ وہ اسے لینے ائرپورٹ جاسکے۔

دفتر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اس لیے اجنبی کو اندر آنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس نے اپنی بھیگی ہوئی چھتری دیوار سے لگائی اور غور سے برنیڈن کو دیکھنے لگا۔

''میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' برنیڈن حیران ہوتے ہوئے بولا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس شخص کو ایسی کیا مصیبت پیش آگئی جو اتنی بارش میں نکل کھڑا ہوا۔

''ریزورٹس انویسٹمنٹ کا دفتر یہی ہے؟'' اس شخص نے رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

برنیڈن نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن وہ اس شخص کی آمد کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا کیونکہ دیکھنے میں وہ نہ تو کوئی گاہک لگ رہا تھا اور نہ ہی سیلز مین جس کا ان کے بزنس سے کوئی تعلق بنتا ہو لہٰذا اس نے ایک بار پھر کہا۔ ''میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

''جولیا... میرا مطلب ہے کہ کیا مس جولیا اسی دفتر میں کام کرتی تھی؟''

''تھی...؟'' برنیڈن کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ اب بھی یہاں کام کرتی ہے۔''

''کیا تم اس کے ساتھی ہو؟''

''ہاں، لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

اجنبی نے اپنی جیب سے شناختی کارڈ نکالا اور برنیڈن کو دکھاتے ہوئے بولا۔ ''میرا تعلق اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ سے ہے۔ کیا تم اس کمپنی کے مالک ہو۔ ہم نے کئی بار یہاں فون کیا اور پیغام بھی چھوڑا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔''

''نہیں۔'' برنیڈن کو یاد آیا کہ جب وہ جولیا کا پیغام پڑھ رہا تھا۔ اس دوران میں کئی مرتبہ فیکس مشین کی لائٹ جلتی بجھتی رہی۔ ''اس کمپنی کی مالکن شہر سے باہر ہے اور کل تک ہی واپس آسکے گی لیکن یہ سب تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''ہم جولیا کے وارثوں کو تلاش کر رہے ہیں، کیا تم اس سلسلے میں ہماری کچھ مدد کرسکتے ہو؟''

برنیڈن کو لگا کہ وہ تاریکی میں ڈوبتا جا رہا ہے اور باہر ہونے والی بارش ایک قیامت خیز طوفان میں تبدیل ہوچکی ہے۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ نیویارک کی رہنے والی تھی۔''

''وہ اس وقت ائرپورٹ پر ہے۔'' اجنبی نے پُراسرار انداز میں کہا۔

''ائرپورٹ۔'' برنیڈن حیران ہوتے ہوئے بولا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں نے اسے ائرپورٹ پر کیوں روک رکھا ہے، کیا وہ اسے منشیات فروش یا اسمگلر سمجھ رہے تھے۔

''اس نے ایسا کیا کر دیا کہ تم لوگوں نے اسے ائرپورٹ پر روک رکھا ہے؟''

''اس نے کچھ نہیں کیا بلکہ وہ مرچکی ہے۔ اس کا انتقال بیلیز میں ہوا۔ یہ ہماری ذمے داری ہے کہ اس طرح کے حالات میں امریکیوں کی لاش ان کے گھر تک پہنچائیں۔ امید ہے کہ تم اس سلسلے میں ہماری مدد کرو گے۔''

برنیڈن کے لیے اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونا دشوار ہوگیا۔ اس نے بہ مشکل تمام کرسی کے ہتھے کو پکڑا۔ وہ بے یقینی کے عالم میں اس اجنبی شخص کو دیکھ رہا تھا اور اس میں اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ اس کے کسی سوال کا جواب دے سکتا۔

☆☆☆

یہ علاقہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ جولیا نے اپنے پیغام میں لکھا تھا۔ جولیا نے اسے ایک پوسٹ کارڈ بھی بھیجا تھا جو اس کی تدفین کے کئی روز بعد موصول ہوا۔ یہ اس کی آخری نشانی تھی جسے برنیڈن نے ایک تعویذ کی طرح اپنی جیب میں رکھ لیا لیکن اس پوسٹ کارڈ پر لکھی تحریر کو بار بار پڑھنے کے باوجود اسے ایسا کوئی اشارہ نہ مل سکا جس سے اظہار ہوتا کہ اس نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کیوں کی تھی۔ پورٹر کے جانے کے بعد وہ بستر کے کنارے ... بیٹھ گیا اور پوسٹ کارڈ کی پشت پر لکھی جولیا کی تحریر پڑھنے لگا۔

''میں نہیں جانتی کہ یہ کارڈ تمہیں کب ملے گا۔ اس تصویر میں سامنے کی طرف جو پہاڑیاں نظر آرہی ہیں، میں وہاں گئی تھی۔ راستے میں ایک جگہ ٹریفک جام تھا۔ ڈرائیور نے بتایا کہ راستے میں ایک جگہ ایسی ہے جہاں بھوت نظر آتے ہیں اس لیے کافی دنوں سے لوگوں نے اس جانب سفر کرنا

www.kahopakistan.com

چھوڑ دیا ہے۔ آگے ایک خطرناک موڑ تھا جہاں بھوت موجود ہو سکتے تھے۔ ڈرائیور نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے گاڑی روک دی اور زور زور سے قہقہے لگانے لگا... شاید وہ ظاہر کرنا چاہ رہا تھا کہ یہ محض توہم پرستی ہے لیکن کوئی بھی گاڑی وہاں سے آگے نہیں جا رہی تھی لہٰذا ہمیں بھی واپس آنا پڑا۔ امید ہے کہ جلد ہی تم سے ملاقات ہوگی، جولیا۔"

برینڈن کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ یہ بات اس کے گمان میں بھی نہ تھی کہ اب وہ کبھی جولیا کو نہ دیکھ سکے گا۔ کیا جولیا نے محض ایک رسمی جملہ لکھا تھا یا واقعی وہ خودکشی کا ارادہ کر چکی تھی کیونکہ پہاڑیوں سے واپس آنے کے چند گھنٹوں بعد ہی اس کی موت واقع ہوگئی تھی گو کہ اس نے جولیا کی وہ تصاویر نہیں دیکھی تھیں جو مرنے کے بعد کھینچی گئی تھیں لیکن پولیس نے اسے اس بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ انہیں برینڈن اور جولیا کے تعلقات کا علم نہیں تھا اور وہ اسے محض جولیا کا ساتھی اور دوست سمجھ رہے تھے۔ اس نے بھی خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا ورنہ شاید اس کی باس ڈونا اور فلاڈیلفیا ہیڈ آفس کبھی بھی اسے جولیا کا ادھورا کام مکمل کرنے کے لیے نہ کہتے۔ اب اس کے پاس صرف پانچ دن تھے۔ اسی دوران میں اسے جولیا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے یہ سفارش کرنی تھی کہ آیا اس ریزورٹ میں سرمایہ کاری کرنے کے منصوبے کو آگے بڑھایا جائے یا اس سے دست برداری اختیار کر لی جائے۔

جولیا نے خودکشی کے لیے بہت ہی سادہ اور مؤثر طریقے کا انتخاب کیا تھا جو کہ جیل کے قیدیوں میں بہت مقبول ہے۔ اس نے نہانے کے گاؤن میں سے ٹیری کلاتھ بیلٹ نکالی اور اس کا ایک سرا باتھ روم کے دروازے میں لگے ہوئے کپڑے ٹانگنے کے ہک سے باندھ دیا اور دوسرا سرا اپنی گردن کے گرد لپیٹ کر گرہ باندھ لی۔ بیلٹ کی لمبائی اتنی تھی کہ وہ آسانی سے باتھ روم کے فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ سکتی تھی پھر وہ آگے کی طرف جھکی اور اس کی گردن کے گرد بیلٹ کا حلقہ تنگ ہوتا گیا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ ہوش و خرد سے بے گانہ ہو چکی تھی۔ پولیس آفیسر نے بتایا تھا کہ اس طرح مرنے میں زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔ اس نے مرنے سے پہلے کوئی تحریر نہیں چھوڑی جس سے معلوم ہوتا کہ اس نے یہ انتہائی قدم کیوں اٹھایا۔

مقامی پولیس نے اس کی قومیت شناخت کرنے کے بعد فوراً ہی امریکی سفارت خانے کو اطلاع دے دی تھی لیکن ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس کی لاش ہٹالی گئی۔ البتہ پوسٹ مارٹم کے دوران سفارت خانے کا ایک سراغ رساں موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پولیس کے ابتدائی بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی یا جنسی تشدد نہیں کیا گیا۔ مقامی پولیس آفیسر نے خودکشی کی ممکنہ وجہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

"اس قسم کی صورت حال میں ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جب لوگ کسی اجنبی جگہ پر اپنے آپ کو تنہا اور ذہنی طور پر منتشر سمجھتے ہوں۔ میں نے گزشتہ برسوں میں ایسے کئی واقعات دیکھے ہیں۔ میری رائے میں اس طرح تنہا سفر کرنا ٹھیک نہیں۔ اس کے لیے آپ کو بہت زیادہ مضبوط ہونا چاہیے۔"

دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک نے برینڈن کو اپنے خیالات سے باہر آنے پر مجبور کر دیا۔ دروازے پر وہی شخص کھڑا مسکرا رہا تھا جو اسے ائرپورٹ سے لے کر آیا تھا۔ وہ تھوڑا سا فربہ اور زرد رو تھا۔ اس نے سلیقے سے اپنے بالوں میں کنگھی کر رکھی تھی۔ برینڈن کو دیکھ کر اس کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی اور وہ اپنے دانت نکالتے ہوئے بولا۔ "مسٹر برینڈن! میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟"

برینڈن نے نفی میں سر ہلایا تو وہ اس کی طرف ایک بوتل بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ ہوٹل کی انتظامیہ کی طرف سے ہے۔ امید ہے کہ تمہیں اس کا ذائقہ پسند آئے گا۔"

برینڈن نے بوتل پر لگے ہوئے معمولی سے لیبل کو پڑھا اور بولا۔ "شکریہ، اس کی کیا ضرورت تھی۔"

وہ شخص تعظیماً تھوڑا سا جھکا اور واپس جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ برینڈن بولا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ مس جولیا کس کمرے میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ کہیں یہ وہی کمرا تو نہیں؟"

وہ شخص مڑتے ہوئے بولا۔ "میں اس کا ڈرائیور نہیں تھا اور نہیں جانتا کہ اس کا قیام کس کمرے میں تھا۔ اس بارے میں انتظامیہ ہی بہتر طور پر بتا سکتی ہے۔"

دوسری صبح ناشتے کی میز پر اس کا سامنا پیگی اور فیونٹس سے ہو گیا۔ اس کی نگاہیں کھڑکی سے باہر مرکوز تھیں کہ ان میں سے ایک اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی مسٹر برینڈن۔ میرا نام کلاڈیل پیگی اور یہ میرا پارٹنر برنانڈو فیونٹس ہے۔ امید ہے کہ تمہارا سفر خوش گوار رہا ہوگا۔ ناشتا کیسا لگا؟"

برینڈن نے عجلت میں کچا پکا انڈا نگلنے کی کوشش کی اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "تم سے مل کر خوشی ہوئی۔"

"نہیں نہیں، بیٹھے رہو۔" پیگی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ فیونٹس نے بھی اس کی تقلید کی۔ پیگی نے ایک ویٹرس کو اشارہ کیا اور باآوازِ بلند بولا۔ "برینڈا پلیز! کافی لاؤ۔"

پیگی نے برینڈن کی پلیٹ دیکھی اور بولا۔ "تم نے ہمارے شیف کا تیار کردہ خوش ذائقہ آملیٹ نہیں چکھا، مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں بہت پسند آئے گا۔"

"ہاں، میں نے بھی یہاں کے کھانوں کی بہت تعریف سنی ہے۔ جولیا نے مجھے بتایا تھا۔"

"بے چاری جولیا۔" پیگی افسوس کرتے ہوئے بولا۔ "اس سے پہلے یہاں کبھی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔"

"میں اور میری بیوی اس کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں۔" فیونٹس بولا۔ "ہم نے اس کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے چرچ میں موم بتیاں بھی روشن کی تھیں۔ شاید اسی طرح کچھ تلافی ہو سکے۔"

"تلافی۔" برینڈن چونکتے ہوئے بولا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"خودکشی کوئی اچھی بات تو نہیں۔ میرے خیال میں مایوس لوگ ایسا کرتے ہیں۔" فیونٹس بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس مرتبہ برینڈن نے اپنا جملہ قدرے بلند آواز میں دہرایا۔

"اس کی روح پرواز کر گئی ہے۔" فیونٹس اس کے لہجے کی سختی کو محسوس کرتے ہوئے سہمے ہوئے انداز میں بولا۔

"کیا وہ کیتھولک تھی؟"

"تم اپنی کافی ختم کرو اور خاموش ہو جاؤ۔" پیگی اپنے پارٹنر کو حکم دیتے ہوئے بولا۔ "تم ہمارے مہمانوں کو پریشان کر رہے ہو۔"

برینڈن نے اپنے چہرے پر پسینے کے قطرے محسوس کیے۔ اس نے دعائیہ انداز میں دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے چہرے پر پھیرے اور آہستہ سے بولا۔ "ہاں، وہ کیتھولک تھی۔"

"اوہ، اچھا۔" فیونٹس نے یوں کہا جیسے اسے اس انکشاف پر حیرت ہوئی ہو۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں تھوڑی دیر بعد واپس آ جاؤں گا۔ میری غیر موجودگی میں تم لوگ بات چیت جاری رکھ سکتے ہو۔"

اس کے جانے کے بعد پیگی بولا۔ "اس کی باتوں کا برا مت ماننا۔ اس وقت اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ مس جولیا کی موت نے اسے بہت زیادہ پریشان کر دیا ہے اور تقریباً ایسی کیفیت ہم سب کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی اس وجہ سے خاصے پریشان ہو۔"

"ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" برینڈن نے اعتراف کیا۔

"کیا تم جولیا کو بہت اچھی طرح جانتے تھے؟" پیگی نے استفسار کیا۔

برینڈن تھوڑا سا ہچکچایا۔ وہ پیگی کو کیا بتاتا کہ جولیا کے ساتھ اس کے کیسے تعلقات تھے۔ وہ شاید خود بھی اس تعلق کو کوئی نام نہیں دے پایا تھا چنانچہ اس نے پیگی کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا وہ یہاں غیر مطمئن نظر آ رہی تھی؟"

"بالکل نہیں۔" پیگی جلدی سے بولا۔ "اس کے برعکس وہ ہمارے ریزورٹ اور مقامی کلچر میں بہت دلچسپی لے رہی تھی۔ وہ یہاں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتی تھی جس پر سب سے زیادہ حیرانی مجھے ہو رہی تھی۔"

"کوئی شخص اسے رات میں پریشان کیا کرتا تھا مسٹر پیگی اور کئی بار اس کے دروازے پر دستک دیا کرتا تھا، کیا یہ بات پولیس کو بتائی گئی؟"

ترس

ایک صاحب علیک سلیک کے بعد اپنے دوست سے کہنے لگے: "یار! آج مجھے تم پر بڑا ترس آ رہا ہے۔"

"وہ کیوں؟" دوست نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہی صاحب بولے: "بات یہ ہے کہ میری بیوی نے ایک قیمتی ساڑی خریدی ہے اور اسے پہن کر دکھانے کے لیے اس نے تمہاری بیگم کو مدعو کیا ہے۔"

بدین سے طاہرہ خانم کی کاوش

خیالِ خاطر

کھانے کے بعد ملازم نے صاحب سے پوچھا:

"چائے لاؤں صاب؟"

صاحب نے کہا: "نہیں، اس سے نیند بھاگ جائے گی۔"

"تو کیا آج آپ گھر ہی میں آرام کریں گے؟" ملازم نے پوچھا۔

"نہیں، میں واپس دفتر جا رہا ہوں۔"

کورنگی کراچی سے حفیظ الرحمٰن کی ہدایت

www.kahopakistan.com

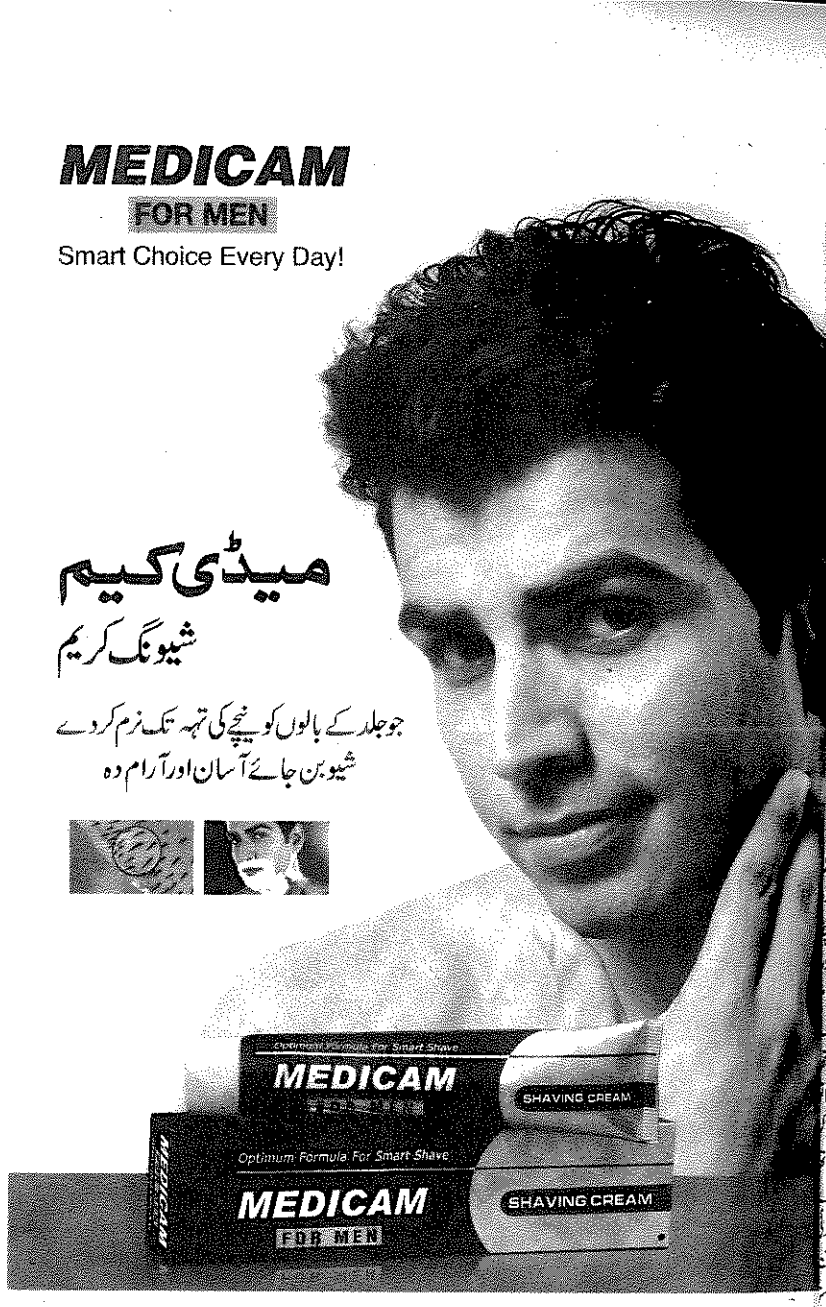

''براہِ کرم مجھے کلاڈیل کہہ کر پکارو۔'' پیگی نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے اس کی شکایت کے بارے میں سن کر اس پر ایکشن لیا تھا اور وہ یہ کہ اس کے دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر ایک چوکیدار کی ڈیوٹی لگا دی تھی لیکن اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ دوسری صبح پھر یہی شکایت ملی جبکہ میرے آدمی نے وہاں کچھ بھی نہیں دیکھا۔ وہ بہت ہی قابلِ اعتماد آدمی ہے۔''

''کیا اس کے دروازے تک جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟'' برنیڈن نے پوچھا۔

پیگی نے لمحے بھر کے لیے برنیڈن کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اگر تم غور سے مشاہدہ کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم ہر روز شام کے وقت ہوٹل میں داخل ہونے والے راستے پر ریت بچھا دیتے ہیں اگر کوئی شخص اس راستے سے چل کر آئے گا تو وہاں اس کے قدموں کے نشان ضرور ملیں گے۔ میرا سیکیورٹی گارڈ اسی راستے پر کرسی ڈالے بیٹھا رہا جو مس جولیا کے کمرے کی طرف جاتا ہے لیکن اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ اگر وہ سو رہا ہو تب بھی کوئی شخص ریت پر قدم رکھے بغیر وہاں سے نہیں گزر سکتا بشرطیکہ وہ کوئی بھوت یا فرشتہ نہ ہو۔''

''پھر یہ سب کیسے ہو گیا؟'' برنیڈن نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

''ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔ اس نے جو کرنا تھا وہ کر لیا لیکن ہمارے حق میں تھوڑی بہت بھلائی کر گئی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اس عورت کے بارے میں ہمدردانہ جذبات رکھتے ہو۔ حیرانی اس بات پر ہے کہ تم یہاں کیوں آئے ہو۔ کیا ہم امید کریں کہ تمہارے آنے سے ہمارا مقصد حل ہو جائے گا اور تم ہمارے بارے میں اپنی کمپنی کو مثبت رپورٹ دے سکو گے، یقین جانو کہ جولیا کی موت سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔''

فیونس بار کے کونے سے نمودار ہوا اور ان کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ''تمام انتظامات مکمل ہیں۔''

''شاید اب ہم تمہارا ٹور شروع کر سکیں۔'' پیگی نے پیشکش کی۔

برنیڈن اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور تھوڑا سا ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر پیگی! ہماری کمپنی کو سیکیورٹی کے حوالے سے کچھ تحفظات ہیں۔''

فیونس اس کے قریب آیا اور اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔ ''موسم گرم ہونے سے پہلے ہمیں نکل جانا چاہیے۔ میں نے تمام انتظامات کر لیے ہیں۔''

پیگی بھی کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''تم دونوں چلو، میں کچھ ضروری کام نمٹا کر آتا ہوں۔''

''کیا میں جولیا کا کمرا دیکھ سکتا ہوں؟'' برنیڈن نے پوچھا۔

دونوں پارٹنرز لمحے بھر کے لیے خاموش ہو گئے پھر پیگی بولا۔ ''وہ تم پہلے ہی دیکھ چکے ہو۔ ہمیں جیسے ہی تمہارے آنے کی اطلاع ملی، وہ کمرا تمہارے لیے مخصوص کر دیا۔ بہرحال مجھے تمہاری ذاتی دلچسپی کے بارے میں علم نہ تھا۔ اگر چاہو تو تمہارا سامان دوسرے کمرے میں رکھوا دوں؟''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔'' برنیڈن جلدی سے بولا۔

پیگی نے کندھے اچکائے اور کچن کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد فیونس نے برنیڈن کو چلنے کا اشارہ کیا اور باہر آنے کے بعد بولا۔ ''میرے دوست! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کمرے میں جھاڑ پھونک کر دی گئی ہے اور ہم نے اس کام کے لیے پادری کو اچھی خاصی رقم ادا کی ہے۔ پھر وہ برنیڈن کی طرف جھکا اور رازداری کے انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''تم جانتے ہو کہ یہ لوگ کتنے توہم پرست ہوتے ہیں۔ ہم بھوتوں کو یہاں آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ورنہ یہاں کوئی بھی کام کرنے کے لیے تیار نہ ہو گا۔''

☆☆☆

اس رات دستک کی آواز اس کے سونے سے پہلے ہی آنا شروع ہو گئی۔ تین مرتبہ کسی نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ برنیڈن تاریکی میں ہی اپنے بستر پر لیٹا رہا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس کے ذہن میں جولیا کی تصویر ابھرنے لگی اور وہ خوف سے منجمد ہو گیا۔ اس سے پہلے وہ کبھی روحوں کا قائل نہ رہا تھا لیکن اب وہ اس بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جولیا کی روح اس سے یہ کمرا چھوڑنے کا مطالبہ کر رہی ہو۔ اس پُراسرار اور خوفناک ماحول میں سب کچھ ممکن تھا۔ گو کہ وہ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے جولیا کے چھوڑے ہوئے کام کو مکمل کرنے اور اس کی موت کے حوالے سے کوئی ثبوت تلاش کرنے کی غرض سے یہاں آیا تھا لیکن اس وقت اس میں ہلنے جلنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ وہ پسینے میں شرابور بستر پر لیٹا اگلی دستک کا انتظار کر رہا تھا۔

www.kahopakistan.com

دوسری صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ دن کافی چڑھ آیا تھا اور سورج کی روشنی پردوں سے چھنتی ہوئی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ باہر سے پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں جو ایک نئی صبح کے روشن ہونے کی نوید دے رہے تھے۔ اچانک ہی دروازے پر دستک ہوئی لیکن یہ آواز قدرے دھیمی اور شائستہ تھی جیسے کوئی اندر آنے کی اجازت مانگ رہا ہو۔ برینڈن بستر سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھا۔

''مسٹر برینڈن! ہم ناشتے پر تمہارا انتظار ہی کرتے رہے۔ تم ٹھیک تو ہو؟''

''ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' برینڈن نے جواب دیا۔

''شاید تم ٹھیک طرح سے سو نہیں سکے۔'' فیونٹس نے اسے غور سے دیکھا۔ ''لگتا ہے کہ رات بھر ان آوازوں نے تمہیں پریشان کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے لیے کمرا تبدیل کرنا بہتر رہے گا۔''

برینڈن سمجھ گیا کہ پیگی اور فیونٹس دونوں ہی جانتا چاہتے تھے کہ گزشتہ شب اس پر کیا گزری اور یہ کہ وہ ان کے منصوبے کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے جس کا مقصد اس کی کمپنی کو ریزورٹ میں سرمایہ کاری پر آمادہ کرنا ہے۔ اس نے نرمی اور ملائمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں یہیں ٹھیک ہوں اور تم لوگوں نے بھی میری حفاظت کی یقین دہانی کروائی ہے۔ اگر کوئی آدھی رات کے وقت میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔''

فیونٹس نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں اور بولا۔ ''ایسا ہی ہے میرے دوست، کلا ڈیل ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت ہے لیکن بدقسمتی سے کچھ چیزیں کنٹرول سے باہر ہو جاتی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ تمہارا وہم ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی چوہا، بندریا، چھپکلی تمہیں تنگ کر رہی ہو۔''

برینڈن کو اس کی ڈھٹائی پر غصہ آ گیا اور وہ تڑخ کر بولا۔ ''میں نہیں جانتا کہ تم اور پیگی کیا کھیل، کھیل رہے ہو لیکن کوئی شخص گزشتہ دو راتوں سے میرے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور جولیا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا، وہ اپنی ای میل میں سب کچھ تفصیل سے لکھ چکی ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ کیا واقعات پیش آئے اور یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

فیونٹس کو بھی غصہ آ گیا اور وہ قدرے تیز لہجے میں بولا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی اس دنیا میں رونما ہونے والے ہر واقعے کے لیے جواب دہ ہوں۔ میں اتنا یقین دلا سکتا ہوں کہ میں اور کلا ڈیل کوئی گیم نہیں کھیل رہے بلکہ کاروبار کر رہے ہیں۔'' اس نے اپنی بات ختم کر کے برینڈن کو غور سے دیکھا اور اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم میرے ساتھ گھومنے نہیں جاؤ گے؟ میرا ارادہ تمہیں یہاں کے قدیم گرجا کی طرف لے جانے کا ہے۔ وہ جگہ سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہے اور وہاں جانے سے تمہیں یہاں کے بارے میں اپنا ذہن بنانے میں مدد ملے گی۔''

برینڈن کو یاد آ گیا کہ جولیا نے بھی اس راستے پر سفر کیا تھا جہاں بھوت پائے جاتے ہیں۔ وہ بولا۔ ''مجھے تیاری کے لیے تھوڑا سا وقت چاہیے۔ میں تم سے ڈائننگ روم میں ملتا ہوں۔''

☆☆☆

راستے میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا اور نہ ہی کہیں ٹریفک جام ملا۔ ڈرائیور نے اعتراف کیا کہ اس نے بھی اس بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے لیکن یہ لوگ قدامت پرست ہونے کے ساتھ ذہنی بھی واقع ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے ایسی کہانیوں پر یقین رکھتے ہیں۔ اچانک ہی بارش شروع ہو گئی اور ہر چیز نکھری نکھری اور صاف نظر آنے لگی لیکن جب وہ منزل پر پہنچے تو بارش تھم چکی تھی اور سورج دوبارہ نکل آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ عبادت گاہ کی طرف قدم بڑھاتے، فیونٹس حاجت کا بہانہ کر کے باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ برینڈن کو شبہ تھا کہ وہ اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے گیا ہے کیونکہ وہ برانڈی کی بوتل اپنی پتلون کی جیب میں چھپا کر لایا تھا۔ برینڈن وقت گزاری کے لیے ان خوانچہ فروشوں کی طرف بڑھ گیا جو مختلف اشیا بیچ رہے تھے۔ ان میں ایش ٹرے، نیکلس، مختلف قسم کے رنگین ماسک اور اسی طرح کی دوسری چیزیں شامل تھیں۔ اس نے ایک ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ ان میں زیادہ تر چیزیں شوقیہ لوگوں کی تیار کردہ تھیں اور ان میں ہنرمندی کا فقدان نظر آ رہا تھا۔

اس کی نظریں فیونٹس کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں کہ اس کی نگاہ ایک ایسی چیز پر گئی جو سیاہ لکڑی سے بنائی گئی تھی۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ یہ کوئی چھڑی ہے لیکن اس کی لمبائی اتنی کم تھی کہ کوئی پستہ قد شخص بھی اس کے سہارے نہیں چل سکتا تھا۔ خوانچہ فروش نے برینڈن کی دلچسپی کو محسوس کرتے ہوئے وہ شے اس کے سامنے کر دی اور فخریہ انداز میں بولا۔ ''چالیس ڈالر!'' یہ ایک قدیم ہتھیار ہے جو میان قبیلے کے لوگ استعمال کیا کرتے تھے۔''

برینڈن نے سوچا کہ دیکھنے میں وہ واقعی قدیم لگتی ہے اور اس کے بنانے والے نے بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ وہ شے کسی سانپ کے جسم سے مشابہ تھی۔ اس نے اسے ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا تو وہ کسی لوہے کی سلاخ کے مانند سخت محسوس ہوئی۔ اس نے چالیس ڈالر ادا کیے گو کہ وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے خاص احمق لگ رہا تھا لیکن یہاں آنے کے بعد پہلی بار اسے تحفظ کا احساس ہوا۔

جب وہ واپس آئے تو اندھیرا پھیل چکا تھا اور فیونٹس کو گھر جانے کی جلدی ہو رہی تھی۔ دیر ہو جانے کی صورت میں اس کی بیوی ناراض ہو سکتی تھی۔ اپنی خریدی ہوئی چیز کو کمرے میں رکھ کر برینڈن کھانا کھانے ڈائننگ ہال میں چلا گیا جو تقریباً خالی پڑا ہوا تھا۔ گرمی کی شدت میں کمی آ چکی تھی اور ہلکی ہوا چلنے سے موسم کافی بہتر ہو گیا تھا۔ کمرے میں آنے کے بعد اس نے ساری کھڑکیاں کھول دیں اور شاور لینے کے بعد اپنے مشاہدے کے حوالے سے کچھ لکھنے بیٹھ گیا تاکہ اپنی کمپنی کے لیے رپورٹ تیار کر سکے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ بستر پر لیٹ گیا اور چند ہی لمحوں میں اسے نیند آ گئی۔

''کون ہے؟'' وہ بستر میں لیٹے لیٹے ہی چلایا۔ دستک کی آواز اس کے دماغ میں گونج رہی تھیں۔ اس نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا لیکن یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ کھلا ہوا ہے یا بند۔ اس نے لیٹے لیٹے ہی اپنا ہاتھ ڈنڈے کی طرف بڑھایا اور جیسے ہی اس کی انگلیوں نے اس سانپ نما چھڑی کو چھوا، اس میں نہ جانے کہاں سے ہمت آ گئی۔ وہ خاموشی سے بستر سے اترا اور دبے پاؤں کے مانند دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب پہنچ کر دیکھا تو دروازہ پوری طرح بند تھا پھر اس نے کھڑکی کی طرف نگاہ ڈالی تاکہ وہاں سے پورچ میں جھانک سکے۔

دوسری بار دستک کی آواز سن کر وہ ایک بار پھر سکتے میں آ گیا۔ اس نے اپنا ڈنڈا ہوا میں لہرایا اور چلاتا ہوا دروازے کی جانب بڑھا۔ باہر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ راہداری میں لگی ہوئی شمعیں بجھا دی گئی تھیں جبکہ اس کے دروازے کے ساتھ لگی ہوئی لائٹ کی روشنی بہت مدھم تھی۔ برینڈن کو یقین تھا کہ اس نے کسی کے قدموں کی آواز سنی ہے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ہوٹل کا استقبالیہ کاؤنٹر تھا۔ وہاں لگی ہوئی لائٹ اچانک ہی بجھ گئی اور چند سیکنڈ بعد دوبارہ جل اٹھی۔ برینڈن کو یوں لگا جیسے اس کے آگے سے کوئی گزرا ہے۔ وہ بھی تیزی سے بڑھا، اس کا رخ ہوٹل کی لابی کی جانب تھا۔

استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی لڑکی اپنی جگہ سے اچھلی اور چیختے ہوئے برابر والے کمرے میں گھس گئی۔ برینڈن نے ایک نظر اس پر ڈالی اور دوبارہ تعاقب میں مصروف ہو گیا لیکن ڈائننگ ہال اور گفٹ شاپ کے دروازے بند تھے۔ وہ واپس کاؤنٹر کی طرف آیا اور بولا۔ ''یہاں کون آیا تھا؟''

جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اس لڑکی کی جانب بڑھا جو دفتر سے باہر آ گئی اور خاصی سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔ برینڈن اسے نظرانداز کرتا ہوا دفتر کے دروازے کی جانب بڑھا۔ اسے شک تھا کہ دستک دینے والا اسی جگہ چھپا ہو گا۔ لڑکی اسے راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہو گئی۔ اس کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں اور وہ بری طرح کپکپا رہی تھی۔ اس چھوٹے سے دفتر میں دو لوہے کی میزوں اور ایک فائل کیبنٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔

اس واقعے کے بعد وہ رات بھر نہ سو سکا۔ صبح ناشتے کی میز پر بےخوابی کے سبب اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ پیگی نے خلافِ توقع ناشتے پر اس کا ساتھ نہیں دیا بلکہ سرد لہجے میں بولا۔ ''مسٹر برینڈن! ناشتے کے بعد تم مجھ سے دفتر میں ملو۔''

برینڈن کو اس کی سرد مہری پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ سمجھ گیا کہ اسے رات والے واقعے کی اطلاع مل چکی ہے۔ اس نے اطمینان سے اپنا ناشتا ختم کیا اور پیگی سے ملنے اس کے دفتر پہنچ گیا جو اس کے انتظار میں بےچینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس نے برینڈن کو بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا اور بولا۔

''تم جب سے یہاں آئے ہو۔ میرے اسٹاف کو خوف زدہ اور میری بےعزتی کر رہے ہو۔ مسٹر فیونٹس نے بتایا ہے کہ کل تم نے ان کے ساتھ بھی جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ میرا خیال ہے کہ ایسی صورتِ حال میں تم ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے۔ میری خواہش ہے کہ تم پہلی دستیاب پرواز سے واپس چلے جاؤ اور اپنی جگہ کسی دوسرے شخص کو بھیج دو جو ذاتی وابستگی سے بالاتر ہو کر یہ ڈیل فائنل کر سکے۔''

برینڈن نے اس کے چہرے پر بھرپور نگاہ ڈالی اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو کہ میری جگہ آنے والا شخص یہاں کے بارے میں کوئی اچھی رپورٹ دے سکے گا۔ اس کا قصور بھی یہی تھا کہ وہ تمہارے خلاف رپورٹ دینے والی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس ریزورٹ میں سرمایہ کاری گھاٹے کا سودا ہو گی۔ وہ نہیں سمجھتی تھی کہ یہ جگہ سیاحوں کے لیے کوئی کشش رکھتی ہے۔''

www.kahopakistan.com

پگی کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں بولا۔ ''کون؟''

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کس کی بات کر رہا ہوں۔ تم اپنے آپ کو جولیا کی موت سے الگ نہیں کر سکتے۔''

پگی کو غصہ آ گیا اور وہ زور سے چلاتے ہوئے بولا۔ ''اب میں تمہیں ایک منٹ کے لیے بھی یہاں برداشت نہیں کر سکتا۔ ابھی فون کرو اور اپنے لیے پہلی فلائٹ کے لیے سیٹ بک کروالو۔''

☆☆☆

اس رات برنیڈن نے سونے کی بالکل بھی کوشش نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ بے سود ہوگی گو کہ اس کی پرواز دوسرے دن سہ پہر میں تھی لیکن اسے ائرپورٹ پہنچنے کے لیے صبح ہی نکلنا تھا۔ پگی سے ہونے والی گفتگو کے بعد اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ دوبارہ اس چھت کے نیچے رات گزارنے کی غلطی نہیں کرے گا۔ ویسے بھی ہوٹل سے آنے والی آوازیں اسے سونے نہیں دیتیں۔ اس رات وہاں گیری فونا کے قدیم رقص اور موسیقی کی تقریب ہو رہی تھی جس کا تذکرہ جولیا اپنے ای میل میں کر چکی تھی۔ چند مہمانوں کے لیے ساحلِ سمندر پر بارنی کیو کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ڈرم کی آوازوں، بے ہنگم موسیقی کا شور اور نشے میں چور مہمانوں کے بلند و بانگ قہقہے اس کی سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔

دستک کی آواز پہلے کی طرح تیز نہیں تھی۔ برنیڈن نے سوچا کہ شاید گہری نیند میں اسے یہ آواز زیادہ محسوس ہوتی ہو۔ وہ پورچ کے آخری سرے پر کرسی میں بیٹھا اپنے مہمان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس جگہ خاصا اندھیرا تھا اسی لیے دستک دینے والے دبلے پتلے نوجوان شخص کی نگاہ اس پر نہیں گئی۔ اس نے دروازے کے ساتھ اپنے کان لگا دیے اور چند لمحوں تک اندر سے آنے والی کسی آواز یا آہٹ کو سننے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس نے دروازے پر لگی ہوئی ناب کو گھما کر چھوڑ دیا اور پورچ میں لگے بلب کی مدھم روشنی میں اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کسی چیز کو دیکھنے لگا۔ ایک بار پھر اس کی نظر دروازے پر گئی اور اس نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اگلا قدم اٹھاتا، برنیڈن دبے پاؤں آگے بڑھا اور اس کے بالکل نزدیک آ کر آہستہ سے بولا۔ ''تمہیں پگی اور فیونس نے بھیجا ہے نا۔ تمہی نے ان کے کہنے پر جولیا کو قتل کیا تھا؟''

وہ نوجوان شخص برنیڈن کی آواز سن کر تیزی سے گھوما۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، برنیڈن نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے دھکیلتا ہوا کمرے کے اندر لے آیا۔ اس کے بعد کے مراحل طے کرنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے اعتراف کر لیا کہ پگی کے کہنے پر پہلے تو اس نے جولیا کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر واپس چلی جائے لیکن وہ اپنی رپورٹ مکمل کیے بغیر نہیں جانا چاہ رہی تھی چنانچہ اسے راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا گیا کیونکہ اس رپورٹ سے پگی اور فیونس کو بھاری نقصان اٹھانا پڑتا اور کمپنی ان کے ریزورٹ میں سرمایہ کاری نہ کرتی۔ اس رات وہ دبے پاؤں اس کے کمرے میں داخل ہوا اور سوتی ہوئی جولیا کے منہ پر تکیہ رکھ کر اسے بے ہوش کر دیا پھر اس نے جولیا کے گاؤن کی پٹی کھول کر ہاتھ روم کے دروازے پر باندھی اور جولیا کے بے جان جسم کو اٹھا کر وہاں تک لے گیا اور پٹی کے دوسرے سرے کا پھندا بنا کر اس کی گردن میں ڈال دیا۔ اس نے دستانے پہن رکھے تھے اس لیے پولیس کو اس کی انگلیوں کے نشانات کہیں بھی نظر نہیں آئے اور یہ فرض کر لیا کہ جولیا نے خودکشی کی ہے۔

برنیڈن نے اپنی ٹائی سے اس کے دونوں ہاتھ پشت سے باندھے اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ اسے صرف ایک منٹ کے لیے کمرے سے باہر جانا تھا۔ وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے کاؤنٹر پر گیا تو وہ لڑکی اسے دیکھتے ہی خوف زدہ ہو گئی۔ برنیڈن نے فون کی طرف اشارہ کیا تو وہ کچھ کہے بنا ملحقہ دفتر میں چلی گئی۔ برنیڈن بھی یہی چاہتا تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے مقامی پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کیا اور بولا۔ ''یہاں ایک مہمان تمہارا منتظر ہے۔''

پندرہ منٹ بعد پولیس وہاں پہنچ گئی۔ پگی اور فیونس اپنے اپنے گھروں میں گہری نیند سو رہے تھے۔ پولیس نے برنیڈن اور کرائے کے قاتل کے بیان کی روشنی میں انہیں رات میں ہی گرفتار کر لیا۔ پہلے تو پگی اور فیونس صاف مکر گئے لیکن کرائے کے قاتل کے اعترافی بیان کے بعد ان کے پاس بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تھی۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد برنیڈن کئی دنوں تک جولیا کو یاد کر کے سوچتا رہا کہ کاش جانے سے پہلے اس کی جولیا سے لڑائی نہ ہوئی ہوتی۔ اب وہ کبھی بھی یہ نہیں جان سکے گا کہ جولیا کے ساتھ اس کا کیا رشتہ تھا۔ کیا اس کی چاہت یک طرفہ تھی۔ کیا جولیا کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ کسی کو اس قتل کے بارے میں علم نہ تھا ورنہ اس کی غیر جانبداری پر حرف آ جاتا اور کمپنی کبھی بھی جولیا کے ادھورے مشن کو پورا کرنے کے لیے اسے نہ بھیجتی ہے... اس طرح جولیا کے قتل پر ہمیشہ پردہ پڑا رہتا۔

★

جوابی کارروائی

کاشف زبیر

چھوٹا بھائی بڑا کے چوہے دان نما دفتر میں قدم رنجا فرمانے کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ میرا اس پر کچھ حساب نکلتا تھا۔ دوسرے رات میں نے دلی نہاری والے کی آتش فشاں نہاری سے شوق کیا تھا۔ جس کے بعد میرے پیٹ میں رہ رہ کر دھماکے ہو رہے تھے اور مجھے شبہ تھا، بنانے والے نے نہاری میں مسالے کی جگہ بارود ڈال دیا ہے کیونکہ میڈ اِن امریکا اور انڈیا بارود عام اور خالص دستیاب ہے اور سنا ہے فری میں پڑتا ہے بلکہ مناسب استعمال کرنے کے عوض معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ مجھے شبہ تھا کہ دلی نہاری والے نے ایسا ہی بارود حاصل کر لیا تھا۔ اس لیے جب میں چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر کے سامنے سے گزرا تو پیٹ میں ایسا دھماکا ہوا کہ میرے ساتھ آس پاس سے گزرنے والے بھی چونک گئے اور احتیاطاً دور ہٹ گئے حالانکہ میں کہیں سے بھی خودکش نہیں لگ رہا تھا۔

تصویر کائنات میں حسن کا موجب صنفِ نازک کو گردانا جاتا ہے... بسا اوقات یہی نزاکت و رعنائی کا پیکر ہر سو ہلچل بپا کر دیتا ہے ...جلیل میاں بھی صنفِ مخالف کے روبرو ہیں ...اور اس دفعہ وہ دوسروں کو مصیبت سے بچاتے ہوئے اپنی جان بھی خطرے کی نذر کر چکے ہیں...

www.kahopakistan.com

''جلیل تُو...'' چھوٹا بھائی بڑا کا منہ مجھے دیکھ کر لٹک گیا۔ ''ادھر کائے کو آیا ہے۔''

''تیری صورت دیکھنے اور... کرنے۔'' میں نے دانت نکال کر کہا۔

وہ پٹاخے کی طرح اُچھلا۔ ''میری صورت پر... کرے گا۔''

''نہیں باتھ روم جا کر کرے گا، کدھر ہے۔'' میں نے پوچھا تو چھوٹا بھائی بڑا نے بادلِ ناخواستہ دفتر کے پچھلے حصے کی طرف اشارہ کیا۔

بیت الخلا کے مدار میں دو چکر لگانے کے بعد میرے پیٹ کو وہ سکون ملا... جو کرکٹ میں انڈیا کو ہرانے کے بعد قوم کو ملتا ہے۔ لیکن جب میں باہر نکل رہا تھا تو مجھے دفتر میں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ چھوٹا بھائی بڑا کسی پر چلّا رہا تھا۔ ''اے میرے کو کیوں مارنے آیا ہے، میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟''

''کچھ نہیں بگاڑا ہے۔'' کسی نے جان بوجھ کر لہجہ خراب کرتے ہوئے کہا۔ ''اپن کو تیرا سپاری ملا ہے... سپاری سمجھتا ہے؟''

''سپاری... تجھے کو میرے مرڈر کا سپاری ملا ہے؟'' چھوٹا بھائی بڑا نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا۔

میں نے آس پاس دیکھا اور صفائی کرنے والا برش اٹھا لیا اس کا ڈنڈا مضبوط لگ رہا تھا۔ سپاری لانے والے قاتل نے کہا۔ ''چل سیٹھ تیار ہو جا۔''

''کیا... کہہ رہا ہے؟'' چھوٹا بھائی بڑا چلّانے لگا۔

میں نے کمرے میں جھانکا تو ایک آدمی چہرے پر نقاب لگائے چھوٹا بھائی بڑا پر پستول تانے کھڑا تھا، ابھی میں سوچ رہا تھا کیا کروں کہ چھوٹا بھائی نے مجھے دیکھ لیا اور چلّا کر بولا۔ ''جلیل میرے کو بچا اس سے۔''

چھوٹا بھائی نے مجھے بھی مروا دیا کیونکہ قاتل نے سر گھما کر مجھے دیکھا۔ اس کا ارادہ یقیناً پہلے مجھے آل جہانی کرنے کا تھا۔ اگرچہ میں ڈھول دھپّے سے ہمیشہ گریز کرتا ہوں لیکن اس وقت میرے حرکت میں آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے برش کا ڈنڈا گھما کر اس کے پستول والے ہاتھ پر مارا اور پستول اس کے ہاتھ سے یوں اڑ گیا جیسے کئی سو سال پہلے نور جہاں کو کبوتر اڑاتے دیکھ کر جہانگیر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ نقاب پوش نے چلا کر میرے آباؤ اجداد کو یاد کیا میں نے دوبارہ ڈنڈا مارا۔ اس کی زبان یک دم رک گئی اور وہ لڑکھڑا کر دروازے پر ڈھیر ہو گیا۔ میں اس کا پستول اٹھانے کے لیے لپکا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ البتہ چھوٹا بھائی... اپنی تجوری کے پاس کھڑا تھا۔

''پستول کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تجوری میں۔''

''تجوری میں کیا کر رہا ہے؟'' میں نے چلّا کر کہا۔

''میرے کو پستول سے ڈر لگتا ہے ادھر سے میرا کوئی نقصان نہیں کر سکتا۔'' اس نے تجوری کو تھپکا۔

''تم پاگل ہوا اس کے پاس دوسرا پستول ہوا...'' میں نے نقاب پوش قاتل کی طرف دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر شبہ ہوا... وہ جہاں پڑا تھا اب نہیں تھا۔ البتہ اس کے سر سے نکلنے والا خون فرش پر پڑا تھا۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو گیا تھا۔ چھوٹا بھائی فرطِ جذبات سے مجھ سے لپٹ گیا۔

''جلیل تو نے مجھے بچا لیا، میں تیرا احسان کبھی نہیں بھولے گا۔''

میں نے خود کو اس سے چھڑایا۔ ''مجھے معلوم ہے تمہارا یہ کبھی نہیں دو تین منٹ سے زیادہ کا نہیں ہوگا اور زیادہ خوش مت ہو وہ بھاگ گیا ہے، جلد مرہم پٹی کرا کے اور دوسرا پستول لے کر آئے گا اور تمہارے سر میں... سوراخ کر دے گا۔''

چھوٹا بھائی ایک بار پھر تھرتھر کانپنے لگا۔ ''پھر میں کیا کرے؟''

''اپنا دفتر بند کرو اور بھاگ جاؤ۔ ویسے تمہارا ایسا کون سا دشمن ہے جس نے تمہاری سپاری دے دی؟''

''میں جانتا تو اس کو اس کی سپاری نہ دے دیتا؟'' وہ بولا۔

''اچھا میرا حساب تو صاف کرو مجھے جانا ہے ایسا نہ ہو وہ ابھی آ جائے اور تمہارے ساتھ مفت میں میرا بھی مرڈر ہو جائے۔''

کیونکہ ابھی ابھی میں نے اس کی جان بچائی تھی اس لیے وہ مجبور تھا کہ میری رقم ادا کر دے۔ اس نے نوٹ گن کر مجھے دیئے اور گھگیا کر بولا۔ ''جلیل میرے ساتھ رہ... میں تجھے معاوضہ دوں گا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''چھوٹا بھائی یہ تو اتفاق تھا اور تم نے مجھے بھی ملوث کر لیا... ورنہ میں خاموشی سے واپس باتھ روم میں بیٹھ جاتا۔ جب وہ تمہیں قتل کر کے روانہ ہو جاتا تو میں بھی چلا جاتا۔''

اس سچ بیانی پر چھوٹا بھائی نے مجھے نہایت غلط نظروں سے دیکھا اور بتایا کہ میں بہت چھوٹا اور گھٹیا آدمی ہوں۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ''سیٹھ تمہاری صحبت میں رہا ہوں اثر تو پڑے گا... اچھا پھر ملیں گے اگر قاتل دوسری بار بھی ناکام رہا۔''

''جلیل میری بات...'' چھوٹا بھائی چلّاتا رہ گیا اور میں اس کے دفتر سے نکل آیا۔ درحقیقت میری حالت اچھی نہیں تھی۔ میں خود کو چھوٹا بھائی کے سامنے سنبھالے ہوئے تھا ورنہ ایک پیشہ ور قاتل سے سامنا کرنا آسان نہیں ہوتا۔ میرے پیٹ کی گڑگڑاہٹ تو رک گئی تھی لیکن حالت خراب تھی۔ سامنے ریڑھی والے سے دو گلاس شربتِ انار پی کر میری حالت بہتر ہوئی۔ اگرچہ ان دنوں راجا کی صورت دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا کیونکہ ایک تو وہ عارفہ کی صحبتِ بد میں زبوں و خوار تھا اور دوسرے مجھے خطرہ تھا کہ اسے میرے پاس سے نوٹوں کی خوشبو آ گئی تو وہ میری جان کو آ جائے گا میں راجا سے بچنا چاہ رہا تھا لیکن اس وقت مجھے اس کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے ایک شخص درکار تھا جس کے سامنے میں دل کا بوجھ ہلکا کر سکتا... جو پیٹ کا بوجھ ہلکا کرنے کے چکر میں دل پر پڑ گیا۔ میں نے عارفہ کا نمبر ملایا۔

''جلیل۔'' اس نے طنزیہ آواز میں کہا۔ ''آج میری یاد کیسے آ گئی؟''

''خدانہ کرے جو مجھے تمہاری یاد آئے اس کے بجائے موت آ جائے تو وہ مجھے قبول ہوگی۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس کا موڈ آف ہو گیا۔

''کیوں فون کیا ہے؟''

''وہ تمہارا عاشق کہاں ہے میرا نام نہاد یار۔''

''تمہارا نام نہاد یار یہاں نہیں ہے۔'' اس نے کچھ دیر بعد بدلے ہوئے لہجے میں کہا تو میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے بھی لہجہ اور بات بدل دی۔

''جھوٹ مت بولو... وہ یقیناً تمہارے پاس ہے۔ عارفہ اپنے پاس لکھ کر رکھ لو راجا کی رہی سہی بربادی کی ذمّے داری تم پر ہوگی۔''

''جلیل، تجھے میری آبادی اور بربادی سے کب دلچسپی ہو گئی؟'' اس بار راجا بولا میرا اندازہ درست نکلا۔ عارفہ نے اسپیکر آن کر دیا تھا۔

''کیونکہ تو میرا یار ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ بتا اس وقت کیفے ڈی پھولس آ سکتا ہے؟''

''مشکل ہے۔'' اس نے حسبِ توقع کہا۔ ''میں ذرا مصروف ہوں۔''

''میں جانتا ہوں تیری مصروفیت کو۔'' میں نے طنز کیا۔ ''راجا، تیری یہ مصروفیت کہیں تجھے قبر میں نہ لے جائے۔''

''تیرے منہ میں خاک۔'' راجا نے دہل کر کہا۔

''میں تو تیرے ساتھ بھلائی کر رہا تھا... ایک مسئلہ بھی ہو گیا ہے اور میرے ساتھ شاید تیری جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔''

''میری جان کو کیوں؟'' وہ تشویش سے بولا۔

''یہ میں تجھے کیفے ڈی پھولس میں بتاؤں گا۔ آدھے گھنٹے بعد اگر تو وہاں آیا تو... ورنہ تجھے بعد میں پتا چل ہی جائے گا۔ کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد انسان کی آنکھوں سے پردے اٹھ جاتے ہیں اور اسے سب نظر آنے لگتا ہے۔''

''جلیل بکواس نہ کر۔'' راجا دہل گیا۔ ''میں آ رہا ہوں۔''

کیفے ڈی پھولس کا ماحول دھواں دھار ہو رہا تھا کیونکہ فتو نے اب وہاں شیشہ بھی رکھنا شروع کر دیا تھا۔ جو سگریٹ یا حقے سے شغل نہیں کرتے یا تائب ہو چکے ہوتے ہیں شیشہ ان کے لیے اچھی چیز ہے۔ میں دوسرا کپ حلق سے اتار رہا تھا کہ راجا دھوئیں میں سے کسی ہارر فلم کے کردار کی طرح نمودار ہوا۔ اپنی اندر دھنسی آنکھوں اور بچکچے گالوں کی وجہ سے وہ مردہ لگ رہا تھا، میں نے افسوس سے اسے دیکھا۔ عارفہ کسی چڑیل کی طرح اس کا خون پی رہی تھی اور اسے احساس نہیں تھا۔ وہ دھڑام سے میرے سامنے بیٹھا اور آدھا جگ پانی پی کر بولا۔ ''جلیل جلدی سے بتا مجھے کس سے خطرہ ہے؟''

''اس سے جس کے پاس سے تو آ رہا ہے۔'' میں نے جل کر کہا۔ ''کسی دن اس کے پہلو سے تیری میت اٹھ رہی ہو گی، یہ بھی ممکن ہے وہ تجھے وہیں بستر کے نیچے گاڑ دے۔''

خلافِ توقع راجا نے دانت نکالے۔ ''اپنی بھی یہی خواہش ہے۔ ادھر قبرستان میں دفنایا تو پڑوس میں کوئی ڈھانچا ہی ہوگا۔''

''پر تو بھول رہا ہے اگر عارفہ کے بیڈروم میں دفن ہوا تو اوپر عارفہ اکیلی نہیں ہوگی۔''

اس پر راجا نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ ''کہنے تو کہنا کیا چاہ رہا ہے؟''

''وہی جو تو سمجھ رہا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''خیر چھوڑ میں نے جس لیے بلایا ہے وہ سن۔''

میں نے راجا کو چھوٹا بھائی کے دفتر میں پیش آنے والا واقعہ سنایا۔ راجا اچھل پڑا۔ ''کرائے کا قاتل؟''

''اس کی باتوں سے ایسا ہی لگ رہا تھا کہ وہ کسی سے رقم لے کر چھوٹا بھائی کو قتل کرنے آیا ہے۔''

''ویسے چھوٹا بھائی ہے اسی قابل۔''

''تو نے ٹھیک کہا، اس نے مجھے مروانے میں بھی کوئی

www.kahopakistan.com

کہ نہیں چھوڑی میرا نام لے دیا اس کے سامنے۔'' میں نے تشویش سے کہا۔ ''اگر وہ کینہ پرور ثابت ہوا تو مجھے ضرور تلاش کرے گا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' راجا نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ''اس لیے تجھ سے دور رہنے میں ہی عافیت ہے ورنہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائے گا۔''

''ٹھیک کہا تو نے۔'' میں بھنا گیا۔ ''تو گھن کی طرح مجھے لگا ہوا ہے جیسے عارفہ تجھے جونک کی طرح لگی ہے۔''

راجا بے غیرتی سے مسکرایا۔ ''یہ تو ہے پر جونک بھی تو دیکھ نا۔'' راجا نے کہا اور رخصت ہو گیا مگر ایک منٹ بعد ہی وہ بدحواسی کے ساتھ واپس آ گیا، اس نے بھنچی آواز میں کہا۔ ''جلیل بھاگ وہ قاتل تجھے تلاش کرتا ہوا یہاں آ گیا ہے۔''

میں اچھل پڑا۔ ''تجھے کیسے پتا چلا؟''

''اس کے سر پر پٹی بندھی ہے اور ایک ہاتھ کندھے سے لٹکا ہوا ہے۔ چہرے کے تاثرات قاتلانہ ہیں وہ ادھر ہی آ رہا ہے۔'' راجا نے رپورٹ پیش کی اور پھر دھوئیں میں کہیں غائب ہو گیا۔ میں نے آس پاس دیکھا اور ایک طرف بھاگنے کی کوشش کی، قاتل اچانک ہی دھوئیں سے نمودار ہوا۔ شکر ہے وہ میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا، میں نے پھرتی سے ایک آدمی کے سامنے رکھا ہوا اخبار اٹھا کر سامنے کر لیا اور اس سائٹ اسکرین کو سامنے رکھتے ہوئے قاتل کو بائی پاس کیا جو اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ یعنی مجھے تلاش کر رہا تھا۔ میں بال بال بچا تھا اور کیفے سے باہر آتے ہی میں نے گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ قاتل کو کس نے بتایا کہ میں کیفے ڈی پھونس میں ہو سکتا ہوں کیونکہ یہ بات صرف راجا کو معلوم تھی یا عارفہ کو۔ ہاں چھوٹا بھائی بھی جانتا تھا کہ میں زیادہ تر کیفے ڈی پھونس میں پایا جاتا ہوں۔ کیا قاتل مرہم پٹی کراتے ہی اپنا نامکمل کام مکمل کرنے آ گیا۔ اس نے پہلے چھوٹا بھائی کو مرحوم کیا اور اب مجھے بھی اس کے پیچھے روانہ کرنے کے درپے تھا۔

اس بار بھی میں قاتل کی شکل نہیں دیکھ سکا۔ پہلے وہ نقاب میں تھا اور اب منہ پر پٹی تھی اور باقی کسر شیشے کے دھوئیں نے پوری کر دی۔ میں گھر کے پاس پہنچا تو دروازے سے ذرا دور ایک برقع پوش خاتون نظر آئی، وہ ذرا جھک کر کھڑی تھی۔ بوڑھی لگ رہی تھی اس وجہ سے بھی میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی اور دروازہ بجانے والا تھا کہ وہ آہستہ سے بولی۔ ''جلیل۔''

مجھے یوں لگا جیسے نازو نے آواز دی ہو، میں رک گیا اور شک سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم نے مجھے آواز دی ہے۔''

''ہاں... کیا اب تم میری آواز بھی نہیں پہچان سکتے؟'' نازو نے خفگی سے کہا۔ ''جلیل تمہاری آنکھوں میں خود تیرا اپنا بال آ گیا ہے۔''

''بال آ گیا ہے۔ یہاں کس خوشی میں کھڑی ہو؟'' میں نے رکھائی سے کہا اور پیچھے دیکھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کسی لمحے بھی قاتل نمودار ہو گا اور فلمی انداز میں ڈز ڈز فائر کر کے میرے جسم میں سوراخ کر کے پستول لہراتا ہوا فرار ہو جائے گا۔

''تیرا انتظار کر رہی ہوں۔''

''نازو، ابھی تم جاؤ، میں تم سے بعد میں ملوں گا۔''

''میں ابھی ملنے کے لیے آئی ہوں اگر تم انکار کرو گے تو تمہارے ساتھ اندر گھس جاؤں گی اور اس کے بعد تم جانتے ہو اپنی اماں کو۔'' اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔ میں نے دانت پیس کر کہا۔

''نازو، خدا کے لیے میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔''

''وہ تو میں بھی ہوں اسی لیے تو تیرے پاس آئی ہوں۔'' وہ بولی۔

میں نے سوچا اور اس سے کہا۔ ''اچھا تم گلی کے کونے پر جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔''

''ٹھیک لیکن اگر تم نہ آئے تو میں آ جاؤں گی۔'' اس نے جانے سے پہلے دھمکی دی۔ میں اندر داخل ہوا تو اماں صحن میں تھیں۔ انہوں نے مشکوک انداز میں مجھے دیکھا۔

''جلیل ابھی تو باہر کس عورت سے بات کر رہا تھا؟''

''اماں مانگنے والی تھی۔'' میں نے کہا اور اندر سے بائیک کی چابی لے آیا۔ ''میں ایک ملازمت کے لیے جا رہا ہوں۔''

''سچ۔'' اماں نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں اور اگر کوئی میرا پوچھتا ہوا آئے تو دروازہ مت کھولنا اسے باہر سے ٹہلا دینا۔''

اماں کی خوشی کافور ہو گئی۔ ''جلیل بے وقوف بناتا ہے مجھے کسی چکر سے بچنے کے لیے گھر سے بھاگ رہا ہے۔''

''نہیں اماں، میری مراد ان دوستوں سے ہے جو بہ قول تمہارے میری تباہی کے ذمے دار ہیں۔'' میں نے دانت نکال کر اماں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، اس سے پہلے کہ اماں مزید سوال جواب کرتیں، میں بائیک لے کر نکل گیا۔

جیسے ہی میں نے بائیک اسٹارٹ کی چاند بانو بھری دوپہر میں چودھویں کے چاند کی طرح نمودار ہوئی۔

''جلیل کہیں جا رہا ہے مجھے ذرا بدھ بازار تک چھوڑ دے۔''

''بدھ بازار لیکن آج تو جمعرات ہے۔''

''جمعرات۔'' اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''پر میں تو بدھ سمجھ رہی تھی۔''

''بدھ کل گزر گیا تم کلینڈر دیکھ کر آؤ۔''

جیسے ہی وہ کلینڈر دیکھنے اندر گئی، میں نے بائیک دوڑا دی۔ مجھے چاند بانو کو بدھ بازار تک ڈراپ کر کے خوشی ہوتی لیکن اس وقت بلائے جان نازو گلی کے کونے پر منتظر تھی۔ جیسے ہی نے بائیک روکی، وہ اچک کر بیٹھ گئی اور میری کمر کس کر پکڑ لی۔ ''ذرا ہٹ کر بیٹھو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، تم بائیک بہت تیز چلاتے ہو۔''

میں نے سچ مچ بائیک دوڑائی۔ ''جانا کہاں ہے؟''

''کہیں بھی لے چلو کیونکہ میرے پاس فی الحال کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔''

''وہ جو شاہراہ فیصل والا فلیٹ، اس کا کیا ہوا؟''

''اسے ٹھکانے لگا دیا ہے۔'' وہ سرد آہ بھر کر بولی۔ ''اپنی ساری جمع پونجی سے بھی ہاتھ دھو چکی ہوں۔''

کیونکہ لنچ کا وقت قریب تھا اس لیے میں نے پیٹ کی حالت کے پیش نظر... ایک درمیانے درجے کے چائنیز ریستوران کے سامنے بائیک روک دی۔ نازو نے اندر کے نیم تاریک ماحول میں آتے ہی برقع سے جان چھڑائی۔ مجھے معلوم تھا، وہ برقع والی لڑکی نہیں ہے اور اس میں یقیناً اس کا دم گھٹ رہا ہو گا۔ نیچے حسب توقع اس نے سنسنی خیز قسم کا لباس پہن رکھا تھا۔ چست ٹی شرٹ جس کی آستین اور گلا دونوں غائب تھے۔ اس سے بھی چست تر جینز تھی۔ میں نے غور کیا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا آج کل لڑکیاں اپنی کھال سے بھی زیادہ فٹ جینز کس طرح چڑھا لیتی ہیں۔''

وہ ہنسی۔ ''یہ راز کی بات ہے شادی کے بعد شنو سے پوچھ لینا۔''

''بہت مشکل ہے، شادی کے بعد اس کے سائز کی جینز ملنا ناممکن ہو گا۔'' میں نے سرد آہ بھری۔

''مجھے بھی تمہارے مستقبل پر ترس آتا ہے۔'' نازو نے کہا۔ ''بیوی کے نام پر بھینس پالو گے۔''

''تمہیں کیا، میں بھینس پالوں یا ہرنی۔'' میں نے خفگی سے کہا اور ویٹر کو اشارہ کیا۔ اسے پہلے تو ڈبل سوپ اور اس کے بعد چکن فرائڈ رائس لانے کو کہا۔ نازو کو چائنیز پسند نہیں تھے اس لیے اس نے برا سا منہ بنایا۔ اپنی چھریری جسامت سے قطع نظر وہ مرغن اور باربی کیو کی شوقین تھی۔ ویٹر سوپ لے آیا۔ میں نے سوپ پیتے ہوئے پوچھا۔ ''اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے، میرے گھر تک کیوں آئیں؟''

''مسئلہ بہت بڑا ہے۔'' اس نے منہ لٹکا کر کہا۔ ''میں نے شادی کر لی ہے۔''

میرے منہ سے بے اختیار ''شادی'' اور اس کے ساتھ سوپ نکل پڑا۔ جلدی سے ٹشو سے منہ صاف کر کے میں نے مشکوک انداز میں پوچھا۔ ''تم نے شادی ہی کہا ہے نا یا میرے کان بج رہے ہیں۔ کل میں نے آتش فشاں والی نہاری کھائی تھی اس کے آفٹر شاک رہ رہ کر آ رہے ہیں۔''

''تم نے ٹھیک سنا ہے۔'' وہ سوپ پیتے ہوئے بولی۔ ''میں نے سچ مچ شادی کر لی ہے ایک مہینہ ہوا ہے۔''

''کیوں... اور کس سے؟''

''شادی کیوں کرتے ہیں۔'' اس نے سوال کیا۔ ''تم کس لیے مرے جا رہے ہو شنو سے شادی کرنے کے لیے؟ اور جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے۔ یہی اصل مسئلہ ہے، میں نے غلط آدمی سے شادی کر لی ہے۔''

''کیا مطلب، وہ آدمی نہیں ہے؟'' میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''کوئی ٹیکنیکی مسئلہ ہے؟''

نازو کا رنگ سرخ ہو گیا۔ ''جلیل... بدتمیز... یہ بات نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''وہ آدمی دو نمبر نکلا۔''

''یعنی تمہارا پرفیکٹ میچ۔''

اس بار نازو نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''اس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔''

''اسی لیے تو کہتے ہیں جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے ایک دن خود اس میں گر جاتا ہے۔''

اس پر نازو نے دبی زبان میں جو ارشادات فرمائے، ان کو بیان کرنے سے میری زبان قاصر ہے۔ وہ پرانی نازو بن گئی... مردانہ وار گفتگو کرنے والی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''اچھا اب مذاق ختم، تم اپنا مسئلہ بیان کرو۔''

سوپ ختم ہونے اور فرائڈ رائس آنے تک نازو نے اپنی داستان سنائی اور مجھے رونے کے بجائے ہنسی آتی رہی جسے میں صرف فساد کے خوف سے ضبط کرتا رہا۔ اس داستان کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ قادر بخش سے نازو کی ملاقات دو مہینے

www.kahopakistan.com

پہلے ہی وہ یو پر ہوئی تھی جہاں کچھ بدمعاش لڑکے نازو کو اکیلا پاکر چھیڑ رہے تھے اور ان کی حرکتیں حد سے تجاوز کر رہی تھیں۔ پاس ہی ایک پولیس والا تھا لیکن وہ انجان بنا رہا۔ لڑکے نازو کو جانے بھی نہیں دے رہے تھے۔ ایسے میں قادر بخش اچانک ہی فرشتہ بن کر نمودار ہوا اور اس نے لڑکوں کی فلمی انداز میں پٹائی کی اور ان میں سے دو تو خاصے ٹوٹ پھوٹ گئے اسی وجہ سے نازو کو شبہ بھی نہیں ہوا... کہ یہ قادر بخش کی کارروائی ہوسکتی ہے، اسے متاثر کرنے کے لیے۔ ایک کی کہنی ٹوٹ گئی اور دوسرا اپنی ناک کی ہڈی کو رو رہا تھا۔ پولیس والے نے اس بار بھی دخل در نامعقولات سے گریز کیا۔ نازو نے قادر بخش کا شکریہ ادا کیا جو اپنے نام کے برعکس ہینڈسم اور پکا شہری جوان تھا۔ اس نے نازو کو نزدیکی ریستوران چلنے کو کہا اور وہ تیار ہوگئی۔ اس ملاقات میں دونوں ایک دوسرے پر خاصے کھل گئے۔

رہی سہی کسر دوسری ملاقات میں پوری ہوگئی۔ نازو اس میں دلچسپی لینے لگی اور یہ بات قادر بخش نے بھی محسوس کر لی۔ وہ کلفٹن میں رہتا تھا اور یہاں اس کا ایک شاندار لگژری فلیٹ تھا۔ میں نے نازو سے پوچھا کہ اس نے شادی سے پہلے اس کا لگژری فلیٹ کہاں سے دیکھ لیا تو وہ اس بات کو گول کر گئی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ شادی سے پہلے ان میں کچھ نہ کچھ میل جول ہوا تھا۔ بہرحال ایک مہینہ پہلے انہوں نے کورٹ میرج اور اس کے بعد کسی نکاح خواں سے نکاح پڑھوالیا۔

عام طور سے شادی کے بعد مردوں کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے لیکن اس کیس میں الٹا ہوا۔ نازو اتنی بے خود ہوئی کہ اس نے نہ صرف اپنا فلیٹ بیچ دیا بلکہ اب تک دو نمبر طریقے سے جو کمایا تھا، وہ بھی قادر بخش کے حوالے کر دیا۔ یہ ساری رقم ملا کر کوئی پچاس لاکھ روپے بنتی تھی۔ فلیٹ کی مالیت ہی پینتیس لاکھ سے زیادہ تھی لیکن عجلت میں بیچنے کی وجہ سے اس کی قیمت توقع سے کم ملی۔ پچاس لاکھ کر سن کر میں دنگ رہ گیا۔

رقم ہاتھ میں آتے ہی قادر بخش اپنے اصل روپ میں سامنے آگیا۔ کہاں تو وہ نازو پر واری قربان ہو رہا تھا اور رقم ملتے ہی اس نے سب سے پہلے نازو پر گھر سے نکلنے پر پابندی لگا دی۔ صرف پابندی ہی نہیں لگائی بلکہ وہ جب باہر جاتا تو دروازے پر باہر سے تالا لگا جاتا۔ اب نازو کی حیثیت ایک ملازمہ اور قیدی کی سی تھی۔ جب قادر بخش نے اس پر پہلی بار پابندی لگائی اور نازو نے احتجاج کیا تو قادر بخش نے اسے بری طرح مارا پیٹا تھا۔ اس کا فلیٹ ساؤنڈ پروف قسم کا تھا اور آس پاس رہنے والے ایک دوسرے کے معاملے میں مداخلت کے قائل نہیں تھے اس لیے نازو کی چیخیں سن کر بھی کوئی نہیں آیا۔ دو دن تک تو وہ بستر سے اٹھ بھی نہیں سکی۔ ایک ہفتے بعد کہیں جا کر اس کی حالت بہتر ہوئی تو اس نے فرار کا فیصلہ کر لیا۔ قادر بخش بالکل بدلا ہوا تھا۔ اس نے نازو کو دھمکانا شروع کر دیا کہ اگر اس نے اسے چھوڑنے یا کسی اور کو اپنے بارے میں بتانے کی کوشش کی تو وہ اسے قتل کر دے گا۔ اس کے پاس پستول تھا اور بہ قول اس کے کہ اس نے ایک درجن سے زیادہ قتل کر رکھے تھے۔

ممکن ہے نازو کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو ڈر جاتی لیکن وہ نازو تھی، اس نے ڈرنے کی اداکاری تو ضرور کی لیکن ڈری نہیں۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی بڑے رستموں سے نمٹ چکی تھی لیکن ان میں اور قادر بخش میں فرق تھا، وہ اس کا شوہر تھا اور اسے قادر بخش سے باقاعدہ چھٹکارا پانا تھا۔ اس نے تیاری کی اور جیسے ہی موقع ملا، وہ وہاں سے نکل آئی۔ قادر بخش دو دن کے لیے حیدر آباد جانے کا کہہ کر نکلا ہوا تھا۔ نازو نے چادروں کو پھاڑ کر رسی بنائی اور پانچویں منزل سے نیچے اتر گئی۔ حسب معمول قادر بخش باہر سے تالا لگا کر گیا تھا۔ نازو کے پاس کچھ بھی نہیں تھا سوائے معمولی رقم کے۔

"میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"جلیل۔" اس نے پُرامید لہجے میں کہا۔ "میں نے دیکھا ہے مشکل کتنی بڑی کیوں نہ ہو تم اس کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیتے ہو۔"

"یہ تو ہے، میں تم لوگوں کے مسائل حل کرتا ہوں اور آخر میں تم لوگ میرے لیے مسئلہ چھوڑ کر نو دو گیارہ ہو جاتے ہو۔" میں نے طنز کیا۔

نازو شرمندہ ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ "تم بے شک گالیاں دے لو، میں برا نہیں مناؤں گی لیکن پلیز اس مشکل وقت میں مجھے اکیلا مت چھوڑنا، میں اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی ہوں۔"

مجھے معلوم تھا کہ اس وقت اس پر میری کہی کسی بات کا اثر نہیں ہوتا اور وہ مجھے کسی صورت نہیں چھوڑتی۔ یعنی طنز کرنا یا اسے کچھ سنانا اپنی توانائی اور وقت برباد کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے اس کے مسئلے پر غور کیا۔ "پہلے مجھے کچھ سوالوں کے جواب دو اس کے بعد میں مدد کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کروں گا؟"

"پوچھو۔"

"یہ قادر بخش کون ہے اور کیا کرتا ہے۔"

پہلے سوال کا جواب نازو نے نہایت روانی اور سلاست سے دیا۔ اسے بھی ناقابلِ اشاعت سمجھا جائے، مگر ان سے قادر بخش کی تاریخ پر قطعی روشنی نہیں پڑ رہی تھی۔ یہ سب نازو کے ذاتی خیالات تھے اس کے بارے میں۔ دوسرے حصے کے جواب میں البتہ اس نے کچھ قابلِ بیان باتیں کیں۔

"اس... نے شادی سے پہلے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اسٹیٹ ایجنٹ ہے لیکن شادی کے بعد میں نے اسے اس قسم کا کوئی کام کرتے نہیں دیکھا اور نہ ہی وہ کچھ اور کرتا تھا البتہ شادی کے بعد وہ دو مرتبہ حیدر آباد جانے کا کہہ کر نکلا تھا اور دو دن بعد واپس آیا تھا۔ جب دوسری بار وہ... نکلا تو میں فرار ہوگئی۔"

"اب تمہارا کیا خیال ہے، قادر بخش کس قسم کا آدمی ہے؟"

نازو نے پہلے تو اپنے ذاتی خیالات سے مستفید کیا اور پھر بولی۔ "مجھے وہ کوئی جرائم پیشہ لگتا ہے۔ ایسا شخص جو اپنے مفاد کے لیے کسی کو قتل بھی کر سکتا ہے۔"

"تم نے گھر کی تلاشی لی ہوگی۔ اس کے بارے میں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے اس کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہو؟"

اس نے انکار کیا۔ "میں نے مکمل تلاشی لی لیکن ایسا کچھ نہیں ملا سوائے میرے کاغذات، نکاح نامے اور کچھ رقم کے۔"

نازو نے مجھے تلاشی کا طریقہ بتایا، اس سے مجھے لگا کہ اس نے سرسری سی تلاشی لی تھی۔ میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے تم نے ٹھیک سے فلیٹ کی تلاشی نہیں لی ہے۔ وہاں یقیناً کچھ نہ کچھ ایسا ہوگا جس تک تم نہیں پہنچی ہو۔"

وہ چونکی۔ "ایسا کیا ہوسکتا ہے؟"

"کچھ بھی... ممکن ہے کوئی بڑی رقم ہو یا کوئی ایسی چیز جس سے قادر بخش کے ماضی اور حال کے کرتوتوں پر روشنی پڑے۔"

"ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو لیکن اب میں وہاں واپس تو نہیں جاسکتی۔ میں تو اپنی ساری جمع پونجی سے بھی ہاتھ دھو چکی ہوں اور دوسرا چکرا لگ ہے۔"

"دوسرا چکر۔" میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ "تمہاری مراد ان چکروں سے ہے جو شادی کے بعد خواتین کو آتے ہیں۔"

نازو سرخ ہوگئی۔ "فضول باتیں مت کرو، میں اس شادی کی بات کر رہی ہوں۔ مجھے اس سے نجات بھی حاصل

تازہ شمارہ ہر بک اسٹال پر موجود ہے

ماہنامہ سرگزشت

جون 2011ء کے شمارے کی ایک جھلک

فسانہ ساز

اردو ادب کے ایک مایہ ناز ادیب کی سرگزشت جس کی کہانیوں میں انوکھا پن تھا

مهاجور

جعلسازی سے ارب پتی بن جانے والے فیس بک کے بانی کی سوانح حیات

زندہ دل

معین اختر کی زندگی کے مخفی وعیاں گوشے

مسلمان سائنس داں

دور حاضر کے مسلمان سائنسدانوں کا مختصر مختصر سا تعارف

گم شدہ محبت

ایک دوشیزہ کی آپ بیتی جو ہمیشہ کے لیے پاگل رہنے کی خواہشمند تھی

اس کے علاوہ

سراب جیسی طویل سرگزشت، معلوماتی اور دل دکھا دینے والی آپ بیتیاں جگ بیتیاں

وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں،

آپ یقیناً گرویدہ ہوجائیں گے،

خاص شمارہ... ہر شمارہ، خاص شمارہ... ہر شمارہ، خاص شمارہ

www.kahopakistan.com

کرنی ہے۔"

"اس کے لیے ہمیں سب سے پہلے قادر بخش کے بارے میں جاننا ہوگا اور اس کے لیے اس کے فلیٹ جانا ہوگا۔ تم نے بتایا کہ وہ دو دن بعد آئے گا؟"

"ہاں کہا تو اس نے یہی تھا لیکن کیا کہہ سکتے ہیں، کہیں وہ پہلے ہی نہ آجائے۔"

"پھر بھی چانس تو ہے۔" میں نے اصرار کیا۔ "فی الحال تو میری سمجھ میں اور کوئی بات نہیں آرہی ہے۔ میں یہاں بیٹھے بیٹھے تو تمہاری جمع پونجی واپس نہیں دلا سکتا اور نہ ہی قادر بخش سے نجات دلا سکتا ہوں۔"

بات نازو کی سمجھ میں آگئی۔ لنچ کر کے ہم قادر بخش کے فلیٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ گلشن کے ایک پوش بلاک میں ایک شاندار سی عمارت میں قادر بخش کا لگژری فلیٹ تھا۔ اس کی مالیت ہی کوئی ایک کروڑ تو ہوگی۔ میں نے نازو سے کہا۔ "اس سے نجات حاصل کرنے کے بجائے ہمت کر کے ساتھ رہو، ہوسکتا ہے کچھ عرصے میں خود مر جائے اور اس کا سب کچھ مع اس فلیٹ کے تمہارے نام ہو جائے۔"

"فی الحال تو مجھے اس سے نجات چاہیے، اندر چلو میں تمہیں دکھاتی ہوں، اس نے مجھ پر کیا کیا ظلم کیے ہیں۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "اوکے، میں نے مان لیا تمہیں اس سے نجات دلانا اشد ضروری ہے۔ نشانات دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

نازو کی وجہ سے ہم گیٹ کی سیکورٹی سے بہ آسانی گزر گئے۔ ورنہ وہاں کسی کو بنا شناخت کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مسئلہ اس وقت ہوا جب فلیٹ کے سامنے پہنچے اور نازو کو یاد آیا کہ اس کے پاس تالے کی چابی نہیں ہے۔ یہ دروازے میں فکس تالا تھا اس لیے باہر سے دیکھ کر کسی کو پتا نہیں چلتا تھا کہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

"اب اندر کیسے جائیں؟"

میں نے تالے کا معائنہ کیا اور کہا۔ "تم ذرا اپنا ہیئر پن عنایت کرو اور سیڑھیوں پر نظر رکھنا، کوئی آئے تو مجھے خبردار کر دینا۔"

اس نے مجھے دو عدد ہیئر پن دیے۔ تالا ذرا پیچیدہ تھا لیکن بالآخر کھل گیا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ نازو نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ یہ خاصا بڑا فلیٹ تھا اس میں تین بیڈ روم، ڈرائنگ اور لاؤنج بھی تھا۔ وسیع کچن تھا۔ تین میں سے ایک ہی بیڈ روم استعمال میں تھا۔ دو میں سے ایک کھلا تھا اور اس میں عام قسم کا فرنیچر تھا جب کہ دوسرا بند تھا۔ میں نے نازو سے پوچھا۔ "اس کمرے میں کیا ہے؟"

"کچھ نہیں، قادر بخش کا کہنا ہے اس میں کاٹھ کباڑ ہے۔"

"اگر کاٹھ کباڑ ہے تو اسے بند کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے کہا تو نازو چونک گئی۔

"یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔"

"ہاں کیونکہ سوچنے کے لیے جس کی ضرورت ہے، وہ تم نے بہت پہلے گنوا دی تھی۔"

"ہاں جب تمہاری ساتھی بننے کا فیصلہ کیا تھا۔" اس نے جوابی طنز کیا۔

"کچھ ایسا ہی حادثہ میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔" میں نے دروازے کے لاک کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ، تم نے قادر بخش کو اپنا ماضی بتانے کی حماقت تو نہیں کی ہے؟"

"بس یہی ایک عقل مندی ہوئی ہے مجھ سے۔" وہ بولی۔ "میں نے خود کو نہایت شریف لڑکی بنا کر پیش کیا تھا۔"

"اس نے مان لیا... میرا مطلب ہے تحقیق نہیں کی۔"

"میں نے اپنی کہانی اس طرح بنائی کہ وہ تصدیق نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس نے یقین کر لیا۔ ویسے بھی جب میں نے اسے سب کچھ دے دیا تو اسے اور کیا چاہیے تھا؟"

"یہ تو تم نے ٹھیک کیا۔ اب ذرا اپنی ہیئر پنیں دوبارہ دو۔"

"کیا اس تالے کو بھی کھولو گے؟"

"بالکل، دیکھنا چاہیے کہ اس کمرے میں کیا ہے؟" میں نے کہا اور اس سے پنیں لے کر تالے پر جھک گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ نازو کچھ خوف زدہ تھی شاید اسے ڈر تھا کہ قادر بخش نہ آجائے۔ یہ تالا باہر والے تالے سے زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد اس نے شکست مانی اور کھل گیا۔ لیکن اب یہ دوبارہ بند نہیں ہو سکتا تھا اس کی اندرونی گراریوں کا بیڑا غرق ہو گیا تھا۔ ویسے یہ تالا بتا رہا تھا کہ اس کمرے میں کچھ خاص بات تھی جس کی وجہ سے قادر بخش نے یہ خاص تالا لگایا تھا۔ جب میں دروازہ کھولنے جا رہا تھا، نازو مارے اشتیاق کے مجھ سے آگے نکلی جا رہی تھی۔ میں نے اسے خبردار کیا۔

"احتیاط سے... اس نے کوئی ٹریپ نہ لگا رکھا ہو۔"

نازو رک گئی۔ "کیسا ٹریپ؟"

"کیا کہا جا سکتا ہے، ویسے کیا تم نہیں جانتی ہو کہ اس قسم کی جگہوں کی حفاظت کے لیے کس قسم کے ٹریپ رکھے جاتے ہیں۔" میں نے کہا اور ایک طرف ہو کر دروازے کا لٹو گھمایا اور اسے اندر دھکیلا اور اسی چیز نے بچا لیا۔ دروازہ کھل گیا اور اندر سے ایسی آواز آئی جیسے کسی دھاتی چیز سے ٹکرایا ہو۔ میں نے نازو کو رکنے کا اشارہ کیا اور خود بغیر کسی چیز کو چھوئے اندر داخل ہوا میری نظر فرش پر تھی لیکن اس پر کوئی چیز نہیں تھی۔ پھر میں نے دروازے کے پیچھے دیکھا۔ ٹکرانے والی چیز ایک دھاتی پٹی تھی جو دیوار میں اس طرح فکس تھی کہ دروازہ ذرا سا کھلنے پر یہ پٹی دروازے کے لٹو سے ٹکرائی جیسا کہ یہ ٹکرائی تھی۔ میں نے نازو سے کہا۔ "ایک چمچ لا نا دھات والا ہو۔"

اس نے چمچ لا کر دیا اور پھر خود بھی اندر آگئی۔ میں نے چمچ دھاتی پٹی پر پھینک کر مارا تو اس سے چنگاریاں اڑیں اور نازو کی ہوائیاں اڑ گئیں کیونکہ وہ اندر دیکھنے کے شوق میں لٹو پکڑ کر دروازہ دھکیلنے جا رہی تھی جیسا کہ ہماری عادت ہے۔ جیسے ہی لٹو کا اندر والا حصہ دھاتی پٹی سے ٹکراتا اس میں طاقت ور کرنٹ دوڑ جاتا اور دروازہ کھولنے والا لٹو پکڑے پکڑے دنیا سے رخصت ہو جاتا۔ نازو نے نئے سرے سے قادر بخش کو گالیاں دینا شروع کر دیں، میں نے اسے روک دیا۔ "یہ بتاؤ کہ اس نے تمہارے سامنے کبھی یہ کمرا کھولا؟"

"ایک بار بھی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے کمرے کا معائنہ کیا اور دروازے کے بالکل ساتھ لگے سوئچ بورڈ نے میری توجہ حاصل کر لی۔ اس کا ایک بٹن دبا ہوا تھا جب کہ اس سے کمرے کی کوئی چیز نہیں چل رہی تھی، میں نے اسے آف کیا اور پھر چمچ اٹھا کر دھاتی پٹی پر مارا تو اس بار چنگاریاں نہیں اڑیں یعنی اس کا کرنٹ بند ہو گیا تھا۔ پھر بھی میری یا نازو کی ہمت نہیں ہوئی کہ اسے چھو کر دیکھتے۔ اب ہم کمرے کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہاں صرف دو الماریاں تھیں۔ دونوں دھات کی بنی ہوئی مضبوط الماریاں تھیں۔ میں نے احتیاطاً ان پر بھی چمچ مار کر دیکھا اور جب کوئی چنگاری نہیں اڑی تو میں نے الماریوں کو چھو کر بھی دیکھ لیا۔ ان میں کرنٹ نہیں تھا شاید قادر بخش نے دروازے والے انتظام کو کافی سمجھا تھا۔ دونوں الماریاں لاک تھیں اور ان کو چابیوں سے ہی کھولا جا سکتا تھا یا جس طرح میں نے دو تالے کھولے تھے اسی طرح ان کو بھی کھولا جا سکتا تھا۔ میں نے ہیئر پنز سنبھالنے سے پہلے نازو سے کہا۔

"اگر کوئی ٹھنڈی چیز ہے پینے والی تو وہ لا دو۔"

"بیئر اور جن کی بوتلیں ہیں۔" اس نے بتایا۔

"لاحول۔" میں نے کہا۔ "میری مراد کسی حلال مشروب سے ہے، تمہیں معلوم ہے میں نے کبھی آنکھوں سے

ایک معصوم سا بچہ

لاہور میں ایک دو رویہ سڑک ہے جس کے دونوں طرف باغات ہیں اور درمیان میں نہر بہتی ہے، یہ دنیا کی خوب صورت ترین سڑکوں میں سے ایک ہے، ایک روز میں کار میں جا رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ سڑک کے عین درمیان ایک معصوم بچہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہے، اس کے قریب ایک تھرماس ٹوٹی پڑی ہے جس میں سے آئس کریم (جسے مقامی لوگ قلفی کہتے ہیں) بہہ کر سڑک پر پھیل گئی ہے۔ مجھے اس معصوم بچے نے زار و قطار روتے ہوئے اشاروں کنایوں میں بتایا کہ ایک موٹر سائیکل سوار اسے ٹکر مار کر چلا گیا ہے، یہ تھرماس اور آئس کریم ایک کمپنی کی ہے اور وہ اجرت پر ان کے لیے کام کرتا ہے، اس پر میں نے اس کی مدد کی مگر اس سڑک پر سے گزرتے ہوئے تین چار بار اس معصوم بچے سے ملاقات ہوئی اور ہر مرتبہ اس کی تھرماس سڑک پر ٹوٹی پڑی ہوتی تھی اور وہ ہچکیاں لے لے کر اپنی وہی داستان دہراتا تھا جو میں نے پہلی دفعہ اس سے سنی تھی۔

❖ ❖ ❖

محبت کرنے والی قوم

پاکستانی بہت محبت والے لوگ ہیں۔ یہ مختلف تہواروں پر ایک دوسرے کو تحفے تحائف دیتے ہیں جس سے فطری طور پر باہمی محبت میں اضافہ ہوتا ہے، اس ضمن میں چھوٹے بڑے میں بھی کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا چنانچہ اکثر ماتحت گاہے گاہے اپنے افسروں کے لیے تحفے لے کر جاتے ہیں۔ ان میں کار کی چابی اور بقرعید پر بکروں کے تحفے بھی شامل ہیں۔ تحفے دینا پاکستانیوں کے کلچر میں شامل ہے۔ حتیٰ کہ راہ چلتے ہوئے اگر کوئی ٹریفک کا اہلکار انہیں روکتا ہے تو یہ اسے بھی کچھ نہ کچھ ضرور تھما دیتے ہیں۔

عطاء الحق کا زور قلم، منتخب کردہ۔۔۔ دور یشم، کراچی

www.kahopakistan.com

بھی نہیں پی ہے۔''
''میں دیکھتی ہوں۔'' اس نے جاتے ہوئے کہا۔
''اصل میں کولڈ ڈرنک تو میں پی جاتی ہوں۔''
میں نے جھک کر ایک تالے کا سوراخ دیکھا اور چتیں لے کر اپنے کام میں لگ گیا۔ مجھے معلوم تھا اس قسم کے لاک جو فکس ہوتے ہیں بہت اچھی کوالٹی کے ہوتے ہیں کیونکہ ان کو بار بار تبدیل کرنا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا تالا بہت اعلیٰ نسل کا تھا تقریباً کسی تجوری کے تالے جتنا اچھا اور مشکل تھا۔ میں پندرہ منٹ میں پسینے پسینے ہو گیا۔ یہاں کوئی پنکھا بھی نہیں تھا۔ نازو نے مجھے کولڈ ڈرنک کا ایک ٹن لا کر تھما دیا۔ دوسرا وہ خود پی رہی تھی۔ ''کیا ہوا، کھلا؟''
''اتنا آسان نہیں ہے، یہ تو تجوری لگ رہی ہے۔''
نازو نے اس کا معائنہ کیا۔ ''اسے کسی طریقے سے نہیں کھولا جا سکتا ہے۔ اگر اسے توڑنے کی کوشش کی جائے تو؟''
''بہت مشکل ہے۔'' میں نے الماری کی چادر پر ہاتھ مارا تو ٹھوس دھاتی آواز پیدا ہوئی۔ ''اسے توڑنا تو رستم زماں کے بس کی بات نہیں ہے۔''
''اگر تالے میں کوئی چیز مار کر اسے توڑ دیا جائے؟''
''اوہ بی بی یہ تالا ہے، تمہارا خالی سر نہیں ہے۔'' میں نے چڑ کر کہا۔ ''اس پر کچھ مارا تو یہ خراب ہو جائے گا اور پھر چابی سے بھی نہیں کھلے گا۔''
نازو کا منہ لٹک گیا۔ ''تب کیا ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے میری جمع پونجی اسی میں ہے۔''
''میرا بھی یہی خیال ہے۔ قادر بخش اپنی رقم بینک میں رکھوانے والا نہیں لگتا۔ تم نے بھی اس سے بینک اکاؤنٹ کے بارے میں سنا ہے؟''
''بالکل بھی نہیں اور نہ ہی اس کے پاس ڈیبٹ کارڈ یا کریڈٹ کارڈ جیسی کوئی چیز دیکھی ہاں اس کا پرس ہمیشہ نوٹوں سے بھرا دیکھا ہے۔''
''اس کا مطلب ہے وہ کیش رکھنا پسند کرتا ہے اور امکان ہے کہ کیش اسی الماری میں ہو۔''
''لیکن یہ تو کھل ہی نہیں رہی۔'' نازو نے کہا۔ وہ یہ سن کر بے تاب ہو گئی تھی کہ اس الماری میں کیش ہو سکتا ہے۔ اب اس کا ذہن کام کرنے لگا تھا۔ ''سنو کیا ہم اسے گیس ویلڈنگ سے نہیں کھول سکتے۔''
میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''ہاں یہ ممکن تو ہے لیکن ہم گیس ویلڈنگ عمارت میں کیسے لا سکتے ہیں؟''
''جیسے خود آئے ہیں۔''
''میرا مطلب ہے سیکیورٹی والے نہیں روکیں گے؟''
''وہ کیوں روکیں گے۔ اگر میں اپنے گھر میں کوئی کام کرانے کے لیے گیس ویلڈنگ والے کو لا رہی ہوں۔''
''تب ٹھیک ہے لیکن اس میں دو ڈھائی گھنٹے لگ سکتے ہیں۔''
''فوراً چلو۔'' اس نے بے تابی سے کہا۔ ''ہم اسے لے کر فوراً واپس آ جائیں تو شام سے پہلے یہ کام نمٹ سکتا ہے۔''
مجھے ایک دکان کا پتا تھا جہاں سے لائٹ گیس ویلڈنگ مشین اور اس کا سامان کرائے پر ملتا تھا۔ مالک سامان کی اصل مالیت کے برابر ڈپازٹ رکھ کر دیتا تھا۔ اس لیے اگر کوئی سامان واپس کرنے نہیں آتا تو اسے خوشی ہوتی تھی۔ وہ مجھے جانتا تھا اس لیے دیکھتے ہی خشک لہجے میں بولا۔ ''جلیل اگر کچھ لینے آیا ہے تو ڈپازٹ پورا رکھنا ہوگا۔''
میں نے نازو کو اس گلی کے کونے پر اتار دیا تھا۔ اسے دیکھ کر دکان کا مالک بلا وجہ متوجہ ہوتا۔ ''فکر مت کرو صابر بھائی تمہارے کچرا مال کا پورا ڈپازٹ دوں گا۔''
''کیا چاہیے؟''
''لائٹ گیس ویلڈنگ مشین چاہیے۔'' میں نے کہا تو اس کے منہ پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔
''پانچ ہزار نکالو۔'' اس نے کہا۔
''پہلے سامان دکھاؤ۔'' میں نے مطالبہ کیا۔ ''آخر کس چیز کے تم پانچ ہزار مانگ رہے ہو؟''
صابر بھائی نے مجھے سامان دکھایا۔ میں نے کہا۔
''صابر بھائی کیوں بے وقوف بناتے ہو ان کی مالیت تو ہزار روپے بھی نہیں ہے اور یہ اپنی مدت بھی پوری کر چکے ہیں، مجھے دھات کاٹنی ہے کہیں خودکشی دھماکا نہیں کرنا ہے۔''
''پانچ ہزار دینا ہے تو دو ورنہ آگے جاؤ۔'' اس نے رکھائی سے کہا تو میں کھڑا ہو گیا۔
''کہیں آگے ہی جانا پڑے گا۔'' میں نے مڑتے ہوئے کہا تو صابر بھائی نے جلدی سے پینترا بدلا۔
''جلیل اتنی جلدی کیا ہے چل تو چار دے دے۔ چار سو کرایہ ہے۔''
''میرے پاس حرام کے پیسے نہیں ہیں۔ میں دو ہزار دوں گا اور دو سو کرایہ دوں گا۔''
بالآخر بک جھک کرنے کے بعد سودا ڈھائی پیشگی اور ڈھائی سو کرائے پر طے ہوا۔ دونوں سلینڈرز پر میٹر گیج لگے تھے جو بتا رہے تھے کہ ان میں پوری گیس بھری ہوئی ہے۔

میں نے پھر بھی صابر بھائی کو خبردار کر دیا۔ ''اگر گیس کم ہوئی تو میں ایک روپیہ بھی کرایہ نہیں دوں گا۔''
''گیس پوری ہے۔'' اس نے سینے پر ہاتھ مارا اور کھانس کر بولا۔ ''میں چیٹنگ کا کام نہیں کرتا ہوں۔''
میں بائیک دوڑاتا ہوا کونے تک پہنچا تو نازو غائب تھی۔ آس پاس نظر دوڑائی تو وہ ایک گلی کی طرف جاتی دکھائی دی۔ اس کے پاس بائیک روکی۔ ''اس طرف کہاں جا رہی ہو، چلو جلدی سے بیٹھو۔''
''ارے جا جلدی سے بٹھا اپنی ماں کو۔'' برقع کے پیچھے سے بڑھیا غرائی تو میرے ہوش اڑ گئے۔ اس نے بالکل نازو جیسا برقع پہنا ہوا تھا اور دبلی بھی ویسی ہی تھی۔ میں نے بوکھلا کر کہا۔
''معاف کرنا اماں۔''
''اماں۔'' وہ پہلے سے بھی زیادہ غرائی۔ ''اماں ہوگی تیری کوئی ہوتی سوتی خبردار جو اماں کہا۔''
میں نے عجلت میں بائیک موڑی اور نازو کو کوستا ہوا اسے تلاش کرنے لگا، اسے بھی اسی وقت غائب ہونا تھا۔ میں ایک چھوٹی گلی کے پاس سے گزرا تو ایک پتھر آ کر میری پشت پر لگا۔ اچھا خاصا بڑا پتھر تھا، میں نے بائیک روک کر اس طرف دیکھا تو نازو گلی سے جھانک رہی تھی۔ میں بھنا کر کہا۔
''یہ کیا حرکت تھی۔''
''سوری۔'' وہ پھرتی سے نکل کر عقب میں بیٹھ گئی۔
''زور سے لگ گیا کیا، میں نے سر کا نشانہ لیا تھا۔''
''تم کہاں دفع ہو گئی تھیں؟''
''دفع نہ ہوتی تو کیا کرتی؟'' اس نے تنک کر کہا۔
''آتے جاتے لفنگوں نے جینا حرام کر دیا تھا۔''
''اصل میں تمہیں لا کر غلطی کی۔ اگر دوبارہ عمارت میں جانے کی مجبوری نہ ہوتی تو میں تمہیں نہ لاتا۔''
''میں تمہیں اکیلے جانے نہیں دیتی۔''
''کیوں تمہیں قادر بخش کی آمد کا خوف تھا؟''
''نہیں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''مجھے تو یہ خوف تھا کہ تم واپس ہی نہیں آؤ گے۔''
میں اس الزام پر بھنا گیا۔ ''اگر میرا نہ جانے کا ارادہ ہو تو میں تمہیں یہیں پھینک کر بھی جا سکتا ہوں۔''
''واقعی۔'' اس نے چیلنج دینے والے انداز میں کہا۔
''ہمت ہے تو پھینک دو۔''
ظاہر ہے میں ایسا نہیں کر سکتا تھا اس لیے دانت پیس کر رہ گیا۔ دو گھنٹے میں ہم واپس قادر بخش کے فلیٹ پہنچ گئے۔
کیونکہ دروازہ اب بند نہیں ہو سکتا تھا اس لیے ہم اسے ایسے ہی بند کر گئے تھے اس امید پر کہ کوئی دروازہ کھولنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ نازو نے فلیٹ کو خالی پا کر سکون کا سانس لیا۔
''میرا خیال ہے وہ سچ مچ حیدرآباد دفع ہو گیا۔''
''اس کے برعکس میرا خیال ہے وہ تمہیں بے خبر رکھ کر اپنے کام سے جاتا ہے۔''
''ممکن ہے۔'' نازو نے سر ہلایا۔ ''اب تم جلدی سے اپنا کام کرو تا کہ ہم یہاں سے نکل جائیں۔''
میں گیس ویلڈنگ کا سامان لے کر الماریوں والے کمرے میں آیا۔ اس میں تقریباً دس منٹ کی گیس تھی یعنی مجھے دس منٹ میں یہ کام مکمل کر لینا تھا۔ اگر اس سے زیادہ دیر لگتی تو الماریاں لاک رہ جاتیں۔ میں نے پہلے ایک چین لے کر الماریوں کے تالوں والی جگہوں پر نشان لگایا جہاں سے چادر کاٹنا تھی۔ گیس کو ہلکا سا کھول کر میں نے پہلے شعلہ جلایا اس کے بعد سیٹنگ کر کے شعلہ کو تیز تر کر لیا۔ یہ کام تجربے کا تھا اور ظاہر ہے مجھے اس کا تجربہ نہیں تھا لیکن پھر بھی میں نے شعلہ اتنا تیز کر لیا کہ جب اسے الماری کی چادر پر رکھا تو وہ اسے یوں کاٹنے لگا جیسے گرم چاقو مکھن کاٹتا ہے۔ نازو میرے پیچھے کھڑی تھی اور بے تابی سے منتظر تھی کہ الماریاں کھل جائیں۔ اس کی نظریں گھڑی پر تھیں اور وہ ہر گزرتے منٹ پر مجھے آگاہ کر رہی تھی۔ پانچ منٹ گزرے تو پہلی الماری کا لاک والا حصہ کچھ ہی باقی رہ گیا تھا۔ پندرہ بیس سیکنڈ کے بعد وہ کٹ گیا تو میں نے وقت ضائع کیے بغیر دوسری الماری کا تالے والا حصہ کاٹنا شروع کر دیا۔ نازو نے اضطراب سے کہا۔
''پہلے اسے تو دیکھ لو۔''
''گیس صرف دس منٹ کی ہے اس لیے پہلے اسے کاٹ دو پھر دیکھتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سلینڈرز سے لگے پریشر میٹرز کی سوئی نیچے آتی جا رہی تھی یعنی پریشر کم ہو رہا تھا اور گیس ختم ہو رہی تھی۔ دوسرا تالا بھی نصف سے زیادہ کٹ چکا تھا اور شعلہ مدھم پڑنے لگا۔ مجھے فکر ہونے لگی کہ یہ تالا پورا نہیں کٹ پائے گا۔ پھر بھی میں کوشش کر رہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ چادر کٹ جائے۔ تقریباً ستر فی صد چادر کٹ گئی تھی کہ شعلہ مدھم پڑ گیا اور اسی فی صد کام مکمل ہوتے ہوتے شعلہ بالکل ہی جواب دے گیا۔ میں نے ٹارچ بند کر دی۔ نازو کا منہ لٹک گیا۔
''یہ تو رہ گیا۔''
''پہلے اسے تو دیکھ لیں۔'' میں نے گرم حصہ بچاتے ہوئے الماری کو کھولا تو اندر صرف ایک فائل رکھی تھی۔ اس

www.kahopakistan.com

کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس بار نازو کے ساتھ مجھے بھی مایوسی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ اس میں کچھ نہ کچھ ملے گا لیکن اس میں ایک فائل کے سوا کچھ نہیں تھا جیسا کہ کالج کے طلبا کی فائل ہوتی ہے۔ نازو چلائی۔ ''لعنت ہو۔''

''میں تم سے متفق ہوں۔'' میں نے فائل اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اسے دیکھتے ہیں۔''

فائل میں اخباری تراشے تھے۔ میں انہیں دیکھنے لگا۔ سارے ہی تراشے شہر میں قتل ہونے والے مختلف افراد کے بارے میں تھے جنہیں نامعلوم قاتل نے نشانہ بنایا تھا۔ یہ تراشے گزشتہ دو سال سے لے کر اب تک کے تھے۔ کوئی ایک درجن تراشے تھے۔ نازو بھی جھانک کر دیکھ رہی تھی اور شاید ہم دونوں کے ذہن میں ایک ہی خدشہ سر سرا رہا تھا جسے پہلے نازو نے الفاظ کا روپ دیا۔ ''جلیل کہیں یہ سارے قتل...''

''قادر بخش نے تو نہیں کیے ہیں۔'' میں نے اس کا جملہ مکمل کیا۔ ''لگ تو ایسا ہی رہا ہے ورنہ اس فائل کو اس طرح سنبھال کر رکھنے کا اور کیا جواز ہو سکتا ہے۔''

نازو کانپ گئی۔ ''میں نے ایک قاتل سے شادی کر رکھی ہے۔''

''اور اس بات کا پورا امکان ہے کہ وہ یہاں آجائے۔''

''پھر کیا ہوگا؟'' نازو گھبرا کر بولی۔

''مرڈر۔'' میں نے سرسے انداز میں جواب دیا۔ ''ہم دونوں کا۔''

''جلیل یہاں سے نکل چل... ابھی... اسی وقت۔''

''یہ الماری باقی ہے۔''

''لعنت بھیج اس پر۔'' وہ چلائی۔ ''جان سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا ہے۔''

''وہ پچاس لاکھ بھی نہیں جو قادر بخش ہتھیا چکا ہے؟'' میں نے سوال کیا تو نازو چونکی۔

''ان کو تو میں بھول ہی گئی تھی۔''

میں نے دوسری الماری کا ہینڈل پکڑ کر کھینچا تو اس کا پٹ ہلکا سا ہلا لیکن وہ اتنی آسانی سے تالے والی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ نازو کہیں سے ایک لوہے کی سلاخ لے آئی، میں اسے تالے کے کٹ جانے والے حصے میں پھنسا کر لیور کا کام لیا تو پٹ کسی قدر مزاحمت کے ساتھ کھل گیا۔ جیسے ہی پٹ کھلا نازو نے کلکاری ماری کیونکہ سامنے ایک خانے میں سلیقے سے نوٹوں کی گڈیاں رکھی تھیں اور یہ ظاہر یہ رقم پچاس لاکھ روپے سے کہیں زیادہ کی تھی۔ ایک چھوٹا ڈرتھا لیکن وہ لاک تھا۔ نازو خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔ اس نے اچھل کر مجھے گلے لگایا اور ایک قابل سنسر حرکت کی۔ میں نے منہ صاف کیا۔

''یہ کیا ہے، تم بھول گئیں کہ ابھی شادی شدہ ہو۔''

''میں اس مخمل پر لعنت بھیج چکی ہوں۔''

''لیکن اس نے ابھی تمہیں طلاق نہیں دی ہے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''جب تک وہ تمہیں طلاق نہیں دے گا تم اس کی بیوی ہی رہو گی۔''

نازو نے شادی کے فیصلے کی طرح غالباً اس معاملے پر بھی نہیں سوچا تھا۔ ''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔''

''تم کورٹ کے ذریعے اس سے طلاق لے سکتی ہو۔''

''اب میں اس کے سامنے آنے کا خطرہ نہیں لے سکتی، وہ مجھے بلا معاوضہ قتل کر دے گا۔''

میں چونکا۔ ''بلا معاوضہ؟''

''میرا خیال ہے وہ پیشہ ور قاتل ہے اور لوگوں سے رقم لے کر ان کے دشمنوں کو ٹھکانے لگاتا ہے۔''

''کوئی بیگ یا ایسی چیز لاؤ جس میں یہ رقم رکھی جا سکے۔'' میں نے کہا۔ ''اس سے پہلے وہ آئے، ہمیں یہاں سے نکل جانا ہوگا۔''

بعض اوقات انسان کے منہ سے بات نکلتی ہے اور کارکنانِ قضا و قدر اسے فوراً لپک لیتے ہیں، اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ ابھی میری بات مکمل ہوئی تھی کہ کال بیل اور نازو کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے کانپتے لہجے میں کہا۔ ''جلیل... منحوس کہیں کے... وہ آگیا ہے۔''

''ممکن ہے کوئی اور ہو۔'' میں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

''نہیں وہی ہے کیونکہ یہاں کوئی اور نہیں آتا ہے۔ میں دیکھتی ہوں۔'' نازو نے کہا اور باہر کی طرف دوڑی کیونکہ اس بار آنے والے نے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی تھی اور ہٹانا بھول گیا تھا۔ نازو کے جاتے ہی میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور خود کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ نازو نے دروازہ کھولا اور میں نے اس کی لرزتی آواز سنی۔

''قادر تم...؟''

''ہاں۔'' ایک غراتی ہوئی مردانہ آواز نے کہا۔ ''کیا مجھے واپس نہیں آنا تھا، مر گیا تھا میں؟''

''نن... نہیں... تم نے کہا تھا دو دن بعد آؤ گے۔'' نازو نے بات بنائی۔ ''تم ایک دن میں آگئے اور یہ کیا ہوا؟''

''اسے چھوڑیے بتائیے کہ باہر والا تالا کیسے کھلا ہوا ہے؟''

''تالا کھلا ہوا ہے، مجھے تو معلوم نہیں۔'' نازو نے اداکاری کی۔ ''شاید تم جلدی میں بند کرنا بھول گئے ہو گے۔''

''ہاں ایسا ہی ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''ذرا جن کی بوتل اور گلاس لے آ۔''

''ابھی لائی۔'' نازو نے کہا اور اس کے لیے ام الخبائث لے آئی۔

''یہ بو کیسی آرہی ہے جیسے کچھ جلا ہو۔'' قادر بخش کو یقیناً ویلڈنگ کی بو آرہی تھی۔

''وہ شاید... ہاں سالن جل گیا تھا۔'' نازو نے جلدی سے کہا اس وقت وہ ہزار جھوٹ فی منٹ کی رفتار سے جھوٹ بول رہی تھی۔ ''یہ تمہیں چوئیں کیسے آئیں؟''

''معمولی سا ایسی ڈینٹ ہو گیا تھا اسی وجہ جلدی آنا پڑا۔'' اس نے کہا۔ ''جو کام کرنے گیا تھا، وہ بھی نہیں ہو سکا۔''

ظاہر ہے وہ کسی کا کام تمام کرنے گیا تھا اور اس حادثے کی وجہ سے نہیں کر سکا تھا۔ نازو کہہ رہی تھی۔ ''سر پر زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ہے؟''

''نہیں۔'' وہ بے زاری سے بولا۔ ''بس یہ ہاتھ کی تکلیف پریشان کر رہی ہے سوجن زیادہ ہے لیکن ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ بتا کھانے کو کیا ہے؟''

''ابھی تو کچھ نہیں ہے۔'' نازو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ وہ اس سے جس طرح بات کر رہی تھی، صاف لگتا تھا کہ قادر بخش سے نازو کی روح فنا ہوتی تھی۔ ''تم نہیں تھے تو میں نے کچھ بنایا نہیں اور جو سالن تھا، وہ جل گیا ہے۔''

''پتا نہیں کس پھوہڑ عورت سے واسطہ پڑ گیا ہے۔'' وہ بے زاری سے بولا اور پھر شاید اس کمرے کی طرف آنے لگا کیونکہ نازو نے بوکھلا کر کہا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''تجھے کیا، اپنے کام سے کام رکھ۔'' اس نے نازو کو جھڑکا۔

''نہیں، پہلے کپڑے بدل لو۔'' نازو اس کے سامنے آگئی۔ ''کتنے گندے ہو رہے ہیں۔''

''ابھی بدل لیتا ہوں سامنے سے تو ہٹ۔''

''تمہیں کیا چاہیے مجھے بتا دو میں لا دیتی ہوں۔''

''تو نہیں لا سکتی مجھے اس کمرے سے کام ہے اور اس کے تالے کی چابی میرے پاس ہے۔''

میری جان بھی نکل گئی۔ قادر بخش یقیناً اس کمرے میں آرہا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں بچاؤ کے لیے کچھ نہیں تھا۔ لیکن مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا نازو نے بعد میں بتایا کہ اس نے قادر بخش کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن وہ تیار نہیں ہوا حد یہ کہ نازو جذباتی انداز میں اس سے لپٹ گئی۔ اس پر اس نے نازو کو جھٹکے سے ایک طرف کر دیا اور چابی نکال کر تالے میں ڈالی لیکن وہ کھلا ہوا تھا مزید کہاں سے کھلتا اس پر قادر بخش نے نازو سے غرا کر کہا۔ ''اچھا حرامزادی اس لیے مجھے روک رہی تھی تو پہلے ہی اس کمرے کو کھول چکی ہے، تیرے پاس چابی کہاں سے آئی؟ ابھی تیرا دماغ درست کرتا ہوں پہلے اندر دیکھ لوں۔''

یہ کہہ کر قادر بخش نے لٹو پکڑا اور یک دم ساکت ہو گیا۔ نازو نے حیرت سے اسے دیکھا اور وہ اسے ہاتھ ہی لگانے جا رہی تھی کہ اچانک قادر بخش نے تھرتھر کانپنا شروع کر دیا اور پھر دھڑام سے زمین پر گر کر بالکل ساکت ہو گیا۔ نازو نے کہا۔ ''قادر کیا ہوا ہے تمہیں؟''

میں نے سوئچ آف کیا، دروازہ کھولا اور نازو کو بتایا۔

''اسے کرنٹ لگا ہے۔''

وہ خوش ہو گئی۔ ''کیسے؟''

''وہ ایسے کہ سلینڈر کی دھاتی ٹارچ نکال کر میں نے دھاتی پتری اور لٹو سے لگا دی اور سوئچ آن کر دیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس میں کرنٹ ہو گا۔'' میں نے پاؤں سے قادر بخش کو ہلایا۔ وہ کراہنے لگا۔ میں نے بوکھلا کر کہا۔ ''جلدی سے باندھنے والی کوئی چیز لے آؤ۔ اس کا منہ اور آنکھیں بھی بند کرنی ہیں۔''

قادر بخش میرے اندازے سے زیادہ ڈھیٹ نکلا تھا، اسے اچھا خاصا جھٹکا لگا تھا لیکن وہ اتنی جلدی ہوش میں آگیا تھا۔ نازو ایک مضبوط ٹیپ لے آئی پہلے میں نے اس کی آنکھوں پر ٹیپ لگایا اور پھر منہ پر اور آخر میں اس کے ہاتھ پاؤں اسی ٹیپ سے باندھ دیے۔ اس کے لباس کی تلاشی لی تھی لیکن اس میں کوئی ہتھیار نہیں تھا اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے نازو کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ ''آج ہی ایک قاتل چھوٹا بھائی کو مرحوم کرنے عین اس وقت آن پہنچا تھا جب میں اس کے دفتر کا باتھ روم استعمال کر رہا تھا۔''

''پھر وہ کامیاب ہوا؟'' نازو نے خوش ہو کر پوچھا۔

''نہیں، میں نے اس کے سر اور ہاتھ پر ڈنڈا مار کر اسے ناکام بنا دیا تھا کہیں وہ مہینہ قاتل تمہارا شوہر تو نہیں ہے کیونکہ اس نے نقاب لگا رکھی تھی۔''

نازو نے خوف زدہ ہو کر اسے دیکھا۔ ''شاید یہی ہو... جلیل اسے قتل کر دے ورنہ یہ بعد میں مجھے نہیں چھوڑے گا۔''

www.kahopakistan.com

''میں قتل نہیں کر سکتا اور اب اس کے سامنے میرا نام مت لینا۔'' میں نے نازو کو خبردار کیا۔ قادر بخش کے پاس سے چابیاں نکلی تھیں انہیں الماری کے اندرونی لاکر پر آزمایا تو ایک چابی لگ گئی۔ اندر تین عدد جدید ترین پستول رکھے تھے۔ ہر پستول کے ساتھ اس کی گولیوں کے ڈبے اور فاضل میگزین بھی تھے۔ اسلحہ بتاتا تھا کہ وہ پیشہ ور قاتل ہی تھا۔ نازو نے رقم ایک بیگ میں سمیٹ لی اور اپنی ساری چیزیں ایک بڑے سوٹ کیس میں ڈال لیں۔ وہ یہاں سے رخصتی کی تیاری کر رہی تھی۔ میں نے اسے ایک بار پھر یاد دلایا۔

''نازو، تمہیں اس سے طلاق لینی ہے۔''

''ہاں، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔'' وہ بولی۔

''ظاہر ہے تمہیں رقم سمیٹنے سے فرصت ملے تو اس بارے میں سوچو۔'' میں نے طنز کیا۔

''صرف میری رقم نہیں ہے۔'' وہ برا مان کر بولی۔

''اس میں تمہارا حصہ بھی ہے۔''

''مجھے معاف رکھو، میں اب توبہ کر چکا ہوں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اب بولو کیا کرنا ہے؟''

''مجھے طلاق تو چاہیے۔'' اس نے سوچ کر کہا۔ ''اور عدالت سے لے نہیں سکتی۔''

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی اگر ایک بار قادر بخش کو اس کا پتا چل جاتا تو وہ اسے زندگی سے طلاق دلوا دیتا۔ میں قادر بخش کے پاس آیا۔ ''قادر بخش تم میری آواز سن رہے ہو؟''

''ہوں۔'' اس نے ناک سے غرا کر کہا۔

''میں جانتا ہوں تم نے سیٹھ چھوٹا بھائی کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر اس نے تمہیں شناخت کر لیا تو تمہیں عدالت میں پیش کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی، اس سے پہلے ہی تم کسی پولیس مقابلے میں انتقال کر جاؤ گے۔''

''ہوں۔'' اس بار اس نے غرائے بغیر کہا۔ میں نے اس کے منہ سے ٹیپ ہٹا دیا اور تقریباً دس منٹ کے مذاکرات کے بعد وہ نازو کو طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا۔ دوسری صورت میں، میں نے اسے بالکل باندھ کر اسی فلیٹ میں چھوڑ کر جانے کی دھمکی دی تھی۔ تین دن میں اس کا انتقال ہو جاتا اور جب اس کی لاش سڑتی تب پڑوسیوں کو پتا چلتا اور نازو کا مسئلہ ویسے ہی حل ہو جاتا۔ پیشہ ور قاتل سہی لیکن جان اسے بھی پیاری تھی اس لیے وہ سچے کاغذ پر نازو کو طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا۔ نازو کو پستول کے ساتھ اس کی نگرانی پر چھوڑ کر میں نکلا اور قادر بخش کے شناختی کارڈ کی مدد سے ایک جگہ سے طلاق کا کاغذ ٹائپ کرایا۔ اس پر گواہوں اور نوٹری کے سائن تک موجود تھے اس لیے یہ صرف دو ہزار کا ملا تھا۔ جب کہ اصل کاغذ پچاس روپے والا تھا۔ اسے لے کر واپس آیا اور قادر بخش کا ہاتھ کھول کر اس سے سائن کرائے۔ نازو نے تصدیق کی کہ سائن درست تھے۔ اسے دوبارہ اسی طرح باندھا کہ وہ دس پندرہ منٹ کوشش کر کے خود کو آزاد کرا لے اور اس دوران میں ہم یہاں سے دور نکل جائیں گے۔ میں نے پوری احتیاط کی تھی کہ وہ مجھے نہ دیکھنے پائے کیونکہ نازو روپوش ہو سکتی تھی، میں نہیں۔

اس دوران میں نازو نے ساری تیاری مکمل کر لی تھی۔ دو عدد بڑے سوٹ کیس تیار تھے۔ میں ٹیکسی لے کر آیا اور پہلے ہم صدر گئے۔ وہاں سے نازو نے مزید خریداری کی۔ اس نے راستے میں بتایا کہ رقم تقریباً ساٹھ لاکھ روپے تھی اور اس کا ارادہ کچھ عرصے میں ملک سے باہر جانے کا تھا اس رقم سے وہ کسی ملک میں آرام سے سیٹ ہو سکتی تھی۔ میں نے اس کی تائید کی کہ اس طرح میرا ایک دردِ سر تو کم ہو گا جو ہر تیسرے چوتھے مہینے میرے سر پر سوار ہو جاتا تھا۔ اس نے مجھے ایک لاکھ دینے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے صرف اخراجات کے پانچ ہزار لیے۔

''باقی مالِ حرام تمہیں مبارک ہو۔'' میں نے نوٹ پرس میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس کا موڈ خراب ہو گیا۔

''اس میں میرے پچاس لاکھ روپے بھی ہیں۔''

''بے شک۔'' میں نے دانت نکالے۔ ''لیکن وہ کون سا حلال کے ہیں۔''

''اور تم نے جیسے بڑے حلال کمائے ہیں۔'' وہ غرائی اس کے بعد ہماری بات چیت بند ہو گئی، میں اسے ایک وومین ہاسٹل لے گیا جہاں اسے جگہ مل سکتی تھی۔ ٹیکسی رکتے ہی میں نے کہا۔

''خدا حافظ اور مہربانی کر کے بھول جانا کہ دنیا میں کوئی جلیل بھی پایا جاتا ہے۔''

''تم بھی بھول جانا کہ نازو بھی ہوتی تھی کبھی۔''

''میں بھول گیا ہوتا... اگر تم بار بار یاد نہ دلایا کرو۔'' میں نے کہا۔ ''میں جا رہا ہوں مجھے ابھی اپنی بائیک بھی لینی ہے۔''

جب بائیک لے کر گھر جا رہا تھا تو سوچا کہ آج بلاوجہ کی بھاگ دوڑ کی لیکن پھر خیال آیا کہ خدا نے آج دو بار مجھے مرحوم ہونے سے بچا لیا... جان بچی سو لاکھوں پائے اور مزید خیر سے بدھو گھر کو جا رہا تھا... کیا یہ کافی نہیں ہے؟

اصل دشمن

تنویر ریاض

کچھ پانے کے لئے بہت کچھ کھونا پڑتا ہے... لیکن بعض لوگ اپنی صلاحیتوں کا استعمال اپنے ہی قریبی احباب میں خرابیاں پیدا کرنے پر صرف کردیتے ہیں... وہ اپنے متعین کردہ ہدف کو ہر صورت حاصل کرنا چاہتے ہیں... اور اس کے لیے وہ دوسروں کو راستے سے ہٹانا ضروری خیال کرتے ہیں...

دشمنی نبھانے والے دوستی کے بھیس میں چھپے دشمن کی حیلہ سازی

پروفیسر ویلیس آئیوری، یونیورسٹی میں وکٹورین اسٹڈیز کے شعبے کا چیئرمین تھا۔ اس میں ایک نہیں کئی خوبیاں تھیں جن کی بنا پر اسے یہ مرتبہ ملا تھا۔ وہ اعتدال پسند محتاط اور ذمے دار شہری تھا۔ وہ ماڈرن لینگویج ایسوسی ایشن کا صدر رہ چکا تھا۔ یونیورسٹی کی سینیٹ کا رکن ہونے کے علاوہ بہترین ادبی کتابوں پر جان دار تبصروں اور بے شمار ادبی مقالوں کے مصنف کی حیثیت سے بھی اسے شہرت حاصل تھی۔ وہ ایک قابل بھروسا شخص تھا اور علمی حلقے اس کی رائے کو اہمیت دیتے تھے۔ مشکل سے مشکل صورتِ حال میں بھی وہ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ اس کی ساری زندگی تعلیمی

www.kahopakistan.com

محاذ آرائیوں اور یونیورسٹی کی سیاست میں گزری تھی۔ وہ عزت، شہرت اور مقبولیت کے اس درجے پر تھا کہ اس کے قریب ترین دوست بھی اس سے حسد کرتے تھے اور اپنے مفاد کی خاطر اس کی ٹانگ کھینچنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے لیکن ویلیس کو ان باتوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ بنیادی طور پر ایک اچھا انسان تھا اور سخت گیر ہونے کے باوجود انصاف سے کام لیتا تھا۔ اس کی شخصیت کو بیان کرنے کے لیے 'معقول' سے زیادہ مناسب لفظ کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگوں سے معاملات طے کرنے میں عمدگی اور معقولیت کا مظاہرہ کرتا البتہ پیٹر ٹرکاٹ سے اس کی کبھی نہیں بنی جو۔۔۔۔ ہمیشہ تعلیمی معاملات میں بگاڑ اور حماقت دکھایا کرتا تھا۔

اس کی شخصیت کے کئی پہلو ایسے تھے جن کی وجہ سے ویلیس اس سے نفرت کرنے پر مجبور تھا۔ وہ بندرگاہ پر کام کرنے والے مزدوروں جیسا لباس پہنتا تھا۔ پرانی جینز اور فلالین کی قمیص اس کا پسندیدہ لباس تھا۔ پاؤں میں سینڈل اور سردیوں میں بھاری بھر کم بوٹ جنہیں دیکھتے ہی کان کن کا نقشہ سامنے آجاتا۔ اس کے برعکس ویلیس کو اپنے عہدے کے تقدس کا خیال تھا اس لیے وہ ہمیشہ سیاہ یا دھاری دار تھری پیس سوٹ میں نظر آتا۔ ٹرکاٹ اس پر بھی پھبتی کسنے سے باز نہ آتا اور آسکر وائلڈ کہہ کر اس کا مذاق اڑاتا۔ ایسی اور بھی بہت سی باتیں تھیں جن کی وجہ سے ویلیس اس کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔

وہ دونوں ہر لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ویلیس مکمل طور پر انگریزی تہذیب کا دلدادہ تھا جو ٹرکاٹ کے نزدیک محض ظاہر داری تھی اور وہ اپنی اس رائے کا اظہار کئی بار کر چکا تھا جبکہ ویلیس اسے چھوٹی عقل کا شخص سمجھتا تھا جس کی سوچ بڑی محدود تھی۔ ویلیس کا خیال تھا کہ وکٹورین حکمرانوں کے بارے میں لیکچر دینے کے لیے سیاق و سباق اور اس دور کے تہذیب و تمدن سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اس کے برعکس ٹرکاٹ زیادہ گہرائی میں جانے کا قائل نہ تھا اور کتابوں میں سر کھپانے کے بجائے اپنا کام ریڈیو، فلموں اور ٹی وی ڈراموں سے چلا لیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بصری مواد لیکچر کے مقابلے میں زیادہ پُراثر ہوتا ہے اور طالب علم اسے آسانی سے سمجھ جاتے ہیں۔

ان دونوں کے اختلافات کا اثر طالب علموں پر بھی پڑ رہا تھا۔ وہ ویلیس کی علمی قابلیت اور مرتبے کے معترف تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں ٹرکاٹ کے انداز میں بھی کشش محسوس ہوتی تھی۔ یہ صورتِ حال کبھی کے لیے پر
کن تھی لیکن ویلیس کا کہنا تھا کہ اس میں ساری غلطی ٹر
کی ہے اور اگر کسی نے اس کے پاگل پن کو نہ روکا تو شعبے
سربراہ کی حیثیت سے وہ مجبور ہوگا کہ وہ معاملے کو اوپر
جائے۔ اس کے ساتھی بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے اور
اس کی باتوں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیتے۔

حقیقت تو یہ تھی کہ پروفیسر ٹرکاٹ خود بھی بہت بیز
اور شعبے کا سربراہ نہ ہونے کے باوجود کچھ لوگوں کی نظر میں
ویلیس سے زیادہ قابلِ احترام تھا۔ اس نے ہمیشہ لی
انٹرویوز میں اپنے آپ کو ماہر ثابت کرنے کی کوشش کی ا
کا زیادہ وقت روایتی شوز اور ایسی کتابوں کی افتتاحی تقریبا
میں گزرتا جن کے اندر بقول ویلیس یہ پیغام چھپا ہوتا کہ
خرید لو۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب ویلیس نے ٹرکاٹ کو
معمولی حالت میں دیکھا تو اس کا ردِعمل وہ نہیں تھا جو کیم
کے اندر یا باہر کسی دوسرے شخص کو دیکھ کر ہوتا۔

اس روز وہ تین گھنٹے کا سیمینار ختم کرنے کے بعد
ساڑھے چھ بجے ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکلا اور پارکنگ لا
کی جانب چل دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کاغذوں سے
ہوا بریف کیس اور دوسرے ہاتھ میں لیپ ٹاپ تھا۔ پارک
لاٹ میں ابھی تک بہت سی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ دسمبر
سرد ہوا میں خزاں رسیدہ پتے اِدھر سے اُدھر اڑ رہے تھے
ویلیس کو اپنے شعبے کے صدر کے یہاں اوپن ہاؤس پار
میں جانا تھا کہ وہ اپنے بریف کیس اور لیپ ٹاپ کو مقفل
دے۔ اس نے اپنی بی ایم ڈبلیو کی ڈکی میں چابی گھمائی ا
اندر کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ڈکی میں پیٹر ٹرکاٹ لیٹا
تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو دہشت کے مارے چلانے
لیکن ویلیس کو اپنے اعصاب پر قابو پانا آتا تھا۔ اس
فوری طور پر ڈکی بند کی اور بریف کیس سمیت لیپ ٹاپ
پسنجر سیٹ پر رکھ دیا پھر اس نے غور سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ا
وہاں کوئی فرد نظر نہیں آیا۔ ایک بار پھر اس نے ڈکی کھول
پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ کسی نے ٹرکاٹ کی ڈمی بنا کر وہاں رکھ
ہے، ممکن ہے کہ یہ کسی شریر طالب علم کی حرکت ہو۔ اندھیر
میں اسے ٹھیک طرح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ محسوس کر
تھا کہ اسے فوری طور پر آنکھوں کا معائنہ کروانے کی ضرورت
ہے۔ اس نے ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ وہ نقلی نہیں، ا
ٹرکاٹ تھا جو نیلے رنگ کی ترپال میں لپٹا ہوا تھا۔ ویلیس کو
سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ٹرکاٹ اس دنیا سے رخصت ہو
ہے۔

ویلیس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی لاش کو چھوا۔ وہ سرد ہو چکی تھی۔ اگر اس میں زندگی کی ذرا سی بھی رمق ہوتی تو وہ پولیس کو فون کر سکتا تھا لیکن موجودہ صورتِ حال میں اس کے لیے پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں گو کہ تین گھنٹے تک سیمینار میں موجودگی اس کی بے گناہی کے لیے کافی تھی لیکن اس کی گاڑی کی ڈکی میں ٹرکاٹ کی لاش کا پایا جانا بہت سی الجھنوں کا سبب بن سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ پولیس کو فون کر دیتا کیونکہ ایک ذمے دار شہری ہونے کی حیثیت سے یہ اس کا فرض بنتا تھا لیکن سبھی جانتے تھے کہ ان دونوں میں نہیں بنتی تھی اور دو دن پہلے ہی ان کے درمیان ایک زوردار جھڑپ ہوئی تھی۔ اب وہ اپنے رقیب کی لاش کے پاس کھڑا اس جھگڑے کی وجہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا پھر اسے یاد آگیا کہ ان کے درمیان الزبتھ براؤننگ کے ناول پر بحث شروع ہوئی تھی اور اس پر اس نے جو تبصرہ کیا، ٹرکاٹ حسبِ عادت اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

ان دونوں کے درمیان جھگڑا اتنا بڑھ گیا کہ دوسرے لوگوں کو مداخلت کرنا پڑی۔ ایک سینئر انتظامی افسر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر ان دونوں نے خاموشی اختیار نہ کی تو وہ چیئرمین کو بلا لے گا گو کہ زیادہ غلطی ٹرکاٹ کی تھی لیکن اب ویلیس نے محسوس کیا کہ جھگڑے کو آگے بڑھانے میں اس کا بھی اچھا خاصا ہاتھ تھا۔ وہ بلاوجہ ہی اشتعال میں آگیا تھا۔ اس واقعے کے بارے میں اس نے پولیس کو فون کرنا مناسب نہ سمجھا۔

اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس صورتِ حال کا کس طرح مقابلہ کیا جائے۔ اس نے پہلے سوچا کہ جس طرح کسی نامعلوم شخص نے ٹرکاٹ کی لاش اس کی ڈکی میں رکھ دی ہے اسی طرح وہ بھی اسے کسی دوسری گاڑی میں ڈال دے۔ اس کے لیے اسے ایک ایسی کار تلاش کرنا تھی جس کی ڈکی کا تالا کھلا ہو۔ اس کی اپنی گاڑی نئی اور جدید طرز کی تھی اور اس کی ڈکی کا تالا چابی کے بغیر نہیں کھل سکتا تھا۔ اگر یہ لاش اسی گاڑی میں پڑی رہتی تو بعد میں پولیس یہ سوال ضرور پوچھتی کہ کوئی دوسرا شخص اس کی ڈکی کا تالا کھولنے میں کیسے کامیاب ہوگیا۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ جلد از جلد اس لاش سے چھٹکارا حاصل کرے۔ ویلیس نے پارکنگ لاٹ میں کھڑی مختلف گاڑیوں کو دیکھنا شروع کر دیا لیکن ان سب کی ڈکی مقفل تھی یا اتنی چھوٹی کہ اس میں ٹرکاٹ کی لاش نہیں سما سکتی تھی۔
بالآخر وہ ایک ایسی سفید ہنڈائی کار تلاش کرنے میں

قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

کامیاب ہوگیا جو اس کے مقصد کے لیے بہت مناسب تھی۔

وہ تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف آیا۔ ریورس گیئر لگا کر اسے گاڑیوں کی قطار سے باہر نکالا اور مطلوبہ کار کے پیچھے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اس نے ڈکی کا دروازہ کھولا اور لاش کو دوسری گاڑی میں منتقل کرنے ہی والا تھا کہ اچانک ہی اس نے طالب علموں کے ایک گروپ کو پارکنگ لاٹ کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے جلدی سے ڈکی کا دروازہ بند کیا، ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور تیزی سے گاڑی کو پارکنگ لاٹ سے باہر نکال لایا۔ اس نے ڈیش بورڈ کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ چھ بج کر پچاس منٹ ہوئے تھے گویا صرف پندرہ منٹ کے دوران میں ہی وہ اپنی زندگی کے سب سے ہولناک تجربے سے دوچار ہو چکا تھا۔ اب اس کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ وہ ٹرکاٹ کی لاش کو لے کر کہاں جائے؟ سڑکوں پر معمول سے زیادہ رش تھا جبکہ زیادہ تر پارک سردی کی وجہ سے بند ہو چکے تھے۔ اسے کیمپس میں ہونے والی کھدائی کا خیال آیا جو ایک نئی عمارت کی بنیاد بھرنے کے لیے ہو رہی تھی لیکن اس جگہ کے گرد باڑ لگا دی گئی تھی اور وہاں دو چوکیداروں کے علاوہ کچھ مزدور بھی رات گزارتے تھے۔ ان کی موجودگی میں لاش کو کسی گڑھے میں پھینکنا ممکن نہ تھا۔

ویلیس کے پاس وقت کم تھا اور اسے پارٹی میں پہنچنے کی بھی جلدی تھی۔ اس کا وہاں جانا بہت ضروری تھا۔ پہلی وجہ تو یہ کہ وہ میزبان مورگن سے وعدہ کر چکا تھا کہ سیمینار ختم ہوتے ہی وہ سیدھا وہاں آئے گا اور دوسری اہم بلکہ خاص وجہ یہ تھی کہ اس کے وہاں نہ جانے سے شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے تھے اور کسی کے ذہن میں بھی یہ سوال آسکتا تھا کہ ویلیس وعدہ کرنے کے باوجود پروگرام کے مطابق پارٹی میں کیوں نہیں آیا۔ اسی لیے اس نے مورگن کے گھر کی طرف جانے والی پتلی سی سڑک پر اترتے ہی دو مرتبہ اطمینان کر لیا کہ گاڑی کی ڈکی مقفل ہے۔

www.kahopakistan.com

عام حالات میں وہ اس پارٹی سے جی بھر کر لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ مورگن اور اس کی نوجوان بیوی نے مہمانوں کی تواضع کے لیے خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ مہمان اپنی پسندیدہ ڈشوں اور عمدہ قسم کی شراب سے دل بہلا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ خوش گپیوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ وہ لوگ یونیورسٹی کی سیاست سے لے کر آنے والے بجٹ تک پر گفتگو کر رہے تھے۔ ان میں ڈیپارٹمنٹ کا ڈین بھی شامل تھا جو بحث میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ مورگن کی نوجوان بیوی کو بھی کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ ویلیس جانتا تھا کہ وہ خوب صورت عورتوں سے فلرٹ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ان تمام ہنگاموں اور دلچسپیوں کے باوجود اس کا ذہن ٹرکاٹ کی لاش میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ بے چینی سے بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ پارٹی جلدی سے ختم ہو تاکہ وہ بھی اس لاش سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ترکیب کر سکے۔

بالآخر مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہونا شروع ہوئے۔ مورگن اور اس کی بیوی صدر دروازے پر کھڑے مہمانوں کو الوداع کہہ رہے تھے۔ باہر غضب کی سردی تھی اور ہلکی ہلکی برف باری شروع ہو چکی تھی۔ ویلیس بہ مشکل تمام اپنی بی ایم ڈبلیو کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو سکا کیونکہ سبھی لوگوں کو وہاں سے نکلنے کی جلدی ہو رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے سب اپنی گاڑی کی ڈکی میں لاش لیے پھر رہے ہیں اور اسے ٹھکانے لگانے کے لیے بے چین ہیں۔

ویلیس جانتا تھا کہ اسے تیزی سے یہ کام نمٹانا ہے کیونکہ وہ ساری رات گھر سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے مورگن کے گھر ہال میں لگے ہوئے وال کلاک میں وقت دیکھ لیا تھا۔ وہ پونے آٹھ بجے وہاں سے نکلا تھا۔ اگر کوئی اس کی مصروفیت کے بارے میں جاننا چاہتا تو اسے بتانے میں کوئی دشواری نہ ہوتی لیکن یہ سب اس کی اپنی احتیاط تھی۔ اگر ایک بار وہ اس لاش سے چھٹکارا پا لیتا تو اس پر شک کرنے کی بالکل بھی گنجائش نہ رہتی۔

وہ شہر کی مصروف ترین سڑک سے گزرتا ہوا بریز وائز کی طرف جانے والے راستے پر چل پڑا وہاں ایک بہت بڑی جھیل تھی۔ وہ سڑک بالکل سنسان تھی اور اس کے آگے پیچھے کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے جھیل کے کنارے لگے ہوئے جنگلے کے ساتھ گاڑی روکی۔ اس کی بتیاں بجھا دیں۔ لاش کو ڈکی سے نکالا اور جھیل میں پھینک دیا۔ کچھ دیر وہ وہیں کھڑا اپنے آپ کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے کسی کار کے انجن کی آواز سنی۔ وہ جلدی سے اپنی بی ڈبلیو میں بیٹھا اور گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ جلدی میں وہ سیٹ بیلٹ باندھنا بھی بھول گیا۔ مرکزی شاہراہ پر آنے سے پہلے اس نے سیٹ بیلٹ باندھی تاکہ دیکھنے والوں کو سب معمول کے مطابق نظر آئے۔

اس کی بیوی آئرین رات کے کھانے پر اس کا انتظار رہی تھی۔ وہ مورگن کی پارٹی میں ڈھنگ سے کچھ نہیں کھا تھا۔ اس لیے کھانے کو دیکھ کر اس کی بھوک چمک اٹھی اور لباس تبدیل کیے بغیر ہی کھانے کی میز پر بیٹھ گیا۔ آئرین اس کی پسندیدہ ڈش چکن روسٹ بنائی تھی۔ اس نے خو ڈٹ کر کھانا کھایا اور تعریفی انداز میں بولا۔ ”ونڈرفل!“

آئرین چونکتے ہوئے بولی۔ ”میں نے کوئی خا ڈش تو بنائی نہیں جو تم اتنا چہک رہے ہو۔ وہی عام سا کھ ہے۔“

وہ ایک زوردار انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔ ”کبھی کب تمہارے بنائے ہوئے عام کھانے بھی خاص ہو جا ہیں۔“

کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس کی طبیعت بگڑنے لگی۔ شا اس نے زیادہ کھانا کھا لیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے ا معمولات میں مزید احتیاط برتنے کی ضرورت ہے کیو آنے والے دنوں میں اس کا کوئی بھی غیر ارادی عمل مسئلہ کر سکتا ہے۔ اس نے خوامخواہ ہی دردِ سر مول لیا تھا پھر وہ یہ کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا کہ اگلے روز صبح اس کی اپنے طالب علموں سے ایک اہم میٹنگ ہے پھر اس نے ایک کتا اٹھائی اور بستر پر لیٹ کر اس کا مطالعہ کرنے لگا۔

آئرین کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ وہ اس کا مطلب سمجھ ہوئے بولا۔ ”گاڑی میں گیس صبح بھروا لوں گا۔“ حالانکہ اسے یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ گیس اسٹیشن ا کے راستے میں نہیں آتا تھا اور اس کے لیے اسے خاص طور ہائی وے سے گھوم کر جانا پڑتا تھا۔

”سپر مارکیٹ سے کچھ سامان لانا ہے۔“ اس کی بیو نے کہا۔

”اس وقت میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“ وہ جھلا ہوئے بولا۔ اس کے چڑچڑے پن کو آئرین نے بھی محسو کیا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی کیونکہ ویلیس اس مزاج آدمی نہیں تھا۔ وہ بستر سے اٹھ کر اپنی میز پر چلا گیا اور ایک کاغذ پر کچھ لکھنے لگا۔ اسے یہ سب کچھ بہت بیزار کن لگ ر تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ٹرکاٹ نے مرنے کے بعد بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اس نے سوچ لیا کہ ٹرکاٹ کے بھوت سے جان چھڑانے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ وہ اپنی اصلیت پر قائم رہے۔

دوسری صبح وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ غیر معمولی خوش اخلاقی سے پیش آیا گو کہ اس دن کا موضوع بہت خشک تھا اور ویلیس کو اس کے کچھ حصوں کی تشریح میں مشکل پیش آ رہی تھی لیکن دو گھنٹے کی عرق ریزی کے بعد وہ اس مشکل مرحلے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے جھیل کا رخ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں پولیس کی گاڑیوں اور ایمبولینس کے علاوہ ٹی وی رپورٹرز اور کیمرا مینوں کا بھی ہجوم ہو گا اور پولیس نے جائے حادثہ کے گرد زرد فیتہ باندھ دیا ہو گا۔ جیسے جیسے وہ اس جگہ سے نزدیک ہوتا جا رہا تھا، اس کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔

درختوں اور پتوں پر برف کی تہ جمی ہوئی تھی اور سورج کی کمزور روشنی میں آسمان گہرا نیلا نظر آ رہا تھا۔ ویلیس کو وہاں کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی سوائے اس کے کہ جھیل کے دونوں کناروں پر بھی برف کی تہ جمی ہوئی تھی۔ وہ حیرت کے عالم میں آگے تک چلا گیا۔ سورج کی کرنوں نے جھیل کے پانی کو ایک سفید چادر میں تبدیل کر دیا تھا اور ٹرکاٹ کی لاش اس کی تہ میں کہیں قید ہو گئی تھی۔ برف پگھلنے تک اس کے سطحِ آب پر آنے کا امکان نہیں تھا۔ اس میں جتنی تاخیر ہوتی اتنا ہی کنفیوژن بھی بڑھتا جاتا اور ٹرکاٹ کی موت کے حقائق تک پہنچنا مشکل ہو جاتا۔ یہ سوچ کر ویلیس مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

گیس اسٹیشن پہنچ کر اس نے گیس بھروائی اور کار واش پر موجود لڑکے کو ہدایت کی کہ وہ گاڑی کو اندر سے اچھی طرح صاف کر دے۔ ویلیس کو امید تھی کہ اس طرح ٹرکاٹ کی لاش کی تمام نشانیاں صاف ہو جائیں گی۔ صفائی مکمل ہونے کے بعد اس نے لڑکے کو معقول ٹپ دی اور کیمپس واپس چلا آیا۔ وہاں لوگ ٹرکاٹ کی غیر حاضری پر قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ اس کا نہ تو کوئی فون آیا اور نہ ہی گھر پر اس سے رابطہ ہو سکا۔ ویلیس کے کان کھلے تھے لیکن اس نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کرنے سے گریز کیا۔ مبادا اس کے منہ سے کوئی ایسا جملہ نہ نکل جائے جو بعد میں پریشانی کا سبب بن جائے۔

لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ کہیں چلا گیا ہے تو کسی کو اس کی گم شدگی میں بھی کوئی سازش نظر آ رہی تھی۔ البتہ اکثریت کا خیال تھا کہ وہ خراب موسم کی وجہ سے کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔ ویلیس نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا۔ کیمپس پولیس اسے شہر کی گلیوں غیر آباد عمارتوں میں تلاش کرتی پھر رہی تھی جبکہ ویلیس مسلسل تھرمامیٹر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ ان دنوں وہ ٹی وی پر موسم کی خبریں بھی بڑی باقاعدگی سے سن رہا تھا۔ جوں جوں برف پگھلنے کا وقت قریب آ رہا تھا، اس کی بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

فروری میں برف پگھلنا شروع ہوئی اور جھیل کی بالائی سطح میں ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی۔ اب وہاں سفید چادر کے بجائے برف کے بڑے بڑے ٹکڑے تیرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پھر ایک دن ٹرکاٹ کی لاش بھی جھیل کی سطح پر ابھری جسے ایک مچھیرے نے دیکھا جو کنارے پر بیٹھا ہوا جاتی ہوئی سردی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

اس کی موت کی تصدیق ہو جانے کے بعد پولیس اس کی موت کی وجہ جاننے میں لگ گئی۔ اس نے خودکشی نہیں کی تھی اور نہ ہی وہ طبعی موت مرا تھا۔ یقیناً اسے کسی نے قتل کر کے لاش جھیل میں پھینک دی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ قتل اس کے کسی دوست نے نہیں بلکہ دشمن نے کیا ہو گا۔ پولیس اسی دشمن کو تلاش کر رہی تھی اور اس حوالے سے کئی سوالات سامنے آ رہے تھے۔ ویلیس اپنے کام میں بہت مصروف ہو گیا تھا اور ڈین کو اس سے شکایت تھی کہ وہ نئی ہدایات پر عمل نہیں کر رہا جس پر ویلیس نے اس سے معذرت کر لی تھی۔ ویسے بھی پولیس کے پاس اس پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کیونکہ جس روز ٹرکاٹ کا قتل ہوا وہ تین سے چھ بجے تک سیمینار میں موجود تھا وہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ مورگن کی پارٹی میں چلا گیا جبکہ ٹرکاٹ کی موت اسی دوران واقع ہوئی تھی۔

اس کے باوجود وہ پولیس کی دلچسپی کا مرکز بن گیا۔ اس کے علاوہ وہ کس پر توجہ دیتے۔ لوگوں کے بیانات سے واضح ہو گیا تھا کہ ویلیس اور ٹرکاٹ میں شدید رقابت چل رہی تھی اور وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ اسے پولیس کو یہ سمجھانے میں کافی وقت لگ گیا کہ ان کے درمیان اختلافات کی نوعیت پیشہ ورانہ تھی اور اس میں زور زبردستی کا کوئی دخل نہ تھا۔ پولیس اس کے خلاف کچھ ثابت نہیں کر سکتی تھی۔ اگر وہ اسے ٹرکاٹ کا دشمن ظاہر کرتی تب بھی موقعِ واردات سے اس کی عدم موجودگی ثابت تھی۔

سیمسٹر کے اختتام تک پولیس کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی

www.kahopakistan.com

تاہم قاتل کے نہ پکڑے جانے سے ویلیس کا تجسس بڑھ گیا تھا۔ اب پولیس کی گاڑی کو دیکھ کر اسے کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی اسے اپنی گاڑی کی ڈکی کھولتے ہوئے کراہت محسوس ہوتی البتہ وہ یہی کوشش کرتا تھا کہ اپنی گاڑی کو ممکنہ حد تک عمارت کے قریب کھڑا کرے جہاں خوب روشنی ہو۔

اپنی ذہانت اور خود پر قابو پانے کی صلاحیت کی وجہ سے وہ کسی بڑی آفت کا شکار ہونے سے بچ گیا۔ ٹرکاٹ کا کانٹا ہمیشہ کے لیے نکل گیا تھا۔ وہ پُرسکون تو تھا لیکن مکمل طور پر خوش نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کیمپس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی واقع ہوگئی ہے۔ ہر طرف ایک بے کیفی کی سی حالت تھی۔ کامن روم میں جاتے ہوئے اسے بوریت ہوتی۔ میٹنگ میں تھکن کا احساس ہونے لگتا۔ اسے کبھی کبھی ٹرکاٹ کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگتی جس کی وجہ سے کسی بھی موضوع پر بحث کرنے میں مزہ آتا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ اس کے شعور میں ایک اور احساس بھی پروان چڑھ رہا تھا وہ یہ کہ اس کے اردگرد کم از کم ایک شخص ایسا ہے جو جانتا ہے کہ اسی نے ٹرکاٹ کی لاش کو ٹھکانے لگایا ہے اور وہ کسی وقت بھی اس کے لیے خطرہ بن سکتا تھا کہ کہ یہ طے ہوگیا تھا کہ ٹرکاٹ کو کسی نامعلوم شخص نے قتل کیا ہے اور اگر اسی نے ٹرکاٹ کی لاش اس کی کار کی ڈکی میں رکھی تھی تب بھی وہ پولیس کو یہ بات بتانے کی حماقت نہیں کرے گا۔ ایسی صورت میں وہ خود بھی بری طرح پھنس جاتا لہٰذا وہ کسی بھی صورت ویلیس کے لیے خطرہ نہیں بن سکتا اور اس کا یہ خوف بے بنیاد ہے۔

ویلیس کے ذہن میں ایک اور سوچ بڑی تیزی سے پروان چڑھ رہی تھی کہ قاتل نے ٹرکاٹ کی لاش چھپانے کے لیے اس کی کار کا انتخاب کیوں کیا جبکہ وہ گاڑی نئی ہونے کے سبب فوراً ہی نظروں میں آسکتی تھی۔ اس کے لیے تو کوئی ایسی کار مناسب رہتی جس میں کوئی امتیازی خصوصیت نہ ہو اور ٹریفک کے ہجوم میں اسے بہ آسانی نہ پہچانا جاسکے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی نے جان بوجھ کر اسے پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی اسے پسینا آگیا۔

ٹرکاٹ سے اس کے اختلافات عملی اور پیشہ ورانہ نوعیت کے تھے۔ دونوں میں سے کسی نے کبھی یہ نہیں چاہا ہوگا کہ فریق مخالف راستے سے ہٹ جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا حقیقی دشمن کوئی اور تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کسی کو اس سے کیا دشمنی ہوسکتی تھی۔ وہ خود سادہ مزاج اور مثبت سوچ رکھنے والا شخص تھا اس لیے سامنے کی بات نہ سمجھ سکا جس عہدے پر تھا، اس میں دوسرے لوگوں کے لیے بڑی کشش ہوسکتی تھی۔ اس کے شعبے میں وکٹورین عہد کے حوالے سے خصوصی چیئر قائم کی گئی تھی جسے حکومت کی طرف سے سال ایک خطیر رقم عطیے کے طور پر ملتی تھی جسے ویلیس بڑی ایمان داری سے طالب علموں کے وظائف اور عملی تحقیق پر خرچ کردیا کرتا تھا پھر شعبہ کا چیئرپرسن ہونے کی وجہ سے اس کے تعلقات علمی وادبی حلقوں کے علاوہ طبقہ امرا سے بھی تھے اور پارلیمنٹ کے کئی ارکان اس سے رابطے میں رہتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی بدطینت شخص نے اس عہدے پر فائز ہونے کے لیے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا منصوبہ بنایا ہو ایک طرف اس نے ٹرکاٹ کو قتل کیا اور دوسری جانب ویلیس کو پھنسانے کے لیے اس کی کار میں لاش رکھ دی۔

ویلیس حیران تھا کہ یہ بات پہلے اس کے ذہن میں کیوں نہیں آئی۔ اس نے صرف کسی اسکینڈل سے بچنے کے لیے پولیس کو اپنی گاڑی میں لاش کی موجودگی کی اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا۔ وہ صرف ٹرکاٹ کو ہی اپنا رقیب اور دشمن سمجھتا تھا اور اسی جذبے سے مغلوب ہوکر اس نے یہ سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ ٹرکاٹ نہیں بلکہ اس کا دشمن وہ نامعلوم قاتل ہے جس نے اس کی گاڑی میں لاش رکھ کر اسے پھنسانے کی کوشش کی ہے۔

اسے یہ جان کر خوف اور ہیجان محسوس ہورہا تھا کہ اس کا کوئی حقیقی دشمن بھی ہے جو انتہائی چالاک اور بے رحم ہے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ قاتل کا تعلق کیمپس سے ہی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اسی کے شعبے سے منسلک ہو۔ اس کے ساتھ سیمینار اور میٹنگز میں شریک ہوتا ہو یا دفتری امور انجام دیتا ہو... کوئی ہے جو اس سے نفرت کرتا اور اسے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ اب اسے ہر ایک پر نظر رکھنا ہوگی ہر لفظ پر غور کرنا ہوگا۔ ہر شخص کی نقل وحرکت نوٹ کرنا ہوگی۔ اب اسے اپنے پرانے دشمن ٹرکاٹ اور نئے نامعلوم دشمن میں واضح فرق نظر آنے لگا تھا۔ ٹرکاٹ اپنی حرکتوں سے اس کے اندر تحریک پیدا کرتا تو جبکہ اس نئے نادیدہ دشمن نے اسے فکر و پریشانی میں مبتلا کردیا تھا۔

اس نے ممکنہ دشمنوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو سب سے پہلے اس کے ذہن میں ایڈگر کا نام آیا۔ وہ امریکن تھا اور ویلیس نے کچھ تعلیمی معاملات میں اس کی مخالفت کی تھی۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ ایڈگر جب بھی اس کی کلاس میں ہوتا تو یوں لگتا جیسے وہ اس کی نگرانی کررہا ہو۔ عام حالات میں وہ ایڈگر کو کبھی اہمیت نہ دیتا لیکن موجودہ صورت حال نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔

دوسرا شخص سال ہوسکتا تھا جس کے بارے میں افواہ تھی کہ ٹرکاٹ نے کسی بات پر ناراض ہوکر اسے دفتر سے نکال دیا تھا اور جس والہانہ انداز میں وہ ویلیس سے بغل گیر ہوا تھا اس پر ویلیس کو بھی حیرت ہورہی تھی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ دشمن کا دشمن آپ کا دوست ہوتا ہے لیکن نہ جانے کیوں وہ اسے دوست ماننے پر تیار نہ تھا۔

اس فہرست میں مزید نام شامل ہوتے گئے جن میں آفس اسسٹنٹ میریلین بھی تھی جو عمر میں اس سے بیس سال چھوٹی لیکن تن وتوش میں دگنی تھی۔ اس نے سوچا کہ کیا وہ کسی کی لاش ڈکی میں رکھ سکتی ہے۔ جواب اثبات میں تھا۔ اس جیسی عورتوں سے ہر کام کی توقع کی جاسکتی تھی۔ اس نے زیر تعلیم طلبہ اور سابق طالب علموں کے بارے میں بھی سوچا۔ اسے اعتراف تھا کہ چند مواقع ایسے بھی آئے جب ان میں سے کچھ طالب علم اس سے خوش نہ تھے۔ ان میں سے کئی فارغ التحصیل طلبہ اب ملازمت کررہے تھے لیکن ان کی رہائش اسی علاقے میں تھی۔ ویلیس نے ان لوگوں پر خاص طور سے نظر رکھنا شروع کردی۔ کون جانے کہ قاتل کیا چاہتا تھا۔

وہ اس کے لیے بہت بُرے دن تھے۔ اسے ہر شخص پر شک ہونے لگا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ کیمپس پولیس ہیڈ کوارٹر گمنام کال کرکے انہیں اپنے خدشات سے آگاہ کرکے ان سے مدد مانگے۔ لیکن اس طرح تو اس کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ وہ جب اس سے خوف کی وجہ معلوم کرنا چاہتے تو اسے پورا قصہ سنانا پڑتا اور اس طرح وہ خود پھنس جاتا۔ اس میں اتنا بڑا قدم اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔

اگلے سال دسمبر تک اس کی حالت خاصی بگڑ چکی تھی۔ اس کا وزن خطرناک حد تک کم ہوگیا تھا اور اسے چلنے پھرنے میں بھی تکلیف ہورہی تھی۔ شعبے کے صدر نے اسے مشورہ دیا کہ اگر وہ ملازمت نہیں چھوڑنا چاہتا تو آرام کی غرض سے سالانہ چھٹی پر چلا جائے۔ ویلیس نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ اسے یہ سن کر بہت تکلیف ہوئی تھی لیکن اس سے بھی زیادہ پریشانی اس وقت ہوئی جب ڈین نے اسے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لینے کا مشورہ دیا لیکن ویلیس نے اسے بھی ماننے سے انکار کردیا۔ ڈین نے اسے سرد مہری سے دیکھا اور بولا۔

”تمہارے خلاف کافی شکایات ہیں اور ان میں کچھ سنجیدہ نوعیت کی ہیں۔“

”ہاں، یہ میرے لیے ایک مشکل سال تھا۔“ ویلیس نے اعتراف کیا۔ ”لیکن اگلے سمسٹر میں صورت حال بہتر ہو جائے گی۔“

”میرا خیال ہے کہ اگر ابھی ریٹائرمنٹ لے لو تو تمہیں زیادہ بہتر حیثیت مل سکتی ہے لیکن بعد میں نہیں۔“

پارکنگ لاٹ کی طرف جاتے ہوئے ویلیس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اس نے کندھے پر اپنا بھاری کمپیوٹر بیگ رکھا ہوا تھا اور اس کے لیے فرش پر قدم جمانا مشکل ہورہا تھا۔ کار سے چند قدم کے فاصلے پر اس کا پیر پھسلا اور اس نے بہ مشکل اپنے آپ کو گرنے سے بچایا۔ اس نے جیسے تیسے ڈکی کھول کر اپنا لیپ ٹاپ اس میں رکھا۔ پھر اس کی نظر ڈکی میں پڑی ہوئی نیلی ترپال کی طرف گئی اور وہ آگے کی طرف جھکتا چلا گیا۔ اس کا آدھا دھڑ ڈکی میں تھا جبکہ نچلا حصہ فرش پر ٹکا ہوا تھا۔ وہ تکلیف میں مبتلا ہوسکتا تھا اگر ایک طالب علم کی نظر اس پر نہ پڑ جاتی۔ اس نے ویلیس کو نیلے کمبل میں لپٹا ہوا اسے ڈکی میں سے ملا تھا اور پولیس کو فون کرتے ہوئے بولا۔ ”تم بہت جلد ٹھیک ہوجاؤ گے۔“

گو کہ ویلیس پوری طرح اپنے حواس میں نہیں تھا پھر بھی اسے غصہ آگیا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کمبل ایک طرف پھینک دیا اور طبی عملے سے لڑنے لگا۔ ڈین اپنے کمرے کی کھڑکی سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ نیچے اتر کر آیا اور طبی عملے کے چیف سے بولا۔

”کیا اسے کوئی اسٹروک ہوا ہے؟“

”ممکن ہے کوئی اسٹروک ہو یا نیومر یا پھر بیماری کا اچانک حملہ۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”اسکیننگ سے پہلے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ دماغ کے حوالے سے بہت کچھ ممکن ہے۔“

”ممکن ہے کہ اس کا ذہن متاثر ہوا ہو۔ پروفیسر ویلیس کئی ماہ سے اپنے آپ میں نہیں تھا۔“

”کون جانے۔“ چیف نے ایمبولینس کا دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”انسانی ذہن کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔“

ڈین جسے انسانی رشتوں کے حوالے سے اپنی مہارت پر ناز تھا۔ وہ الیکٹرانکس کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا تھا۔ اس نے تائید میں سر ہلایا اور مسکرانے لگا۔ اسے اطمینان تھا کہ آئندہ کئی برسوں تک وہ شعبہ انگریزی میں سکون سے بیٹھ کر کام کرتا رہے گا کیونکہ اب وہاں دور دور تک کوئی حریف نظر نہیں آرہا تھا۔

www.kahopakistan.com

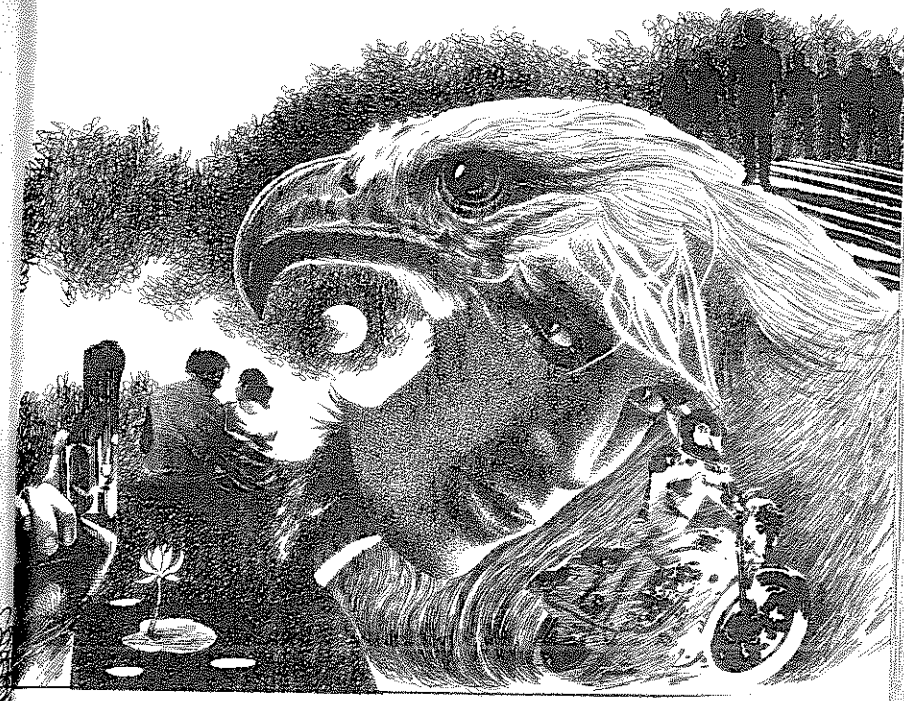

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے ..... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی ..... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے ..... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے ..... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے ..... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیشِ نظر رکھتا ہے ..... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستانِ محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ..... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے ..... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمحِ نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر ..... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے ..... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر ..... ایک للکار ہے۔

للکار

طاہر جاوید مغل

ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

www.kahanipakistan.com

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار گھڑیاں گن گن کر کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت بخیریت گھر واپس تو آ گئی لیکن اس کے ماتھے پر ایک داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر سیٹھ سراج مجھے زدوکوب کیا اور میں خودکشی کا سوچنے لگا لیکن پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم صفورا کی چھوٹی بہن نادیہ عمران پر بُری طرح فریفتہ ہو گئی۔ نادیہ نے عمران سرد مہری کا انتقام لینے کے لیے ہمارے ایک دوست سلیم کو بے دردی سے مار دیا۔ سلیم کی موت کا بدلہ لینے کے لیے عمران نے نادیہ کو گولی مار دی۔ میڈم ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے کے تاریک پانیوں اوجھل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ میرے اہل خانہ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کو موقع سے بھگا دیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیر میری والدہ کو مجبور کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگا لیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ میں ماں کے جسدِ خاکی تک پہنچنے کے چلّاتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ گر گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ میں والدہ کو پکارتا ہوا ایک گھنے جنگل میں بھاگتا رہا۔ یہاں ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور آج میں کچھ گھنٹوں یا دنوں کے بعد نہیں، دو برسوں کے بعد ہوش میں ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور تل پانی۔ زرگاں میں حکم جی کا اختیار چلتا ہے۔ حکم ایک عیاش اور بے انصاف شخص ہے۔ سلطانہ اس کی دست برد سے بچنے کے لیے اسٹیٹ کی دوسری بڑی آبادی تل پانی میں آ گئی۔ یہاں حکم جی کا چھوٹا بھا کارمختار تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں مجھے زرگاں میں پگوڈا پہنچایا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر دیا گیا۔ یہاں میری میڈم صفورا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے پگوڈا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ مجھ پر تشدد کر کے سلطانہ کو مجبور کیا گیا اور اس نے جارج کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ پھر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر میں بھاگتے بھاگتے ایک غار میں پہنچ گیا۔ وہاں مجھے چوہان اور دیگر لوگ مل گئے جو وہاں چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے جارج گورا کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ سلطانہ بھی یہیں تھی۔ میں وہاں کے تین افراد کے ساتھ خاموشی سے جارج کو قتل کرنے کے ارادے سے نکل پڑا مگر جارج نے اپنا راستہ بدل دیا۔ پھر ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا۔ ہم ماریا کو لے کر وہاں سے نکلے۔ ہم نے ایک نہر کے پاس پہنچ کر کشتی میں سفر کر اس کشتی میں ہمیں ایک عجیب الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ بعد ازاں ہمیں چلا کہ وہ جوڈو کراٹے کا نامور چیمپئن ہے۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے۔ ماریا کے اغوا کا مقصد اپنی بہت ساری باتیں منوانا تھا۔ پھر چوہان اور میں نے یہ لیا کہ میرے جسم میں ایک چپ نصب کی گئی ہے۔ ماریا کے وارثوں کو دی گئی مہلت ختم ہو چکی تھی۔ انہوں نے ہمارے بہت سے مطالبات مان لیے۔ ہمارے سات افراد کو رہا بھی کیا گیا۔ ہمیں غار سے نکلنے کا راستہ دیا گیا مگر غار سے نکلنے سے پہلے جیکی وہاں سے غائب ہو گیا۔ سفر کے دوران ہم ایک چوکی میں گئے۔ وہاں ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ ہم چوکی سے نکلے لیکن اس کوشش میں احمد اور مہیش سمیت ہمارے ساتھی مارے گئے۔ ہم بھاگتے رہے۔ میں ساتھیوں سے الگ ہو گیا اور بارونداجیکی تک جا پہنچا۔ پھر دشمن یہاں بھی پہنچ گئے اور انہوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہاں مقابلہ شروع ہو گیا۔ دشمن کو وہاں سے مار بھگایا گیا۔ مجھے اور جیکی کو تل پانی چھوٹے سرکار کے دیوان میں پہنچا دیا گیا۔ سلطانہ کی ذہنی حالت خراب تھی۔ ایک دن وہ خاموشی سے دیوان سے نکل گئی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ تل پانی پہنچنے والوں میں شکنتلا بھی شامل ہے۔ سلطانہ کے غیاب کے بعد اس کی تلاش جاری تھی۔ تلاش کے دوران ہم سلطانہ کے دھوکے میں شکنتلا تک پہنچ گئے۔ شکنتلا کو دیوان لے آیا گیا۔ میں نے شکنتلا کو جیکی کے بارے میں نہیں بتایا مگر ایک رات جیکی کے کمرے میں پہنچ گئی۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ جیکی نے دم توڑ دیا۔ ادھر زرگاں میں تین ہندو سے قتل ہونے پر سلطانہ پر شک کیا جا رہا تھا۔ میں ایک اچانک اپنی نگرانی پر مامور لوگوں کو چکمہ دے کر دیوان سے نکل پڑا۔ میں ایک ہندو فیملی کے گھر پہنچ گیا۔ وہ کٹر ہندو تھے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ سلطانہ کو اپنے طور پر سزا دینا چاہتے ہیں لیکن ان کے پنڈت کے مطابق وہ سزا ایک خاص آدمی دیتا جو وہ مجھے سمجھ رہے تھے۔ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کا تعلق انتہا پسند ہندو تنظیم سے تھا۔ پھر ایک روز ستیش نے بتایا کہ انہوں نے سلطانہ کو جارج اور حکم جی کے لوگوں سے چھڑا کر اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیا ہے اور اسے دینے کا وقت آن پہنچا ہے۔ وہ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے گیا۔ ستیش کے مطابق سلطانہ کو زندہ جلایا جاتا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ میرے ہاتھ میں مشعل نما لکڑی تھما دی گئی۔ پھر ایک نوجوان اس پر تیل ڈالنے آیا۔ اس نے چہرے پر بھبوت مل رکھا تھا۔ اس نے عمران کا ذکر کیا تو ساکت رہ گیا۔ پھر وہ ہنسا تو اس کے ہموار دانتوں کی قطار نظر آئی۔ وہ عمران تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ رات کو وہ مجھ سے ملنے آیا لیکن اس بارے میں زیادہ کچھ نہیں بتایا مگر اس نے کہا کہ ہم سلطانہ کو وہاں سے نکال لیں گے۔ اس نے بتایا کہ مہاگرو اور اس کی بیوی اس کے قبضے میں ہیں۔ گرو سلطانہ کی سزا تین دن کے لیے ملتوی کر دی۔ عمران اکیلا نہیں تھا بلکہ اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ پھر عمران نے مہاگرو کے ذریعے تاڑی میں دھتورا ملا دیا وہاں موجود تمام پہرے دار بے ہوش ہو گئے۔ ہم ایک سکھ سردار کی گھوڑا گاڑی میں وہاں سے فرار ہوئے اور ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچے۔ وہاں ہم نے افضل نامی شخص کے مکان میں قیام کیا۔ گروسو بھاش وہاں سے بھاگ نکلا۔ یہ صورت حال تشویشناک تھی۔ ہم نے تاؤ افضل کا گھر چھوڑ دیا اور جنگل میں کرنے لگے۔ ہمارا وہاں مزید ٹھہرنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ تاؤ افضل اور اس کی بیٹیاں بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ جنگل میں ہمیں ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ میں عمران سے کہا کہ وہ مجھے کچھ کرنے دے تاکہ سلطانہ کا مجھ پر اعتماد بحال ہو۔ میں نے ایک ڈاکو سے دوبدو مقابلہ کیا اور اس مقابلے کو تماشے کی شکل دے مجھے کئی چوٹیں آئیں مگر میں نے اپنے مدمقابل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ ہم واپس بستی میں آئے مگر ہم نے ایک مندر کے تہ خانے میں قیام کیا۔ ہمارا قیام آفتاب خاں نامی شخص کے تعاون سے ہوا۔ رات کو آفتاب باہر سے کوئی بُری خبر لایا۔ اس نے بتایا کہ حالات ٹھیک نہیں۔ وہاں کافی ہندو جمع تھے۔ ہم

ہوا دان سے مندر کا منظر دیکھا۔ جنوبی ہندوؤں نے گروسو بھاش کا سر کاٹ دیا تھا اور پوجا پاٹ کر رہے تھے۔ انہوں نے تاؤ افضل کے بھتیجے بھائی کی نیلی کو بھی یرغمال بنا لیا تھا۔ انہوں نے باقی لوگوں کو تو چھوڑ دیا مگر کلثوم نامی جوان لڑکی کو پکڑ لیا تھا۔ میں رات کو آفتاب کی مدد سے مندر کے تہ خانے سے باہر نکل پڑا اور کلثوم کو وہاں سے نکال لایا۔ ہم واپس تہ خانے میں پہنچ گئے۔ سب میری اس دلیری پر حیران تھے۔ گروسو بھاش کی موت کے بعد جنوبی ہندوؤں کے دو گروہ بن گئے تھے اور ان میں کسی بھی وقت لڑائی چھڑ سکتی تھی۔ کلثوم کے فرار کے بعد مہندر نے اس کا الزام رام پرشاد کی بہو پر لگایا اور فیصلہ ہوا کہ رام پرشاد جلتے تیل میں ہاتھ ڈال کر پرکھشا دے گا۔ پھر پرکھشا کا وقت آ گیا اور رام پرشاد نے جلتے تیل میں ہاتھ ڈال دیے۔ وہ چلانے لگا۔ اس کے ہاتھ جل گئے تھے پھر جنوبی ہندوؤں نے رام پرشاد کو ہلاک کر دیا اور مالا کو پکڑ لائے۔ اب اسے جلتے تیل میں پھینکا جانے والا تھا۔ پھر عمران نے کچھ کرنے کا کہا اور گولی چلا دی۔ مہندر مارا گیا۔ ستیش کے آدمیوں نے بھی گولیاں چلا دیں اور وہ لوگ مالا کو نکال لے گئے۔ مندر میں آگ لگ گئی تھی۔ ہم واپس تہ خانے میں آ گئے۔ میں رات میں دوبارہ مندر سے نکلنا چاہتا تھا مگر عمران نے مجھے روک لیا۔ میری گردن کے زخم سے خون کا رساؤ پھر شروع ہو گیا تھا اور تکلیف بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں درد سے لڑتا رہا۔ درد شدید تھا۔ مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو رہا ہوں۔ درد بڑھتا جا رہا تھا۔ عمران ڈاکٹر لی وان کو گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ لے آیا اور اسے میرا آپریشن کرنے پر مجبور کیا۔ صورت حال خطرناک تھی۔ اس میں میری جان بھی جا سکتی تھی۔ خیر میرا آپریشن ہو گیا اور میری گردن سے وہ منحوس چپ نکال دی گئی۔ دس روز بعد میں پوری طرح صحت یاب ہو گیا تھا۔ میں اور عمران تہ خانے سے باہر نکلے۔ ہمیں راج بھون پہنچنا تھا۔ ہم نے ایک چھکڑے پر سبزیاں لادیں اور راج بھون پہنچ گئے۔ ہمارے پاس اسلحہ بھی تھا۔ ہم وہاں موجود پہرے داروں کو پچھاڑ کر راج بھون میں داخل ہوئے۔ وہاں حکم جی کے بیٹے کی پیدائش پر جشن منایا جا رہا تھا۔ ہم اس جشن کا فائدہ اٹھا کر اندر داخل ہوئے اور فائرنگ کر دی۔ ڈاکٹر اسٹیل کا بھائی اس فائرنگ میں مارا گیا۔ ایک دو بندے زخمی ہوئے۔ پانڈے نے ہمارا پیچھا کیا مگر وہ بھی میرے ہاتھوں مارا گیا۔ ہم ایک ہندو فیملی کے گھر میں گھس گئے اور وہ جیتی نامی لڑکی کو یرغمال بنا لیا مگر اس نے ہم سے پورا تعاون کیا۔ اسی کی زبانی ہمیں پتا چلا کہ اسحاق کو سزائے موت دی جا رہی ہے۔ ہم وہاں سے نکلے مگر اسحاق کے لیے کچھ نہ کر پائے۔ اسے بے انتہا اذیت دے کر موت کی نیند سلا دیا گیا۔ ہم نے عہد کیا کہ اسحاق کی ایک ایک چیخ، ایک ایک درد کا بدلہ ضرور لیں گے۔ ہم وہاں سے نکل رہے تھے کہ ایک گلی میں سپاہیوں کا ناکا نظر آیا۔ وہاں موجود افسر کو دیکھ کر میں سکتہ زدہ رہ گیا۔ میرے سامنے رنجیت پانڈے کھڑا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ہمارے اور رنجیت کے درمیان کم و بیش پچاس میٹر کا فاصلہ تھا۔ رنجیت کا دھیان ہماری طرف نہیں تھا۔ میں نے عمران کا بازو دبایا۔ ہم رک گئے اور پھر جلدی سے ایک بغلی گلی میں مڑ گئے۔

میرا دماغ سنسنا رہا تھا۔ ”کیا بات ہے؟“ عمران نے چلتے چلتے پوچھا۔

”تم نے اس افسر کو دیکھا جو ناکے پر تلاشی لے رہا تھا؟“

”ہاں... وہی بینگن کی رنگت والا...“

”وہ رنجیت پانڈے ہے۔“

”کون سا پانڈے؟“

”رنجیت پانڈے... جسے پرسوں میں نے چاقو مارے تھے... اور جس کے بارے میں جیتی نے بھی بتایا تھا کہ وہ مر گیا ہے۔“

”تو یہ کوئی اور ہوگا۔ اس کا ہم شکل... اس کا پارٹ ٹو۔“ عمران نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

”نہیں یار! وہ سو فیصد وہی ہے۔ میں نے اسے دھیان سے دیکھا ہے۔ اس کی آواز سنی ہے۔ یہ وہی بدبخت ہے۔“ میری آواز کانپ رہی تھی۔

”تو پھر جسے تم نے اس روز لوڈر میں مارا، وہ کوئی اور تھا۔ وہاں تو بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی اور اندھیرا بھی تھا۔“

میری آنکھوں کے سامنے لوڈر کے تہلکہ خیز مناظر گھومنے لگے۔ وہ دوڑ کر لوڈر پر چڑھ آیا تھا اور آتے ساتھ ہی مجھ پر جھپٹ پڑا تھا۔ وہاں اندھیرا تھا... اور شاید اس کے چہرے پر کچھ رنگ بھی ملا ہوا تھا۔ میں سناٹے میں رہ گیا... تو کیا میں اب تک اس غلط فہمی کا شکار رہا ہوں کہ میں نے رنجیت پانڈے کو مار دیا ہے؟

ذہن میں بہت سے سوال ابھر رہے تھے لیکن ابھی ان سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا۔ ابھی ہمیں کسی سے ملنا تھا... بلکہ مجھے کسی سے ملنا تھا اور اس ملاقات کا پروگرام ہم پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ ہمارا رخ زرگاں کے عظیم الشان پگوڈا کی طرف تھا۔ میری معلومات کے مطابق میڈم صفورا اسی پگوڈا میں تھی اور مجھے گروسو بھاش سے یہ بھی پتا چلا تھا کہ اب اسے پگوڈا میں کچھ آزادیاں حاصل ہو گئی ہیں اور وہ پگوڈا میں آنے والے سفید فام لوگوں سے راہ و رسم بھی بڑھا رہی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میڈم صفورا جارج گورا تک پہنچنے میں ہماری مدد کر سکتی ہے۔ اس نے خود بھی تو کہا تھا کہ ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور یہاں رجواڑے میں ہمارا فائدہ نقصان ایک ہے۔ لیکن میڈم صفورا سے ملنے میں ایک گمبھیر مسئلہ بھی تھا اور وہ یہ کہ عمران میرے ساتھ تھا۔ پچھلی ملاقات میں صفورا نے عمران کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ مجھے ابھی تک یاد تھے۔ وہ عمران کو مسلسل شیطان اور قاتل جیسے القابات سے نوازتی رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اس کی بہن نادیہ کا قاتل ہے اور وہ اسے کبھی معاف نہیں

www.kahopakistan.com

کرے گی۔

بے شک عمران کے حوالے سے اس کا رویّہ بڑا سخت تھا لیکن یہ بات بھی حقیقت تھی کہ پچھلے تین چار برس میں میڈم صفورا کے غم و غصے میں خاطر خواہ کمی بھی واقع ہوئی تھی۔ حالات کے شکنجے میں جکڑے جانے کے بعد اس کے دل میں نرمی پیدا ہوئی تھی اور اس کے مزاج کے چڑھے ہوئے دریا کو ہموار انداز میں بہنا آگیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں اچھے طریقے سے اس کے ساتھ بات کرتا اور اسے یہ سمجھاتا کہ موجودہ حالات میں عمران ہمارا کس قدر مددگار ثابت ہوسکتا ہے تو وہ اس کے بارے میں بھی نرم رویّہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاتی۔ ہمارا پروگرام یہی تھا کہ میں اکیلا پگوڈا میں جاؤں اور عمران باہر کہیں مناسب جگہ پر میرا انتظار کرے گا۔

شام کے سائے لمبے ہوکر جھٹ پٹے میں اوجھل ہوتے جارہے تھے۔ ہوا تیز تھی اور یخ بستہ ٹھنڈ، شام کے شانہ بہ شانہ زرگاں کے گلی کوچوں میں اتر رہی تھی۔ ہم نے مقامی انداز میں اپنے چہرے پگڑیوں میں لپیٹے ہوئے تھے۔ اسحاق کی موت کا بے پناہ غم اور پانڈے کی دید کی زبردست حیرت سینے میں چھپائے ہم ندی کی طرف بڑھتے رہے۔ یہ مٹیالے پانی والی وہی ندی تھی جو راج بھون کی دیواروں کو چھوتے ہوئے گزرتی تھی۔ اس کے کنارے تفریحی باغ بنے ہوئے تھے۔ اچھے موسم میں یہاں شام کے وقت یقیناً اہلِ زرگاں کی بھیڑ ہوتی ہوگی لیکن اس نہایت سرد شام میں بس اِکا دُکا لوگ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جانب ایک قہوہ خانہ نظر آرہا تھا۔ نیم گرم جگہ بیٹھنے اور انتظار کرنے کے لیے مناسب تھی۔ عمران قہوہ خانے میں چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”تمہیں اندازاً کتنا وقت لگے گا؟“

”یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جلدی بھی آسکتا ہوں اور ہوسکتا ہے کہ تمہیں رات گئے تک انتظار کرنا پڑے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں قہوہ خانے میں یا اس کے آس پاس ہی ملوں گا۔“

عمران سے رخصت ہوکر میں پگوڈا کی طرف بڑھ گیا۔ وہ زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک باغ کے درختوں کے عقب سے پگوڈا کی مخروطی چھت کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔ میں تنگ گلیوں سے گزر کر آگے بڑھتا رہا۔ راج بھون کے سامنے خونی تماشا دیکھ کر واپس آنے والوں کی ٹولیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ جیسے کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دے کر لوٹ رہے تھے۔

جلد ہی میں پگوڈا کی وسیع و عریض سیڑھیوں کے سامنے تھا۔ اس سرد شام میں یہاں بھی کم کم لوگ ہی نظر آرہے تھے۔

گرد و پیش کو دیکھ کر میری نگاہوں میں کئی بھولے بسرے منا[ظر]
تازہ ہوگئے۔ مجھے اور سلطانہ کو جب تل پانی سے پکڑ کر زرگا[ں]
لایا گیا تو میں سب سے پہلے اسی بودھ مندر میں آیا تھا۔ یہا[ں]
میری حیثیت ایک خدمت گار قیدی کی سی تھی۔ ایک بار تو
انھی سیڑھیوں پر الٹا لٹا کر بید بھی مارے گئے تھے۔ اب بھی
سیڑھیوں پر ایک درمیانی عمر کا شخص اوندھا پڑا سسک رہا تھ[ا]
لگتا تھا کہ کچھ دیر پہلے اسے بید زنی کی سزا دی گئی ہے۔ ای[ک]
طرف دو تین کوڑھی افراد پھٹے پرانے کمبل اوڑھے بیٹھے تھے
گیروا کپڑوں والے بھکشو اندر باہر آجا رہے تھے۔ عام لوگ
بھی سیڑھیاں اترتے چڑھتے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے
جوتے اتارے اور اسی طرح پگڑی لپیٹے اندر داخل ہوگیا۔ مجھ[ے]
وہ کوٹھڑی نظر آئی جو میرا مسکن تھی اور پھر ہمیش یاد آیا۔ وہ جوا[ن]
سال بھکشو جو ہمارا ہم سفر بنا تھا اور تل پانی کے راستے میں ہمیش[ہ]
کے لیے ہم سے جدا ہوگیا تھا۔

صفورا کو یہاں کورتی کہا جاتا تھا۔ میں نے پگوڈا کے
وسیع و عریض احاطے میں اس امید پر نگاہ دوڑائی کہ شاید مجھے
کورتی یعنی صفورا گھومتی پھرتی دکھائی دے جائے لیکن ایسا
نہیں ہوا۔ میں نہایت ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں چلتا، مٹھ کی
طرف بڑھا۔ صفورا کی رہائش اسی مٹھ (مدرسے) کی طرف
تھی۔ نوجوان بھکشوؤں کی ایک ٹولی تھالیوں میں پھول سجا[ئے]
پگوڈا کے اندرونی حصے کی طرف جارہی تھی۔ اندر سے ڈھو[ل]
بجنے کی مدھم آواز باہر آرہی تھی۔ مٹھ کے عین سامنے برآمد[ے]
میں مجھے ایک بوڑھا شخص بیٹھا نظر آیا۔ اس نے کمبل لپیٹا ہوا
تھا اور ڈھول کی لے پر آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ میں نے اس
شخص کو یہاں پہلے بھی دیکھا تھا۔ یہ نابینا تھا۔ میں سیدھا اس
کے پاس چلا گیا۔

میں نے مقامی لب و لہجے میں کہا۔ ”بابا جی! میں کو[رتی]
سے ملنا چاہتا ہوں۔“

بوڑھے نے اپنا بے نور آنکھوں والا چہرہ میری طرف
پھیرا اور قدرے حیرت سے بولا۔ ”کون ہو تم؟“

”میرا نام وجیت ہے جی۔ تج پور سے آیا ہوں۔ پچھلی
بار جب میں آیا تھا تو کورتی نے مجھ سے انگلیوں کی خارش کی [دوا]
منگوائی تھی...“

”لیکن وہ تو یہاں سے چلی گئی ہے...“ بوڑھا عار[ضی]
سے بولا۔

”کہاں؟“ میں نے بھی ترت پوچھا۔

”لال بھون میں...“

”لال بھون میں؟“

”ہاں، وہ گوری چمڑی والے لے گئے ہیں اسے۔ وہاں بڑی موجیں ہیں اس کی۔ پر وہ بدھا کی گناہ گار ہے۔ وقتی طور پر سکھ شانتی حاصل بھی کر لیوے گی تو انجام بُرا ہی ہونا ہے...“

شاید میں کچھ دیر مزید اس بوڑھے کے پاس بیٹھتا اور اسے کریدنے کی کوشش کرتا مگر اسی دوران میں دور سے دو منڈے ہوئے سروں والے بھکشو بوڑھے کی طرف آتے دکھائی دیے۔ میں اپنی بات مختصر کرکے بوڑھے کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا۔

لال بھون کا نام میں نے پہلے نہیں سنا تھا۔ تاہم بوڑھے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کوئی مشہور عمارت رہی ہوگی۔ میں اس کا کھوج لگا سکتا تھا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ پگوڈا کے وسیع و عریض احاطے سے باہر نکل کر میں نے جس پہلے راہ گیر سے لال بھون کے بارے میں پوچھا، اس نے انگلی سے اشارہ کرکے کچھ فاصلے پر ایک سرخی مائل عمارت کی نشان دہی کردی۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ اب شہر کی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ گھوڑا گاڑیوں اور چھکڑوں پر بھی لیمپ روشن ہوگئے تھے۔ گلیوں کی رہی سہی رونق بھی تیزی سے ختم ہورہی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد میں لال بھون کے سامنے کھڑا تھا۔ پرانی طرزِ تعمیر کی یہ کافی وسیع عمارت تھی۔ یہاں بھی جنریٹرز کی موجودگی کا پتا چلتا تھا۔ گیٹ کے پاس برقی قمقمے روشن تھے اور اندر بھی کچھ کھڑکیوں میں برقی روشنی نظر آرہی تھی۔

میں ہر خطرے سے بے نیاز لال بھون کی سرخی مائل عمارت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میری گرم چادر کے نیچے بھرا ہوا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور اور شکاری چاقو موجود تھا۔ جونہی میں گیٹ کے سامنے پہنچا، ایک باوردی پاسبان سامنے آیا۔ اس کی رنگین پگڑی کا شملہ دو فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ سخت سردی کے سبب اس کے نتھنوں سے بھاپ خارج ہورہی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے مجھے سرتاپا گھور کر پوچھا۔

”مجھے کورتی صاحبہ سے ملنا ہے۔ تج پور سے آیا ہوں۔ وہ مجھے جانتی ہیں۔“

”کون کورتی؟“ نہایت کرخت لہجے میں پوچھا گیا۔

ایک دم مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میڈم صفورا کے لیے کورتی کا لقب پگوڈا میں استعمال کیا جاتا تھا اور یہ کوئی اچھا لقب نہیں تھا۔ اس کا مطلب شاید گناہ گار عورت تھا۔ اب صفورا پگوڈا میں نہیں تھی۔ اس پر کچھ غیر مقامی لوگوں کی نظرِ کرم ہوئی تھی اور وہ اب اس عالی شان عمارت میں تھی۔

میں نے بات کو سنبھالنے کی کوشش کی اور پاسبان سے کہا۔ ”میں اس خاتون صاحبہ سے ملنا چاہتا ہوں جو پاکستانی ہیں اور اس سے پہلے پگوڈا میں سیوا کرتی تھیں...“

”تم میڈم صفورا جی کی بات کرتے ہو؟“ پاسبان نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ”لیکن تم ہو کون اور کہاں سے آئے ہو؟ اور سب سے پہلے یہ چادر اتار کر ایک طرف رکھو۔“ پاسبان کا انداز سخت ہوتا جارہا تھا۔

اسی دوران میں دو اور محافظ نما شخص بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ مسلح تھے۔ میں نے کہا۔ ”میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میڈم مجھے بڑی اچھی طرح جانتی ہیں۔ آپ بس ان تک میرا پیغام پہنچا دیں۔ ان کے آنے سے پہلے میں آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا اور اگر آپ لوگ زبردستی پوچھنے کی کوشش کریں گے تو میڈم بہت ناراض ہوں گی۔“

”ان کی راضی اور ناراضی کی پروا نہ کرو تم... یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ تم یہ چادر اور پگڑی اتار دو... چلو شاباش، جلدی کرو۔“

”تم اپنے ساتھ ساتھ میڈم جی کا بھی نقصان کررہے ہو۔“ میں نے بھی سخت لہجے میں کہا۔

ہمارے درمیان تکرار شروع ہوگئی لیکن اس سے پہلے کہ یہ تکرار زیادہ سنگین شکل اختیار کرتی اور مجھے زبردستی عمارت میں گھسنا پڑتا، ایک شان دار گھوڑا گاڑی گیٹ کی طرف آتی دکھائی دی۔ دو گھوڑوں والی اس چمکیلی گاڑی کو دیکھتے ہی محافظ تن کر کھڑے ہوگئے اور انھوں نے سلام کے انداز میں اپنے ہاتھ اپنے ماتھوں سے لگا دیے... تاہم ایک موچھیل محافظ نے مجھے بازو سے تھامے رکھا۔

گھوڑا گاڑی کی کھڑکی کا پردہ سرکا۔ مجھے میڈم صفورا کی شکل نظر آئی... آخری بار میں نے اسے بڑی خستہ حالت میں دیکھا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا اور جسم پر چیتھڑے تھے لیکن آج وہ اپنے مخصوص بوائے کٹ اسٹائل میں نظر آرہی تھی۔ چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی تھا۔ یہ تقریباً وہی روپ تھا جو ہم لاہور کی لال کوٹھیوں میں دیکھا کرتے تھے۔ ایک اسمارٹ جواں سال اور دبنگ عورت۔

صفورا نے محافظوں کے چہروں پر ہیجان کے آثار دیکھ لیے تھے۔ ”کیا بات ہے؟“ اس نے کھڑکی میں سے سر نکال کر پوچھا۔

”یہ بندہ زبردستی اندر گھسنا چاہتا ہے جی۔ تلاشی بھی نہیں دے رہا۔“

www.kahopakistan.com

’’پگڑی ہٹاؤ۔‘‘ میڈم صفورا کرخت لہجے میں بولی۔

’’آپ مجھے اچھی طرح جانتی ہیں میڈم... لیکن میں ان کے سامنے پگڑی ہٹانا نہیں چاہتا۔‘‘

میری آواز سن کر صفورا ذرا چونکی مگر اس کا ذہن ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا... میں نے اسے اشارہ دیتے ہوئے کہا۔ ’’مجھے نادیہ کی موت کا بہت افسوس ہے میڈم۔ میں اسی بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

ایک لمحے میں صفورا نے مجھے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کا رنگ بدلا... اس نے موچھیل محافظ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ’’چھوڑ دو انہیں۔‘‘

محافظ ایک دم بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ میڈم صفورا نے مجھے گاڑی میں آنے کا اشارہ کیا۔

میں شان دار گاڑی کی نیم گرم فضا میں آ گیا۔ گاڑی طویل ڈرائیو وے کو طے کر کے عمارت کے پورچ میں رکی۔ جلد ہی میں میڈم صفورا کے ساتھ لال بھون کے اندر تھا۔

یہ عمارت باہر سے تو درمیانی حالت کی نظر آتی تھی لیکن اس کا ’’اندر‘‘ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بلند چھتیں، محرابی دروازے، دبیز قالین، خوب صورت غالیچے اور بڑے بڑے فانوس... باوردی ملازم اور ملازمائیں ننگے پاؤں، بے آواز چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ کسی حصے سے موسیقی کی آواز ابھر رہی تھی اور شوخ لڑکیوں کے سریلے قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے... در و دیوار سے رنگ و بو کے غیر مرئی سوتے پھوٹ رہے تھے۔ ایک فوارے اور شان دار حوض کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم ایک شان دار کمرے میں داخل ہو گئے۔

میڈم صفورا نے انگریزوں کی طرح پتلون قمیص اور جرسی پہن رکھی تھی۔ اس کے پاؤں میں جوگر ٹائپ جوتے تھے۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ میں نے پگڑی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ ’’اوہ تابش! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں تمہیں پھر اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں۔ اٹ از رئیلی ونڈر فل۔‘‘ اس نے مجھے چھوتے ہوئے کہا۔

’’مجھے بھی یقین نہیں آ رہا۔ پچھلی بار ہماری دونوں ملاقاتیں بڑے بُرے حالات میں ہوئی تھیں۔ ہم دونوں کی گردنوں میں آہنی کڑے تھے۔ آپ کا سر مُنڈا ہوا تھا اور باقی کا حلیہ بھی قابلِ رحم تھا۔ لیکن اب... اب تو آپ وہی لاہور والی میڈم صفورا نظر آ رہی ہیں...‘‘

’’خیر، ایسی بھی بات نہیں ہے۔ لیکن جو کچھ بھی تبدیلی آئی ہے، اس کے لیے کافی محنت کرنا پڑی ہے مجھے۔ تفصیل بتاؤں گی تو تم حیران رہ جاؤ گے لیکن... یہ سب باتیں تو بعد کی ہیں۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے آ پہنچے؟ مجھے تو تمہارے بارے میں بُری بُری خبریں مل رہی تھیں۔

’’خبریں تو اب بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں ہیں میڈم۔ آپ کو پتا چل ہی گیا ہوگا کہ جارج گورا نے سلطانہ کے ساتھ اپنے گھر میں کیا کیا تھا؟‘‘

’’ہاں تابش! وہ واقعہ تو واقعی افسوس ناک تھا۔ وہ اسے جیل سے نکال کر اپنے گھر لے گیا تھا۔ اس ساری بات کا پتا اس وقت چلا جب اس کے گھر پر حملہ ہوا... اور جارج کے محافظوں نے لوگوں پر اندھا دھند گولیاں چلائیں۔‘‘

’’اس واقعے کے بعد بھی واقعات کا ایک سلسلہ ہے میڈم... جارج نے اپنے پاپوں کا گھڑا بھر لیا ہے، اب اس گھڑے کو ہر صورت پھوٹنا ہی پھوٹنا ہے۔‘‘

میڈم صفورا گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر طویل سانس لے کر بولی۔ ’’میں نے سنا تھا کہ تم میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ اب تم وہ پہلے والے تابش نہیں رہے ہو۔ مجھے یقین نہیں ہوتا تھا لیکن اب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔‘‘

’’بس میڈم! ایسی تبدیلیاں یونہی تو نہیں آتیں۔ ان کے پیچھے حالات کا لمبا جبر ہوتا ہے... اگر موقع ملا تو میں آپ کو یہ طویل کہانی ضرور سناؤں گا۔‘‘

میڈم کی عقابی نگاہیں جیسے میرے اندر تک دیکھ رہی تھیں۔ اس نے میری گرم چادر کے نیچے اسلحے کی موجودگی کا اندازہ لگا لیا تھا اور شاید اس آگ کو بھی دیکھ لیا تھا جو میرے سینے میں بھڑک رہی تھی۔

وہ ایک بار پھر طویل سانس لے کر بولی۔ ’’تو تم جارج گورا کے لیے یہاں آئے ہو؟‘‘

’’کچھ ایسا ہی سمجھ لیں میڈم۔‘‘

’’اکیلے ہو یا کوئی اور بھی ساتھ ہے؟‘‘

’’ایک ساتھی بھی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’وہ کہاں ہے؟‘‘

’’یہیں زرگاں میں۔ ایک قہوہ خانے میں چھوڑ کر آیا ہوں اسے۔‘‘

میڈم نے سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکال کر اپنے ہونٹوں سے لگایا اور قیمتی لائٹر سے سلگا کر دھیمی آواز میں بولی۔ ’’تابش! بہت خطرناک اور مشکل کام کا ارادہ لے کر پہنچے ہو تم یہاں... بہادری اور خودکشی میں فرق ہوتا ہے۔‘‘

’’آپ مجھے ڈرا رہی ہیں۔‘‘

’’میں کیا ڈراؤں گی... سچ پوچھو تو میں خود ڈری ہوئی ہوں۔ یہ بہت سفاک لوگ ہیں اور آج کل ایک دم ہائی الرٹ بھی ہیں۔ جارج گورا تک پہنچنا تو بہت دور کی بات ہے تابش! آج کل اس کے کسی ادنیٰ افسر تک رسائی بھی مشکل ہے۔‘‘

میں نے عجیب اعتماد سے کہا۔ ’’میڈم! آپ نے خود کہا ہے کہ یہ وہ تابش نہیں ہے جسے آپ جانتی تھیں۔ اور میڈم... یہ نیا تابش آپ سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ نہ صرف جارج گورا تک پہنچے گا بلکہ اس کے دس بیس ٹکڑے بھی کرے گا۔ اور صرف یہی نہیں میڈم... ہم اس منحوس جگہ سے نکلیں گے... اپنی آزاد دنیا میں واپس پہنچیں گے۔ اپنے پاکستان، اپنے لاہور، اپنے جانے پہچانے گلی کوچوں میں۔ بہت جلد میڈم۔‘‘

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر بند کر لیا۔ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولی۔ ’’وہ دوسرا بندہ کون ہے جو تمہارے ساتھ آیا ہے؟‘‘

’’میں آپ کو اس کے بارے میں بھی بتاتا ہوں۔ لیکن پلیز پہلے تھوڑا سا اپنے بارے میں بتا دیجیے۔ میرا کنفیوژن دور ہوگا۔ آپ پگوڈا کی مصیبت سے نکل کر اس شان دار لال بھون میں کیسے پہنچیں؟‘‘

’’تمہیں معلوم کیسے ہوا کہ میں یہاں ہوں؟‘‘ میڈم نے جوابی سوال کیا۔

’’میں پہلے پگوڈا میں ہی گیا تھا۔ وہیں سے پتا چلا۔ میں سیدھا یہاں آ گیا۔‘‘

’’یہ حماقت تمہیں مہنگی پڑ جاتی تو پھر؟‘‘

’’کیا مطلب میڈم؟‘‘

’’گارڈز سے تمہاری تکرار ہو رہی تھی۔ وہ تمہاری پگڑی اتروا دیتے تو عین ممکن تھا کہ تمہیں پہچان لیتے اور پھر تم نے چادر کے نیچے اسلحہ بھی لگایا ہوا ہے۔‘‘

’’میڈم! اردو کا وہ محاورہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا، جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔ سچ پوچھیں تو میں کشتیاں جلا کر یہاں آیا ہوں۔ جارج نام کے اس پھوڑے کو جڑوں سے کاٹوں گا یا پھر خود ختم ہو جاؤں گا۔‘‘

میرے پُرتپش لب و لہجے نے میڈم صفورا کو ایک بار پھر چونکایا۔ وہ دھیان سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میرے اور صفورا کے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی، پھر صفورا نے مجھے بتایا کہ وہ پگوڈا سے یہاں کیسے پہنچی۔ وہ بولی۔ ’’میرے خیال میں میرے یہاں پہنچنے میں اس بات کو بھی دخل ہے کہ میں انگلش روانی سے بول لیتی ہوں۔ پگوڈا میں جارج گورا کے ساتھی سرجن اسٹیل نے ایک بار مجھ سے تھوڑی سی بات چیت کی اور پھر ہمارے درمیان اکثر بات ہونے لگی۔ اسٹیل نے ہی جارج سے میری سفارش کی اور کہا کہ میں کافی سزا کاٹ چکی ہوں، اب میرے ساتھ کچھ رعایت کی جائے۔ یہ اس سفارش کا ہی نتیجہ تھا کہ مجھے پگوڈا سے نکال کر یہاں پہنچا دیا گیا... تم ٹھیک کہتے ہو، یہ واقعی پازیٹو چینج ہے۔ یہاں مجھے ہر طرح کا سکون آرام حاصل ہے۔ میری حیثیت حکم جی کی معمولی ملازمہ کی سی ہے۔ پھر بھی جاب اچھا اور انٹرسٹنگ ہے۔‘‘

’’کیسا جاب؟‘‘ میں نے پوچھا۔

وہ ہولے سے مسکرائی۔ ’’یہ آوازیں سن رہے ہو تم؟‘‘

میں نے کان دھرے۔ لال بھون کے کسی دور افتادہ حصے سے لڑکیوں کے گانے کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ شاید کورس کی شکل میں کوئی طربیہ نغمہ گا رہی تھیں یا گانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

’’یہ گانے کی آوازیں ہیں۔‘‘

’’ہاں، یہاں مجھے کچھ لڑکیوں کی نگہبانی سونپی گئی ہے اور یہ کوئی عام لڑکیاں نہیں ہیں۔ ان چالیس لڑکیوں کو پورے راجواڑے میں سے چنا گیا ہے۔ ان کی عمریں اٹھارہ اور بیس سال کے درمیان ہیں۔ ان میں سے صرف پانچ مسلمان ہیں، باقی ساری ہندو ہیں۔ میرا کام یہاں ان لڑکیوں کو بنانا سنوارنا اور ادب و آداب سکھانا ہے۔ میری مدد کے لیے کچھ اور لوگ بھی یہاں موجود ہیں۔ ہندی ڈانس کی تربیت دینے والی گیتا لکھی، ایک ماسٹر ہندو گائیک، ایک جڑی بوٹیوں کا ماہر وید اور اس طرح کے دوسرے لوگ۔‘‘

’’ان لڑکیوں کا کیا کیا جائے گا؟‘‘

’’میرے خیال میں تم نے بھی ساتویں کے جشن کا سنا ہوگا۔ یہ اس راجواڑے کا سب سے بڑا فیسٹیول ہوتا ہے۔‘‘

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میڈم صفورا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ’’اس فیسٹیول میں راج بھون کے لیے جو سات پریاں چنی جاتی ہیں، وہ انہی لڑکیوں میں سے چنی جائیں گی۔ ان میں سے زیادہ تر سادہ اور گم صم ٹائپ کی ہیں۔ انہیں بنانا سنوارنا اور راج بھون کے ادب و آداب سکھانا سب کچھ یہیں لال بھون میں ہوتا ہے۔‘‘

میں نے ساتویں کے جشن اور سات رنگوں کی پریوں کے بارے میں پہلے بھی کافی کچھ سنا تھا۔ یہ سب کچھ بہت داستانی لگتا تھا مگر یہاں اس اسٹیٹ میں یہ ایک ٹھوس حقیقت کی صورت میں موجود تھا۔ یہ قدیم رسم پورے اہتمام کے ساتھ یہاں جاری ساری تھی... بلکہ خود سلطانہ پر بھی ایک بڑا الزام یہ تھا کہ اس نے خود کو پری بننے کے اعزاز سے جان بوجھ

www.kahopakistan.com

کر محروم کیا...اور پریوں کے چناؤ سے پہلے ہی آناً فاناً شادی کر لی۔

میری اور میڈم صفورا کی گفتگو جاری تھی کہ اچانک دروازے پر عجلت آمیز دستک ہوئی۔ ”کون؟“ میڈم نے بارعب آواز میں پوچھا۔

”میڈم! میں ہوں ثمرین۔“ روتی ہوئی سی آواز ابھری۔

”اوہ گاڈ۔“ میڈم نے سٹپٹائے لہجے میں کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”میں ایک منٹ میں آئی۔“

اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ مجھے روتی سسکتی لڑکی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے ایک کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔ میڈم ساتھ والے لاؤنج میں ایک خوبرو لڑکی کے ساتھ کھڑی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک مختصر سا چمکیلا لباس تھا۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”یہ دیکھیں میڈم! یہ کپڑے پہننے کو کہہ رہی ہے مجھے گیتا دیدی۔ یہ مجھ سے نا ہیں ہوگا۔“

یہ لباس کپڑے کے دو نہایت مختصر ٹکڑوں پر مشتمل تھا۔ لڑکی کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ وہ کسی شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔

میڈم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیار سے جھڑک کر بولی۔ ”اچھا، ہر بات پر رونا دھونا نہ شروع کر دیا کرو۔ پہلے مجھے بتایا تو کرو کہ پرابلم کیا ہے۔ چلو آؤ میرے ساتھ...“ وہ خوش شکل لڑکی کے ساتھ ایک راہداری میں اوجھل ہو گئی۔

اسی دوران میں دو اور خوب صورت لڑکیاں لٹک مٹک کر چلتی ہوئی کھڑکی کے سامنے سے گزریں۔ انہوں نے بعینہٖ وہی مختصر لباس پہن رکھا تھا جو ابھی ثمرین نامی لڑکی نے میڈم کو دکھایا تھا۔

میں کھڑکی بند کر کے واپس اپنی جگہ آ بیٹھا اور میڈم کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی واپسی میں چار پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

”کون تھی یہ؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر میں یہ کہوں کہ یہ تمہاری ایک دور کی رشتے دار تھی تو پھر؟“ میں چونک کر میڈم کو دیکھنے لگا۔ وہ مسکرادی۔ ”یونہی مذاق کر رہی تھی۔“

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ پوچھتا، وہ سگریٹ کا ایک چھوٹا کش لے کر بولی۔ ”جو کچھ تم کہہ رہے ہو اگر وہ واقعی صحیح ہے تو پھر... تم بڑے سنگین وقت پر اور بڑے سنگین ارادوں سے یہاں آئے ہو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم سے کیا کہوں۔“

”آپ کچھ بھی نہ کہیں۔ ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ جو کچھ آپ کہنا چاہ رہی ہیں، وہ میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ اس حوالے سے ہم بعد میں تفصیل سے بات بھی کر سکتے ہیں۔“

وہ میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر ایک اور کش لے کر بولی۔ ”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو تابش؟“

میں نے کہا۔ ”میڈم! چاہتا تو بہت کچھ ہوں اور چاہوں گا وہ ہم سب کے بھلے میں ہوگا لیکن فی الوقت تو ہمیں بس دو تین روز کا ٹھکانا دے دیجیے۔“

”اوکے...مل گیا۔“

”میں اپنے ساتھی کو بلا سکتا ہوں؟“

”بلالو۔ کون ہے وہ؟“

میں نے نشست سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”میڈم! اب تک آپ نے جو سوال پوچھے ہیں، ان میں یہ سوال سب سے ٹیڑھا ہے...لیکن مجھے امید ہے کہ آپ کی فہم و فراست اور محبت اس سوال کو اور اس کے جواب کو اتنا ٹیڑھا نہیں رہنے دے گی۔“

”کھل کر بات کرو تابش!“

کھڑکیوں سے باہر ایک سرد رات نے پنجے گاڑے تھے... یہ پوری عمارت قالینوں غالیچوں کی وجہ سے گرم تھی پھر بھی کمرے میں ہلکی خنکی محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں نے مناسب الفاظ کا چناؤ کیا اور پھر میڈم صفورا کو دھیرے دھیرے عمران کے بارے میں سب بتا دیا۔ میڈم کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ سب سے پہلے تو اسے اسی بات کا یقین نہیں آیا کہ عمران تاحال زندہ ہے۔ دوسری بڑی حیرت یہ تھی کہ وہ یہاں اس اسٹیٹ میں، اس شہر میں موجود ہے اور اس گھر سے ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قہوہ خانے میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہے۔

ایک طویل سکتے کی سی کیفیت سے نکلنے کے بعد میڈم صفورا بولی۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سراج اور شیرے وغیرہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کے سینے پر گولیاں لگی تھیں اور وہ پانی میں ڈوب گیا تھا۔“

”بے شک میڈم! یہ سب کچھ ہوا تھا لیکن وہ پھر بھی بچ رہا۔ اس کے جسم پر بس ایک دو گولیاں ہی لگ سکیں اور ان کے نشان اس کے جسم پر موجود ہیں۔“

میں نے میڈم صفورا کو امریکن بلٹ پروف جیکٹ کے بارے میں بتایا اور وہ باقی باتیں بھی بتائیں جو عمران میرے گوش گزار کی تھیں۔ میں نے دیکھا صفورا کی پیشانی پر پسینا ہے۔ اس کی آنکھوں کے اندر گہرائی میں وہ سارے پرانے کرب جاگ گئے تھے جن کا تعلق لاہور والے واقعات سے اور پھر چھوٹی میڈم نادیہ کی موت سے تھا۔

میں نے لجاجت سے کہا۔ ”میڈم! وقت کے ساتھ بہت کچھ تبدیل ہوا ہے۔ میں تبدیل ہوا ہوں، آپ ہوئی ہیں... ہمارے حالات، ہمارا گردوپیش سب کچھ بدل گیا ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا، اب ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ میڈم! بے شک وہ صدمہ شدید تھا جو آپ کو پہنچا۔ اس جیسے کم شدت کے اور بھی کئی صدمے ہیں جن کا تعلق ان دنوں سے ہے۔ کتنا اچھا ہو میڈم... اگر ہم ان صدموں کو بھلا کر اپنی موجودہ مصیبت سے نکلنے کے لیے کوئی مشترکہ کوشش کر سکیں۔“

میڈم خاموش رہی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ آنکھوں کے کنارے سرخ ہو رہے تھے۔ لگتا تھا، وہ بڑی مشکل سے اپنے آتشیں آنسوؤں کو روکے ہوئے ہے۔ میں نے کہا۔ ”میڈم! میں بڑے مان سے آپ کے پاس آیا ہوں اور وہ مان یہ ہے کہ جس طرح آپ نے مجھے معاف کیا ہے، اسی طرح عمران کو بھی کر دیں گی... بے شک جرم بہت بڑا ہے لیکن مجھے آپ کے ظرف کا آسرا ہے۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ آپ کا ظرف آپ کے غم و غصے سے کہیں زیادہ ہے... پلیز میڈم! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں، ہم آپ کی دی ہوئی معافی کا حق ادا کر دیں گے۔ ہم آپ کے ایک اشارے پر اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھ لیں گے۔ اللہ نے چاہا تو اس راجواڑے کی اونچی دیواریں اب زیادہ دیر ہمارا راستہ نہیں روک سکیں گی...“

میں جو کچھ کہہ رہا تھا، دل کی گہرائی سے کہہ رہا تھا اور کہتے ہیں کہ جو بات دل سے نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے... میں نرم و گداز لہجے میں بولتا رہا اور میڈم خاموشی سے سنتی رہی... کبھی اس کے چہرے پر گہرا کرب جھلکتا، کبھی وہ ایک طویل آہ بھر کر رہ جاتی... میری گفتگو کے دوران میں اس نے ایک دو سخت جملے بھی کہے تاہم میں نے ان جملوں کا توڑ کیا... اور عمران کے حوالے سے میڈم صفورا کا غم و غصہ دور کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ اس کوشش کا نتیجہ مثبت نکلا۔ بالآخر میڈم نے عمران کو یہاں لانے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ تاہم اس نے کہا۔ ”وہ فی الحال میرے سامنے نہیں آئے۔ میں ایک دو دن میں خود ہی اس سے ملاقات کروں گی۔ اس دوران میں مجھے خود کو سنبھالنے میں مدد ملے گی۔“

”آپ جیسا کہتی ہیں، ویسا ہی ہوگا میڈم! جو کچھ ہوا اس کا افسوس اور دکھ اسے بھی بے چین رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جب تک آپ سے معافی نہیں مانگے گا اور آپ اسے معاف نہیں کریں گی، وہ ذہنی سکون سے دور رہے گا۔“ میں نے اپنی طرف سے بات بناتے ہوئے کہا۔

میڈم نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھوں کے نم کناروں کو صاف کیا اور اپنے بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں پھیر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی اٹھ گیا۔ وہ بولی۔ ”میں اپنے منیجر مدن کو بھیجتی ہوں، وہ تمہیں میری گاڑی میں لے جائے گا۔“

کچھ دیر بعد ایک ہٹا کٹا خرانٹ سا شخص آن موجود ہوا۔ اس کی عمر تیس سال سے اوپر ہی ہوگی۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام مدن ہے۔ میں نے مقامی طرز کی پگڑی پھر سر اور چہرے پر لپیٹ لی۔ بہرحال، مدن نے مجھے سلطانہ کے شوہر مہروز کی حیثیت سے پہچان لیا تھا۔ ہم باہر نکل کر اسی شان دار گھوڑا گاڑی میں آ بیٹھے جس میں صفورا یہاں پہنچی تھی۔ یہ بالکل بند گھوڑا گاڑی تھی۔ یخ بستہ ہوا اور سردی کے اثرات سے کافی حد تک محفوظ۔ ہم اس گھوڑا گاڑی پر دھند آلود ندی کے کنارے کنارے چلتے مطلوبہ جگہ پر پہنچے۔ میں گھوڑا گاڑی کے اندر ہی رہا اور منیجر مدن قہوہ خانے کے اندر سے عمران کو لے آیا۔ ہم نے واپسی کا سفر مکمل خاموشی سے طے کیا... منیجر مدن نے بات چیت کرنے کی کوشش کی تاہم میں نے مختصر جواب دے کر اسے خاموش کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم لال بھون کے ایک نہایت آرام دہ بیڈروم میں موجود تھے۔ یہاں آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ شیشے کی الماری میں شراب کی بوتلیں چنی ہوئی تھیں اور خوب صورت تپائی پر بسکٹ، پیسٹری، کاجو اور اس طرح کے دیگر لوازمات موجود تھے۔

ہم نے اپنی چادریں اور پگڑیاں وغیرہ اتار دیں اور ایزی موڈ میں ہو گئے۔ توقع کے مطابق میڈم صفورا دوبارہ نظر نہیں آئی، تاہم کھانا پُرتکلف تھا۔ بعد میں سبز چائے سے تواضع کی گئی۔ کھانے کے دوران میں ہم دھیمے لہجے میں بات کرتے رہے اور میں نے عمران کو اب تک کی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس عمارت میں ہونے والی سرگرمیوں کی روداد نے عمران کو بھی حیران کیا۔ وہ بولا۔ ”جگر! یہ تو میرے فساد پلس کے لیے بڑی زبردست اسٹوری ہے۔ اس کا عنوان ہو سکتا ہے... چالیس لڑکیاں چالیس کہانیاں بلکہ اکتالیس کہانیاں۔ میڈم صفورا خود بھی تو ایک کہانی ہے۔ اب اندازہ لگاؤ، اکتالیس کہانیوں کو فی کہانی پچاس منٹ کے دورانیے میں بتایا جائے اور ہر دورانیے میں پچاس بریک ہوں تو یہ بن گئے تقریباً دو ہزار بریک۔ ہر بریک میں آج کل شریف سے شریف چینل

www.kahopakistan.com

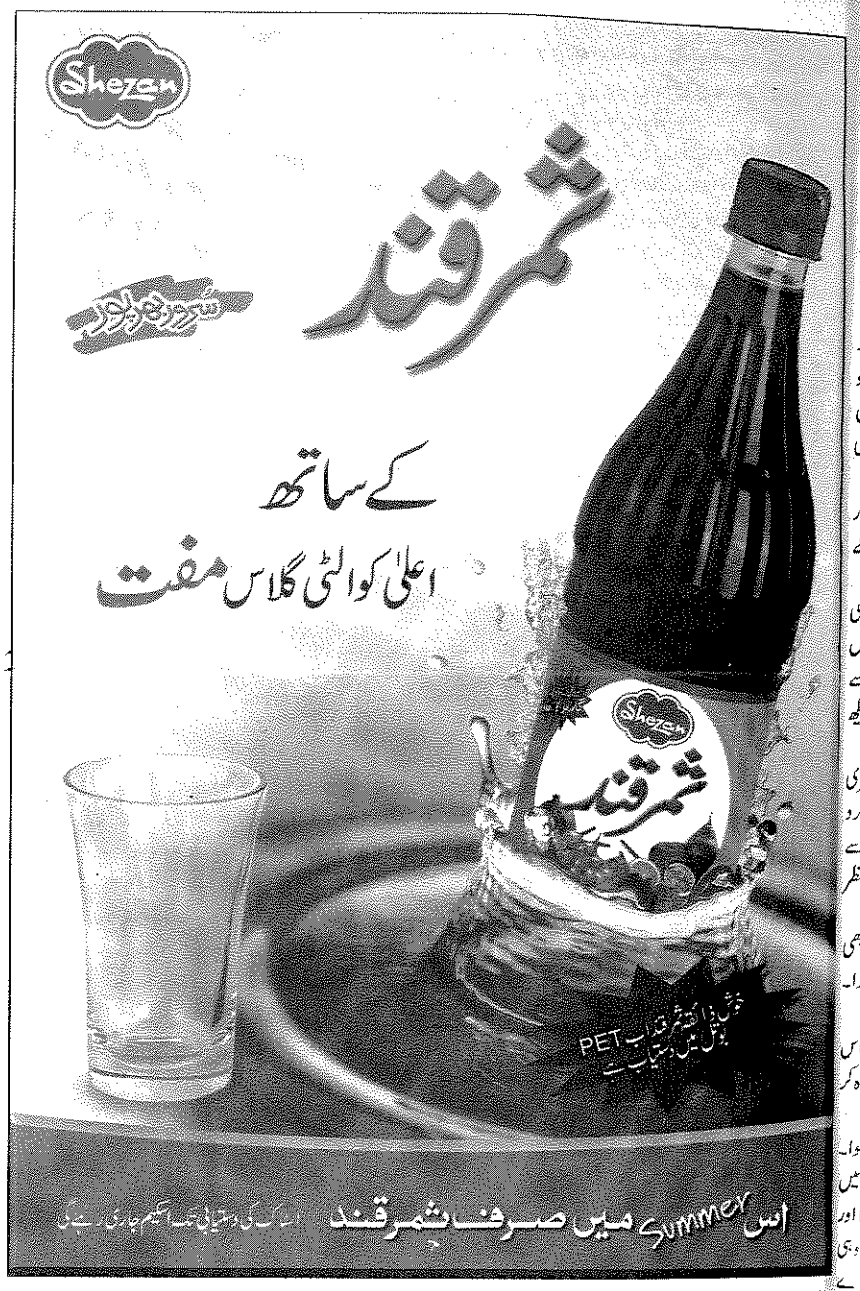

بھی چودہ پندرہ اشتہار تو چلا ہی دیتا ہے۔ تو یہ ہو گئے تقریباً تیس ہزار اشتہار... اور مجھے تو لگتا ہے کہ اتنی زبردست لڑکیوں... میرا مطلب ہے اسٹوریوں کے لیے یہ تیس ہزار اشتہار بھی کم رہیں گے۔"

"یہاں سے زندہ بچ کر نکلو گے تو اشتہار چلاؤ گے نا۔" میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"جگر! مجھے ایسی باتوں سے مت ڈرایا کرو۔ ہمارا تو کام ہی ہے پلٹ کر جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا۔"

"جو کچھ تم لوگ "جھپٹ" کر پلٹتے ہو اس کا بھی سب کو پتا ہے۔"

"خبردار، ہم پر رشوت کا الزام نہ لگانا۔ ورنہ بریکنگ نیوز میں جگہ پا جاؤ گے۔ ہم شاہین صفت لوگ ہیں۔"

"لیکن ہم نے تو دیکھا ہے کہ جہاں واقعی خطرہ ہو، وہاں پولیس والوں کی طرح تم لوگ بھی پلٹ کر پلٹتے اور پلٹتے ہی پلٹتے چلے جاتے ہو۔"

"میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ شاہین صفت لوگوں سے یوں طنزیہ لہجے میں بات نہیں کرتے۔ اور یہ وہ اقبال والا شاہین نہیں ہے۔"

"یہ کون سا ہے؟"

"یہ لاہور کا مشہور رس فروش ہے۔ گنّے کا رس بیچتا ہے۔ اس نے ایسا ڈبل ایکشن بیلنا بنوایا ہے کہ خشک سے خشک گنّے سے بھی دو چار گلاس رس نکال کر دکھا دیتا ہے... بلکہ اس کا تو کہنا ہے کہ کسی بھی پلاسٹک یا لکڑی وغیرہ کے ٹکڑے پر "گنا" لکھ دیا جائے تو وہ اس میں سے بھی رس نکال کر دکھا دے گا۔"

"اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟" میں نے اپنا بستر درست کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی جس طرح شاہین رس فروش، سوکھے سڑے گنّے سے بھی رس نکال لیتا ہے، ہم بھی نہایت پُرسکون حالات اور لوگوں کے اندر سے تہلکہ خیز خبریں نکال سکتے ہیں..." اس نے ایک بار بولنا شروع کیا تو بولتا چلا گیا۔

اسحاق کی دردناک موت نے میرا دل بوجھل کر رکھا تھا اور یقیناً ایسا ہی بوجھ عمران کے دل و دماغ پر بھی تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری اور اپنی توجہ اس گمبھیر دکھ سے ہٹانے کے لیے یہ اوٹ پٹانگ گفتگو کر رہا ہے۔ اس گفتگو کے بیچ بیچ وہ کچھ سنجیدہ باتیں بھی کر جاتا تھا۔ ان باتوں کا تعلق اس لال بھون اور یہاں کی کرتا دھرتا میڈم صفورا سے تھا.. صفورا کے حوالے سے عمران کے ذہن میں ابھی خدشات موجود تھے۔ یہ خدشات اسی وقت دور ہو سکتے تھے جب عمران اور صفورا میں آمنے سامنے بات ہوتی اور وہ دونوں ماضی کو بھلا کر آگے کی طرف دیکھنے کا فیصلہ کرتے۔

میں عمران کے خدشات کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ خدشات بدترین صورت میں صحیح ثابت ہونے والے ہیں اور بہت جلد۔

ہم کھانا کھانے کے کچھ ہی دیر بعد سو گئے۔ میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنے اردگرد ہر چیز دھندلائی ہوئی سی نظر آئی۔ سر پر جیسے منوں بوجھ تھا۔ کئی سیکنڈ مجھے یہ سمجھنے میں ہی گزر گئے کہ میں کہاں اور کس حالت میں ہوں۔

ایک پھنکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "حرامزادے... تم کیا سمجھتے تھے... میری میزبانی انجوائے کرو گے۔ میری چھت تلے بیٹھ کر میری روٹیاں توڑو گے... میں اتنی جلدی بھول جاؤں گی اپنی بہن کے قاتل کو... اتنی جلدی معاف کر دوں گی..."

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سر بُری طرح چکرا رہا تھا اور تب میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ اور پاؤں بڑی سختی کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔

میں نے اپنے سامنے صفورا کو دیکھا۔ وہ تن کر کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور آنکھیں شعلہ فشاں تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ اپنی کمر... پر رکھے عمران سے مخاطب تھی۔ غنودگی کے سبب میں یہ سارا منظر بہ مشکل دیکھ پا رہا تھا۔

میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ عمران کے ہاتھ بھی میری طرح پشت پر بندھے ہوئے ہیں اور اس کے پاؤں کے گرد نائیلون کی سرخ رسّی کی مضبوط بندش ہے۔ میرے جاگنے سے پہلے شاید اسے مارا بھی گیا تھا۔ وہ بستر کے بجائے قالین پر نظر آ رہا تھا اور اس کے ہونٹ خون آلود تھے۔

میرا ذہن ایک بار پھر تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ متلی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل میڈم صفورا کو پکارا۔ "میڈم! یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ نے تو وعدہ کیا تھا.."

"خاموش۔" ایک بھاری مردانہ آواز نے کہا اور اس کے ساتھ ہی میری پسلیوں پر ایک بے رحم ٹھوکر لگی۔ میں کراہ کر رہ گیا۔

ٹھوکر زوردار تھی تاہم اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ میرے دماغ پر چھائی ہوئی گہری دھند چھٹنا شروع ہو گئی۔ میں نے کوشش کی اور بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عمران قالین پر تھا اور اس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی ازلی اطمینان تھا جو بدترین حالات میں بھی اس کے چہرے

www.kahopakistan.com

سے جدا نہیں ہوتا تھا۔

میڈم صفورا نے عمران کے سر کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑا اور زوردار جھٹکے دے کر بولی۔ ”یو باسٹرڈ! تم نے تین چار سال کو کافی عرصہ سمجھا... شاید تمہیں پتا نہیں، تیس چالیس سال بھی گزر جاتے تو مجھے تمہاری شکل بھولتی اور نہ تمہارا جرم... تم نے میری بہن کو مارا ہے۔ اس کے بدلے تمہیں اپنی جان دینا پڑے گی... اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔“ اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ہاں... یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا... تم تمنا کرو گے کہ کاش تم اسی رات ڈیک تالے پر مر گئے ہوتے۔“ صفورا کے لہجے میں آگ تھی اور جنون تھا۔ وہ اس عورت سے بالکل مختلف نظر آرہی تھی جسے چند ماہ پہلے میں نے پگوڈا میں فرش کی صفائی کرتے دیکھا تھا... اور اس عورت سے بھی جس سے کل شام میں نے اسی عمارت میں ڈیڑھ دو گھنٹے بات چیت کی تھی۔

میں نے اپنے ڈولتے ذہن کو سنبھالا اور لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ ”میڈم! آپ جلد بازی کر رہی ہیں۔ آپ جانتی نہیں کہ ہمارا کتنا بڑا نقصان ہو جائے گا۔“

”شٹ اَپ۔“ میڈم گرجی۔ ”تم اپنی عقل دانش اپنے پاس ہی رکھو۔ اگر تم میں عقل ہوتی تو تم اسے یہاں لے کر نہ آتے۔ تم کیا سمجھتے تھے، میں اتنی ہی کمزور اور بھلکڑ ہوں۔“

میں نے محسوس کیا کہ واقعی مجھ سے اندازے کی بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ میں سمجھا تھا کہ حالات کی بے رحم چکی میں پسنے کے بعد میڈم کی کیمسٹری میں غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں لیکن میں بھول گیا تھا کہ عورت کو داناؤں نے ہمیشہ ایک پہیلی قرار دیا ہے اور میڈم صفورا جیسی عورت تو ویسے بھی ”بھید بھری“ ہوتی ہے۔

ہمیں یقیناً کھانے میں بے ہوشی کی زود اثر دوا دی گئی تھی۔ مجھے کھانے کے بعد کی کوئی بات یاد نہیں آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم کھانا کھاتے کھاتے ہی سو گئے تھے اور پھر یہ نیند گہری بے ہوشی میں بدل گئی تھی۔ یقیناً یہ گہری بے ہوشی ہی تھی کہ عمران جیسا شخص بھی کچھ نہیں کر پایا تھا اور اب میری ہی طرح بندھا ہوا پڑا تھا۔ میں نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی اور میری حیرانی میں اضافہ ہو گیا۔ اب صبح کے چار بجنے والے تھے۔ یعنی ہم تقریباً چھ گھنٹے بعد ہوش میں آئے تھے۔ عمران غالباً مجھ سے پہلے ہوش میں آگیا تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ جب میرے حواس بحال ہونا شروع ہوئے تو عمران کے ساتھ میڈم صفورا کا غصیلا مکالمہ جاری تھا۔

میڈم صفورا نے عمران کے پہلو میں جوگر بوٹ کی زوردار ٹھوکر رسید کی اور پھنکاری۔ ”بتا، کیا قصور تھا میری بہن کا؟ بس یہی نا کہ وہ تجھ سے دوستی کر بیٹھی تھی۔ اتنے سے جرم کی اتنی سخت سزا دے دی تو نے اسے...“

”میڈم! وہ آپ کی بہن تھی۔ آپ کو اس کا کوئی قصور نظر نہیں آئے گا لیکن اگر کوئی انصاف سے اس کے قصور لکھنے بیٹھے تو شاید ایک کتاب بن جائے۔ اس پوری کتاب کو ایک طرف رکھ دیا جائے اور اس کا صرف ایک جرم ہی دیکھا جائے تو وہ بھی اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتا تھا۔ بے گناہ سلیم کی موت کوئی معمولی واقعہ نہیں تھی میڈم... لیکن ہم ان باتوں میں پڑیں گے تو یہ بحث کبھی ختم نہیں ہو سکے گی۔“ عمران بولا۔

”گھبراؤ مت۔ میں تمہیں بحث کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں چھوڑوں گی۔“ میڈم پھنکاری۔ ”تمہیں صرف اپنی جان کی دہائی دینے کے سوا کوئی خیال ہی نہیں آئے گا۔“

ایک دم عمران اپنے مخصوص ہلکے پھلکے موڈ میں آگیا اور بولا۔ ”میڈم! شاید آپ کو کسی نے بتا دیا ہے کہ آپ غصے میں زیادہ خوب صورت نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ہر دو منٹ بعد گرجنے برسنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی ہیں۔“

”میرا اندازہ ہے کہ تم بھی روتے چلاتے اور مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے کافی اچھے لگتے ہوگے۔ میں اس کی تصدیق کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ خوفناک انداز میں بولی۔

”یہ دیکھیں... جوں جوں آپ کا غصہ بڑھ رہا ہے آپ کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو آپ اگلے دو چار منٹ میں ضرور قلوپطرہ بن جائیں گی۔“

”اگلے دو چار منٹ میں اور بھی بہت کچھ ہوگا۔ ہم دیکھیں گے کہ ایک مسخرہ اپنی چوکڑی بھول کر کس طرح روتا چلاتا ہے اور زندگی کی بھیک مانگتا ہے۔“ میڈم نے کہا۔

”آپ مستقبل کی بات اتنے یقین سے کیوں کرتی ہیں میڈم۔ گلوکار مکیش صاحب کہہ گئے ہیں... آگے بھی جانے نہ تو، پیچھے بھی جانے نہ تو، جو کچھ ہے بس یہی ایک پل ہے۔“

میڈم صفورا بغیر کچھ کہے، لکڑی کی الماری کی طرف گھومی۔ اس نے الماری کھولی اور اندر سے ایک سرنج اور انجکشن نکال لیا۔ میڈم کے چہرے پر انتہا درجے کی بے رحمی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ وہی میڈم تھی جسے ہم نے ایک عرصہ پہلے لال کوٹھیوں میں دیکھا تھا... اس کے رعب داب سے اردگرد کی ہر شے سہمی ہوئی سی رہتی تھی۔ اس کے طور اطوار میں کسی شعلہ مزاج ملکہ کی جھلکیاں تھیں۔

”یہ کس چیز کا انجکشن ہے میڈم؟“ عمران نے معصومیت سے پوچھا۔

”یہ بولتی بند کرنے کے لیے ہے۔“ اس نے ترت جواب دیا۔

”تو پھر یہ آپ خود کو کیوں نہیں لگا لیتیں؟ مجھے تو ڈر ہے کہ آپ اسی طرح بولتی رہیں اور آپ کا غصہ شریف بڑھتا رہا تو آپ قلوپطرہ سے بھی دو چار ہاتھ آگے نکل جائیں گی۔ اتنا زیادہ حسن ہم سے برداشت نہیں ہوگا۔ خاص طور سے مجھ سے تو بالکل بھی نہیں۔ یہ نہ ہو کہ میں یہ رسیاں توڑ کر دھڑام سے آپ کے اوپر آ گروں اور یہیں اس قالین پر عشق کی انتہا ہو جائے۔“

میڈم نے اس مرتبہ جواب میں کچھ نہیں کہا۔ غالباً وہ عمران کی خوش گفتاری کا عملی جواب دینا چاہتی تھی۔ اس نے بڑے اطمینان سے انجکشن کے وائل کو شیک کیا اور پھر اسے اوپر اٹھا کر سرنج میں بھرنا شروع کر دیا۔ یہ ہلکے سبز رنگ کا انجکشن تھا۔ اچانک مجھے جارج گورا کی جیل کے قیدی عبدالرحیم کی بات یاد آگئی۔ اس نے جارج کی جیل میں ستم گری کے ہتھکنڈوں کا ذکر کرتے ہوئے خاص قسم کے انجکشن کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ منحوس انجکشن جارج کے بہنوئی سرجن اسمتھ کا ایجاد کردہ ہے۔ یہ معتوب قیدی کو لگایا جاتا ہے اور وہ کم از کم بارہ گھنٹے کے لیے زندگی اور موت کے درمیان لٹک جاتا ہے۔ پورے جسم پر سرخ نشان نمودار ہو جاتے ہیں اور اتنا شدید درد ہوتا ہے کہ قیدی بلک بلک کر موت کی بھیک مانگنے لگتا ہے۔ سخت سے سخت جان قیدی بھی اس طرح کے زیادہ سے زیادہ تین انجکشن برداشت کر پاتا ہے اور چھتیس گھنٹے بعد موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

میرے جسم کے مساموں سے پسینا بہہ نکلا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ آہنی دروازے والے اس ساؤنڈ پروف کمرے میں عمران بھی اس مہلک ترین انجکشن کا شکار ہونے والا ہے۔ مجھے اس انجکشن کا نام یاد نہیں آرہا تھا، تاہم عبدالرحیم نے اس کا رنگ سبزی مائل بتایا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ انجکشن کی سزا کو سولی کے بعد دوسری بدترین سزا سمجھا جاتا ہے۔ عمران کو یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا لیکن اتنی بات تو یقیناً وہ بھی سمجھ چکا تھا کہ میڈم صفورا اس سرنج کے ذریعے کوئی مہلک دوا داخل کرنے والی ہے جو اسے شدید ترین تکلیف میں مبتلا کر دے گی یا پھر ہو سکتا ہے کہ موت سے ہی ہم کنار کر دے۔

سرنج بھرنے کے بعد میڈم صفورا نے دراز قد گارڈ کو اشارہ کیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے میری پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی تھی۔ دراز قد گارڈ آگے بڑھا اور عمران کو الٹا کرنے کے لیے نیچے جھکا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنا خطرناک کام کرنے جا رہا ہے... اور ہم میں سے بھی کسی کو معلوم نہیں تھا... اچانک میری آنکھوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ عمران نے اپنی بندھی ہوئی ٹانگیں پورے زور سے گارڈ کے سینے پر ماریں ..... وہ اچھلتا ہوا اس میز سے ٹکرایا جس پر ہمارا ذاتی سامان پڑا تھا۔ میز ٹوٹ گئی اور گارڈ کراہتا ہوا فرش بوس ہوا۔

تب ایک اور حیران کن منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ عمران کی ٹانگوں سے لپٹی ہوئی نائیلون کی رسی تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔ وہ کم از کم تین جگہ سے ٹوٹی تھی، اس کے بل ایک دم کھلتے چلے گئے۔ عمران اچھل کر کھڑا ہوا۔ میڈم تانبے کے ایک وزنی گل دان کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔ عمران نے جھک کر بہ آسانی یہ وار بچایا۔ اپنی پشت پر ٹانگ کی شدید ضرب کھا کر میڈم لڑکھڑاتی ہوئی آتش دان کے قریب گری۔ اس دوران میں دراز قد گارڈ سنبھل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ ہولسٹر کی طرف بڑھا رہا تھا جب عمران نے اس پر وار کیا۔ یہ ایک بے مثال وار تھا۔ مجھے اب فائٹنگ آرٹ کی کافی سمجھ بوجھ آ چکی تھی۔ میں عمران کے اس وار کی ٹائمنگ، ایکوریسی اور طاقت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ عمران نے پوری طاقت سے اپنی ٹانگ گھما کر گارڈ کے چہرے پر رسید کی تھی۔ میں نے جبڑا ٹوٹنے کی آواز بالکل صاف سنی۔ گارڈ کا سر بڑی شدت سے ساتھ آہنی دروازے سے ٹکرایا اور وہ مُردہ چھپکلی کی طرح قالین پر لڑھک گیا۔

میڈم جھپٹتی ہوئی اس ساؤنڈ پروف کمرے کے شمالی گوشے کی طرف گئی۔ یہ ایک طرح سے اس طویل کمرے کا دوسرا پورشن تھا، اسے نشست گاہ کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ میڈم کے یوں اس حصے کی طرف جھپٹنے کی وجہ چند لمحے بعد سمجھ میں آئی۔ جس وقت گارڈ چوٹ کھا کر گرا، پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ گرتے وقت پستول ہاتھ سے پھسلا اور نشست گاہ کی طرف چلا گیا تھا۔

جونہی عمران نے محسوس کیا کہ میڈم پستول پر جھپٹی ہے، عمران نے بھی جست لگائی اور ٹوٹی ہوئی میز کے قریب گرا۔ یہاں ہماری ذاتی اشیا بکھری ہوئی تھیں اور ان میں عمران کا ریوالور بھی شامل تھا۔ عمران اپنے ریوالور تک پہنچ گیا... لیکن اس سے پہلے میڈم پستول تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے عمران پر دو فائر کیے۔ عمران پھرتی سے لیٹ گیا۔ یہاں اس کی بے مثال ”لک“ نے بھی کام کیا۔ دونوں گولیاں عقب میں آہنی دروازے پر لگیں۔ عمران کے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے

www.kahopakistan.com

ہوئے تھے۔ اس نے کسی پیراک کی طرح جست لگائی اور ہوا میں اڑتا ہوا وزنی چوبی الماری کے پیچھے گرا۔ یہ وہی الماری تھی جس میں سے کچھ دیر پہلے میڈم نے انجکشن نکالا تھا۔ اس کے بعد میں نے جو منظر دیکھا، وہ عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتا۔ عمران کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ ان بندھے ہوئے ہاتھوں کو اس نے زور لگا کر اس طرح موڑ لیا کہ وہ الماری کے عقب سے میڈم پر فائر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میڈم نشست گاہ میں تھی اور وہاں کی نیم تاریکی میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ غالباً وہ بھی کسی چیز کے پیچھے پوزیشن لے چکی تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے پر کم از کم تین تین فائر کیے۔ دھماکوں سے کمرا گونج اٹھا۔ میں بغیر کسی آڑ کے بستر پر پڑا تھا۔ کوئی آوارہ گولی میرا مزاج پوچھ سکتی تھی۔ تاہم ایسا نہیں ہوا۔ میرے محفوظ رہنے سے ایک اور بات بھی ثابت ہوئی اور وہ یہ کہ میڈم کے سارے غیظ و غضب کا رخ عمران کی طرف تھا اور وہ مجھے بخشنے پر آمادہ تھی۔

وہ فائر کرنے کے ساتھ ساتھ چنگھاڑ بھی رہی تھی۔ ''حرامزادے... کتے! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تجھے بڑی بُری موت دوں گی۔''

میں نے زندگی میں پہلی بار کسی عورت کو اس طرح مردانہ وار للکارتے اور باقاعدہ گولی چلاتے دیکھا تھا۔ یقیناً وہ پستول استعمال کرنے میں مہارت بھی رکھتی تھی۔

دفعتاً عمران کے ریوالور سے ''ٹرچ'' کی آواز نکلی۔ وہ خالی ہو چکا تھا۔ یہ بڑی تشویشناک صورتِ حال تھی۔ یقیناً یہ آواز میڈم کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ اس کا پلڑا بھاری ہو چکا تھا۔ اب کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میرا ریوالور بھی کمرے میں موجود تھا مگر وہ خاصے فاصلے پر تھا۔ عمران الماری کے عقب سے نکل کر اس تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو یقیناً میڈم صفورا کی گولی کا شکار ہو جاتا۔ لیکن پھر وہ کچھ ہوا جس کا ہم میں سے کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یہ ایک بالکل ڈرامائی واقعہ تھا۔ گارڈ سمیت اس کمرے میں ہم کل چار ذی روح موجود تھے لیکن ہم ایک کو بھولے ہوئے تھے۔

اچانک میں نے میڈم کی کربناک آواز سنی۔ بالکل یہی لگا جیسے کسی نے اچانک اس پر خنجر چلا دیا ہو۔ وہ نہ صرف چلائی بلکہ لڑکھڑا کر کسی چیز پر گری۔ ''او گاڈ... او گاڈ...'' وہ دہشت سے پکارتی جا رہی تھی۔

عمران چند سیکنڈ تک الماری کے عقب میں رہا۔ شاید یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ میڈم کوئی چال تو نہیں چل رہی۔ تاہم میڈم کا لہجہ گواہی دینے لگا تھا کہ وہ تکلیف اور دہشت کے تحت چیخ رہی ہے۔ عمران الماری کے عقب سے نکل کر میڈم کی طرف بڑھا... میں نے بھی بہ مشکل خود کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا اور تب میری نگاہ سانپ پر پڑی۔ وہی گول داغوں والا مہلک ترین جاندار جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا ڈسا پانی طلب نہیں کرتا۔ ہم نے اسے زرگاں کے راستے میں ایک دلدلی علاقے سے پکڑا تھا اور یہ اب تک ایک کینوس کے تھیلے میں ہمارے ساتھ تھا۔ کمرے میں ہونے والی دھینگا مشتی کے دوران میں ہماری ساری اشیا یہاں وہاں بکھر گئی تھیں۔ یقیناً ان میں یہ کینوس کا تھیلا بھی شامل تھا۔ خبر نہیں کہ یہ کب تھیلے میں سے نکلا اور کب کسی کونے کھدرے میں رینگ گیا۔ اب وہ میری طرف آ رہا تھا۔ اس کی ''آمد'' کا نظارہ ایک دل خراش تجربہ تھا۔ عمران نے میڈم کا گرا ہوا پستول اٹھایا اور تاک کر فائر کیا۔ پہلے فائر میں ہی سانپ کی کھوپڑی صاف اڑ گئی۔ خون کے چھینٹے صوفے کے سفید غلاف کو رنگین کر گئے۔

میڈم نے اپنی پنڈلی دونوں ہاتھوں میں جکڑی ہوئی تھی اور تکلیف کی شدت سے صوفے پر ڈھیری ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً سخت جان تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو شاید بے ہوش ہو چکی ہوتی۔ عمران اور میں پشت جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ عمران نے چھری سے میرے ہاتھ کھول دیے، میں نے عمران کے کھولے۔ عمران میڈم کی طرف لپکا۔ وہ زبردست برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی تاہم تکلیف اس کے چہرے اور پورے جسم سے ظاہر تھی۔ اس کے صاف شفاف رنگ میں ہلکی سی نیلاہٹ کی آمیزش ہوتی جا رہی تھی۔ چہرہ پسینے سے تر تھا۔ وہ کراہی۔ ''مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔''

اس کی ٹوٹی ہوئی آواز سن کر یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ یہی عورت کچھ دیر پہلے شیرنی کی طرح گرج رہی تھی۔

سانپ نے اپنے دانت میڈم صفورا کے ٹخنے میں ذرا اوپر گاڑے تھے۔ نیلی جراب کے نیچے سے خون رس رہا تھا۔ اپنا ''جوگر'' وہ پہلے ہی اتار چکی تھی۔ عمران نے اس کی جراب بھی کھینچ دی۔ ''اس کا مفلر دینا مجھے۔'' عمران نے مجھ سے مخاطب ہو کر بے ہوش گارڈ کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے بے سدھ پڑے شخص کے گلے سے مفلر کھینچ کر عمران کو دیا۔ عمران نے یہ مفلر کس کر زخم سے ذرا اوپر باندھ دیا۔

سریع الاثر زہر کے اثرات کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا مگر آج پہلی بار آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا۔ زخم کے اردگرد صفورا کی جلد تیزی سے نیلی پڑتی جا رہی تھی...

''چابی کہاں ہے؟'' عمران نے خشک لہجے میں صفورا سے پوچھا۔

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بے ہوش گارڈ کی طرف اشارہ کیا۔ گارڈ کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور اسے دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ شاید وہ دم توڑ چکا ہے۔ صرف سانس کی مدھم حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بقیدِ حیات ہے۔

میں اپنے پاؤں کھول چکا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر گارڈ کی جیبیں ٹٹولیں اور کمرے کی چابی برآمد کر لی۔ یہ ڈھائی تین انچ لمبی اسٹیل کی خاص چابی تھی۔ میں نے اور عمران نے آنکھوں آنکھوں میں مشورہ کیا پھر میں دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا اور تب میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ جس ہضمی قفل کے سوراخ میں، میں نے چابی گھمانی تھی، وہ اپنی اصلی حالت میں نہیں تھا۔ اندھادھند فائرنگ کے دوران میں گولیاں اس اسٹیل کے دروازے سے ٹکرائی تھیں اور قفل کا سوراخ ناکارہ ہو گیا تھا۔

''چابی اندر نہیں جا رہی۔'' میں نے عمران کو اطلاع دی۔

''چابی اندر نہیں جائے گی تو اس کی جان باہر آ جائے گی۔'' عمران نے کہا۔

اور وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ تکلیف، صفورا کی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ زخم کے اردگرد کی جلد کا رنگ بدل رہا تھا۔ عمران نے میرے ساتھ مل کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش یکسر ناکام ہوئی۔ ہم نے دروازے کو زور زور سے پیٹنا اور صفورا کے ملازمین کو پکارنا شروع کیا۔ جلد ہی اس آہنی دروازے سے باہر لوگ جمع ہو گئے۔ وہ باہر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم اندر سے لگے رہے مگر یہ دروازہ ''مستقبل قریب'' میں کھلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ کمرے میں سے نکلنے کا واحد راستہ یہی ایک دروازہ تھا۔ کوئی کھڑکی، روشن دان، بغلی دروازہ، کوئی شے نہیں تھی۔ کمرے کے اندر اور باہر ایک دم ہی تہلکہ سا مچ گیا۔ دونوں طرف سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی جا رہی تھی... وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ عمران نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''شاید اسی موقع کے لیے کہا جاتا ہے... لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔''

وہ پلٹ کر میڈم صفورا کی طرف بڑھا اور اس کے زخم کا معائنہ کرنے لگا۔ پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ میرا یہ یار واقعی انوکھا تھا۔ سب سے منفرد، سب سے جدا۔ وہ یونہی تو دلوں میں جگہ نہیں بناتا تھا، یونہی تو وہ رگِ جاں میں سما کر دھڑکنوں کا حصہ نہیں بن جاتا تھا۔ وہ اگر وقت پڑنے پر فولاد تھا تو وقت پڑنے پر ریشم کی طرح نرم اور چاندنی کی طرح گداز بھی تھا۔ میں عمران کی بات کر رہا ہوں... جو میری توانائیوں کا سرچشمہ تھا اور میرے لیے زندگی کا دوسرا نام بن چکا تھا۔ اس نے میڈم صفورا کی پنڈلی کو دونوں ہاتھوں سے دبایا اور پھر اس کے نہایت خطرناک زخم پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ وہ اپنے ہونٹوں کی پوری طاقت سے زخم کا مواد چوس چوس کر ایک گلاس میں تھوکنے لگا۔

''عمران! یہ کیا کر رہے ہو؟'' میں بے تاب ہو کر بولا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے تسلی دی اور اپنا کام جاری رکھا۔ گلاس میں خون جمع ہو رہا تھا اور اسی خون سے عمران کے خوب صورت ہونٹ بھی لتھڑے ہوئے تھے۔ بظاہر یہ صرف خون تھا لیکن اس میں یقیناً سانپ کا سریع الاثر زہر بھی شامل تھا۔ جب زخم سے نکلنے والا مواد کم ہو گیا تو عمران نے شکاری چاقو کی مدد سے زخم کے گرد دو اور گہرے کٹ لگائے اور وہاں سے بھی SUCKING شروع کی۔ میڈم پر اب غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔

کمرے میں رکھے ایک انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ باہر سے میڈم صفورا کے منیجر مدن کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''اندر کیا ہو گیا ہے... دروازہ کیوں نہیں کھل رہا؟''

''میڈم شدید زخمی ہو گئی ہیں۔ انہیں فوری طور پر ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضرورت ہے۔ کسی بھی طرح دروازہ کھولو۔ نہیں کھلتا تو توڑ دو۔'' میں نے کہا۔

صرف چند سیکنڈ بعد آہنی دروازے پر باہر سے وزنی ہتھوڑے کی زوردار ضربیں لگائی جانے لگیں۔ یہ ضربیں ہضمی قفل کی جگہ پر لگائی جا رہی تھیں۔ ضربوں سے پیدا ہونے والا شور قیامت خیز تھا۔ مُردے بھی قبروں میں جاگ سکتے تھے اور گارڈ مرا نہیں صرف بے ہوش ہوا تھا۔ وہ کسمسانے اور کراہنے لگا۔ میں اس کی طرف سے چوکس ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی مقامی طرز کی رنگین پگڑی میں، میں نے اپنا منہ پھر لپیٹ لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لال بھون کے عام ملازمین میری صورت دیکھیں۔ اسی دوران میں آہنی دروازہ ایک دھماکے سے کھل گیا۔ صفورا کے درجنوں ملازمین بھرّا مار کر اندر گھس آئے۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ کسمساتا ہوا زخمی گارڈ... سانپ کی لاش... عمران کا خون آلود منہ... یہ سارے مناظر انہیں مزید ششدر کر رہے تھے۔

عمران گرجا۔ ''جلدی کرو۔ میڈم کو اسپتال لے جانا ہے۔''

کئی افراد میڈم پر جھک گئے اور اسے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔

☆☆☆

www.kahopakistan.com

میڈم کو اسپتال لے جانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہیں لال بھون میں ڈاکٹر اسٹیل کا ایک تجربہ کار معاون پہنچ گیا۔ اس نے میڈم کو ایک دو انجکشن دیے، ڈرپ لگائی اور میڈم کی طبیعت بحال ہونا شروع ہوگئی۔ درحقیقت عمران کے بروقت اور دلیرانہ اقدام نے میڈم کو شدید خطرے سے دوچار ہونے سے بچالیا تھا۔

لیکن عمران کو بھی اس کا کچھ خمیازہ بھگتنا پڑا۔ رات کو عمران کا منہ سوج گیا اور یہ سوجن باہر ہی نہیں منہ کے اندر بھی تھی۔ اسے زبان ہلانے میں بھی دشواری ہونے لگی... علی الصباح میں نے میڈم کے منیجر مدن کو بتایا۔ اس کو بھی یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ عمران نے ہنگامی طبی امداد کے طور پر میڈم کے زخم پر منہ رکھا تھا اور اس کا زہر نکالا تھا ...... عمران کے اس دلیرانہ ایثار نے ڈاکٹر کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی متاثر کیا تھا۔ ان میں مدن بھی شامل تھا... وہ خود ہی ڈاکٹر کے پاس گیا اور عمران کی کیفیت بتا کر دوا لے آیا۔ ڈاکٹر نے تسلی دی کہ اگر مریض کے منہ کے اندر کوئی تازہ زخم نہیں تو پریشانی کی بات نہیں... ایک دو دن میں اس کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ میں نے ٹارچ کی مدد سے اچھی طرح عمران کے منہ کا اندرونی معائنہ کیا۔ کوئی زخم نظر نہیں آیا۔ رات کو عمران کو تھوڑا سا بخار بھی ہو گیا لیکن مجموعی طور پر اس کی حالت زیادہ خراب نہیں ہوئی۔ دوسری طرف میڈم کی حالت تیزی سے بہتر ہو رہی تھی۔

اگلی صبح میں میڈم کی خبر گیری کے لیے اس پورشن کی طرف گیا جہاں میڈم کی رہائش تھی۔ میڈم تک پہنچنے میں منیجر مدن نے میری مدد کی۔ ہم ایک ایسی راہداری میں سے گئے تھے جہاں کسی ملازم یا گارڈ سے ہماری مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ مزید احتیاط کے طور پر میں نے ایک گرم ٹوپی اور مفلر سے اپنا دو تہائی چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ ایک بلند و بالا دروازے سے گزر کر ہم ایک شان دار بیڈ روم میں پہنچے۔ یہاں ایرانی قالین بچھے تھے اور کھڑکیوں پر دبیز پردے جھول رہے تھے... میڈم سفید اجلے بستر پر لیٹی تھی۔ اسے ابھی تک ڈرپ لگی تھی۔ پاؤں پر پٹی بھی بندھی ہوئی تھی۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھتی رہی۔ آنکھیں بھی بالکل بے تاثر تھیں۔ اگر میرا خیال تھا کہ میڈم کے انداز میں نرمی یا احسان مندی نظر آئے گی تو مجھے مایوسی ہوئی۔ میں نے اس کا حال احوال پوچھا۔ اس نے مختصر جواب دیے۔ میں کئی منٹ اس کے پاس رکا۔ اس دوران میں، میں منتظر رہا کہ شاید وہ عمران کے بارے میں کچھ پوچھے... مگر ایسا نہیں ہوا... بالآخر میں اس سے اجازت لے کر واپس ہو گیا۔ منیجر مدن بھی میرے ساتھ تھا۔ جب ہم کمرے کے دروازے پر پہنچے تو میڈم صفورا نے مجھے آواز دی۔

''تابش!''

''جی میڈم!'' میں نے پلٹ کر کہا۔

''تمہارے دوست کا حال اب کیسا ہے؟''

''جی... میڈم! کل شام تک تو ٹھیک نہیں تھا، اب تھوڑا سا بہتر ہے۔''

''مدن لال!'' میڈم نے منیجر کو مخاطب کیا۔

''جی میڈم!'' اس نے ادب سے جھک کر کہا۔

''ناشتے کے بعد ڈاکٹر کو بلاؤ اور اس سے کہو کہ وہ اس کے دوست کو اچھی طرح دیکھے اور میڈیسن تجویز کرے۔''

میڈم کے لہجے میں مثبت تبدیلی محسوس کر کے مجھے عجیب سے اطمینان اور خوشی کا احساس ہوا۔ عمران دل جیتنے کا ہنر جانتا تھا۔ کبھی کبھی اس کی یہ صلاحیت جادو جیسی لگتی تھی۔ شاید یہاں بھی اس جادوگری نے کام دکھایا تھا۔

... یہ چار روز بعد کی بات ہے۔ میں، عمران اور میڈم صفورا ایک بند کمرے میں بیٹھے تھے اور صورتِ حال پر کھل کر بات کر رہے تھے۔ میڈم صفورا اور عمران کے تعلقات میں حیرت انگیز تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ اس تبدیلی کا محور و منبع پانچ چھ روز پہلے کا وہی ڈرامائی واقعہ تھا جس نے میڈم اور عمران دونوں کو جان کے لالے ڈال دیے تھے... میڈم صفورا نے ہمیں یہ بات بتا کر حیران کیا کہ پانچ چھ روز پہلے جب لال بھون کے مین گیٹ پر میرے ساتھ اس کی ملاقات ہوئی تو وہ چوراہے میں اسحاق کی سولی کا منظر دیکھ کر واپس آ رہی تھی۔ میں نے بھی اسے بتایا کہ اسحاق ہمارے ساتھیوں میں سے تھا اور اس کی دردناک موت نے ہمیں شدید صدمہ پہنچایا ہے۔ میڈم نے بھی اسحاق کی موت کے حوالے سے وہی روداد سنائی جو اس سے پہلے ہم ریٹائرڈ فوجی کی بیٹی دجنتی سے سن چکے تھے۔ اپنی بہن ماریا کے اغوا کا بدلہ لینے کے لیے جارج گورا نے اسحاق کی بھاوج کو اٹھوایا تھا اور اپنی تحویل میں رکھا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کوئی اس عورت کو چھڑوانا چاہتا ہے تو اس کے لیے میدان کھلا ہے۔ وہ آئے اور اس سے دو دو ہاتھ کر کے عورت کو چھڑوا لے۔ دوسری صورت میں اس عورت پر اس کا پورا حق ہوگا اور وہ اپنی سوچ کے مطابق اس کے مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔

یہ تقریباً ویسا ہی ہتھکنڈا تھا جو پولیس والے یا دوسرے بااثر لوگ اپنے مفرور مجرموں کو پکڑنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ان کے اہلِ خانہ کو دھر لیتے ہیں... اور اپنے اہلِ خانہ کو بچانے کے لیے مجرم یا ملزم کو سامنے آنا پڑتا ہے۔ میڈم نے بتایا کہ اسحاق، جارج گورا سے دوبدو مقابلے کے لیے آیا تھا اور یہ مقابلہ اسے کرنا پڑا۔ حالانکہ اس میں اسحاق کی کامیابی کا امکان دس پندرہ فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ سب تو جنگل کے قانون جیسا لگتا ہے۔ جس میں زور ہو، وہ اپنی مرضی کا فیصلہ ٹھونسنے کے لیے آزاد ہو جائے۔''

''بس کچھ ایسا ہی ہے۔'' میڈم نے کہا۔ ''اس رسم کو یہاں سامبر کہا جاتا ہے اور یہ پتا نہیں کب سے چلی آ رہی ہے۔''

''کب ہوئی تھی یہ زور آزمائی؟'' عمران نے پوچھا۔

''پچھلے بدھ کو۔ اور اس حقیقت سے انکار نہیں کہ سامبر کے اصول کے مطابق حمیدہ کے دیور اسحاق کو پورا پورا موقع دیا گیا تھا۔ دونوں میں تلوار بازی ہوئی تھی۔ یہاں چھوٹے سائز کی تقریباً دو فٹ لمبی تلوار استعمال ہوتی ہے جسے کٹار یا کٹاری کہا جاتا ہے۔ جارج ایسے مقابلوں میں بہت مہارت حاصل کر چکا ہے اور کسی کو ایسے ''باؤٹس'' میں اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتا۔ اس نے لڑائی شروع ہونے کے ڈیڑھ دو منٹ بعد ہی اسحاق کی کٹار گرادی تھی اور اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا تھا مگر پھر اس نے اسحاق کو ایک اور موقع دیا۔ اس مرتبہ بھی وہ دو منٹ سے زیادہ اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکا۔ اس کی ران پر زخم لگا اور وہ گر گیا۔ جارج نے کٹار کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔ اس مقابلے سے پہلے ہی جارج نے واضح کر دیا تھا کہ اگر سامبر میں اس کے مقابلے میں آنے والا مقابلہ ہار گیا تو اسے ماریا کے اغوا کی پوری پوری سزا ملے گی اور یہ سزا حمیدہ کے دیور کو دی گئی۔ مقابلے کے فوراً بعد جارج نے اس کے ہاتھ کی انگلیاں کٹار سے کاٹ ڈالی تھیں۔ بعد میں اسے سولی چڑھا دیا گیا۔''

عمران نے پوچھا۔ ''اب اس لڑکی حمیدہ کے حوالے سے صورتِ حال کیا ہے؟''

میڈم صفورا نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''انور خاں یہاں زرگاں کا ایک دلیر مسلمان ہے۔ سنا ہے کہ حمیدہ کو چھڑانے کے لیے اس نے جارج کے سامنے آنے کا ''اناؤنس'' کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دو تین روز کے اندر زرگاں میں ایک اور خونی واقعہ ہو جائے۔''

''کیا انور خاں یہاں زرگاں میں آئے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔ اسے یہیں آنا پڑے گا۔''

''کیا اس مقابلے سے پہلے ہی ہم کسی طرح اس ''لڑاکے مرغے'' کا سر قلم نہیں کر سکتے؟'' عمران نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا۔

''سوچا تو بہت کچھ جا سکتا ہے لیکن تھیوری اور پریکٹیکل میں بہت فرق ہوتا ہے۔'' میڈم نے سگریٹ کا گہرا کش لیا۔

''کیا آپ کی رسائی جارج تک نہیں ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''مجھے یہاں آئے تقریباً تین ماہ ہو چکے ہیں۔ اس دوران میں صرف ایک بار جارج سے ملاقات ہوئی ہے اور وہ بھی یہاں نہیں راج بھون میں۔ آج کل یہ سارے لوگ اپنی سیکیورٹی کی طرف سے بہت چوکس ہیں۔ خاص طور سے حکم جی، جارج اور سرجن اسٹیل، ماریا وغیرہ... ایک ہفتے پہلے بھی ایک خونی واقعہ ہوا ہے۔ کچھ لوگوں نے راج بھون کے اندر گھس کر کارروائی کی ہے۔ ساری سیکیورٹی کو درہم برہم کر کے وہ راج بھون کے اندر پہنچے، گارڈز سے رائفلیں چھینیں اور اندھا دھند فائرنگ کی۔ سرجن اسٹیل کے بھائی کے علاوہ کئی گارڈز بھی مارے گئے۔ اس کے علاوہ...''

ایک دم میڈم صفورا بات کرتے کرتے چپ ہو گئی۔ اس نے جیسے چونک کر ہم دونوں کو دیکھا۔ پھر ٹھٹکتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تم دونوں بھی زرگاں دو تاریخ کو ہی پہنچے تھے نا؟''

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اور یہ واقعہ بھی اسی دن ہوا۔ کہیں... میرا مطلب ہے... کہیں...'' وہ کھوجتی نظروں سے ہماری طرف دیکھتی جا رہی تھی۔

عمران نے میری طرف اور میں نے اس کی طرف نگاہ دوڑائی۔

میڈم بولی۔ ''کہیں تم دونوں کچھ چھپا تو نہیں رہے ہو؟''

عمران نے میڈم کی اجازت سے اس کے سگریٹ کیس میں سے ایک سگریٹ لیا اور بولا۔ ''میڈم! ہم چھپا رہے تھے لیکن اب چھپانا نہیں چاہتے۔ ہمیں قدرت نے ایک ہی راستے پر لا کھڑا کیا ہے اور اب ہمیں ایک ہی رخ پر جانا ہے...''

اس کے بعد میں نے اور عمران نے اپنی کہانی کا وہ حصہ بھی میڈم کے گوش گزار کر دیا جو اب تک اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ یہ جان کر ششدر ہوئی کہ یہ ہم ہی تھے جنہوں نے اس رات راج بھون میں تہلکہ مچایا تھا... اور پھر صاف بچ کر نکل گئے تھے۔ میڈم کے ساتھ اس گفتگو میں ہم پر ایک اور انکشاف بھی ہوا اور وہ یہ کہ اس رات میں نے سرپٹ بھاگتی ...... گاڑی کے اندر جس شخص کو جہنم داصل کیا، وہ رنجیت پانڈے نہیں اس کا

www.kahopakistan.com

چچازاد گرومیت پانڈے تھا۔ دونوں کی شکل اور قد کاٹھ کافی حد تک ملتے جلتے تھے۔ ان کو قریب سے نہ جاننے والے اکثر دھوکا کھا جاتے تھے۔ مجھے وحشی کے پتا کا وہ فقرہ بھی یاد آیا جو اس نے پانڈے کی موت کی اطلاع دیتے ہوئے بولا تھا۔ اس نے ''چھوٹے پانڈے'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔

ہمارے اور میڈم کے درمیان ہونے والی یہ طویل گفتگو کئی لحاظ سے کارآمد رہی۔ کئی طرح سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوا۔ اسی گفتگو میں میڈم کے ایک سوال کے جواب میں عمران نے یہ بھی بتایا کہ جب بے ہوشی کی حالت میں میڈم نے اس کے اور میرے ہاتھ پاؤں بندھوا دیے تھے تو وہ اچانک اپنے پاؤں کی رسّی توڑنے میں کامیاب کیسے ہوگیا تھا۔ عمران نے بتایا کہ ہوش میں آنے کے بعد وہ اس رسّی کو ایک میز کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے ساتھ رگڑتا رہا تھا اور اسے کمزور کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ہمیں یہ بھی پتا چلا کہ ایڈووکیٹ ..... ابرار صدیقی کی بھی بقایا سزا معاف ہونے کی امید ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہ بھی چار پانچ روز میں ایک قریبی گوڈے سے یہاں لال بھون میں پہنچ جائے۔ یہاں لال بھون کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی کئی انکشافات ہوئے۔ میں، عمران اور میڈم سر جوڑ کر بیٹھے اور پہلی بار مشترکہ طور پر سوچا کہ ہم اس راجواڑے کی تاریکی سے نکل کر کس طرح آزاد فضاؤں میں پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اہم ترین مقصد بھی زیر بحث آیا جس کے لیے ہم یہاں پہنچے تھے اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھی تھی... یعنی جارج گورے کی موت...

یہ دوسرے روز کی بات ہے، عمران لان کی طرف چہل قدمی کے لیے گیا تھا۔ میں کمرے میں تھا۔ پچھلے کئی ماہ سے میں نے ایک دن کے لیے بھی ورزش نہیں چھوڑی تھی۔ جہاں اور جس وقت موقع ملتا، میں دن میں کم از کم ایک ڈیڑھ گھنٹا اپنی جسمانی فٹنس کو ضرور دیتا تھا۔ اب بھی میں کمرے کے اندر ہی اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ مارشل آرٹ اور باکسنگ وغیرہ میں ایک لفظ ''شیڈو فائٹ'' استعمال ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کھلاڑی کا بغیر کسی حریف کے خیالی لڑائی لڑنا اور اس طرح خود کو چست رکھنا۔ کچھ دیر تک شیڈو فائٹ کرنے کے بعد میں ڈپس لگانے میں مصروف ہوگیا۔ یہ کوئی دس بیس یا سو پچاس ڈپس نہیں تھے بلکہ میں گنتی کرتا ہی نہیں تھا۔ ایک بار شروع ہوتا تھا تو پھر جب تک بازو بے دم نہیں ہوجاتے تھے، لگا رہتا تھا۔ جیکی یہی کہا کرتا تھا۔ جہاں ہمت جواب دے جاتی ہے، وہیں سے غیر معمولی ''امپروومنٹ'' کا آغاز ہوتا ہے۔

اس دن میں اپنے جسم پر شاید کچھ زیادہ ہی سختی کر گیا۔ ورزش ختم کی تو پیٹ کے بالائی حصے میں اینٹھن شروع ہوگئی۔ میں قالین پر لیٹ گیا اور خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کھڑکیوں سے باہر لان کا منظر نظر آرہا تھا۔ دوپہر ہوچکی تھی مگر سرما کی دھوپ میں ابھی تک کوئی دم خم نہیں آیا تھا۔ میں نے دیکھا دور ایک روش پر عمران اکڑوں بیٹھا ہوا میڈم صفورا کے چھوٹے رشین کتے کو پچکار رہا تھا۔ میڈم بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ کتے کو غالباً کوئی چوٹ آئی تھی۔ عمران اس کی چوٹ پر دوا لگانے میں مصروف تھا۔ ساتھ ساتھ وہ میڈم سے باتیں بھی کرتا جارہا تھا۔ اس نے جب کسی کو رام کرنا ہوتا تھا تو اس کی خوش گفتاری عروج پر پہنچ جاتی تھی۔ اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ میڈم سنجیدہ نظر آتی تھی۔ وہ بس عمران کی کسی کسی بات کا ہی جواب دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد میڈم کا ملازم کتے کو گود میں اٹھا کر میڈم کے پیچھے پیچھے درختوں میں اوجھل ہوگیا، عمران واپس کمرے کی طرف آگیا۔ وہ کمرے میں پہنچا اور میرے تاثرات دیکھ کر چونک گیا... ''جگر! کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''کچھ نہیں... پیٹ میں ذرا درد ہورہا ہے۔''

''ذرا نہیں ہورہا۔ تم تو پیلے پڑے ہوئے ہو لیکن یہ ہوا کیوں... مجھے تو لگتا ہے تم نے اندھادھند ورزش فرمائی ہے۔'' وہ ہمیشہ کی طرح بہت جلد درست نتیجے پر پہنچ گیا۔

میں خاموش رہا تو اس کے انداز ے کی تصدیق ہوگئی۔ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''کبھی کبھی تم جنون کی حد تک چلے جاتے ہو۔ خود اپنے آپ پر ظلم کرنے لگتے ہو۔ نقصان اٹھاؤ گے۔''

پھر وہ میرے قریب بیٹھ گیا اور میرے پیٹ کو ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ ''کہاں ہے درد؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے خود پتا نہیں چل رہا۔'' میں زبردستی مسکرایا۔

''میں میڈم سے بات کرتا ہوں۔''

میں نے اسے روک دیا۔ ''خوامخواہ بات کا بتنگڑ نہ بناؤ۔ اب میں پہلے سے بہتر ہوں۔''

تھوڑی سی کوشش کرکے میں نے اسے قائل کرلیا کہ درد ناقابل برداشت نہیں اور اب کم ہوتا جارہا ہے۔

حقیقت میں ایسا نہیں تھا... درد شدید تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، اب اپنی کسی بھی تکلیف کے لیے مجھے دوا کا سہارا لینا اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں تکلیف کو دوا کے بغیر برداشت کرتا تھا اور اکثر یہ بُرا وقت گزر ہی جاتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ آدھ پون گھنٹے تک درد نے زور مارا پھر دھیرے دھیرے کم ہوکر ختم ہوگیا۔

اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی اور میڈم اندر آگئی۔ وہ نسبتاً اچھے موڈ میں تھی۔ سانپ کے ڈسنے کے اثرات اب اس پر نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے۔ ہمارے کمرے کے آہنی دروازے کی مرمت ہوچکی تھی اور بے ہوش ہوجانے والا دراز قد گارڈ بھی اب روبہ صحت تھا۔ میڈم نے سگریٹ سلگایا اور ہمیں بھی پیشکش کی۔ عمران نے یہ پیشکش شکریے کے ساتھ قبول کرلی۔ میڈم بولی۔ ''آج کل یہاں زرگاں میں ایک اور بات گردش کررہی ہے۔ لوح یا تختی والی بات۔ تم نے کچھ سنا ہے اس بارے میں؟''

''نہیں میڈم۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''یہ تو تمہیں پتا ہی ہے نا کہ حکم جی کے خاص قیدی اگر جیل وغیرہ میں نہ بھی ہوں تو اسٹیٹ کی حدوں سے نکل نہیں سکتے۔ انہیں پکڑ لیا جاتا ہے۔ عام طور پر اسے حکم جی کی روحانی طاقت کا کرشمہ قرار دیا جاتا ہے۔ اب کچھ لوگ یہ بات کہہ رہے ہیں کہ جس میجک کے ذریعے ان قیدیوں کو اسیر کیا جاتا ہے، وہ کسی لوح یا تختی پر لکھا جاتا ہے اور پھر یہ چھوٹی سی لوح قیدی کے جسم میں ڈال دی جاتی ہے۔ یہ اس لوح کی شکتی ہے کہ وہ قیدی جہاں بھی جاتا ہے، حکم جی کی نظروں میں رہتا ہے...''

عمران زیرِلب مسکرایا اور بولا۔ ''اس بارے میں آپ کا کیا آئیڈیا ہے میڈم؟''

میڈم سگریٹ کا طویل کش لے کر بولی۔ ''اسٹیٹ کے عام لوگ تو اسی میجک اور لوح والی بات کو درست سمجھتے ہیں لیکن چند پڑھے لکھے ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ جس چیز کو میجک یا لوح اور نقش وغیرہ کہا جاتا ہے، وہ شاید کوئی جدید ڈیوائس ہے... کوئی الیکٹرانک چپ وغیرہ...''

کچھ دیر کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر میں نے کہا۔ ''میڈم! آپ نے مجھ سے ابھی تک یہ اہم سوال نہیں پوچھا کہ میں زرگاں سے فرار ہونے کے بعد حکم کے ہرکاروں کی نگاہ سے کئی ہفتے تک کیسے بچا رہا اور کیسے پھر چوری چھپے یہاں زرگاں پہنچ گیا؟''

''بے شک یہ سوال میرے ذہن میں آتا رہا ہے۔'' میڈم نے کہا۔

''آپ نے جو تختی والی بات کہی ہے میڈم... وہ بالکل درست ہے اور میں اب تک اسی لیے بچا رہا ہوں کہ میں اپنے اندر اس تختی کی موجودگی سے باخبر ہوگیا تھا۔''

''باخبر ہوگیا تھا؟''

''جی میڈم! اور مجھے پتا چل گیا تھا کہ مجھے اس کا توڑ کیسے کرنا ہے۔''

میڈم نے پہلے میری طرف پھر عمران کی طرف اور تب دوبارہ میری طرف دیکھا۔ ''کیا تم اس کی وضاحت کرنا پسند کروگے؟'' اس نے کہا۔ تختی والی بات اسے ششدر کررہی تھی۔

ہمیں میڈم کا اعتماد اور بھروسا درکار تھا اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا تھا جب ہمارے درمیان کم سے کم پردہ باقی رہے۔ میں نے میڈم کو چپ کے حوالے سے تقریباً سبھی کچھ بتا دیا... اور یہ بھی بتا دیا کہ بالآخر یہ چپ کیسے اور کیونکر میرے جسم سے نکل سکی ہے۔ میڈم یہ ساری روداد بہت حیرت کے عالم میں سنتی رہی، بیچ میں کہیں کہیں اس نے سوالات بھی کیے۔ میں نے میڈم کو اس نہایت خطرناک آپریشن کا نشان دکھایا اور دیگر تفصیلات بتائیں۔

اس کے بعد میڈم ہی کے کہنے پر میں نے میڈم کے سر کے پچھلے حصے کا معائنہ بھی کیا۔ میرے ذہن میں اس بات کا ساٹھ ستر فیصد امکان موجود تھا کہ میڈم صفورا اور.... ابرار صدیقی کے جسم میں بھی چپ رکھی گئی ہوگی مگر کم از کم میڈم صفورا کی حد تک تو یہ اندازہ غلط نکلا۔ فوری طور پر میڈم کے جسم میں چپ کی موجودگی کا سراغ نہیں ملا۔ ہماری یہ سنسنی خیز گفتگو جاری تھی کہ کسی عورت کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آئیں۔ وہ شاید کسی کو ڈانٹ رہی تھی اور مار بھی رہی تھی۔ پھر جس کو مارا جارہا تھا، اس کے چلّانے کی آواز بھی ابھری۔ یہ اسی دن والی ثمرین نامی لڑکی کی آواز تھی۔

''اوہ گاڈ! یہ پھر تماشا لگ گیا ہے۔'' میڈم نے بیزار لہجے میں کہا۔ ہم سے معذرت کرکے وہ باہر چلی گئی۔

اسے باہر کا معاملہ سنبھالنے اور واپس آنے میں تقریباً دس منٹ لگ گئے۔

''اس لڑکی کا کیا مسئلہ ہے میڈم؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں جو لڑکیاں تربیت کے لیے اور پالش وغیرہ ہونے کے لیے آتی ہیں، ان میں سے کچھ تو ایسی ہوتی ہیں جن کی اپنی مرضی بھی اس میں شامل ہوتی ہے۔ وہ راج بھون کی رنگینیوں اور وہاں کے آرام و آسائش میں جانے کا شوق دل میں رکھتی ہیں لیکن کچھ کو یہ سب کچھ مجبوری کی وجہ سے کرنا پڑتا ہے اور وہ دل ہی دل میں یہ خواہش رکھتی ہیں کہ وہ ''فیری سلیکشن'' سے بچ جائیں تو اچھا ہے۔ اب ان میں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو چپ رہتی ہیں اور دوسری وہ جو تھوڑی بہت مزاحمت کرتی ہیں۔ یہ ثمرین نامی لڑکی بھی مزاحمت کرنے والیوں میں ہے۔ یہ اکثر کسی بات پر اڑ جاتی

www.kahopakistan.com

ہے اور پھر بار پیٹ کا شکار ہوتی ہے۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ تمہاری بیوی سلطانہ کے گھرانے سے بھی اس کا تھوڑا بہت تعلق ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

میڈم چند لمحے توقف کرنے کے بعد بولی۔ "یہ سلطانہ کی رشتے دار ہے۔ اس کی شادی سلطانہ کے بھائی نبیل سے ہونے والی تھی لیکن پھر نبیل کمر پر لگنے والی چوٹ کی وجہ سے مفلوج ہو کر بستر پر پڑ گیا۔ پہلے امید تھی کہ شاید وہ علاج معالجے سے ٹھیک ہو جائے لیکن یہ بھی نہ ہو سکا۔ پھر وہ لوگ ویسے ہی زرگاں چھوڑ کر تل پانی چلے گئے... اب یہ لڑکی نظر میں آگئی ہے۔"

"نظر میں آگئی... کیا مطلب؟" عمران نے پوچھا۔

"ساتویں کا جشن شروع ہونے سے قریباً چھ مہینے پہلے راج بھون کے خاص اہل کاروں کی ٹیم جس میں عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں، دوشیزاؤں کی تلاش میں نکلتی ہے۔ جو لڑکیاں سلیکٹ ہوتی ہیں ان کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ "نظر میں آگئی ہیں۔ اس "تلاش" میں وہ سیکڑوں عورتیں بھی مدد کرتی ہیں جو مقامی آبادی میں موجود ہوتی ہیں اور ان کے رابطے راج بھون سے ہوتے ہیں۔"

"تو آپ کا مطلب ہے کہ اس ثمرین نامی لڑکی کی شادی سلطانہ کے بھائی سے ہونے والی تھی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"بالکل ایسا ہی تھا اور ان لڑکیوں میں آٹھ دس اور بھی ایسی ہیں جو بالکل ناخوش ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس وقت کو کوستی ہوں جب وہ کسی وجہ سے نظر میں آگئیں۔"

میرے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ میں نے میڈم سے اس بارے میں دو چار سوال مزید پوچھے۔ میڈم نے بتایا کہ اس ثمرین نامی لڑکی نے اسے خود یہ ساری تفصیل بتائی ہے۔ وہ اس لڑکے کی یاد اب بھی دل میں بسائے ہوئے ہے۔

مجھے وہ ساری باتیں یاد آگئیں جو تائو افضل نے مجھے سلطانہ اور اس کے بھائی کے بارے میں بتائی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ سلطانہ اپنے بھائی کا علاج کرانے کی شدید خواہش رکھتی تھی۔ اس نے محنت مزدوری کر کے پندرہ ہزار روپے کی رقم جمع کی تھی لیکن اس سے پہلے کہ یہ رقم نبیل کے کام آتی، میں خود بیمار پڑ گیا تھا۔ میرا بخار اترنے کا نام نہیں لیتا تھا اور ایک ہچکی ہر وقت میرا سینہ دہلائی رہتی تھی۔ سلطانہ نے اپنی جمع پونجی بشمول اپنے زیورات، بے دریغ میرے علاج پر خرچ کر دی تھی۔ پتا نہیں کہ خاموشی اور رازداری کے ساتھ اس لڑکی نے کتنے احسان لادے ہوئے تھے میرے سر پر۔ میں جدھر رخ کرتا تھا، مجھے اس کے بے مثال ایثار کے نشان نظر آتے تھے۔ اس ایثار کی وجہ سے وہ خود مشکلوں کا شکار ہوئی تھی اور اس کے قریبی بھی۔

جواں سال نبیل کا بیمار اور مایوس چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا۔ مجھے لگا کہ میں اس کی بربادیوں میں اہم حصے دار ہوں۔ میری وجہ سے وہ اپنی صحت سے دور ہوا اور شاید اپنی محبت سے بھی۔

"کن خیالوں میں کھو گئے ہو؟" میڈم کی آواز نے مجھے چونکایا۔

"میں اس لڑکی سے مل سکتا ہوں؟"

"مل کر کیا کرو گے؟"

"میں اس سے تھوڑی سی بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو کر لینا، اس میں کون سی رکاوٹ ہے۔ ابھی وہ ذرا رو دھو رہی ہے۔ گیتا لکھی سے آج پھر اس کی لڑائی ہوئی ہے۔ ایک لڑکی نے اپنے سر کے بال سامنے سے کٹوانے تھے۔ اس نے ثمرین سے کہا۔ بال تھوڑے سے زیادہ کٹ گئے۔ بناؤ سنگار والی ٹیچر نے گیتا کو بتایا۔ گیتا نے ثمرین کو ڈانٹا ڈپٹا ہے۔ جس کے بال کٹے ہیں اس کی تو اچھی درگت بنی ہے۔ چھڑی سے مار پڑی ہے اسے۔ یہاں ایسے معاملوں کی بڑی سختی ہے۔ انتخاب کے لیے نظر میں آنے والی لڑکیوں کو لگے بندھے اصولوں کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔ خلاف ورزی پر جان تک کے لالے پڑ سکتے ہیں۔"

اس بارے میں ہماری معلومات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے میڈم نے بتایا۔ "حکم جی کو یہاں اوتار کا درجہ دیا جاتا ہے۔ تربیت پانے والی لڑکیوں کو بتایا جاتا ہے کہ اوتار اور اس کے خاص مصاحبوں کی خوشی کا خیال رکھ کے وہ ہر جنم میں اعلیٰ رتبہ پا سکتی ہیں۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ اگر کسی وقت ان کی قسمت جاگے اور حکم جی یا ان کا کوئی مصاحب ان کی طرف خاص انداز کی "پیش قدمی" کرے تو انہیں کس طرح خوش آمدید کہنا ہے اور ان کو رجھانے کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کرنے ہیں، گیتا لکھی اس تربیت کی ماہر ہے اور گیتا لکھی سے اکثر ثمرین کی چپقلش ہو جاتی ہے۔" یہ ساری باتیں تن بدن میں آگ لگا دینے والی تھیں۔ حکم جی اور اس کے حواریوں کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، وہ بالکل سچ ثابت ہو رہا تھا۔

ان باتوں سے تصدیق ہوتی تھی کہ جیکی کی حسین محبوبہ شکنتلا والی کہانی بھی بالکل سچ تھی۔ شکنتلا کی "پریم کہانی" کی وجہ سے حکم جی اسے اپنی پتنی تو نہ بنا سکا لیکن اسے حاصل کرنے کے لیے اس نے شکنتلا کو فیری یا پری کا درجہ دے دیا۔ اس کے لیے سبز رنگ کا چناؤ کیا گیا اور وہ راج بھون کی سبز پری کے طور پر حکم جی کے گھڑے کی مچھلی بن گئی۔ ایسی نہ جانے کتنی شکنتلائیں اور ثمرینیں حکم جی اور جارج گورا وغیرہ کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں اور ابھی چڑھنے والی تھیں۔

میڈم کے جانے کے بعد بھی میں اور عمران ثمرین کے بارے میں بات کرتے رہے۔ عمران کو بھی اس لڑکی سے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بولا۔ "اس کا معاملہ بھی تمہاری ثروت جیسا ہی لگتا ہے... وہ کیا کہتے ہیں، ٹوٹی کہاں کمند۔ مجھے ایک وظیفہ یاد آ رہا ہے جو ایسی لڑکیوں کو مصیبت سے بچانے کے لیے پڑھا جاتا ہے۔ اگر وہ پورا یاد آگیا تو شاید ہم اس کو بچا لیں۔" وہ ایسی ہی گول مول باتیں کرتا تھا۔

اس رات میں سونے کے لیے لیٹا تو دیر تک بارونڈا جیکی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا، اپنے کٹے پھٹے جسم کے ساتھ میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آگ اور ہونٹوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہا تھا۔ مجھے بھولنا نہیں۔ مجھے یاد رکھنا اور میری بے بسی کو بھی۔ اور اپنا حوصلہ بلند رکھنا۔ میں نے تمہیں کمزور نہیں رہنے دیا ہے۔ اپنی ساری آگ تمہیں سونپ دی ہے اور اپنے دشمن کے بارے میں بھی بتا دیا ہے...

پھر میرا دھیان سلطانہ کی طرف چلا گیا۔ میں اسے مندر کے تہ خانوں میں چھوڑ آیا تھا اور کہہ آیا تھا کہ میں وہ کام پورا کر کے آؤں گا جس کے لیے وہ اپنا سر ہتھیلی پر لے کر پھرتی رہی ہے۔ میرا نشانہ جارج گورا تھا اور میں جلد از جلد اس تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں جوں جوں جارج گورا کے بارے میں زیادہ جان رہا تھا اور اس کی خصلت کو زیادہ پہچان رہا تھا، میرے دل میں اس کے لیے نفرت اور انتقام کا بہاؤ تیز تر ہو رہا تھا۔ وہ گوری چمڑی والا یہاں کے لوگوں کو شاید انسان ہی نہیں سمجھتا تھا۔ زرگاں اس کے لیے شکارگاہ تھی۔ یہاں کے مرد و زن اس کے لیے پُرگوشت چوپایوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ خاص طور سے مقامی خواتین اس کا من پسند شکار تھیں اور وہ اس حوالے سے کسی طرح کی شرمندگی بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ برملا کہتا تھا... مجھے مقامی عورتیں بھاتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر میرے دل میں انہیں حاصل کرنے کی خواہش جاگتی ہے۔ میں اس حوالے سے کمزور ہوں۔ ہوا اور پانی کے بغیر تو میں شاید زندہ رہ جاؤں لیکن خوش شکل نمکین عورتوں کے بغیر نہیں۔

یہ عورت باز شخص میری سلطانہ کو داغ دار کر چکا تھا۔ اس کے ماتھے پر بدنامی کا ٹیکا لگا چکا تھا۔ وہ راجپوت خاندان کی طرح دار بیٹی تھی۔ جارج نے اس کا پندار توڑا تھا، اس کی آن بان خاک میں ملائی تھی... اور وہ ابھی تک زندہ تھا، راج بھون کی بلند دیواروں کے اندر سانس لے رہا تھا، زندگی کی ساری لذتوں سے بہرہ مند ہو رہا تھا... اور حمیدہ جیسے نئے شکار پھانس رہا تھا۔

میرے سینے میں بھڑکتے ہوئے شعلے الاؤ بن گئے۔ میں بے قرار ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا... مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک دوسرے بستر پر عمران سو رہا تھا۔ اسے کیا پتا تھا، میں کس کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ میں ہر مصلحت اور اندیشے کو بالائے طاق رکھ دینے کے مرحلے میں آگیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں ایک واشگاف فیصلے تک پہنچ گیا... میں نے دیوار پر لٹکے ہوئے ہولسٹر میں سے بھرا ہوا ریوالور نکال کر اپنی جیکٹ میں رکھا اور جیکٹ پہن لی... ایک سرخ دھند سی میری آنکھوں کے سامنے چھاتی چلی جا رہی تھی۔ میں عمران کو سوتا چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔

رات کے قریباً دس بج چکے تھے۔ نیم گرم کمرے سے باہر سردی تھی اور میں جانتا تھا کہ لال بھون سے نکلتے ہی میرا سامنا کڑاکے کی ٹھنڈ سے ہوگا لیکن سردی، گرمی، بھوک پیاس، چوٹ اور بے آرامی کی دی ہوئی تکلیفیں مجھے اچھی لگتی تھیں۔ یہ تکلیفیں میرے بے تکلف دوستوں جیسی ہو گئی تھیں۔ مجھے ان کے ساتھ مل بیٹھنا اور ان کی "کمپنی" میں خوش رہنا آگیا تھا۔ جیسے نہایت تیز مرچ مسالے کی وجہ سے آنسو آ جاتے ہیں لیکن انسان مزہ بھی محسوس کرتا ہے... کچھ ایسا ہی مزہ مجھے دکھ جھیل کر آتا تھا۔

میں دو راہداریوں میں سے گزر کر ایک بڑے لاؤنج میں پہنچا۔ ایک قریبی ہال نما کمرے سے ٹی وی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ ٹی وی اور اس جیسی دوسری الیکٹرانکس اشیا یہاں خال خال ہی دیکھنے میں آتی تھیں۔ ٹی وی پر وی سی آر کے ذریعے لڑکیاں کوئی رومانی فلم دیکھ رہی تھیں... یا شاید انہیں "تربیت" کے طور پر دکھائی جا رہی تھی۔ گاہے بگاہے نوخیز لڑکیوں کی کھلکھلاتی ہنسی بند دروازے کے عقب سے ابھرتی تھی۔ میں برآمدے میں چلا آیا۔ کڑک سردی نے استقبال کیا۔ وسیع لان میں دھند پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف الاؤ روشن تھا مگر وہاں کوئی پہرے دار نظر نہیں آیا۔ غور کیا تو پہرے دار صاحبان ایک کھڑکی سے چپکے نظر آئے۔ وہ تاریکی میں کھڑے تھے اور ادھ کھلی کھڑکی میں سے ٹیلی وژن دیکھ رہے تھے۔ یہاں یہ چیز یقیناً "عجوبہ تفریح" کے زمرے میں آتی تھی۔

میں پہرے داروں کی نظر بچاتا ہوا باغیچے کی طرف چلا

www.kahopakistan.com

گیا۔ دن کی روشنی میں، میں اس جگہ کا معائنہ کر چکا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ لال بھون سے چوری چھپے نکلنے کے لیے یہ راستہ بہترین ہے۔ سامنے سے ایک گارڈ ٹارچ ہلاتا آرہا تھا۔ میں جلدی سے ایک مور پنکھ کی اوٹ میں ہو گیا۔ وہاں سے ایک روش پر چلتا ہوا میں دس فٹ اونچی بیرونی دیوار تک پہنچ گیا۔ یہاں کچنار، مہندی اور جامن وغیرہ کے پیڑ تھے۔ میں ایک درخت پر چڑھ کر دیوار پر آیا اور پھر خاموشی سے دوسری طرف کود گیا۔

لال بھون کی عمارت پانچ چھ کینال میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں عمارت کا چکر کاٹ کر روشن سڑک پر آ گیا۔ یہاں اِکا دُکا گاڑیاں اور گھوڑا گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا، سڑک کشادہ ہوتی گئی اور رونق میں بھی قدرے اضافہ ہو گیا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سیدھا راج بھون کی طرف جا رہا تھا۔ راج بھون کے بلند و بالا محرابی دروازے کی روشنیاں کافی دور سے دکھائی دے رہی تھیں۔ آج میں نے پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ اس سے پہلے میں اور عمران پگڑیوں میں چہرہ چھپا کر زرگاں میں پھرتے رہے تھے، آج پگڑی نہیں تھی اور پتا نہیں کیوں میں چہرہ چھپانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا، یہاں میرا کوئی شناسا مجھے پہچان سکتا ہے۔ میں جارج کا مفرور قیدی تھا اور اب تو اور کئی الزام بھی میرے سر آ چکے تھے جن میں تیواری لال اور ڈیوڈ کے قتل کے علاوہ ماریا کے اغوا کو بھی شامل کیا جا سکتا تھا۔

ان اندیشوں کو دیوانی ٹھوکر سے اڑاتا ہوا میں سیدھا راج بھون کے بلند و بالا دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میرے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے اور رگوں میں لہو کی جگہ آگ دوڑ رہی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق، ابھی میں راج بھون کے عظیم الشان دروازے سے پچاس ساٹھ قدم دور ہی تھا کہ مسلح گارڈز نے مجھے روک لیا۔

"کیا بات ہے... کہاں جا رہے ہو؟" ایک افسر نما شخص نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"میں جارج گورا سے ملنا چاہتا ہوں۔" میرا لہجہ سپاٹ اور مستحکم تھا۔

کئی گارڈز میرے اردگرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ اچانک مجھے پہچان لیا گیا۔ ایک شخص نے حیرت بھری آواز میں کہا۔ "... یہ تو وہی ہے... مختار کی بیٹی کا شوہر۔"

سب سناٹے میں رہ گئے۔ میرے چہرے پر ٹارچوں کی روشنی پھینکی گئی۔ ایک دم دو گارڈز نے رائفلوں کا رخ میری طرف کر دیا۔ "تم مہرو ز ہو؟" انچارج گارڈ کی چونکی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"ہاں... اور جارج کو بتاؤ۔ میں اس سے ابھی ملنا چاہتا ہوں۔"

"ملاتے ہیں... ملاتے ہیں... ابھی تم ادھر آؤ۔" انچارج نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔ ایک دوسرے گارڈ نے تیزی سے میری تلاشی لی اور ریوالور میری قمیص کے نیچے سے نکال لیا۔

وہ مجھے مین گیٹ کے پاس ہی واقع ایک چھوٹے سے کمرے کی طرف کھینچنے لگے۔

"چھوڑ دو۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "تم نے میری تلاشی لے لی ہے، اب مجھے جارج کے پاس جانے دو۔ میں اس سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"تمیز سے بولو۔ اور کیا بات کرنے آئے ہو تم؟"

"میں اس کے اعلان کے جواب میں آیا ہوں۔ اس نے سامبر کا چیلنج دے رکھا ہے۔ میں یہ چیلنج قبول کرتا ہوں۔" بہت سے لوگ اردگرد اکٹھے ہو چکے تھے اور میں یہی چاہتا تھا۔ میں نے چیلنج کی بات کی تو گارڈز میں ایک دم سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ ان کا سخت رویّہ بھی قدرے نرم پڑ گیا۔ میں نے اپنی بات دُہرائی۔ "جارج کو بتا دو کہ میں سامبر میں اس کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔"

"کوئی نشہ وغیرہ تو نہیں کر رکھا۔ میرا مطلب ہے جو کہہ رہے ہو، ہوش حواس میں کہہ رہے ہو نا؟" انچارج گارڈ کے لہجے میں ہلکا سا طنز داخل ہو گیا۔

"ہاں، ہوش حواس میں ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم بھی ہوش حواس کے ساتھ سنو۔ مجھے جارج سے ملواؤ۔"

مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ ایک بار پھر مزید احتیاط سے میری تلاشی لی گئی۔ اردگرد ہلچل نظر آنے لگی تھی۔ انچارج گارڈ نے مجھ سے کچھ مزید سوالات پوچھے جن کے میں نے طے شدہ جواب دیے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں یہاں اکیلا پہنچا ہوں اور آج ہی آیا ہوں۔

قریباً پندرہ منٹ بعد میں نے ایک منحوس صورت کو اپنے روبرو پایا۔ یہ جارج کا بہنوئی اور ماریا کا شوہر سرجن اسٹیل تھا۔ وہ خاصا دراز قد تھا۔ نشے کے سبب اس کی آنکھیں قدرے سوجی ہوئی تھیں۔ چند دن پہلے میری رائفل کی گولی اس کے بھائی کو لگی تھی اور وہ جہنم واصل ہو گیا تھا۔ اس موت کا غم بھی اس کے چہرے پر تلاش کیا جا سکتا تھا۔

اس نے مجھے سر تا پا دیکھا اور اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں حقارت آمیز تجسس نظر آنے لگا۔ وہ بناوٹی لہجے میں بولا۔

"خوش آمدید۔ تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوا۔ بہت اچھا بات... کہ تم کو ڈھونڈنے میں ہام کو زیادہ "اسٹرگل" نہیں کرنا پڑا۔"

میں نے بے خوف ہو کر کہا۔ "مجھے بھی خوشی ہے کہ مجھے پالتو کتوں سے نہیں لڑنا پڑا۔ میں سیدھا ان کے مالک سے دو دو ہاتھ کر سکتا ہوں۔"

"تم اپنی بکواس بند کرو۔" انچارج پھنکارا اور اس نے میرے سر پر چوٹ لگانے کے لیے رائفل کا دستہ فضا میں بلند کیا۔

"نہیں۔" سرجن اسٹیل نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔ "اس نے چیلنج قبول کیا۔ اب یہ ہام کی حفاظت میں ہے۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوئیں گا، اب رُول کے مطابق ہوئیں گا۔"

انچارج پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد دو تین اور اہم افراد وہاں آن موجود ہوئے، یہ مقامی فوج کے افسران ہی لگتے تھے۔ میں نے خدا بخش کو بھی دیکھا۔ یہ وہی شخص تھا جو چند ماہ پہلے موہن کمار وغیرہ کے ساتھ ٹل پانی پہنچا تھا تاکہ مجھے اور سلطانہ کو چھوٹے سرکار کی پناہ سے نکال کر واپس زرگاں لا سکے۔ مجھے پہچاننے کے بعد ہر چہرے پر سنسنی کے آثار نظر آرہے تھے... مجھ سے بار بار پوچھا گیا کہ کیا میرے ساتھ کوئی اور بھی یہاں زرگاں پہنچا ہے؟ میں نے ہر بار اس سوال کا جواب نفی میں دیا۔ دراصل ان لوگوں کو انور خاں کے بارے میں شک تھا... سرجن اسٹیل نے مجھ سے کہا۔ "ہام کو معلوم ہوا تھا کہ وہ بھگوڑا انور خاں بھی یہاں آنا مانگتا۔ وہ بھی چیلنج قبول کرتا۔"

"وہ بھگوڑا نہیں سرجن... وہ باغی ہے اور ابھی اس جیسے اور کئی باغی تم لوگوں کو ناکوں چنے چبوائیں گے۔ اور جہاں تک اس کے آنے کی بات ہے تو اس کی جگہ میں آ گیا ہوں۔"

ہمارے درمیان کچھ دیر تک گفتگو جاری رہی۔ سرجن اسٹیل کی طرف سے خدا بخش کوئی پیغام لے کر جارج گورا کی طرف گیا۔ اس کی واپسی پندرہ بیس منٹ بعد ہوئی۔ جارج گورا اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس نے تھوڑی دیر تک سرجن اسٹیل اور فوجی افسران سے کھسر پھسر کی۔ اس کے بعد خدا بخش نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "سامبر سے پہلے کے دو چار دن تم کہاں رہنا چاہتے ہو؟"

"میں تمہارے اس راج بھون کے سوا کہیں بھی رہنے کو تیار ہوں۔" میں نے فوراً جواب دیا۔

"یہاں اور کون سی جگہ ہے؟"

میں نے چند سیکنڈ تک سوچنے کی اداکاری کی پھر کہا۔ "تم لوگ مجھے پگوڈا میں ٹھہرا سکتے ہو۔"

"پگوڈا میں کیوں؟" سرجن اسٹیل نے دریافت کیا۔

"وہاں میری پرانی ساتھی کورتی (میڈم صفورا) موجود ہے۔"

"تو تم کورتی کے پاس رہنا مانگتا۔" اسٹیل نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ میں نے بھی اسی طرح سر کو حرکت دی۔

"لیکن کورتی تو کہیں اور ہے۔" خدا بخش نے کہا۔

"وہ جہاں بھی ہے، میں اس کے ساتھ ٹھہر سکتا ہوں۔"

"اوکے۔ اس کا ارینجمنٹ ہو جائیں گا۔" اسٹیل بولا۔

گفتگو کے دوران میں وہ برابر مجھے تفتیشی نظروں سے گھور رہا تھا۔ کسی وقت اس کے تاثرات عجیب سے ہو جاتے تھے۔ یہی وہ شخص تھا جس نے میرے سر کے اندر منحوس چپ پلانٹ کی تھی۔ وہ چپ جو میرے جسم کا حصہ بن گئی تھی اور جسے اپنی مرضی سے جدا کرنے کا مطلب موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ غالباً اسٹیل کے ذہن میں کئی سوال کلبلا رہے تھے۔ ان میں سے ایک اہم سوال یہ رہا ہوگا کہ مجھے زرگاں سے باہر ہر طرف دور دور تلاش کیا جا رہا تھا۔ ممکن تھا کہ سگنل وصول کرنے والے کئی انٹینا یہاں وہاں چکرا رہے ہوں۔ میں اس ساری تلاش کو ناکام کر کے یہاں راج بھون کے عین سامنے آ نمودار ہوا تھا۔ یہ کیونکر ہو سکا تھا؟ کیا یہ ایک اتفاق تھا؟ یا پھر اس کی چپ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا؟ یا پھر کوئی اور مسئلہ ہو گیا تھا؟

میں سمجھ گیا کہ بہت جلد مجھے اس چپ کے حوالے سے بھی اسٹیل وغیرہ کو جواب دینا پڑے گا۔

کچھ دیر تک مجھ سے پوچھ تاچھ جاری رہی... پھر کڑے پہرے میں مجھے میڈم صفورا کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ میں گھوڑا گاڑی میں تھا۔ تین مسلح گارڈ میرے سامنے بیٹھے تھے۔ ایک گھوڑا گاڑی آگے اور ایک پیچھے تھی۔ ان میں بھی چوکس محافظ موجود تھے۔ ہر نگاہ میں میرے لیے تجسس، حیرت اور طنز کا ملا جلا تاثر تھا۔ جو کوئی دیکھ رہا تھا، مجھے تولنے والی نظروں سے ہی دیکھ رہا تھا۔ جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ میرے اندر کیا ہے جس کے بل بوتے میں جارج گورا جیسے شخص کو للکارنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اپنے انجام کی پروا کیے بغیر موت کے جبڑوں میں سر دے رہا ہوں۔ یہ گارڈز وغیرہ اپنے افسران کی وجہ سے چُپ تھے ورنہ ہو سکتا تھا کہ وہ مجھ پر حقارت اور طنز کے تیر چلانا شروع کر دیتے۔

پھر بھی ایک گارڈ سے برداشت نہیں ہو سکا، وہ ایک طرف تھوک کر بولا۔ "بھگوان کا شکر کرو، تمہیں بڑوں کی طرف

www.kahopakistan.com

سے رکھشا مل گئی ہے، نا ہیں تو اس گاڑی کے اندر تمہاری ایک بوٹی بھی نہ ملتی۔''

''تم بھی شکر کرو کہ میں یہاں کتوں بلوں سے نہیں، ان کے مالک سے لڑنے کے لیے آیا ہوں۔''

گارڈ نے مشتعل ہو کر میرا گریبان پکڑنا چاہا لیکن دوسرے نے اسے روک دیا۔ ''چھوڑو یار! یہ اپنی موت آپ مرنے والا ہے۔''

''اور یہ کوئی آسان موت نا ہیں ہووے گی، اس کے ساتھی کی طرح اس کی بھی ایک ایک ہڈی ٹوٹے گی پہلے۔ جتنا بڑا اپرادھ ہے، اس سے بڑی سزا ہووے گی۔''

''کس اپرادھ کی بات کرتے ہو تم؟ میں نے کسی کی ماں بہن کے ساتھ کیا کر دیا ہے؟''

''تم نے کیا ہے... اور یہ ساری دنیا جانت ہے۔ تم ان لوگن میں شامل ہو جنہوں نے سرجن صاحب کی دھرم پتنی کو اغوا کیا اور ان کی آبرو خراب کی۔'' گارڈ کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ''اور تم نے ان کو گولی مار کر زخمی بھی کیا۔'' وہ اپنا فقرہ مکمل کرتے ہوئے بولا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ ماریا کی بات کر رہا ہے۔ میں نے اطمینان سے کہا۔ ''مجھے تم جیسے کرائے کے ٹٹوؤں کے سامنے صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن پھر بھی سن لو کہ سرجن کی پتنی اور جارج کی بہن ماریا کو سلطانہ کے بدلے میں اٹھایا گیا تھا... اور وہ بدبخت اٹھائے جانے کے قابل تھی لیکن یہاں دوسری بات بھی یاد رکھو۔ اسے اٹھانے والے مسلمان تھے۔ انہوں نے تمہاری عورت کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو تم نے ان کی عورت کے ساتھ کیا۔''

گارڈ پھنکارا۔ ''کوئی ناری بھی کسی مرد پر ایسا جھوٹا الزام نا ہیں لگا سکتی... کیا تم انکار کرت ہو کہ شریمتی ماریا کی عزت خراب ہوئی؟''

''نہیں، میں انکار نہیں کرتا۔ شریمتی جی کی عزت خراب ہوئی لیکن کسی نے نہیں، اس نے خود کی۔ اس نے اندھیری رات میں ایک پاری کو اپنا جسم رشوت کے طور پر پیش کیا اور اس کی مدد سے بھاگ نکلی...''

''یہ بکواس ہے۔'' گارڈ گرجا۔ ''اس طرح کی باتیں تم مسلوں نے ہی پھیلائی ہیں۔ اپنے گندے اپرادھ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے تم لوگن نے۔ ناری کی عزت...''

''کون ناری؟ کیسی عزت؟'' میں نے بھڑک کر اس کی بات کاٹی۔ ''یہ گوری چمڑی والے جنہیں تم نے اپنا آقا بنایا ہوا ہے، عزت آبرو، پوترا اور شرم حیا جیسے لفظوں کا مطلب ہی نہیں جانتے۔ ان کے دیس میں جا کر دیکھو، یہ ماریا جیسی میمیں ایک برگر اور ایک کوک کے لیے کسی کے ساتھ بھی جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں... اور یہاں برگر کوک کا نہیں، جان کا معاملہ تھا۔''

گارڈ نے دانت پیسے۔ ''بھگوان کی سوگند... اگر مجھے بڑوں کا ڈر نہ ہوتا تو میں اسی جگہ تمہاری کھوپڑیا میں سوراخ کر دیتا۔''

''اچھا، تم دونوں چپ ہو جاؤ۔'' دوسرے گارڈ نے ذرا تحکم سے کہا۔ وہ قدرے سینئر دکھائی دیتا تھا۔

اسی دوران میں اس قافلے کی گاڑیاں لال بھون کے سامنے پہنچ گئیں۔ کئی دیگر اہم عمارتوں کی طرح یہ عمارت بھی جنریٹر کی برقی رو سے روشن تھی۔ گاڑیاں مین دروازے کے سامنے رک گئیں اور وردی میں ملبوس دو افسر نما افراد لال بھون کے اندر چلے گئے۔ یقینی بات تھی کہ وہ میڈم صفورا کو ساری صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے گئے تھے۔ مجھے میڈم کی فہم و فراست اور معاملہ فہمی پر اعتماد تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی گفتگو سے ان افسران کو کسی طرح کا شک نہیں ہونے دے گی۔ میں ابھی صرف چند گھنٹے پہلے یہاں سے گیا اور اب ایک نئی حیثیت سے واپس آیا تھا۔

دونوں افسران پندرہ بیس منٹ بعد واپس آئے اور مجھے نیم گرم گھوڑا گاڑی سے اتار کر لال بھون کے اندر لے گئے۔ گیٹ پر موجود گارڈز اور دیگر ملازمین نے اس سے پہلے میری صورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ میں میڈم صفورا کا وہی مہمان ہوں جو چند روز پہلے یہاں پہنچا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اب ان لوگوں میں سے کچھ نے مجھے سلطانہ کے شوہر کی حیثیت سے پہچان لیا ہو، بہرحال وہ سب خاموش تھے۔

لال بھون کی عالی شان راہداریوں سے گزر کر میں جلد ہی میڈم صفورا کے سامنے تھا۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں تھی۔ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ نیند سے جاگی ہے۔ میری توقع کے عین مطابق میڈم صفورا مجھ سے اسی انداز میں ملی جس میں اسے ملنا چاہیے تھا۔ اس نے قدرے حیرت ظاہر کی کہ میں اس وقت اس حال میں یہاں زرگاں میں موجود ہوں۔ اس نے اپنی اس حیرت میں ہلکی سی ''ناگواری'' بھی شامل کر لی تھی۔

ہمارے درمیان تھوڑی سی گفتگو ہوئی پھر فوجی افسر نے میڈم صفورا کو بتایا۔ ''جو کچھ بھی ہے میڈم، یہ شخص فی الحال سر جارج کے مہمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرجن صاحب کا حکم ہے کہ اسے یہاں لال بھون میں رہنے کی آگیا دی جاوے اور ہر طرح کی سہولت بھی مہیا کی جاوے۔ اس کے بارے میں مزید احکامات سر جارج بعد میں دیویں گے۔''

میڈم نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، اگر یہ سر کا آرڈر ہے تو یہ یہاں رہ سکتا ہے۔ لیکن اس کی حفاظت...''

''اس کے لیے آپ کوئی چنتا نہ کریں۔ ٹھیک اسی وقت سے یہ عمارت ہمارے ''سیکیورٹی گھیرے'' میں رہے گی۔ عمارت کے اندر بھی سر جارج کی اسپیشل فورس کے لوگن موجود رہیں گے۔''

میڈم صفورا کو علیحدگی میں کچھ ہدایات دینے کے بعد فوجی افسران واپس چلے گئے... جونہی تنہائی میسر آئی، ایک دروازے کے عقب سے عمران بھی نمودار ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ''اوئے گھامڑ، یہ کیا گڑبڑ گوٹالا کیا ہے تو نے؟'' اس نے مجھے گدی سے دبوچ لیا اور زور سے آگے پیچھے ہلایا۔

''سب کچھ بتاتا ہوں۔ بتانے کے لیے ہی تو یہاں آیا ہوں۔'' میں نے اس سے اپنی گردن چھڑاتے ہوئے کہا۔

''غضب خدا کا! اتنا بڑا دھوکا۔ نہ کوئی صلاح نہ مشورہ۔ مجھے سوتا چھوڑ کر نکل گئے اور جا پہنچے راج بھون کے سامنے... یار! اچی بات ہے، مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا۔ تم اتنے بے وفا اور کمینے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے تم نے مجھ سے یا میڈم سے بات تک نہیں کی۔ نہیں نہیں... ضرور میں جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا ہوں۔ ابھی یہ سارا طلسم ٹوٹ جائے گا...'' وہ اداکاری کر رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ واقعی بہت حیران بھی تھا۔

''تم نے جو کچھ سنا ہے، وہ سچ ہے ڈیئر۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یعنی تم جارج گورا کا چیلنج قبول کر آئے ہو... اور اسے للکار آئے ہو کہ اس سے دوبدو لڑائی کرو گے؟''

''ایسا ہی ہے۔''

وہ میڈم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میڈم! اس نے ضرور کوئی زہریلی چیز کھالی ہے۔ یہ زہر اس کے دماغ کو چڑھ گیا ہے یا پھر اس نے نشہ کیا ہے۔ اس کا ڈوپ ٹیسٹ کراؤ میڈم... یہاں ڈوپ ٹیسٹ ہو سکتا ہے نا... چل بھئی چل... اٹھ...''

اسی دوران میں کمرے کے بند دروازے پر دستک ہوئی۔ گیتا نے میڈم کو پکارا۔ غالباً کوئی ایمرجنسی کام تھا۔ میڈم ''ابھی آئی'' کہہ کر باہر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی عمران ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں سے گہری فکرمندی جھانکنے لگی ہے۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تابی! یہ کوئی اچھا کام نہیں کیا تو نے... کم از کم مشورہ ہی کر لیتا۔ اس کا مطلب ہے کہ تو مجھے اپنا نہیں سمجھتا۔''

''اپنا سمجھتا ہوں لیکن مشورہ نہیں کر سکتا تھا۔ مشورہ کرتا تو تم مجھے کبھی نہ جانے دیتے۔ اس کام میں سے سیکڑوں خطرے نکال کر مجھے بتا دیتے اور بعد میں ہو سکتا تھا کہ یہ سارے خود مول لے لیتے۔''

''تو کیا ساری مصیبتوں، پریشانیوں اور سارے خطروں کا ٹھیکا تو نے لے لیا ہے؟''

''یہ ساری مصیبتیں اور پریشانیاں پیدا بھی تو میری ہی کی ہوئی ہیں۔ تمہارا جارج اور حکم وغیرہ سے کیا واسطہ ہے۔ یہ ساری دشمنیاں میری ہی پالی ہوئی ہیں۔ تم مانو یا نہ مانو لیکن میں نے آج تک تم سے لیا ہی لیا ہے۔ ہر قدم پر تمہارا سہارا لیتا رہا ہوں اور تم کسی بھی چیز کی پروا کیے بغیر یہ سہارا مجھے دیتے رہے ہو۔ لیکن اب نہیں... اب پلیز مجھے اپنے طور پر کچھ کرنے دو۔ مجھے میرے ہونے کا احساس ہونے دو...''

''لیکن تابی...''

''نہیں عمران! اب اس بارے میں کچھ نہ بولو۔ ویسے بھی جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ اب اگر کر سکتے ہو تو ایک کام کرو... کسی بھی ذریعے سے انور خاں تک اطلاع پہنچا دو۔''

''کیسی اطلاع؟''

''یہی کہ اب وہ زرگاں نہ آئے۔ وہ جس کام کا ارادہ رکھتا تھا، وہ اب میں نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ اب اسے جان مصیبت میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

عمران ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اسی دوران میں میڈم بھی واپس آ گئی۔ اس کے چہرے پر بھی تشویش اور برہمی تھی۔ وہ بولی۔ ''تابش! یہ بہت جذباتی فیصلہ کیا ہے تم نے۔ یہ قدم اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟ تم نے آناً فاناً خود کو ایک بہت بڑی مصیبت میں ڈال لیا ہے۔''

''مصیبت میں تو ہم سب ہیں ہی۔''

''لیکن تمہیں کیا ضرورت تھی جارج کے ''مرضی کے محاذ'' پر لڑنے کی؟ تم اس کام کے لیے کوئی اور راستہ بھی ڈھونڈ سکتے تھے۔ ہم تینوں مل کر سوچتے تو کوئی حل نکل آتا۔''

''اب تو جو ہونا تھا ہو چکا میڈم۔'' میں نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

وہ بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ ''بے وقوفی ہوئی ہے تم سے۔ کم از کم مشورہ ہی کر لیتے تم... جارج نے ایک

www.kahopakistan.com

پھندا لگایا ہوا ہے اور تم نے اس کے پھندے میں آنے کے لیے شان دار پھرتی دکھائی ہے۔ اب واپسی کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے تمہارے پاس۔''

''میں واپس آنا چاہتا بھی نہیں ہوں میڈم... اور آپ اتنا زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں نے اب زمانے کا بہت گرم سرد دیکھ لیا ہے۔ مرنے مارنے کی ہمت آچکی ہے مجھ میں۔ میں جارج گورا کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہوں گا۔ آپ یقین رکھیں، اس شخص کو اس کی توقع سے کہیں زیادہ مزاحمت ملنے والی ہے۔'' میں نے پُر یقین لہجے میں کہا۔

میرے لہجے کی حرارت اور توانائی کو محسوس کر کے میڈم کے چہرے کے تناؤ میں ایک بے ساختہ کمی واقع ہوئی۔ وہ ایک نشست پر بیٹھ گئی اور مجھے تولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ پچھلے چند ماہ میں تم بہت زیادہ بدلے ہو۔ تمہارے بارے میں اڑتی اڑتی خبریں بھی ہم تک پہنچتی رہی ہیں۔ ان میں رنجیت پانڈے والی خبر بھی شامل تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تم نے تن تنہا پانڈے سے مار اماری کی تھی اور وہ اس مار اماری میں زخمی بھی ہوا تھا... واٹ سوایور... میں سمجھتی ہوں کہ یہ جارج بالکل اور طرح کا بندہ ہے۔ میں یہ کہوں تو شاید غلط نہ ہو کہ اس کا ٹمپرامنٹ ایک پروفیشنل فائٹر جیسا ہو چکا ہے۔ پچھلے تین چار سالوں میں اس نے اس طرح کی لڑائیوں کا خاطر خواہ تجربہ حاصل کیا ہے اور اس بات کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ وہ ہر طرح کی فائٹنگ میں ایک نہایت طاق اور سخت جان حریف ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ وہ یہاں اسٹیٹ میں آباد ہونے سے پہلے انگلینڈ میں کیا کرتا تھا؟''

''جی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''برمنگھم میں مارشل آرٹس کا ایک بہت بڑا کلب ہے۔ یہ کلب 1925ء میں جارج کے دادا نے شروع کیا تھا۔ دادا کے بعد جارج کا باپ اور پھر خود جارج اس کلب کا کرتا دھرتا رہا۔ فائٹنگ آرٹ میں اس شخص کی دلچسپی خاندانی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مجرمانہ ذہن کا مالک بھی ہے۔ اس لحاظ سے ہم اسے دودھاری تلوار کہہ سکتے ہیں۔ اس تلوار کو زہر کی پان لگانے کے لیے حکم جی کی دوستی اور مکمل پشت پناہی بھی موجود ہے۔ ہم اس برصغیر کے لوگ فطری طور پر محکوم طبیعت کے مالک ہیں۔ جو چیز باہر سے اور خاص طور سے مغرب سے آتی ہے، وہ ہمیں بہت جلد متاثر کرتی ہے اور اگر اس چیز میں واقعی کوئی بات بھی ہو تو پھر تو سونے پر سہاگا ہے۔ جارج باہر سے آیا ہے اور اس میں ٹیلنٹ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقامی لوگ پوجنے کی حد تک اس سے متاثر ہیں لیکن تو ہم پرست تو اسے شکتی کا دیوتا تک کہہ ڈالتے ہیں۔ حکم جی کی طرف سے اس کو ... کا خطاب ملا ہوا ہے۔''

''اور دوسری طرف ان سرجی نے راجواڑے کو ... شکارگاہ بنایا ہوا ہے۔'' عمران نے کہا۔

''ایسا ہی ہوتا ہے۔ طاقت اپنے قانون خود بنا... ہے۔ جس کے پاس اختیار ہوتا ہے اس کے لیے ... آسانیاں مہیا ہو جاتی ہیں اور اگر اختیار گورے کے پاس ... پھر کیا ہی بات ہے۔ گورا ہم جیسے لوگوں پر اپنا اختیار استع... کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ یہ لوگ یونہی تو دو سو سال یہ... حکومت نہیں کر گئے۔''

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''میڈم! میں ... جلد بازی پر شرمندہ ہوں لیکن ایک بار پھر کہوں گا کہ جو ہونا ... وہ ہو چکا۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ میرے دو کا... دیں۔''

''کیسے کام؟''

''زیادہ مشکل کام نہیں۔ آپ بہ آسانی کر سکتی ... میڈم۔''

''کچھ کہو گے تو پتا چلے گا۔''

''کسی طرح نل پانی میں انور خاں تک یہ پیغام ... دیں کہ وہ یہاں آنے کا پروگرام فوراً ختم کر دے کیونکہ میں ... جارج کا چیلنج قبول کر لیا ہے۔''

میڈم صفورا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھ... ہے... اور دوسرا کام۔''

''مجھے اس عمارت میں ایک علیحدہ پورشن دیں جہ... میں دو چار دن میں اپنی فٹنس کو بہتر کر سکوں۔''

''علیحدہ پورشن کی کیا ضرورت ہے، یہاں ایک چھو... ''جم'' موجود ہے۔ تم چاہو تو صبح گیارہ بارہ بجے تک ا... آزادی سے استعمال کر سکتے ہو لیکن یہ سب تو بعد کی با... ہیں۔ پہلے یہ تو پتا چلے کہ سامبر چنا والے کیا کہتے ہیں۔''

''سامبر چنا والے... کون؟'' میں نے پوچھا۔

''پنڈت مہاراج اور ان کے چیلے۔ اس سامبر کی... میں دو حریفوں کے آمنے سامنے آنے کا حتمی فیصلہ یہ لوگ کرتے ہیں۔ با قاعدہ کنڈلیاں وغیرہ نکالی جاتی ہیں ... مناسب وقت بھی طے کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ فیصلہ ... ہوتا ہے کہ دونوں حریف کس طریقے سے ایک دوسرے ... سامنا کریں گے۔ یعنی لڑائی خالی ہاتھ ہو گی یا کوئی ہتھ... استعمال کیا جائے گا... اور اگر ہتھیار استعمال کیا جائے گا تو ... سا ہوگا اور اس ہتھیار سے بچاؤ کے لیے کیا انتظام ہوگا۔ ام... طور پر سامبر کی لڑائی صرف حریف کو زیر کرنے کے لیے ہوتی ہے لیکن کچھ موقعوں پر ایسا بھی ہوا ہے کہ لوگ شدید زخمی ہوئے ہیں یا پھر ان کی جان ہی چلی گئی ہے۔''

ہم تینوں کے درمیان رات آخری پہر تک گفتگو جاری رہی۔ اس گفتگو کے آخر میں میڈم نے وعدہ کیا کہ وہ صبح سب سے پہلا کام یہی کرے گی کہ کسی طرح انور خاں تک میرا پیغام پہنچائے گی۔ اس لال بھون میں ایک بندہ ایسا تھا جس پر میڈم اندھا اعتماد کر سکتی تھی۔ اس کی حیثیت یہاں میڈم کے خاص الخاص کارندے جیسے ہو گئی تھی۔

میڈم کے جانے کے بعد میں اور عمران سو گئے۔ بارونڈا جیکی نے میری تربیت کے دوران میں جو ہدایات مجھے دی تھیں، ان میں یہ بھی شامل تھی کہ میں نرم بستر پر سونے سے گریز کروں اور کئی دوسری ہدایتوں کی طرح میں اس ہدایت پر بھی عمل کرتا تھا بلکہ مجھے ایسا کرنا اچھا لگتا تھا۔ یہاں بھی میں قالین پر چادر بچھا کر سوتا تھا۔ عمران نے کئی بار چاہا کہ میں اس کی طرح بستر استعمال کروں لیکن میں ٹال گیا... ہم دوپہر سے کچھ ہی دیر پہلے بیدار ہوئے۔ کئی دن کے ابر آلود موسم کے بعد یہ ایک چمکیلا دن تھا۔ بھون کے وسیع سبزہ زار میں نرم دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہمیں میڈم نے ہی بیدار کیا تھا۔ وہ خاصی جلدی میں نظر آتی تھی۔ اس نے اطلاع دی۔ ''جارج صاحب آرہے ہیں۔ تم منہ ہاتھ دھو کر جلدی سے تیار ہو جاؤ... اور تم بھی کسی کمرے میں چلے جاؤ۔ جب تک جارج صاحب یہاں ہیں، باہر نہیں آنا۔'' میڈم نے آخری الفاظ عمران سے مخاطب ہو کر کہے۔

عمران سے بات کرتے ہوئے وہ اس سے نگاہ نہیں ملاتی تھی۔ بظاہر تو یہی لگتا تھا کہ زہریلے سانپ والے ڈرامائی واقعے کے بعد وہ عمران کو معاف کر چکی ہے یا کم از کم اتنا تو ہو چکا ہے کہ وہ اسے برداشت کر رہی ہے۔ لیکن اس کی دلی کیفیت کے بارے میں ابھی حتمی رائے قائم کرنا مشکل تھا۔

''آپ کا کیا اندازہ ہے، جارج کے آنے کا مقصد کیا ہوگا؟'' عمران نے پوچھا۔

''میرے خیال میں اس کے ساتھ پنڈت مہاراج ہوں گے جو کنڈلی وغیرہ نکالیں گے... اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ سامبر کے بارے میں ڈسکشن ہو۔'' میڈم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے جلدی سے منہ ہاتھ دھویا اور میڈم کا فراہم کردہ لباس پہنا۔ یہ پینٹ شرٹ اور سوئیٹر پر مشتمل تھا۔ شیو کئی دن سے بڑھی ہوئی تھی۔ مجھے شیو کا سامان بھی مہیا کر دیا گیا۔

آدھ پون گھنٹے میں، میں بالکل فریش ہو گیا اور حقیقتاً میں اندر سے بھی بہت فریش تھا۔ راج بھون کے سامنے جا کر جارج گورا کو للکارنے کے بعد میرے اندر کا غبار نکل گیا تھا۔ میرے رگ وپے میں دوڑنے والی بے پناہ بے قراری ایک طرح کے ٹھہراؤ میں بدل گئی تھی۔ اب مجھے یہ سوچ کر لطف محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنے بدترین دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کروں گا اور اس کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں آؤں گا۔

جارج گورا کی آمد کی وجہ سے لال بھون میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ ملازمین بھاگے پھر رہے تھے۔ گارڈز بھی چوکس اور ہوشیار نظر آتے تھے۔ قریباً ایک بجے کے قریب جارج گورا اپنے دو درجن اسپیشل گارڈز کے ساتھ لال بھون کی چار دیواری میں داخل ہوا۔ اس کے یہ اسپیشل گارڈز پگڑیوں کے بغیر تھے۔ ان میں مجھے چند سفید فام افراد بھی نظر آئے اور یقیناً یہی لوگ سیکیورٹی کے انچارج بھی تھے۔ ان میں سے کچھ افراد نے پہلے سے موجود گارڈز کے ساتھ بیرونی حصے میں پوزیشن سنبھال لی۔ باقی جارج گورا کے ساتھ عمارت کے اندر چلے آئے۔ گارڈز کے وزنی بوٹوں سے برآمدوں کے فرش لرز اٹھے۔ ایک دہشت کی سی فضا پیدا ہو گئی۔ اسپیشل فورس کے دو گارڈز، جارج سے پہلے ہی اندر آگئے۔ انہوں نے مجھے سرتاپا دیکھا۔ یہ دونوں سفید فام تھے۔ مجھے 'گڈ نون' کہنے کے بعد انہوں نے اچھی طرح میری تلاشی لی اور پھر مجھے ایک ساتھ والے چھوٹے کمرے میں لے گئے۔ یہاں بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دو تین منٹ بعد جارج گورا اپنے تین مسلح گارڈز کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ میڈم صفورا اور منیجر مدن وغیرہ بھی اس کے عقب میں موجود تھے۔

جارج کو میں نے چند دن پہلے راج بھون کی شاہی بالکونی میں دیکھا تھا لیکن اس وقت ہمارے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد آج میں اسے اپنے روبرو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں نہایت خطرناک چمک تھی۔ یہ آنکھیں کسی انسان سے زیادہ درندے کی آنکھیں لگتی تھیں۔ غیر متوقع طور پر اس نے مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔ ''زرگاں میں خوش آمدید۔''

اس نے اپنے ہاتھ کی مضبوط گرفت میرے ہاتھ پر قائم کر رکھی تھی۔ شاید اس طرح وہ میری جسمانی طاقت اور اعصابی مضبوطی کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

وہ مجھ سے فقط دو فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ اس نے

www.kahopakistan.com

اختیار اور جسمانی طاقت کے نشے میں سلطانہ کو روندا تھا۔ جی چاہا کہ ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر اس پر جا پڑوں اور تب تک خود کو اس سے جدا نہ کروں جب تک وہ ختم نہیں ہو جاتا لیکن عملی طور پر ایسا ممکن نہیں تھا۔ تین گارڈز موجود تھے، وہ مجھے چھلنی کر کے رکھ دیتے۔ مجھے ابھی صبر کرنا تھا۔

جارج نے کہا۔ ''ہام کا خیال ہے کہ تم انگلش سمجھ سکتا۔''

''ہاں، میں سمجھ سکتا ہوں۔'' میں نے انگریزی میں جواب دیا۔

''اوکے... ویسے تو تم سے پوچھنے کی بہت سی باتیں ہیں لیکن فی الوقت ہم صرف اس اعلان کے حوالے سے بات کریں گے جو تم نے کل راج بھون کے سامنے کیا ہے۔'' جارج کا لہجہ خشک تھا۔

''میں بھی صرف اسی حوالے سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے شستہ انگریزی میں جواب دیا۔

''تمہیں شرائط کا پتا ہے؟''

''مجھے تمہاری ہر شرط بغیر سنے منظور ہے۔ میں صرف تم سے لڑنا اور تمہیں ہرانا چاہتا ہوں۔''

''بہت خوب... بہت خوب۔'' میرے لہجے کی آگ کو محسوس کر کے اس نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ ''یسوع بُری نظر سے بچائے، مورال بہت اونچا ہے تمہارا۔''

''شکریہ۔''

''پھر بھی میں تمہیں شرائط بتا دینا چاہتا ہوں۔ تم ایک مفرور مجرم ہو۔ تم پر جو سنگین الزامات ہیں، ان کی کم سے کم سزا موت ہے۔ لیکن تم نے دلیری کا مظاہرہ کیا ہے۔ چوہے کی طرح پکڑے جانے کے بجائے خود یہاں پہنچ گئے ہو۔ اب تم پر ریاست کا قانون نہیں بلکہ کھیل کے اصول لاگو ہوں گے۔ تم میرے ساتھ ون ٹو ون زور آزمائی کرو گے۔ اگر تم جیت گئے تو تمہارے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ تم یہاں سے جا سکو گے بلکہ اپنے دوست کی بھاوج کو بھی لے جا سکو گے... لیکن اگر تم ون ٹو ون باؤٹ میں ہار گئے تو پھر تمہارا انجام وہی ہوگا جو تمہارے دوست اسحاق کا ہوا۔ تمہیں بغیر کسی ٹرائل کے سزائے موت دی جائے گی۔ راج بھون کے سامنے سولی چڑھا دیا جائے گا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' میں نے بلاتوقف کہا۔

''اوکے... لیکن اس سے پہلے پنڈت مہاراج کو تمہاری کنڈلی وغیرہ نکالنی ہوگی اور مقامی رواج کے مطابق شبھ گھڑی کا چناؤ کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہم یہ طے کریں گے کہ ہماری لڑائی کس طرح کی ہوگی اور اس کے رولز اور ریگولیشن کیا ہوں گے۔''

''اس حوالے سے میں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں لیکن چلو... پہلے تم کنڈلیاں وغیرہ نکلوا لو۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں کنڈلیاں وغیرہ نکلوا لیتا ہوں لیکن اس سے پہلے مجھے بھی کچھ کرنا ہے۔ یہ کنڈلیوں والا کام آج ہو کل ہو سکے گا۔ آج میں کسی اور چیز کی تصدیق کے لیے یہاں آیا ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

جارج نے ایک گارڈ کو اشارہ کیا، وہ باہر چلا گیا۔ جارج نے میڈم منصورا اور مدن وغیرہ کو بھی باہر بھیج دیا۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے حکم دیا۔ میں قالین پر بیٹھ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔

وہ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہیں بھی اس پر تھیں۔ اس کی عمر پینتیس چالیس کے قریب تھی تاہم وہ اپنی عمر سے کم نظر آتا تھا۔ وہ ایک نہایت مضبوط اور ورزشی جسم کا مالک تھا۔ خاص طور سے اس کی گردن اور شانے غیر معمولی طور مضبوط نظر آتے تھے۔ قد کاٹھ کے لحاظ سے وہ مجھ سے کہیں بہتر تھا اور جسم کے پھیلاؤ میں تو کافی فرق تھا۔ اس نے مجھے دیوار کے ساتھ بٹھا دیا تھا اور اب پتا نہیں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اسی دوران میں باہر جانے والا گارڈ دوبارہ واپس آیا۔ اب اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر نما شخص بھی تھا۔ اس کے ہاتھوں پر سفید دستانے تھے۔ اس نے ایک سرنج پکڑی ہوئی تھی۔ غالباً وہ مجھے کچھ انجیکٹ کرنا چاہ رہا تھا۔

''گھبرانے کی بات نہیں۔'' جارج نے کہا۔ ''تمہاری صحت اور سلامتی کا سب سے بڑا ضامن اب میں خود ہوں۔ میرا تم سے وعدہ ہے، سامبر کے دن تک تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔''

''یہ انجکشن کس لیے ہے؟''

''سمجھو، تمہاری جسمانی صحت کو چیک کرنے کے لیے ہے۔ اس میں تمہاری ہی بہتری ہے۔''

ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ آخر وہ چپ والا معاملہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ان لوگوں کے انٹینا میری پوزیشن کو لوکیٹ نہیں کر رہے تھے اور وہ جاننا چاہ رہے تھے کہ ایسا کیوں ہے۔ غالباً مجھے کوئی نشہ آور دوا دی جا رہی تھی۔ کمرے میں جارج کے علاوہ صرف تین افراد تھے اور یقیناً یہ جارج کے اعتماد کے لوگ تھے...

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''جارج! میں سمجھ گیا ہوں تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ اگر تم اپنا وقت بچانا چاہتے ہو تو میں براہِ راست تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔''

''تم کیا بات کر رہے ہو؟'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں چپ کی بات کر رہا ہوں۔''

میرے الفاظ نے جارج جیسے مضبوط شخص کو ہلا دیا۔ اس کے تینوں ساتھی بھی بُری طرح چونک گئے۔ جارج نے ایک گہری سانس لے کر خود کو سنبھالا اور بولا۔ ''کیا تم اپنی بات کی وضاحت کرنا پسند کرو گے...؟''

''بالکل پسند کروں گا۔ میں اس چپ کی بات کر رہا ہوں جسے یہاں لوح یا تختی کہا جاتا ہے۔ یہ تختی میرے اندر بھی موجود تھی۔ شاید مجھے اس کا پتا کبھی نہ چلتا... یا اگر چلتا بھی تو میں اس کی حقیقت کبھی معلوم نہ کر پاتا۔ لیکن پھر کچھ ایسا ہوا کہ صورتِ حال ایک دم بدل گئی۔''

میں نے ذرا توقف کیا اور اپنی گردن کے عقب میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم لوگ دیکھنا چاہتے ہو تو دیکھ لو کہ یہاں کیا ہوا ہے۔''

ڈاکٹر اور جارج ایک ساتھ آگے بڑھے۔ ڈاکٹر نے میری گدی کا معائنہ کیا۔ یہاں آپریشن کا نشان تھا اور ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ ''یہ کیا ہے؟'' سفید فام ڈاکٹر نے پوچھا۔

''مجھے یہاں چوٹ لگی تھی اور زخم ہو گیا تھا۔ پھر زخم میں انفیکشن ہو گیا۔ میرا پورا جسم درد کے شدید شکنجے میں جکڑ گیا اور کسی وقت یوں لگنے لگا کہ مجھے اوپر کے دھڑ کا فالج ہو رہا ہے۔ طبیعت بہت بگڑ گئی تو پتا چلا کہ یہ سب اس ''چپ'' کی وجہ سے ہے۔ میرے ساتھی ڈاکٹر چوہان نے جیسے تیسے اس چپ کو نکال دیا...''

جارج اور ڈاکٹر حیرانی سے سن رہے تھے۔

میری بتائی ہوئی تفصیل جارج وغیرہ کے لیے حیران کن تھی اور یقیناً اس سے زیادہ یہ بات حیران کن تھی کہ میں نے چپ اپنے جسم سے علیحدہ کرائی اور اس کے باوجود جان لیوا صورتِ حال سے بچا رہا۔

ڈاکٹر کے علاوہ جارج نے بھی میری جلد کو دبا دبا کر اس بات کی تصدیق کی کہ چپ میرے جسم میں موجود نہیں ہے۔

آخر جارج ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''لگتا ہے کہ تم کچھ چھپا رہے ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''کیا واقعی اس بھگوڑے ڈاکٹر چوہان نے یہ کام کیا ہے؟''

''میں وہی بتا رہا ہوں جو میرے ساتھ ہوا ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

جارج اور سفید فام ڈاکٹر کچھ دیر تک الجھی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر جارج نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگائی اور بولا۔ ''اگر واقعی سب کچھ ویسا ہی ہوا ہے جیسا تم بتا رہے ہو تو پھر تم ایک خوش قسمت شخص ہو۔ جب ڈاکٹر چوہان سے ملاقات ہو گی تو میں اسے اس آپریشن پر ''شاباش'' ضرور دوں گا۔'' اس نے شاباش کا لفظ معنی خیز انداز میں کہا تھا اور اس لفظ میں ایک سفاک دھمکی کی ساری سنگینی بھر دی تھی۔

سفید فام ڈاکٹر نے امریکن لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''اب وہ چپ کہاں ہے؟''

''مجھے اس بارے میں ٹھیک سے معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے ڈاکٹر چوہان نے کہیں پھینک دیا تھا۔''

''پھینک دیا تھا تو بھی اس کے سگنل تو ملنے چاہئیں۔'' جارج نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

''اتنی عقل تو ڈاکٹر چوہان میں بھی تھی۔ اس نے چپ نکالتے ہی اسے ضائع کر دیا تھا۔ ضائع کرنے کے بعد ہی اس نے اسے کہیں پھینکا ہوگا۔''

''تم اتنی بے یقینی سے بات کیوں کر رہے ہو؟ کیا چوہان نے تمہیں اس بارے میں اصل صورتِ حال نہیں بتائی؟''

''یہ ایک اتفاق ہے کہ آپریشن کے بعد چوہان سے میری تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی۔'' میں نے پہلے سے سوچا ہوا جواب دیا۔

کچھ دیر تک اس بارے میں بات چیت جاری رہی۔ تب جارج یہ کہہ کر رخصت ہو گیا کہ وہ کل پھر آئے گا... اور اس سے پہلے پنڈت مہاراج یہاں پہنچیں گے اور کنڈلی وغیرہ نکالیں گے۔ چپ کے حوالے سے جارج کی الجھنیں ابھی پوری طرح دور نہیں ہوئی تھیں۔

جب جارج اپنے مسلح گارڈز کے ہمراہ کمرے سے نکل رہا تھا، ایک بار پھر میرا جی چاہا کہ ہر اندیشے کو ایک طرف رکھ کر اس پر جھپٹ پڑوں۔ اس کو سانس لینے کے لیے... اور مسکرانے کے لیے اور زمین پر دندنانے کے لیے چند منٹ بھی زندہ نہ چھوڑوں... مار دوں یا مر جاؤں۔ اس عیاش، عورت باز کو دیکھ کر میرے اندر ایک ایسی ناقابلِ برداشت نفرت جاگتی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا شاید میرے لیے ممکن نہ ہو۔

لال بھون سے نکلتے ہوئے جارج اور اس کے ساتھی دو چار منٹ کے لیے اس بڑے ہال کمرے میں ٹھہرے جہاں

www.kahopakistan.com

لڑکیاں کتھک ناچ کی تربیت حاصل کر رہی تھیں۔ جارج کے پہنچتے ہی موسیقی رک گئی اور لڑکیاں ایک قطار میں کھڑی ہو گئیں۔ میڈم صفورا مؤدب انداز میں گرانڈیل جارج کے پہلو میں موجود تھی۔ وہ لڑکیوں کی صحت اور تعلیم و تربیت کے بارے میں جارج کو معلومات فراہم کر رہی تھی۔ وہ کافی فاصلے پر تھے، ان کی باتیں میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد جارج، مسلح گارڈز کے جلو میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

تنہائی میسر آتے ہی عمران اور میڈم صفورا پھر میرے پاس موجود تھے۔ میڈم صفورا کے چہرے پر بہت تجسس نظر آ رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اسے کمرے سے نکالنے کے بعد جارج گورا نے مجھ سے کیا بات چیت کی ہے اور جارج کے ساتھ ڈاکٹر کی آمد کا مقصد کیا تھا۔

میں نے میڈم اور عمران کو وہ ساری گفتگو بتائی جو چپ کے حوالے سے میرے اور جارج کے درمیان ہوئی تھی۔ یہ واقعی اہم گفتگو تھی۔ میں نے جارج کو بتایا تھا کہ چوہان نے چپ میرے جسم سے علیحدہ کرنے کے بعد توڑ پھوڑ کر ضائع کر دی تھی لیکن وہ چپ صحیح سالم حالت میں اب بھی مندر کے زیریں تہ خانے میں موجود تھی۔ عمران کا خیال تھا کہ ہم اس چپ کو کسی موقع پر اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں۔

...اگلے روز علی الصباح ہی پنڈت مہاراج اپنے پورے پروٹوکول کے ساتھ لال بھون میں آ دھمکا۔ یہ ایک پچاس پچپن سالہ شخص تھا۔ اس کے گلے میں بہت سی مالائیں تھیں۔ وہ سفید دھوتی قمیص میں تھا۔ ایک نہایت اعلیٰ درجے کی کشمیری شال اس کے کندھوں پر تھی۔ اس کی وضع قطع دیکھ کر سورگ باشی گرو سو بھاش کی یاد آتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ پنڈت مہاراج کے بال بہت لمبے تھے اور اس کی شخصیت مجموعی طور پر بہت بارعب نظر آ رہی تھی۔

پنڈت نے مجھے سرتاپا گھورا اور منہ میں کچھ اشلوک وغیرہ پڑھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت آمیز شناسائی کی جھلک صاف محسوس کی۔ اس نے اپنے بھرائے ہوئے لہجے میں مجھ سے چند سوال کیے۔ میرے اندازے کے مطابق ان سوالوں کا مقصد صرف یہ جاننا تھا کہ میں ماضی میں واقعی یادداشت کے مسئلے کا شکار رہا ہوں یا پھر یہ کوئی ڈراما قسم کی چیز تھی۔

معلوم نہیں کہ وہ میرے جوابات سے کس حد تک مطمئن ہوا، بہرحال اس نے اپنا اصل کام شروع کرتے ہوئے مجھ سے چند سوالات کیے۔ میری تاریخ پیدائش، مقام اور والدین کے نام دریافت کیے۔ اس کے بعد وہ اپنے ایک چیلے کے ساتھ لمبے چوڑے حساب کتاب میں مصروف ہو گیا۔ چیلے کے پاس کچھ پرانے کاغذات اور پوتھیاں وغیرہ بھی تھیں۔ جانے ان پوتھیوں کی ورق گردانی سے کیا کیا ڈھونڈتا رہا، پنڈت مہاراج کو بتاتا رہا، جسے پنڈت صاحب تحریر فرماتے رہے۔ آخر وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔

اس کے کوئی پندرہ بیس منٹ بعد بھون میں کل سنسنی آمیز ہلچل محسوس ہوئی۔ گارڈز کی بھاگ دوڑ دکھائی دی، ملازمین الرٹ ہو گئے۔ تب زرگاں میں شکتی کا دیوتا، یعنی جی کے بعد اہم ترین شخص سر جارج گورا اپنے دو درجن گارڈز کے جلو میں دکھائی دیا۔ اس کی آمد سے پہلے میری اور کمرے کی اچھی طرح تلاشی لی گئی، تب وہ دندناتا ہوا اندر آ گیا۔

آج جارج گورا نے کوٹ کے بجائے بند گلے کی ایک پتلی سی جرسی پہنی ہوئی تھی۔ اس ہائی نیک جرسی کے نیچے قمیص وغیرہ بھی نہیں تھی۔ اس ڈریس کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ یا تو وہ مجھے اپنے شان دار کسرتی جسم کی جھلک دکھا کر مرعوب کرنا چاہتا تھا یا پھر اس نے میری نقل کی تھی۔ آج کی طرح ایک دن پہلے بھی بہت سردی تھی۔ میں نے تب بھی ایک ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ شاید اس نے مجھے جتایا تھا کہ اگر میں صرف ایک ٹی شرٹ میں موسم کی سختی جھیل سکتا ہوں تو وہ بھی ایسا کر سکتا ہے۔

آج پھر اس نے بھرپور توانائی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور میرے بازو کو باقاعدہ جھنجھوڑا۔ کسی تمہید کے بغیر وہ اصل موضوع پر آ گیا اور بولا۔ ”پنڈت مہاراج کی طرف سے کلیئرنس مل گئی ہے۔ سامبر کی رسم بدھ کو سہ پہر کے وقت ہو گی۔ بدھ کو سہ پہر کے وقت۔“ اس نے دُہرایا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”کس طرح لڑنا پسند کرو گے؟“

”میں کسی بھی طرح لڑنے کے لیے تیار ہوں۔ جیسا کہ میں نے کل کہا تھا، اس لڑائی کے حوالے سے میں ایک تجویز دینا چاہتا ہوں۔“

”کہو۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ تم یہ تجویز مان لو گے...“

”کیا تم پہیلیاں بجھوانا چاہتے ہو؟“

”میں چاہتا ہوں کہ یہ لڑائی مرنے یا مار دینے پر ہو۔“

اس نے ذرا چونک کر مجھے دیکھا پھر اوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بہت خوب... بہت خوب... دلیری دکھا رہے

فہرست کتب 2009 2010

کتابیات پبلی کیشنز

مکتبہ نفسیات

سسپنس ڈائجسٹ کے سلسلے

دیوتا	50 حصے (جاری ہے)	75/- فی حصہ
طالوت	3 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
موت کے سوداگر	18 حصے (جاری ہے)	75/- فی حصہ
فرعون	2 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ

جاسوسی ڈائجسٹ کے سلسلے

گمراہ	8 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
مغرور	6 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
صدیوں کا بیٹا	5 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
شکاری	20 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
مجاھد	11 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
آتش فشاں	13 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ

سب رنگ ڈائجسٹ کے سلسلے

بازی گر	7 حصے (جاری ہے)	75/- فی حصہ
انکا	2 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
اقابلا	2 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
سونا گھاٹ کا پجاری	(مکمل)	60/- فی حصہ
غلام روحیں	(مکمل)	60/- فی حصہ

دیگر ڈائجسٹوں کے سلسلے

چھلاوا	صبیحہ بانو	(مکمل)	[illegible]
جال	صبیحہ بانو	(مکمل)	75/-
ھمزاد	شمیم نوید	(مکمل)	75/-
شاطر 1 2	مسٹری میگزین کا سلسلہ	(مکمل)	75/- فی حصہ
نک ویلوٹ کی چوریاں	2 حصے	(مکمل)	75/- فی حصہ
انعام یافتہ کہانیاں	ڈائجسٹوں کی بہترین کہانیاں		50/-
چارلس سوبھراج کی سرگزشت			60/-
کالی کہانیاں	اے ایس صدیقی		40/-
بہترین کہانیاں	اے ایس صدیقی		75/-
شیطان صفت	مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ	(زن، زر، زمین کے مقدمات کی سچی کہانیاں)	75/-
سبز قدم	مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ	(زن، زر، زمین کے مقدمات کی سچی کہانیاں)	75/-
اسیر ھوس		[illegible]	75/-
دہشت انتقام		[illegible]	75/-
ماورائی لوگ		(روحانی صلاحیتوں کے حامل لوگوں کے سچے واقعات)	85/-
کشتہ سیاست		(ایک کنوارے سیاست داں کی سرگزشت)	85/-

تصوف

سفیرانِ حرم	(خان آصف) (چاروں ایمائے کرام کی حالاتِ زندگی)	250/-
صاحبِ کرامات (4 حصے مکمل)	[illegible]	250/- فی حصہ
سوانح انبیاء	(ضیاء تسنیم بلگرامی) 2 حصے	250/- فی حصہ
روشنی کے مینار	(ضیاء تسنیم بلگرامی)	250/-
عظمت کے مینار	(ضیاء تسنیم بلگرامی)	250/-
پراسرار بندے	(ضیاء تسنیم بلگرامی)	250/-
نبوت کے جھوٹے دعوے دار (2 حصے جاری ہے)	(ضیاء تسنیم بلگرامی)	250/- فی حصہ
احوالِ اولیا	(ڈاکٹر ساجد امجد) (اولیاء کرام کی سوانح حیات)	350/-
عاشقانِ خدا	(ڈاکٹر ساجد امجد) (اولیاء کرام کی سوانح حیات)	250/-
سفرِ آخرت	(محمد فاروق قادری)	250/-
حکایات اولیاء 1 2	(ضیاء تسنیم بلگرامی)	30/- فی حصہ

افسانے / ناول

ایمان کا سفر	(محی الدین نواب کی کہانیوں کا مجموعہ)	250/-
کچرا گھر	(محی الدین نواب کی کہانیوں کا مجموعہ)	200/-
آدھا چہرہ	(محی الدین نواب کا طویل معاشرتی ناول)	300/-
بہتے پانی پہ مکاں	(ناهید سلطانہ اختر کا رومانی ناول)	250/-
دکھ کا دریا سکھ کا ساگر	(آسیہ مرزا کا رومانوی ناول)	800/-
دھوپ بارش اور سائے	(نگہت سیما)	1000/-
سیپ، صدف اور ساحل	(رخ چوھدری کا مکمل ناول)	450/-
خلش	(ڈاکٹر نگہہ بلگرامی)	450/-
بہتی چاندنی کا سکوت	(ناهید چوھدری کا خوب صورت ناول)	450/-
مہمان	(ماہ مبین)	300/-
منزل کہاں ھے	(ماہ مبین)	300/-
قیدی سانس لیتا ھے	(زاھدہ حنا کے انقلابی افسانے)	100/-
بجلی گری نشیمن پر	(نورحسین شاہ کا مکمل معاشرتی ناول)	150/-
صحرا میں کنول	(نورحسین شاہ کا مکمل ناول رنگین تصاویر کے ساتھ)	150/-
گہن لگا چاند	(نورحسین شاہ کا مکمل ناول)	150/-
آدم زادی	(مظلوم عورتوں کی سچی کہانیاں)	100/-
انجم تاباں	(فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والوں کا مختصر تعارف)	200/-
سفید ڈاکو	(محسن رضا کا طبع زاد ناول)	200/-
مارکو پولو	(محسن رضا کے قلم سے)	200/-
تم میرے سنگ ھو	(رضوانہ پرنس کے خوب صورت افسانے)	130/-
سدا میرے ھی رھنا	(رضوانہ پرنس کے خوب صورت افسانے)	130/-
یہ کیسا جیون	(شمیم نازصدیقی کے خوب صورت افسانے)	125/-
تین خوفناک کہانیاں	(ابنِ حق کے قلم سے)	200/-

www.kahopakistan.com

اور چالاکی بھی۔''

''چالاکی سے کیا مطلب؟''

''لڑائی کسی بھی طرح کی ہو، ہارنے کی صورت میں تمہیں تو مرنا ہی ہے۔ اور میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ تم سولی چڑھنے کے بجائے گولی یا چاقو وغیرہ کے زخم سے مرو۔''

''تمہاری دلیری اور بے خوفی کے بارے میں تمہارے پیچھے بہت شور مچاتے ہیں لیکن اب مجھے لگ رہا ہے کہ وہ سب ''شور'' ہی ہے۔ جو دلیل تم پیش کر رہے ہو اس میں کوئی خاص وزن نہیں ہے۔''

''مجھے اکسانے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہ اچھی طرح تمہاری سمجھ میں آگیا ہے۔ اب اسے ماننا یا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔''

جارج کی نیلگوں آنکھوں میں ایک بار پھر نفرت اور رقابت کی برق لہرائی۔ وہ اندر سے ابل رہا تھا۔ یہ جان کر مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ وہ مجھے قرار واقعی اہمیت دے رہا ہے۔ میرے خیال میں اس اہمیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے ان لوگوں کو کچھ ثابت کر کے دکھایا تھا۔ پہلے جارج کی حراست سے فرار ہونا اور پھر پانڈے جیسے گھمنڈی کو یادگار مزاحمت دینا معمولی واقعات نہیں تھے۔

جارج ٹانگیں چوڑی کر کے کھڑا تھا۔ بڑے اسٹائل سے کمر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''اس بارے میں بھی سوچ لیتے ہیں۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ کس طرح لڑنا پسند کرو گے؟ تم ویسٹرن انداز میں ڈیول کھیل سکتے ہو، تلوار بازی کر سکتے ہو، کشتی، چاقو زنی، باکسنگ... جو تمہارا دل چاہے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ ہم بغیر کسی ہتھیار کے خالی ہاتھ لڑیں اور تب تک لڑتے رہیں جب تک کوئی ایک حتمی طور پر جیت نہ جائے۔''

''تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے جیسے یہ لڑائی شاید بہت دیر تک چلے گی۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ خاصی غیر دلچسپ لڑائی ہوگی۔ ایک دو منٹ میں ہی تمہارا جنازہ تیار ہو جائے گا۔''

''کچھ ایسے ہی خیالات تمہارے بارے میں میرے بھی ہیں۔'' میں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''بہت خوب... بہت خوب۔'' اس نے ایک بار پھر اوپر نیچے سر ہلایا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ایک طرف تم کہہ رہے ہو کہ تم ''مرو یا مارو'' کی لڑائی لڑنا چاہتے ہو۔ دوسری طرف خالی ہاتھ لڑنے کی بات کر رہے ہو۔ خالی ہاتھوں سے بندہ مارنے میں کافی دقت پیش آیا کرتی ہے اور میری کھال بھی تھوڑی سی موٹی ہے۔''

''تو اپنا کوئی من پسند ہتھیار رکھ لو۔ چاقو یا کٹاری... کچھ اور...''

''ٹھیک ہے۔ اس بارے میں تمہیں کل بتا دیا جائے گا۔'' جارج نے مبہم انداز میں کہا۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میرے طرز تخاطب نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس کے اندر طیش کا دریا ابل رہا تھا۔ وہ اس ابال کو ضبط کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ وہ مجھے جان کی امان دے چکا تھا ورنہ شاید اسی جگہ وہ خوں ریز لڑائی شروع ہو جاتی جس کی منصوبہ بندی کی جا رہی تھی۔

اس کے طیش اور اس کی آتش پائی نے مجھے لطف دیا۔

عمران ابھی سو رہا تھا۔ میں اس ہال کمرے کی طرف چلا گیا جہاں جسمانی ورزش کا ساز و سامان موجود تھا۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اس جگہ کو ''جم'' کہا جا سکتا تھا۔ ایک دیواروں پر انڈین فلمی اداکاراؤں ہیما مالینی، زینت امان، سری دیوی وغیرہ کی تصویریں لگی تھیں۔ ان تصویروں میں ان خواتین کی جسمانی ''فٹنس'' نمایاں نظر آتی تھی۔ سہ پہر کے بعد ٹریزر گیتا دیدی لڑکیوں کو لے کر یہاں آتی تھی اور ڈیڑھ گھنٹے گزارتی تھی۔ فی الوقت یہ ''جم'' خالی پڑا تھا۔ ایک گوشے میں جاگنگ مشین موجود تھی اور سینڈ بیگ بھی جھول رہا تھا۔ میں جاگنگ مشین پر ایکسر سائز میں مصروف ہو گیا۔ قریباً آدھے گھنٹے تک میں نے اندھا دھند ورزش کی اور پسینے سے شرابور ہو گیا۔ پھر میں سینڈ بیگ پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ جب میں کام شروع کرتا تھا تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا تھا۔ اردگرد کا احساس تو دور کی بات ہے، مجھے اپنا ہوش بھی نہیں رہتا تھا۔ باروندا جیکی کی تربیت نے مجھے کسی اور ہی سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ میں نے سینڈ بیگ کو اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا۔ وہ جگہ جگہ سے خوں رنگ ہو گیا۔ یہ میرا اپنا ہی خون تھا جو میرے ہاتھوں کی جلد سے اور ناخنوں سے رستا تھا۔ یہ ورزش نہیں تھی، مشق بھی نہیں تھی... یہ ایک جنون تھا، ایک آگ تھی جو سینڈ بیگ کے روبرو ہوتے ہی میرے جسم میں پھیل جاتی تھی۔ غیظ و غضب کے عالم میں کچھ ہو جاتا تھا مجھے۔ آج کل اسحاق کی دردناک موت کی یاد نے میرے رگ و پے میں کچھ اور چنگاریاں بھر دی تھیں۔ جب میں دیوانہ وار اپنے کام میں مصروف ہوا تھا، عمران کی آمد نے مجھے چونکایا۔ میں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں باکسنگ کے ہلکے گلوز نظر آ رہے تھے۔ میری طرف دیکھ کر دلکش انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''لگتا ہے کہ مارشل آرٹ کی کسی دھواں دھار فلم کا اثر ہو گیا ہے تم پر۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی سانسیں درست کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''بے زبان کو مارنا اچھی بات نہیں ہے۔ کوئی ایسا ہو جو تھوڑا بہت جواب بھی دے سکے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے دستانوں کی ایک جوڑی میری طرف بھی پھینک دی۔

میں نے دو گلاس پانی پیا اور دستانے پہن لیے۔ وہ چہکا۔ ''بس میری ناک پر نہ مارنا کیونکہ یہ میں نے جگہ جگہ کھسیڑنی ہوتی ہے اور ہو سکے تو پڑپڑی (کنپٹی) کو بھی چھوڑ دینا کیونکہ سنا ہے شریف لوگ یہاں لگنے والی چوٹ سے اکثر فوت ہو جاتے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں، تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''تم زبان درازی کرنے لگے ہو لیکن خیر، اس کی سزا میں تمہیں ''رنگ'' میں دوں گا۔ لنگر سے ہو جاؤ۔''

ہم دونوں لکڑی کے ہموار فرش پر باکسنگ میں مصروف ہو گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اور عمران اس طرح آمنے سامنے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ عمران ایک زبردست ''لڑاکا'' ہے۔ میں لاہور میں، ہڑپہ میں اور پھر جہلم وغیرہ میں اس کی غیر معمولی پھرتی اور توانائی کے مظاہرے دیکھ چکا تھا۔ وہ سنگین ترین صورت حال میں بھی بڑے سکون سے لڑتا تھا اور یوں لگتا تھا کہ لڑ نہیں رہا، سرکس میں کوئی خطرناک آئٹم دکھا رہا ہے۔ میں نفسیاتی طور پر ہمیشہ اس سے مرعوب رہا تھا... لیکن اب یہ مرعوبیت میری اندرونی تبدیلیوں کے دھارے میں کافی حد تک دب گئی تھی۔

ہم پہلے وارم اپ ہوتے رہے پھر ایک دوسرے پر ہلکے ہلکے حملے کرنے لگے۔ یکا یک عمران نے اپنے دائیں بازو کو بجلی کی سی تیزی سے حرکت دی۔ بے حد کوشش کے باوجود میں خود کو اس کے طوفانی مکے سے نہ بچا سکا۔ آنکھوں میں تارے سے ناچے اور میں لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔

وہ مسکرایا۔ ''جارج سے لڑنا چاہتے ہو تو اس کے لیے زندہ رہنا ضروری ہے اور مجھے تمہاری خیریت مشکوک نظر آ رہی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی وہ ایک قریبی الماری کی طرف گیا اور وہاں سے دو ''فیس گارڈز'' لے آیا... ہم دونوں نے یہ گارڈز پہن لیے اور ایک بار پھر باکسنگ اسٹائل میں آ گئے۔ اب میں کافی احتیاط کر رہا تھا۔ تکنیک میں عمران مجھ سے کہیں بہتر تھا۔ میں نے اسے دو تین مکے رسید کیے لیکن جواب میں مجھے اس کے پانچ چھ سہنے پڑے۔ باکسنگ کے ساتھ ساتھ وہ فقرے بازی بھی کر رہا تھا۔ ہم بُری طرح ہانپنے لگے۔ اسی دوران میں وہ پھر ایک چکما دے گیا۔ بایاں ہاتھ استعمال کرتے کرتے اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنا اسٹاک مکا استعمال کیا۔ اس بار میں قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا اور گر گیا۔

وہ خود ہی گنتی گننے لگا۔ ''ایک... دو... تین... چار۔''

اس کے آٹھ تک پہنچتے پہنچتے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے کھڑے ہوتے ہی وہ چیتے کی طرح جھپٹا۔ ایک بار پھر تابڑ توڑ وار کیے۔ میں دوبارہ چت ہو گیا۔ ذہن پر دھند سی چھانے لگی لیکن اس کے ساتھ ہی ایک آگ بھی بھڑک اٹھی۔ میری قوت برداشت کام آئی اور میں عمران کے گنتی شروع کرتے ہی پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

اب ہم دونوں نے ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کیے۔ میرے ہونٹوں سے خون رسنے لگا تھا۔ عمران کے رخسار پر بھی چوٹ آئی تھی۔ مجھے لگا کہ شاید عمران اپنی کارکردگی دکھا کر اپنی اندرونی خفگی ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کو بائی پاس کیا تھا اور بڑی خاموشی سے راج بھون جا کر جارج کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ شاید وہ اس طرح یہ بتانا چاہتا تھا کہ جارج کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے لیے وہ مجھ سے بہتر ہے۔

اس کی یہ بات غلط ثابت کرنے کے لیے میں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اگلے راؤنڈ میں اسے چند سخت مکے رسید کیے مگر تب اچانک پھر اس کی بہتر تکنیک کام کر گئی۔ عمران نے راؤنڈ ہیچ کے انداز کا ایک مکا میری ٹھوڑی پر رسید کیا اور اس مرتبہ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب میں گرا اور کب لکڑی کے فرش نے میری پشت کو چھوا۔ دماغ لٹو کی طرح گھوم گیا تھا۔

عمران نے پھر گنتی شروع کی... چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ... میں پھر کھڑا ہو گیا۔ دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔ ایک بار پھر ہم ایک دوسرے پر جھپٹے... اگلے قریباً پانچ منٹ میں واقعی بہت سخت لڑائی ہوئی۔ میں نے عمران کو زیادہ چوٹیں لگائیں اور یہ سخت بھی تھیں مگر عمران کی چوٹوں میں صفائی اور ایکوریسی تھی۔ ان پانچ منٹ میں، میں قریباً تین بار فرش بوس ہوا اور دوبارہ اپنا توازن قائم کر کے اٹھا۔

''بس بھئی بس۔'' عمران پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''اب سلطانہ بھابی کا بھی کچھ خیال کرنا پڑے گا۔''

اس نے فیس گارڈ اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے ہونٹوں سے بھی خون رسنے لگا تھا۔ چہرے پر ایک دو نیل بھی تھے۔ میں نے بھی فیس گارڈ اتار دیا۔ ایک طرف سے میڈم عفورا نمودار ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے

www.kahopakistan.com

تھے۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ وہ کسی اوٹ میں کھڑی ہو کر یہ ساری لڑائی دیکھتی رہی ہے۔

عمران نے پسینا پونچھتے ہوئے میڈم کو مخاطب کیا اور بولا۔ ''کیا خیال ہے میڈم! میں ٹھیک کہہ رہا تھا نا؟''

''لگتا تو ایسے ہی ہے۔'' میڈم نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا رمزیہ باتیں کر رہے ہو آپ دونوں؟'' میں نے دستانے اتارتے ہوئے عمران سے پوچھا۔

''سچ سچ بتا دوں یا گول مول بات کر دوں؟'' وہ مسکرایا۔

''سچ سچ ہی بتا دو کیونکہ یہ نیکی تم کم کم ہی کرتے ہو۔'' میں نے کہا۔

وہ پانی پیتے ہوئے بولا۔ ''میں میڈم کو چھوٹا سا ثبوت دینا چاہتا تھا۔''

''کس بات کا ثبوت؟''

''میں میڈم کو بتانا چاہتا تھا کہ تم چھوکوے بن چکے ہو۔ چھوکوما سمجھتے ہو نا تم؟ جسے انگلش میں چھوا کہتے ہیں۔''

''انگلش میں نہیں، اردو میں کہتے ہیں۔'' میں نے تصحیح کی۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اب اس بات کا بھی ثبوت مل رہا ہے کہ تمہارے مُکّے میں کافی جان ہے۔ میری یادداشت کی چولیں ہل گئی ہیں اور انگریزی اردو آپس میں گڈمڈ ہو گئی ہے... ہاں تو میں بات کر رہا تھا چھوکوے کی... میں میڈم کو بتانا چاہتا تھا کہ تم اپنے لائف اسٹائل کی وجہ سے اس جانور کی طرح ڈھیٹ اور سخت جان ہوتے جا رہے ہو اور یہ ثابت ہو گیا ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''

میڈم مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں بتاتی ہوں... دراصل بات یہ ہے کہ میری رائے میں اگر جارج گورا سے دو دو ہاتھ کرنے ہی ہیں تو پھر تمہارے بجائے عمران کو آگے ہونا چاہیے تھا کیونکہ میرا خیال یہ تھا اور کسی حد تک اب بھی ہے کہ لڑائی بھڑائی کے فن میں عمران تم سے آگے ہے۔ دوسری طرف عمران کا کہنا یہ تھا کہ تم ایک اور حوالے سے اس سے کہیں آگے ہو۔ اور یہ ایسا حوالہ ہے جو فائٹنگ آرٹ میں سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ یعنی قوتِ برداشت اور درد سہنے کی صلاحیت... اور میرے خیال میں یہ بات پچھلے بیس پچیس منٹ میں کافی حد تک ثابت ہوئی ہے۔ میں واقعی تمہاری برداشت کی صلاحیت سے ''امپریس'' ہوئی ہوں۔ اتنی چوٹیں کھا کر گرنا اور پھر پاؤں پر کھڑے ہو جانا معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن اِٹ از وَنڈر فل۔''

''تو یہ میرا سرپرائز ٹیسٹ ہو رہا تھا۔'' میں نے عمران کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلو ایسا ہی سمجھ لو برخوردار... اوہ... سوری... میں نے تمہیں برخوردار کہہ دیا۔ دماغ گھوم گیا ہے۔ تمہارے مُکّے میں کافی طاقت ہے یار۔'' اس نے اپنا سر تھامتے ہوئے کہا۔

میں اس کی مسخری پر یکسر خاموش رہا۔ چند سیکنڈ تک کوئی بھی کچھ نہیں بولا۔

وہ اس گمبھیر خاموشی کو توڑنے کے لیے مسکرایا۔ ''لگتا ہے کہ تم چھوکوما کہنے کی وجہ سے ناراض ہو گئے ہو۔ لیکن تمہاری سخت جانی کی وجہ سے میں نے تمہیں چھوکوما کہا ہے۔ تیزی اور پھرتی میں تم خود کو کسی اور جانور سے تشبیہ دے سکتے ہو... مثلاً باہروالا۔''

وہ سور کی بات کر رہا تھا۔ اس کی بکواس پر میرا پارا اوپر چلا گیا لیکن میڈم کی موجودگی کی وجہ سے میں بولا کچھ نہیں۔

میڈم بولی۔ ''یہ باہروالا کیا ہوتا ہے بھئی؟''

''یہ... یہ چیتے کی طرح کا ایک جانور ہوتا ہے جی۔'' عمران نے بات بنائی۔

''بھئی اس لحاظ سے تو تم دونوں ہی باہروالے ہو۔ میں تمہاری فائٹ سے متاثر ہوئی ہوں۔''

عمران بولا۔ ''آپ بھی تو کم ''باہروالی'' نہیں ہیں۔ میں نے کچھ موقعوں پر آپ کو بڑی تیزی سے فیصلہ کرتے اور حرکت میں آتے دیکھا ہے۔''

''اچھا چھوڑو اس بات کو۔ اب دونوں اپنا حلیہ درست کرو۔ شام کو کچھ لوگ تابش کو دیکھنے آ رہے ہیں۔''

''لیکن یہ تو شادی شدہ ہے۔''

وہ عمران کے فقرے کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ خبر پورے زرگاں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ہے کہ سلطانہ راجپوت کا شوہر زرگاں واپس پہنچ گیا ہے اور وہ جارج گورا سے لڑنا چاہتا ہے۔ ہر طرف اس بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ایک دلچسپ مقابلہ ہوگا۔''

''اس خیال کی وجہ؟'' عمران نے پوچھا۔

''رنجیت پانڈے۔'' میڈم نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ ''رنجیت پانڈے زرگاں کا سب سے کرخت اور دبنگ افسر ہے۔ اس رنجیت پانڈے کے ساتھ تل پانی کے دیوان میں تابش کی ٹکر ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تابش نے نہ صرف پانڈے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا بلکہ اسے پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ اس کامیابی کا کریڈٹ ملنے کے بعد تابش کو یہاں کافی شہرت حاصل ہوئی ہے... زرگاں میں اکثر لوگ اس کے بارے میں بات کرتے رہتے تھے۔ لوگوں کے لیے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ شخص جو ڈیڑھ دو سال پہلے تک ایک عضوِ معطل کی طرح اپنی بیوی کے آسرے پر جی رہا تھا، اب پانڈے جیسے بندے سے ٹکر لینے کے قابل ہو گیا ہے... اب جو نئی صورت سامنے آئی ہے، اس نے مزید ہلچل مچا دی ہے۔ راج بھون کے دروازے کے سامنے جا کر جارج کو للکارنا اور اس کا چیلنج قبول کرنا، ہر جگہ زیرِ بحث ہے۔ شام کو جو لوگ آ رہے ہیں، یہ زرگاں کے عمائدین میں سے ہیں۔''

''یہ کیا کریں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارے ناخن دیکھیں گے کہ کہیں تم لڑائی کے دوران میں جارج کو کھرونڈے سے مارنا نہ شروع کر دو۔'' عمران نے کہا۔

میڈم اس کے مذاق کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ ''کچھ نہیں، بس یہ لوگ تم سے ملیں گے اور تمہیں یقین دلائیں گے کہ چیلنج قبول کرنے کے بعد تمہاری حیثیت ملزم یا مجرم کی نہیں رہی ہے۔ اب جو کچھ بھی ہوگا، وہ سامبر کے قدیم اصولوں کے مطابق ہوگا اور تمہیں مقابلے کے دن تک ہر طرح کی سہولت حاصل رہے گی، وغیرہ وغیرہ۔''

''میڈم! میرے کام کا کیا بنا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں... تمہارا کام ہو گیا ہے... میں نے پرسوں شام ہی تمہارا پیغام تل پانی روانہ کر دیا تھا۔ اب تک انور خاں کو یہ اطلاع پہنچ چکی ہوگی کہ اسے فی الحال زرگاں آنے کی ضرورت نہیں۔ پہلے وہ تمہارے اور جارج کے مقابلے کا نتیجہ دیکھ لے۔''

''اس بات کی تصدیق کب تک ہو سکے گی کہ اطلاع پہنچ گئی ہے؟''

''کل شام تک۔ لیکن تم بالکل مطمئن رہو۔ یہ کام ہو چکا ہے۔''

میڈم کے جانے کے بعد میں نے عمران کو گھورا۔ اس نے فوراً ہاتھ جوڑ دیے۔ ''جگر! اگر کہیں زیادہ چوٹ لگی ہے تو معاف کر دینا۔''

''چوٹیں تو تمہیں بھی کم نہیں لگیں۔ تمہارا تھوبڑا سوجتا جا رہا ہے... اور میرے خیال میں میرا بھی یہی حال ہے۔''

''یعنی بقول شاعر، دونوں طرف ہے سوج برابر چڑھی ہوئی۔'' وہ چہکا۔ ہم ہنسے اور بغل گیر ہو گئے۔

رات کو بڑی بڑی پگڑیوں اور فربہ جسموں والے کچھ مقامی لوگ مجھ سے ملنے آئے۔ ان کا رویّہ بس لیے دیے جیسا رہا۔ تاہم ان کی نگاہوں میں میرے حوالے سے دلچسپی اور گوناگوں تجسس تھا۔ میں ان کے لیے جیسے کوئی عجوبہ قسم کی شے تھا۔ وہ میری ''کایا کلپ'' کے بارے میں جاننے کے خواہش مند تھے لیکن کھل کر کوئی سوال بھی نہیں کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے سلطانہ اور اس کے اہلِ خانہ کے بارے میں بھی کچھ نہیں پوچھا، حالانکہ یہ سوال بھی ان کے ذہنوں میں ہلچل مچا رہا تھا۔

رات کو میں اور عمران ایک ہی کمرے میں لیٹے تھے۔ میں اپنے معمول کے مطابق سخت فرش پر دراز تھا (قالین پر) جبکہ عمران بستر پر لحاف اوڑھے لیٹا تھا۔ دھیرے دھیرے مجھے اس طرح سونے کی عادت ہو گئی تھی۔ میں حیران تھا کہ اب مجھے سردی بے چین نہیں کرتی تھی۔ دوپہر والی مارا ماری کے سبب عمران کی ناک کافی سوج گئی تھی مگر وہ ایسی باتوں کی پروا کب کرتا تھا۔ اس نے اپنے خوب صورت بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''یار! کبھی کبھی تو میں بارونددا جیکی سے واقعی بہت متاثر ہوتا ہوں۔ افسوس ہے کہ اس کی اور میری ملاقات نہ ہو سکی، ورنہ ہو سکتا ہے کہ میں بھی اس کی شاگردی اختیار کر لیتا۔''

''پھر کوئی ڈراما رچا رہے ہو؟''

''نہیں جگر! میں سنجیدہ ہوں۔ جیکی نے تم جیسے پھوہڑ بندے کی کیمسٹری چند مہینوں میں تبدیل کر کے رکھ دی ہے۔ درد کے حوالے سے جو فلسفہ اس نے تمہیں دیا ہے، میں اس سے پورا متفق تو نہیں لیکن اس کے نتائج کو جھٹلانا بھی بہت مشکل ہے۔''

''تو پھر؟''

''تو پھر تم سے اظہارِ یکجہتی کے طور پر آج مابدولت بھی فرش پر استراحت فرمائیں گے۔'' اس نے چھلانگ لگائی اور میرے پہلو میں آ کر قالین پر لیٹ گیا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اظہارِ یکجہتی کرنا ہے تو پورا کرو۔ لحاف کیوں لپیٹ رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''تم نے وہ شعر نہیں سنا۔ آپ سے پہلے تم ہوئے، پھر تُو کا عنوان ہو گئے۔ ہر کام آہستہ آہستہ ہوتا ہے بھائی۔ اتنا اظہارِ یکجہتی بھی نہ کراؤ کہ کل سویرے اکڑا ہوا پایا جاؤں اور لوگ اظہارِ افسوس کے لیے تمہارے پاس آنے لگیں۔ تم سے پوچھا جائے کہ کیا ہوا؟ تو بولو، بس جی اظہارِ

www.kahopakistan.com

بیکجہتی ہو گیا... اچھی بھلی رضائی پڑی تھی مگر رضائی کی جگہ اس نے ''یکجہتی'' اوڑھ لی... اور صبح تک اپنے مرحوم بزرگوں سے اظہارِ یکجہتی کر گیا۔''

اگلے دن صبح میں اور عمران پُرتکلف ناشتے سے فارغ ہونے کے کچھ دیر بعد جم میں چلے گئے۔ میں ورزشوں میں مصروف ہو گیا اور عمران اس قدیم کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا جو منیجر مدن نے اسے دی تھی۔ یہ کتاب اس راجواڑے یعنی بھاٹڈیل اسٹیٹ کی قدیم رسموں کے بارے میں تھی اور اس میں سویمبر اور سامبر وغیرہ کا ذکر بھی تھا۔ اس کتاب میں اس مورتی کا تذکرہ بھی کیا گیا تھا جسے چرانے کی پاداش میں ہم یہاں پہنچے تھے اور سنگین مسائل کا شکار تھے۔ لوگ ایک مدت سے بدھا کی اس مورتی کو آراکوئے کے نام سے پکارتے رہے تھے، یعنی وہ شے جو اپنی حفاظت خود کرتی ہے اور خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے والوں کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے۔ ابھی تک تو یہ مورتی آراکوئے ہی ثابت ہوئی تھی۔

لال بھون کے وسیع سبزہ زار پر ابھی تخ بستہ اوس کے قطرے موجود تھے۔ طویل قطاروں میں کیاریوں کے اندر سرما کے پھول جیسے زردی مائل دھوپ سے حظ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جم کے قریب دو باوردی گارڈز موجود تھے اور صرف جم ہی نہیں، پورے لال بھون کو اسپیشل فورس کے کمانڈوز نے گھیرا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہم جدھر جاتے ہیں، درجنوں نگاہیں ہمارا پیچھا کرتی ہیں۔

میری ورزش اور مشق جاری تھی۔ پھر میں نے عمران کو بھی اس میں شامل کر لیا۔ ابھی ہم دونوں کو مصروف ہوئے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ گیتا کی آواز سنائی دی اور پھر کئی لڑکیوں کی جلترنگ جیسی آوازیں ابھریں۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ قریباً ڈھائی درجن نہایت خوبرو لڑکیاں ہمارے سامنے کھڑی تھیں۔ یہ سب کی سب وہی تھیں جنہیں ساتویں کے جشن میں 'سات پریوں' کے انتخاب میں حصہ لینا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر ایسی تھیں جنہوں نے اب خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ ان میں چمک دمک آ گئی تھی۔ ان کے عارض دہکتے تھے اور زلفیں لہراتی تھیں۔ وہ بات بات پر کھلکھلاتی تھیں، ایک دوسرے سے چہلیں کرتی تھیں اور آنکھوں آنکھوں میں بھید بھری باتیں کہتی رہتی تھیں۔

''کیا بات ہے گیتا دیوی؟'' میں نے ان کی ٹرینر سے پوچھا۔

''یہ سب تم سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''کس لیے؟''

''بھئی جس لیے لوگ مشہور لوگوں سے ملنا چاہ[تے] ہیں۔ انہیں قریب سے دیکھنا چاہتی ہیں۔''

''میں ایسا مشہور تو نہیں ہوں۔''

''یہ تو تمہارا خیال ہے نا... ذرا یہاں سے باہر نکل [کر] دیکھو۔ ہر طرف تمہارے چرچے ہیں۔'' گیتا بولی۔

''کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہے۔''

''کئی وجہیں ہیں... اور ان میں سے ایک وجہ تمہارا رہن سہن ہے۔'' وہ مسکرائی اور سخت سردی میں میرے نا[کافی] ناکافی کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

اب لڑکیوں نے مجھے گھیرا ڈال لیا تھا۔ ان کے جسم سے خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ آپس میں سرگوشیاں بھی کر رہی تھیں۔ ان میں وہ لڑکی بھی نظر آئی جس کا نام میڈم نے ثمرین بتایا تھا اور جس کے بارے میں کہا تھا کہ اس کی شادی سلطانہ کے بھائی سے ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ وہ آج بھی خوش دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ایک لڑکی نے ہمت کر کے کہا۔ ''سنا ہے کرنل پانی... آپ کی لڑائی پانڈے صاحب سے ہوئی تھی؟''

''بالکل ہوئی تھی... لیکن اس شخص کے نام کے ساتھ ''صاحب'' لگا کر اس لفظ کی توہین نہ کرو۔''

چند لڑکیوں کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ نظر آئی۔ ان میں ثمرین بھی شامل تھی۔

''سنا ہے، آپ کو درد نہیں ہوتا؟'' ایک دوسری لڑکی نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

''کون کہتا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''یہاں کے ملازمین کہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ نے آپ کو یہاں ''جم'' میں ورزش کرتے دیکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کے شریر سے خون بھی رسنے لگے تو آپ کو پتا نہیں چلتا۔''

ایک لڑکی نے لقمہ دیا۔ ''اور آپ بے موسم کے کپڑے پہن کر گھومتے ہیں، فاقے کرتے ہیں، فرش پر سوتے ہیں [اور] عام پانی سے اشنان بھی کر لیتے ہیں۔''

ثمرین نے کہا۔ ''لیکن جہاں تک ہم کو جانکاری [ہے] آپ پہلے تو ایسے نہیں تھے۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کی یادداشت کے ساتھ کوئی مسئلہ تھا۔''

''اپنے سوال کا جواب تم نے خود ہی دے دیا ہے۔'' عمران نے مدبرانہ انداز میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''خیر سے آپ کون ہیں؟'' زرق برق کپڑوں والی ایک لڑکی نے تنک کر عمران سے پوچھا۔

''میں میڈم کا ملازم ہوں۔ لیکن آج کل یہاں جم میں آ رہا ہوں، ٹریننگ میں تابش کا ساتھ دینے کے لیے بلکہ... بلکہ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ مجھے اس کا استاد بھی کہا جا سکتا ہے۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں؟'' ایک لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

''استاد تو یہ واقعی ہے... بلکہ بہت استاد ہے۔ اور آپ بھی اس سے ذرا دور ہٹ کر کھڑی ہوں۔ یہ لڑکیوں کو بہت جلد شاگردی میں لے لیتا ہے۔''

''دیکھو مسٹر تابش... اِٹ از ٹو مچ۔ میں اس سے زیادہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا اور وہ بھی اتنی زیادہ لڑکیوں کے سامنے۔''

''تو لڑکیاں کم کر دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کو باہر بھیج دیتے ہیں۔''

اس نے مجھے مُکا دکھایا پھر لڑکیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اے خوش جمال... پری پیکران۔ میں آپ کو ایک بہت اونچی بات بتاتا ہوں۔ جس طرح بد سے بدنام زیادہ بُرا ہوتا ہے، اسی طرح اچھے سے مشہور زیادہ عزت دار ہو جاتا ہے۔ یہ تابش صاحب بس مشہور ہو گیا ہے، ورنہ یہ کوئی ایسا رستم سہراب بھی نہیں ہے۔''

لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسیں۔ ایک بولی۔ ''ہم تو اتنا جانتی ہیں جی کہ جو شخص پانڈے صاحب جیسے شخص سے ٹکر لے سکتا ہے... وہ جارج گورا صاحب کے لیے بھی ضرور مشکل پیدا کرے گا۔''

''تو آپ سب یہ چاہتی ہیں کہ جارج صاحب کے لیے مشکلیں پیدا ہوں؟''

لڑکیاں ایک دم خاموش ہو گئیں۔ ان کی ٹرینر گیتا جلدی سے بولی۔ ''نا ہیں، ایسی بات تو نا ہیں۔ جارج صاحب کی حیثیت ہمارے مالک کی سی ہے۔ ہم ایک غیر کے مقابلے میں ان کی ہار کا کیوں سوچیں گے؟ ہم چاہتی ہیں کہ بھگوان ہمیشہ کی طرح ان کو کامیاب کرے...'' اس کے ساتھ ہی اس نے سوالیہ نظروں سے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔

کئی لڑکیوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بہرحال، ان کے تاثرات ان کے اندرونی جذبات کی چغلی کھا رہے تھے۔ ان میں سے شاید ہی دو چار ہوں جو دلی طور پر گیتا کی بات سے اتفاق کر رہی ہوں۔ اور مجھے تو لگ رہا تھا کہ شاید گیتا بھی وہ نہیں کہہ رہی جو اس کے دل میں ہے۔ وہ تیس پینتیس سال کی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اب سے پانچ دس سال پہلے تک وہ خاصی حسین رہی ہو گی۔ اس کے جسم میں بھی کشش تھی۔ عین ممکن تھا کہ ماضی قریب میں وہ بھی جارج کی عیش پرستی کا شکار رہی ہو۔

میڈم صفورا نے بتایا تھا کہ وہ بہت باتونی ہے۔ اس ملاقات میں اس کا ثبوت بھی ملا۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں جتنی باتیں ساری لڑکیوں نے کیں، اس سے دگنی صرف گیتا مکھی نے کیں۔ عمران بھی ٹھیک ٹھاک چرب زبان تھا۔ وہ گیتا کا خوب ساتھ دے رہا تھا۔ گیتا زرگاں کے بڑے بڑے لوگوں سے اپنے تعلقات کے بارے میں بتا رہی تھی اور یہ بتا رہی تھی کہ وہ رقص کی کون کون سی اکیڈمی میں ٹیچر کی حیثیت سے وزٹ کرتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر ان دونوں کی گفتگو کا رخ جارج گورا کی طرف مڑ گیا۔ گیتا ایک نمک خوار کی حیثیت سے اس کی تعریفیں کرنے لگی اور بتانے لگی کہ اپنی کچھ چھوٹی موٹی خامیوں کے باوجود وہ زبردست قسم کا سوشل ورکر ہے اور کھل کر خیر خیرات کرتا ہے۔ عمران اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

میں گیتا کے سامنے بات کرتے ہوئے خاص احتیاط کر رہا تھا۔ مجھے میڈم کی یہ بات یاد تھی کہ گیتا پیٹ کی ہلکی ہے اور اس کے سامنے بات کرتے ہوئے محتاط رہنا ہے۔

میرا خیال تھا کہ عمران کو بھی میڈم کی یہ نصیحت یاد ہو گی لیکن پھر جوشِ گفتار میں وہ کہیں کا کہیں نکل گیا۔ گیتا کی ایک بات پر وہ شدومد سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بالکل... گیتا دیوی... تم صحیح کہہ رہی ہو۔ بہت بڑا دل ہے جارج صاحب کا۔ وہ ایسے ہی بڑے نہیں بنے۔ اب ترسوں کی بات ہی لو، جب وہ یہاں آئے تھے۔ سامبر کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ طے ہو رہا تھا کہ مقابلہ کس طرح کا ہو گا۔ حضرت تابش صاحب نے جوش میں آ کر فرما دیا کہ یہ ''مرو یا مارو'' کی فائٹ ہونی چاہیے۔ یعنی FIGHT TILL DEATH۔ اب اگر کوئی کم ظرف ہوتا تو وہیں آگ بگولا ہو جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہیں پر مارا ماری شروع ہو جاتی۔ لیکن جارج صاحب نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ کہا کہ سوچ کر بتائیں گے۔ اب اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ خدانخواستہ وہ ڈر گئے۔ یہ بڑے دل گردے کی بات ہے کہ ایک بااختیار بندہ کسی بے اختیار بندے کی غلط بات حوصلے سے سنے۔ کیوں گیتا دیوی! غلط تو نہیں کہا؟''

''سولہ آنے ٹھیک ہے۔'' گیتا نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ ''مجھے تو واقعی حیرانی ہو رہی ہے کہ اس طرح کی بات ہوئی ہے... میں تو یہ کہوں گی کہ...''

www.kahopakistan.com

"میں سمجھ گیا ہوں، آپ جو کہنا چاہ رہی ہیں۔" عمران نے تیزی سے گیتا کی بات کاٹی۔ "اگر جارج صاحب نے سوچنے کا وقت لیا ہے تو اس واسطے نہیں کہ وہ گھبرا گئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ سامبر کے بارے میں جو کچھ طے ہوا ہے، وہ اسی طرح رہے اور کوئی نئی شروعات نہ ہو... یہی بات ہے نا گیتا دیوی؟"

گیتا نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر عمران کی رفتار زیادہ تیز تھی۔ "میں خود بھی فائٹنگ آرٹ کی تھوڑی بہت سمجھ رکھتا ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جارج صاحب مہافائٹر ہیں۔ ہم تابش صاحب سے صرف ہمدردی کا اظہار کر سکتے ہیں یا پھر یہ دعا کر سکتے ہیں کہ ان کے لیے جارج صاحب کے دل میں کچھ رحم پیدا ہو جائے اور وہ سامبر کی شرطوں میں کچھ ردّوبدل کر دیں۔"

"یہ بہت مشکل ہے۔" گیتا نے دبے لہجے میں کہا اور پھر ایک جھرجھری سی لی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی قینچی زبان کو پھر حرکت دیتی عمران دوبارہ پہل کر گیا۔

"میں سمجھ گیا گیتا دیوی کہ آپ کیا سوچ رہی ہیں۔ میری آنکھوں میں بھی وہی دو تاریخ والا منظر ہے... کیا نام تھا اس بدقسمت کا؟"

"اسحاق۔" گیتا نے کہا۔

"ہاں... اسحاق... میں نے اس کا آخری وقت دیکھا تھا، اللہ ہر کسی کو ایسے وقت سے بچائے۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور ایک بار پھر بولتا چلا گیا۔ گیتا کا چہرہ دیدنی تھا۔ وہ بولنا چاہ رہی تھی لیکن عمران کہیں سانس لیتا تو وہ منہ کھولتی۔ سیر کو سوا سیر ٹکر گیا تھا۔ گیتا کچھ دیر تک پیچ و تاب کھاتی رہی۔ اسی دوران میں اندر سے اسے میڈم کا بلاوا آ گیا اور وہ اپنی شاگرد لڑکیوں کے ساتھ اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی عمران مسکرانے لگا۔ "جگر! لگتا ہے گیتا دیوی کا پیٹ آج ضرور پھول جائے گا۔ ایسے لوگوں کے لیے خاموش رہنا عذاب سے کم نہیں ہوتا۔"

میں غصے میں کھول رہا تھا۔ جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ تو نے کیا ڈراما کیا ہے بھئی۔ میڈم نے سمجھایا بھی تھا کہ گیتا کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرنی۔ تو نے سارا کچا چٹھا کھول دیا۔ یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ میں نے جارج کو "مرو یا مارو" والی تجویز دی ہے؟"

"یار! اس میں بُرائی ہی کیا ہے؟ لیکن اگر تم ناراض ہوتے ہو تو میں اپنے الفاظ واپس لے لیتا ہوں۔" وہ اٹھ کر چل دیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"الفاظ واپس لینے۔" وہ معصومیت سے بولا۔

"دیکھو، تم دوسروں کو بے وقوف سمجھنے کی عادت چھوڑ دو۔ مجھے بتاؤ تم نے گیتا کے سامنے یہ سب کچھ کیوں کہا ہے؟"

"اچھا... تم بتاؤ، تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے کیوں کہا ہے؟" اس نے جوابی سوال جڑ دیا۔

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ تم یہ بات پھیلانا چاہ رہے ہو۔"

"کیوں؟"

"شاید تم سب کو بتانا چاہتے ہو کہ میں نے دلیری دکھائی ہے اور جارج کو "مرو یا مارو" کا چیلنج دیا ہے۔"

"ونڈر فل، یار! تمہارے ہاتھ چومنے کو دل چاہتا ہے۔ تم واقعی جینئس ہو۔ میرے اندر سے ایسی عقل مندی ڈھونڈ نکالی جو میرے میں تھی ہی نہیں۔ ویسے یہ بات ہے تو بڑی زبردست۔ ہر کس و ناکس کو پتا چل جائے گا کہ تم نے اس لڑائی میں جارج کو "مرو یا مارو" والا چیلنج دیا ہے۔ اب اس کے لیے اس چیلنج کو قبول نہ کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ بہت خوب یار... بہت خوب۔"

میں اسے گھورتا رہا۔ کبھی اس پر طیش آتا، کبھی اس کی چالاکی کی تعریف کرنے کو دل چاہتا۔ وہ ایسا ہی گورکھ دھندا تھا۔ کبھی سیدھا سادہ، کبھی جلیبی کی طرح گول گول۔ یقینی بات تھی کہ اس نے گیتا سے جو کہا، پلاننگ کے ساتھ کہا تھا۔

اس پلاننگ کا نتیجہ صرف پندرہ بیس گھنٹے میں سامنے آ گیا۔ اگلے روز صبح ناشتے پر میڈم اپنے کتّے سمیت آ دھمکی۔ اس نے بتایا۔ "زرگاں میں کھلبلی ہے۔ یہ بات پھیل گئی ہے کہ سلطانہ راجپوت کے "پاکستانی پتی" نے جارج گورا کو سامبر کے لیے تجویز دی ہے کہ یہ لڑائی کسی ایک فریق کی موت تک جاری رہے۔"

"یہ بات پھیلی کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"آئی ڈونٹ نو۔ اس کا پتا تو جارج کے علاوہ بس ہم دو تین لوگوں کو تھا۔ بہرحال جو بھی ہے... اب یوں لگ رہا ہے کہ اس حوالے سے جارج کا فیصلہ چند گھنٹوں میں ہی سامنے آ جائے گا۔"

جارج کا فیصلہ تو سامنے نہیں آیا تاہم رات نو دس بجے کے لگ بھگ میڈم صفورا ہمارے بیڈ روم میں آئی۔ میں اور عمران اس وقت مونگ پھلی کھانے اور باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ ہماری گفتگو کا موضوع ہزاروں لوگوں کے سامنے اسحاق کی دردناک موت ہی تھی۔ وہ منظر کوشش کے باوجود ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ اس کی بے کسی، اس کا کرب، اَن گنت مشتعل لوگوں کے درمیان وہ یکسر تنہا اور زخم زخم تھا۔

میڈم کے آتے ہی ہم خاموش ہو گئے۔ وہ بولی۔ "تم لوگ راج بھون میں ہلچل مچا کر یہاں آرام سے بیٹھے ہوئے ہو۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی پنڈت مہاراج یہاں آئے ہوئے تھے۔ کسی خاص الخاص موقع کے سوا وہ کم ہی خود چل کر کسی کے پاس آتے ہیں۔ ان کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ ان پر ججمنٹ کی بھاری ذمے داری آن پڑی ہے۔ وہ خود کو پھنسا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ اگر درست فیصلہ دیتے ہیں تو حکم جی سمیت جارج کے خیرخواہ ناراض ہوتے ہیں اور غلط فیصلہ دے نہیں سکتے کیونکہ سب کچھ پرانی کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ جو لوگ دھرم کو سمجھتے ہیں، وہ اس فیصلے کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔"

"کیا آپ سامبر کی لڑائی کی بات کر رہی ہیں؟"

میڈم نے اثبات میں سر ہلایا۔ اپنے بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں چلا کر بولی۔ "یہ بات پوری طرح پھیل گئی ہے کہ سلطانہ کے شوہر نے سر جارج کو "مرو یا مارو" کا چیلنج دیا ہے۔ اب سامبر کے پرانے اصولوں کے مطابق جارج کو تابش کی یہ للکار قبول کر لینی چاہیے... اور یہی دلیرانہ فیصلہ بھی کہلائے گا مگر کچھ لوگ ایسا نہیں چاہتے۔ ان کا پوائنٹ آف ویو یہ ہے کہ یہ دو "ہم رتبہ" افراد کا مقابلہ نہیں ہے۔ ایک عام شخص ہے، دوسرا ریاست کا ایک اہم ترین فرد ہے۔ اس پر بہت سی ذمے داریاں ہیں، بے شمار لوگوں کی بہتر زندگی اس کی سلامتی سے وابستہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسی سوچ رکھنے والے زیادہ تر لوگ وہی ہیں جن کا تعلق حکمراں طبقے اور ہائی جینٹری سے ہے۔"

"اب پنڈت مہاراج کیا کہتا ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"میں نے بتایا ہے نا کہ وہ پھنس گیا ہے۔ اب اس مسئلے کو حل کرنے کی ساری ذمے داری اس پر ڈال دی گئی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کو لاء کی تشریح کرنی ہے اور یہ فیصلہ دینا ہے کہ جارج، تابش کا مطالبہ پورا کرنے کا پابند ہے یا نہیں۔ اب شاید وہ اس اہم "ججمنٹ" سے فرار حاصل کرنا چاہ رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی درمیانی راستہ نکل آئے۔"

"درمیانی راستہ؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، وہ مجھ سے یہی بات کرنے کے لیے آیا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ اگر تم خود ہی اپنے اس مطالبے سے دست بردار ہو جاؤ تو فیصلے کی ضرورت ختم ہو جائے گی۔ یعنی تم کہہ دو کہ تم جارج سے "مرو یا مارو" کی فائٹ نہیں چاہتے ہو۔"

"اس کے بدلے میں مجھے کیا حاصل ہو گا؟ مجھے تو ہارنے کی صورت میں سولی ہی چڑھنا ہے۔"

"میں نے بھی پنڈت مہاراج سے یہی بات کہی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ ہو سکتا ہے، وہ اس سلسلے میں حکم جی سے تھوڑی بہت رعایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔"

"یعنی مجھے دو چار گھنٹے کے لیے سولی پر لٹکانے کے بجائے عمر بھر کے لیے لٹکا دیا جائے۔ زرگاں کی جیل میں ڈال دیا جائے... نہیں میڈم... مجھے یہ کڑی سزا منظور نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ جو بھی ہونا ہے، بس ان دو چار دنوں میں ہو جائے۔" میرا لہجہ حتمی اور فیصلہ کن تھا۔

میڈم نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر وہ عمران کو دیکھ کر بولی۔ "تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟"

چند لمحوں کے لیے میری اور عمران کی نگاہیں ٹکرائیں۔ ایک بجلی سی کوندی۔ یہ وہی بجلی تھی جو ہمیں ہر خطرے سے بے نیاز کر دیتی تھی۔ جو ہمیں یاد دلاتی تھی کہ ہم موت کے آگے نہیں پیچھے بھاگنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میرا فیصلہ وہی ہو گا میڈم جو تابش کا ہو گا۔"

"تابش تو فیصلہ دے چکا ہے۔"

"تو میں بھی دے رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ ٹھیک کہہ رہا ہے میڈم! سزا میں رعایت کے نام پر جارج کی جیل میں زندگی اور موت کے درمیان لٹک جانے کے بجائے آناً فاناً موت کو گلے لگانا اس کے لیے بہتر رہے گا۔"

میڈم کی آنکھوں میں ایک تعجب سا نظر آنے لگا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر اور دھواں فضا میں چھوڑ کر بولی۔ "بہرحال... تم لوگ کل تک اس بارے میں مزید سوچ لو۔"

"سوچ لیا میڈم۔" میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "میرا جواب ایک دن بعد بھی یہی ہو گا اور ایک ماہ یا ایک سال بعد بھی یہی۔ آپ پنڈت کو بتا دیں کہ میں اپنے پورے ہوش و حواس سے اپنے مطالبے پر قائم ہوں۔"

میڈم چلی گئی۔ میں نے عمران کی طرف دیکھا اور عمران نے میری طرف۔ میں یونہی تو اس پر ناز نہیں کرتا تھا۔ وہ میری رگِ جاں سے قریب تر تھا۔ بارونداجیکی نے مجھے جسمانی طور پر مضبوط بنایا تھا لیکن عمران نے اس سے بڑا کام کیا تھا۔ اس نے مجھے روحانی اور ذہنی استقامت دی تھی۔ مجھے اندر سے بدلا تھا۔ اب بھی وہ اس نازک موقع پر مجھے ایک ایسی توانائی دے رہا تھا جسے لفظوں میں بیان کرنا شاید میرے لیے ممکن نہ ہو۔ وہ

www.kahopakistan.com

میرا دل بن کر میرے دل میں دھڑک رہا تھا۔ وہ میرے بازو بن گیا تھا، میرا حوصلہ بن گیا تھا۔

میری آنکھوں میں نمی آگئی۔ ”تھینک یو عمران۔“ میں نے دل کی گہرائی سے کہا۔

وہ چند لمحے چپ رہا پھر ایک دم پٹری سے اتر گیا۔ ”تھینک یو کس بات کا؟ یہ تو میرا پیشہ ہے یار۔ لوگوں کو ذرا بھڑکا کر ایک دوسرے سے لڑانا اور پھر کھٹا کھٹ بریکنگ نیوز بناتے جانا۔ اب دیکھنا، فساد پلس پر کیسی کیسی لیڈ چلے گی... اور اس کے بعد تبصرے، تجزیے اور ترڈپے چلیں گے۔ ترڈپے سمجھتے ہو نا تم؟ ایسے ٹاک شوز جن میں سنجے دانشور اچھل اچھل کر تڑف تڑف کر لڑتے ہیں۔ اب ذرا تم سوچو، ایک تو دانشور ہو اوپر سے گنجا... وہ کیا قیامت نہ ڈھائے گا۔ بس مزہ آجائے گا۔ یار! آٹھ دس کروڑ تو ہم یہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی بنا لیں گے۔“

”یہ پنڈت مہاراج کی منافقت پر غور کیا ہے تم نے؟“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”یار! غور کرنے کے لیے ناظرین جو ہوتے ہیں۔ ہمارا کام تو بس پسوڑی ڈالنا ہے اور وہ ہم انشاء اللہ ڈالیں گے۔“

میں نے اس کی طنزیہ گفتگو کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ وہی منافقت ہے جو ہر مذہب کے کٹر لوگوں میں نظر آتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ اپنے علم کا سارا زور مذہب کو موم کی ناک بنانے پر صرف کر دیتے ہیں۔ اپنے گرو سورگ باشی سو بھاش کی کارستانیاں تو تمہیں یاد ہیں نا؟ اس کے دوغلے پن کی ایک چھوٹی سی مثال وہ گرم ٹھنڈے پانی والا معاملہ تھا۔ اپنی سہولت کے لیے اس نے ادھ بجھے انگاروں کو آگ کی تعریف سے خارج کر دیا تھا۔ اب دیکھو، یہی کچھ یہاں یہ لمبی زلفوں والا پنڈت مہاراج کر رہا ہے۔ ایک مشکل فیصلے سے بچنے کے لیے ”بیک ڈور“ کارروائیاں کر رہا ہے۔“

ہماری گفتگو کافی دیر جاری رہی پھر ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ اب میری طرح عمران بھی سخت قالین پر ہی سوتا تھا، ہاں وہ لحاف ضرور اوڑھتا تھا۔

ہم لال بھون کی اونچی دیواروں میں بند تھے۔ چاروں طرف کڑا پہرا تھا۔ پھر بھی زرگاں کی صورت حال کی کچھ جھلکیاں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ان جھلکیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ زرگاں کی فضاؤں میں ارتعاش اور ہلچل ہے۔ یہ ہلچل دو طرح کی تھی۔ ایک تو یہی جارج اور میری لڑائی والا معاملہ تھا۔ اس لڑائی کو یوں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی کہ اس سے پہلے میں تل پانی میں رنجیت [illegible] شخص کو ناکوں چنے چبوا چکا تھا۔ دوسری ہلچل ساتویں [illegible] سالانہ جشن کی تھی۔ یہ جشن بھی چند روز میں پہنچا چاہتا تھا [illegible] کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہماری معلومات کے مطابق زر[گاں] کے گلی کوچوں کو سجایا سنوارا جا رہا تھا۔ مختلف کھیل تماش[وں کا] انتظام ہو رہا تھا۔

ایسے ہی کچھ کھیل تماشوں کی تیاری لال بھون کے [اندر] بھی ہو رہی تھی۔ میں حسب معمول دوپہر سے ذرا پہلے جم [میں] ورزش اور مشق کے لیے چلا گیا۔ عمران کچھ دیر میرے ساتھ [رہا] پھر وہ گیتا لکھی کے ساتھ ایک پھول دار روش پر ٹہلتا ٹہلتا [دوسری] طرف نکل گیا۔ میں اکیلا ہی لگا رہا۔ میرے جسم کے ہر [مسام] سے پسینا پھوٹنے لگا اور رگ پٹھے اپنی برداشت کی آخری [حد] چھونے لگے۔ میں اپنی دیوانہ وار کوشش سے ہر روز اس [حد کو] تھوڑا سا وسیع کر دیتا تھا۔ دوران مشق میں جم کے دروا[زے] کھڑکیاں بند کر لیتا تھا کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ لال بھ[ون] کے گارڈز اور ملازمین کھڑکیوں اور دروازوں کی جھر[یوں] سے مجھے دیکھنا پسند کرتے تھے۔

عمران کو اوجھل ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ ورزش کر کے میں نے پسینا پونچھا۔ کچھ دیر تک سانسیں درست [کیں] اور پھر عمران کی تلاش میں نکلا۔ وہ یہاں بھی بڑی تیزی [سے] اپنی جگہ بنانے لگا تھا۔ کبھی کسی سے گپ شپ کرتا نظر آتا [اور] کبھی کسی کا کوئی مسئلہ حل کرنے میں لگا ہوتا تھا۔ لال بھ[ون] میں سب کو یہی معلوم تھا کہ وہ میڈم کا خصوصی ملازم [ہے۔] اسے مارشل آرٹ کی کچھ سمجھ بوجھ ہے اور میڈم کا ارادہ [اسے] اپنے ذاتی محافظوں میں شامل کرنے کا ہے۔

میں عمران کو ڈھونڈتا ہوا اندرونی حصے میں پہنچا تو وہ ایک بڑے ہال کمرے میں ملا۔ یہاں بڑی رونق تھی۔ [کچھ] لڑکے لڑکیوں کی ایک ٹولی بازی گری اور شعبدہ بازی [کی] ریہرسل کر رہی تھی۔ لڑکے لڑکیوں کی عمریں پندرہ بیس کے درمیان رہی ہوں گی۔ میں آج انہیں پہلی بار یہاں دیکھ رہا تھا۔

ایک طرف جمناسٹک کے انتظامات تھے۔ ایک [لڑکا] تنے ہوئے رسّے پر چلا جا رہا تھا۔ پریوں کے انتخاب [میں] حصہ لینے والی چالیس عدد لڑکیاں بھی اس ریہرسل کو انجو[ائے] کر رہی تھیں۔ ایک جانب منیجر مدن بھی بیٹھا تھا۔ مدن [کے] قریب عمران ایک نوخیز لڑکی کے ساتھ تند و تیز گفتگو [میں] مصروف تھا۔ لڑکی نے سرخ رنگ کا نیم عریاں لباس پہن[ا ہوا] تھا۔

میں نے قریب کھڑی گیتا سے پوچھا۔ ”کیا معاملہ ہے؟“

وہ بولی۔ ”یہ لال کپڑوں والی لڑکی بہت زبردست بازی گر ہے۔ اسے یہاں لٹل مس انڈیا کہا جاتا ہے۔ تمہارا دوست خوامخواہ اس کے ساتھ میچ ڈال کر بیٹھ گیا ہے۔“

”کیسا میچ؟“

”یہ لڑکی لوہے کے اس چکر کے اوپر کھڑی ہو کر اسے اپنے پاؤں سے چلاتی ہے اور ساتھ ساتھ کرتب دکھاتی ہے۔ تمہارا دوست کہتا ہے کہ وہ بھی ایسا کر لے گا۔“ گیتا نے تھوڑی دور پڑے ایک آہنی چکر کی طرف اشارہ کیا۔ یہ کڑا نما چکر زمین سے قریباً آٹھ فٹ اونچا تھا۔ اسے ایک چھ سات انچ چوڑی آہنی پٹی کو گول کر کے بنایا گیا تھا۔ اس پر چڑھنے کے لیے لکڑی کا ایک اسٹول بھی پڑا تھا۔

بظاہر اس چکر کے اوپر چڑھ کر اسے پاؤں سے گول گول دھکیلنا اور ساتھ ساتھ کوئی کرتب دکھانا کافی مشکل کام لگتا تھا لیکن عمران جیسے شخص کے لیے ہرگز مشکل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں کوئی جانتا نہیں تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک ماہر فنکار ہے اور اس سے کئی گنا زیادہ مشکل کام کر سکتا ہے۔

معاملہ کافی گرما گرم تھا۔ لٹل مس انڈیا کے حمایتی اس کے حق میں چلا رہے تھے اور عمران کو دعوت دے رہے تھے کہ وہ اپنا دعویٰ ثابت کر کے دکھائے۔ سترہ اٹھارہ سالہ نوخیز لڑکی بھی لال بھبوکا ہو رہی تھی۔ وہ زور سے بولی۔ ”اچھا تم باقی چھوڑو، پہلے والا آئٹم ہی کر کے دکھا دو۔“

”او کے۔“ عمران نے سینہ تان کر کہا۔ ”میں کروں گا۔“

”لو، میں تمہارے لیے ایک بار پھر دُہرا دیتی ہوں۔“ لڑکی تند لہجے میں بولی۔

گیتا لکھی نے ایک چھوٹے اسٹول پر کھڑے ہو کر اناؤنسمنٹ کے انداز میں کہا۔ ”لو بھئی، لڑکے لڑکیو! لٹل مس انڈیا بمقابلہ بگ مسٹر پاکستان۔“

”ہو ہا“ کا شور بلند ہوا... سرخ کپڑوں والی نوخیز لڑکی پھرتی سے اسٹول پر چڑھی اور پھر لوہے کے چکر پر کھڑی ہو کر توازن درست کرنے لگی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ دونوں طرف پھیلا دیے تھے۔ ایک دوسری لڑکی نے اس کی دونوں ہتھیلیوں پر دو لمبی تلواریں رکھ دیں۔ یہ بالکل سیدھی تلواریں تھیں۔ لڑکی نے رومن اسٹائل تلواریں اپنی دونوں ہتھیلیوں پر عمودی رخ سے کھڑی کیں اور انہیں بیلنس کر لیا پھر وہ اپنے پاؤں کے ساتھ، چھ سات انچ چوڑے آہنی چکر کو گول گول دھکیلنے لگی۔ اس نے تماشائیوں کے درمیان دو راؤنڈ مکمل کیے۔ تلواروں کو ہتھیلیوں پر بیلنس رکھنے کے ساتھ ساتھ چکر کو دھکیلنا واقعی مشکل کام لگتا تھا۔

لڑکی نے دو راؤنڈ مکمل کرنے کے بعد تلواریں پھینکیں اور خوب صورت انداز میں قلابازی لگا کر فرش پر آگئی۔ تالیوں سے ہال گونج گیا۔

اب عمران کی باری تھی۔ اس نے پہلے فرش پر کھڑے ہو کر تلواروں کو اپنی ہتھیلیوں پر کھڑا کیا۔ پھر پورے کرتب کے لیے اسٹول پر چڑھ کر چکر پر کھڑا ہو گیا۔ کرتب مشکل تھا لیکن عمران جیسے شخص کے لیے نہیں۔ اس نے تلواروں کو ہتھیلیوں پر کھڑا کر کے بیلنس کیا پھر آہستہ آہستہ آٹھ فٹ اونچے چکر کو اپنے پاؤں سے دھکیلنے لگا۔ دو چار لوگ عمران کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے مگر اکثریت لٹل مس انڈیا کی حمایتی تھی۔ یہ لوگ عمران کو ”ہوٹ“ کر رہے تھے اور ڈرانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

عمران نے ایک راؤنڈ مکمل کیا پھر دوسرا شروع کیا اور تب وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ کم از کم مجھے تو ہرگز نہیں تھی۔ عمران لڑکھڑایا، سنبھلنے کی کوشش کی۔ ایک تلوار گر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا توازن دوبارہ حاصل کرتا، آہنی چکر اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گیا... وہ آٹھ فٹ کی بلندی سے اڑتا ہوا نیچے آیا۔ ایک دم شور بلند ہوا، اس میں قہقہے بھی شامل تھے۔ عمران نیچے بیٹھے تماشائیوں پر گرا تھا۔ یہ وہی، پریوں کے انتخاب میں حصہ لینے والی دوشیزائیں تھیں۔ جو ایک دو لڑکیاں اس کے نیچے آئیں، وہ بُری طرح چلائیں۔ عمران کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے نیچے آنے والی لڑکیوں میں سے ایک زخمی ہوئی تھی۔ عمران نے جو تلوار پکڑ رکھی تھی، اس کی نوک لڑکی کی گردن کو چھیلتی ہوئی گزر گئی تھی۔ لڑکی کا خون رسنے لگا تھا اور وہ تکلیف سے دُہری ہو گئی تھی۔ میں دیکھ کر بُری طرح ٹھٹکا۔ یہ ثمرین تھی۔ میں تیزی سے اس کی طرف گیا۔ زخم گہرا نہیں تھا لیکن پانچ چھ انچ لمبا اور قریباً دو انگل چوڑا تھا۔ وہ گردن سے شروع ہو کر اس کے کان کی لو تک چلا گیا تھا۔

”ویری ساری... ویری ساری۔“ عمران بار بار کہہ رہا تھا۔

”اوہ گاڈ۔“ گیتا زخم دیکھ کر بڑبڑائی۔

اس نے اپنی ساڑی کے پلو سے ثمرین کا خون روکا اور اسے لے کر ہال سے نکل گئی۔ سرخ کپڑوں والی لڑکی کے حمایتی، فاتحانہ نعرے لگا رہے تھے۔ عمران پہلے تو کھسیانا نظر آیا... پھر اس نے کھلے دل سے ہار مان لی اور تند و تیز فقروں کی

www.kahopakistan.com

طرف سے کان لپیٹ کر وہاں سے نکل گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ہم آگے پیچھے کمرے میں آئے۔

''یہ کیا کیا تم نے؟'' میں نے سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔

''وہی جو تم نے دیکھا ہے۔''

''مسخری مت کرو عمران... مجھے بتاؤ ایسا کیوں کیا ہے؟''

''یار! کیا خوبرو لڑکیوں کے اوپر گرنا تمہارا ہی حق ہے۔ آخر ہم بھی سینے میں دل رکھتے ہیں۔ جب گر ہی گئے تو سوچا کہ چلو کسی اچھی جگہ پر گریں...''

''تم بکواس کر رہے ہو... تم... تم... جان بوجھ کر گرے ہو۔ جان بوجھ کر ہارے ہو۔ کیا ضرورت تھی اس طرح اپنی بے عزتی کرانے کی... اور پھر اس لڑکی کو جو چوٹ لگی ہے، اس کا ذمے دار کون ہے؟''

''ذمے دار کوئی نہیں... ایسا حادثہ تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے یار۔ جہاں تک بے عزتی کی بات ہے، ہم پہلے ایسے کون سے نواب عزت بیگ ہیں۔''

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو... میرا ٹرم کرنے کا ارادہ ہے کیا؟'' وہ بولا۔

میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''تم بہت اونچی شے ہو عمران... تم نے... جان بوجھ کر ثمرین کو زخم لگایا ہے نا؟''

''توبہ توبہ'' وہ گال پیٹنے لگا۔ ''اتنا بڑا الزام اور وہ بھی جمعتہ المبارک کے دن۔''

''یہ الزام نہیں... حقیقت ہے... میں سمجھ گیا ہوں... سب سمجھ گیا ہوں۔ تم نے کہا تھا ثمرین بچ سکتی ہے... اور تم نے اس کو بچایا ہے... تم نے اسے داغ دار کیا ہے... کیونکہ تم جانتے ہو کہ بے داغ اور بے عیب لڑکی ہی فیری سلیکشن میں حصہ لے سکتی ہے۔''

اس نے دیدے گھمائے۔ ''زبردست... ونڈرفل۔ یار! تم واقعی سپر جینئس ہو۔ بندے کے اندر ایسی عقل مندیاں ڈھونڈ لیتے ہو جو اس نے کی ہی نہیں ہوتیں۔ میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ بھئی واہ... یہ مجھ سے کیا بے ساختہ کارنامہ سرزد ہو گیا ہے۔ بھئی واہ۔''

مجھے پتا تھا، وہ بدستور بکواس کر رہا ہے۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''تم کو سمجھنا بڑا مشکل ہے عمران... پتا نہیں کیا شے ہو تم؟''

''میں کوئی شے نہیں۔ بس یہ تمہارا حسنِ نظر ہے شہزادے۔ مجھے ایسی فلموں کا ہیرو بنا دیتے ہو جن کا میں نے صرف نام سنا ہوتا ہے۔ تمہیں یاد ہے، فلم پاکیزہ میں دلیپ کمار کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

میں خاموش رہا۔ وہ میری طرف سے خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھ گیا۔ تم کہنا چاہ رہے ہو کہ فلم پاکیزہ میں تو دلیپ کمار تھا ہی نہیں... بھئی یہی ہوا تھا نا۔ اسے فلم میں لیا ہی نہیں گیا اور اس کی جگہ راج کمار کو لے لیا گیا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ فلم آن میں بھی ہوا تھا...'' وہ ایک بار پھر اوٹ پٹانگ بولتا چلا گیا۔

...وہ رات خاصی تاریک تھی۔ میں اور عمران پہلو بہ پہلو قالین پر لیٹے تھے۔ وہ دو دن سے زبردستی مجھے بھی لحاف اوڑھا رہا تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے لیکن دونوں کے ذہنوں میں یقیناً ایک ہی طرح کے خیالات گھوم رہے تھے۔ وہ مقابلہ جس نے دیکھتے ہی دیکھتے زرگاں میں غیر معمولی شہرت حاصل کر لی تھی۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ صیاد خود اپنے دام میں آ گیا ہے۔ اب بات خود جارج کے ہاتھ سے بھی نکلی ہوئی لگتی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ اس مقابلے کی نوعیت اور دیگر شرائط کے بارے میں جو فیصلہ بھی ہونا ہے، وہ پنڈتوں، پنچوں اور دیگر عمائدین نے کرنا ہے اور آخری رائے پنڈت مہاراج کی ہوتی ہے۔

رات کا پتا نہیں وہ کون سا پہر تھا جب میری آنکھ کھلی۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی، فقط ایک کھڑکی میں سے تھوڑی سی روشنی اندر آ رہی تھی۔ مجھے عمران نے ہی ہلا کر جگایا تھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ کسی شکاری جانور کی طرح چوکنا اور چوکس نظر آتا تھا۔ اس نے دونوں لحافوں کو قالین پر اسی طرح پڑا رہنے دیا جیسے ان کے نیچے کوئی لیٹا ہو۔ پھر وہ قالین پر اوندھے منہ رینگتا ہوا غسل خانے کے دروازے کی طرف گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ میری ساری حسیات آناً فاناً بیدار ہو گئی تھیں اور میں سمجھ گیا تھا کہ ہم کسی شدید خطرے میں ہیں۔ چند ہی سیکنڈ بعد ہم تاریک سرد غسل خانے کے اندر تھے۔ عمران نے دروازے میں تھوڑی سی جھری رہنے دی اور باہر دیکھنے لگا۔ یہی وقت تھا جب مجھے کمرے کی کھڑکی کے پاس کسی سائے کی حرکت محسوس ہوئی...

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

ڈبل رول

سیرینا راض

پروفیشن کوئی بھی ہو... اس کی باریکیوں کو سمجھے بغیر کامیابی قدم نہیں چومتی... وہ بھی فنونِ لطیفہ سے وابستہ تھا... اور چاہتا تھا کہ اس کا شمار مایہ ناز فنکاروں میں کیا جائے... اس کھوج و جستجو نے اسے ایک نئے فن سے متعارف کرا دیا...

ایک ہی شخصیت کے قالب میں ڈھلے دو کرداروں کے ملاپ کا انوکھا کھیل

کینی ماؤنٹ فورڈ کی دلی آرزو تھی کہ اسے بھی اچھا اداکار تسلیم کیا جائے۔ ڈراما اسکول سے تربیت مکمل کرنے کے بعد اس نے ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھایا تھا۔ اس نے تھوڑا بہت تھیٹر میں بھی کام کیا تھا لیکن زیادہ وقت ٹی وی کو دیا کیونکہ وہاں سے اچھی آمدنی ہوتی تھی۔ وہ تیس سال کا ہو چکا تھا لیکن یہ وہ منزل نہیں تھی جس کا اس نے خواب دیکھا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جب ان کے پیشے کی سچائی اور وقار کی بات ہو رہی ہو تو وہ دوسرے اداکاروں کے درمیان سب سے نمایاں نظر آئے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ تھیٹر پر زیادہ سے زیادہ کام کرے۔

www.kahopakistan.com

وہ جانتا تھا کہ ڈراما جتنا خشک اور غیر واضح ہوگا اتنا ہی ایکٹر کے وقار میں اضافہ ہوگا۔ بالکل تجریدی آرٹ کی طرح جس میں دیکھنے والوں کے پلّے کچھ نہیں پڑتا مگر پھر بھی وہ مصوّر کے کمالِ فن کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ان گنے چنے ڈائریکٹرز میں سے کسی ایک کے ساتھ کام کیا جائے جنہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ دیکھنے والے ان کے کام سے کتنا لطف اندوز ہوتے ہیں چنانچہ کینی ماؤنٹ فورڈ نے بھی اپنے آپ کو ذہنی طور پر کسی ایسے ہی ہدایت کار سے ملنے کے لیے تیار کرلیا۔

اس کے لیے آگے بڑھنے کا یہ ایک اچھا موقع تھا۔ ایک کامیاب سٹ کام میں بارمین کا کردار ادا کرنے پر اسے اتنی آمدنی ہوگئی کہ وہ اپنے مکان کی قسطیں ادا کرسکے۔ اس کے علاوہ اسے اپنی گرل فرینڈ اداکارہ لیزے کی رفاقت میسر تھی جس کی وجہ سے اس کا نام بھی اخبارات و جرائد میں سرخیوں کی زینت بن رہا تھا۔ وہ ایک طویل دورانیے کے سوپ میں کام کررہی تھی اور اس کی وجہ سے اس کی شہرت کی بھوک بھی عارضی طور پر ختم ہوگئی تھی۔ انہیں پیسوں کی ضرورت نہیں تھی اور کینی اس پوزیشن میں تھا کہ وہ فن کی خاطر کسی آرٹ ڈرامے میں کام کرسکے۔

ان دنوں برطانوی تھیٹر میں چارلی فینٹن نامی ڈائریکٹر کی بڑی دھوم تھی۔ اس قبیل کے دوسرے ہدایت کاروں کی طرح وہ بھی تحریر شدہ مسوّدے کا ذرا بھی خیال نہ رکھتا اور سین میں برجستگی اور بے ساختگی لانے کی خاطر لکھے ہوئے حصوں کو مسترد کردیتا۔ چارلی کردار نگاری کے حوالے سے بھی بڑی گہری سوچ رکھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کسی بھی کردار کو ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اداکار اپنے تخیل اور مشاہدے کا سہارا لینے کے بجائے خود اس کردار کا روپ دھارے۔ مثلاً اگر ایک ایکٹر اس کے ڈرامے میں دودھ والے کا کردار ادا کررہا ہے تو وہ اسے تین مہینے کے لیے گھر گھر دودھ پہنچانے کے کام پر لگا دیتا یا کوئی اداکارہ طوائف کا رول پلے کررہی ہوتی تو اسے ریڈ لائٹ ایریا کی گلیوں میں کھڑے ہوکر گاہکوں کو اپنی جانب متوجہ کرنا ہوتا۔ اسی پر بس نہیں بلکہ چارلی خود گاہک کا روپ دھار کر اس کے پاس جاتا... صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ اپنا کام خوش اسلوبی سے کررہی ہے یا نہیں۔

جب اس کے ڈرامے کے اداکار پوری طرح اپنے آپ کو کرداروں میں ڈھال لیتے تو کئی ہفتوں تک ریہرسل ہوتی پھر ہدایت کار ایڈیٹنگ کے بعد اسکرپٹ کے بہترین حصوں کو علیحدہ کرلیتا۔ جب ڈراما شروع ہوجاتا تو اداکاروں کے مکالموں پر مشتمل یہ مسوّدہ کتابی شکل میں شائع کردیا جاتا اور اس کی رائلٹی چارلی فینٹن کو ملتی۔ ان حربوں سے اس کی عزت اور عظمت میں کچھ اور اضافہ ہوجاتا۔ چارلی کی کارکردگی سے متاثر ہوکر خوب صورت اداکارائیں بھنورے کی طرح اس کے گرد منڈلاتی رہتی تھیں جبکہ عزت اور شہرت کے متلاشی اداکار اس کے ساتھ کام کرنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ انہی میں سے ایک کینی بھی تھا۔

بالآخر اسے چارلی سے ملاقات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ وہ نیشنل تھیٹر میں ہونے والے ڈرامے کا پہلا شو تھا حالانکہ لیزے کے لیے یہاں ہونے والے اس ڈرامے میں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا لیکن وہ اس امید پر چلی آئی کہ کوئی فوٹو گرافر اس کی تصویر اتار لے اور وہ کسی رسالے میں شائع ہوجائے۔ جیسے ہی شو کا اختتام ہوا تو چارلی اپنے مداحوں میں گھرا ملحقہ بار تک چلا آیا اور اپنی عادت کے مطابق شیکسپیئر کی ڈراما نگاری میں خامیاں نکالنے لگا۔ موقع دیکھ کر کینی کے ایک اداکار دوست نے اس کا تعارف چارلی فینٹن سے کروادیا۔ اس نے کینی کو نظرانداز کرتے ہوئے اس کی گرل فرینڈ لیزے کو غور سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں نے تمہارا کچھ کام دیکھا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اتنی اچھی اداکاری سوپ کے کچرے میں کس طرح چمک رہی ہے۔''

لیزے اپنی تعریف سن کر شرما گئی اور اس کے جواب میں ایک دلکش مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ یہ اس کے لیے زیادہ مشکل نہ تھا، وہ خود بھی خوب صورت تھی اور ہر کام بڑی خوب صورتی سے کرتی تھی۔ کینی کے لیے یہ صورتِ حال خاصی حوصلہ افزا تھی۔ اگر وہ اس کی گرل فرینڈ کے کام سے واقف ہے تو یقیناً چارلی نے اسے بھی سٹ کام میں کام کرتے ہوئے دیکھا ہوگا لیکن یہ خوش فہمی زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکی۔ ہدایت کار نے چشمے کی اوٹ سے اسے دیکھا اور بولا۔ ''ہاں، میں تمہارا نام جانتا ہوں۔ ٹی وی پر کام کرنے کے باوجود ابھی تک مکان کی قسطیں ادا کررہے ہو۔''

''ہاں، لیکن اب میں اپنی سمت بدلنا چاہتا ہوں۔''

''کس جانب؟''

''میں سنجیدہ تھیٹر کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں، سب یہی کہتے ہیں۔'' چارلی نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں واقعی اس بارے میں سنجیدہ ہوں۔''

''کینی! میں نہیں سمجھتا کہ تم سنجیدہ تھیٹر کے لیے موزوں ہو۔ تمہاری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ اوسط درجے کا کام کرکے پیسے بناتے رہو۔''

''میں اس سے اتفاق نہیں کرتا اور سنجیدہ تھیٹر کرنا چاہتا ہوں۔''

''واقعی۔'' ہدایت کار نے سر سے پاؤں تک اس کا تنقیدی جائزہ لیا اور بولا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ تم یہ کام کرسکو گے۔''

''تم مجھے آزما کر تو دیکھو۔''

چارلی لمحہ بھر کو خاموش رہا پھر بولا۔ ''میں ایک نئے پروجیکٹ پر کام شروع کررہا ہوں۔ اس کا تعلق لندن کے جرائم پیشہ گروہوں سے ہے اور اس میں کام کرنے والے اداکاروں کو ان گروہوں میں داخل ہوکر انہی جیسا بننا ہوگا۔''

اس موقع پر لیزے نے اسے خفیف سا اشارہ کیا جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ بات کو یہیں ختم کردے لیکن کینی نے اسے مکمل طور پر نظرانداز کرتے ہوئے چارلی سے کہا۔ ''میں تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں فون پر تمہیں مزید تفصیلات سمجھا دوں گا۔'' چارلی نے باہر کی جانب نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں اپنا موبائل نمبر دے دوں؟'' کینی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''میں موبائل استعمال نہیں کرتا۔ تمہیں گھر کے نمبر پر فون کرلوں گا۔'' چارلی نے ایک بار پھر لیزے کو دیکھا اور کینی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم تین ماہ کے اندر کسی گروہ کا رکن بننے میں کامیاب ہوگئے تو تمہیں اس نئے پروجیکٹ میں کام مل سکتا ہے۔''

''ایسا ہی ہوگا۔'' کینی نے پُراعتماد انداز میں کہا۔

☆☆☆

لیزے اس خیال سے متفق نہیں تھی کہ کینی مجرموں کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے زیرِ زمین چلا جائے کیونکہ اس طرح وہ لیزے کے ساتھ تقریبات، فلموں کے پریمیئر اور ڈراموں کے افتتاحی شوز میں شرکت نہیں کرسکے گا۔ اس وقت اسے کینی کی ضرورت تھی۔ کچھ بھی ہو وہ ٹی وی کا ایک جانا پہچانا چہرہ تھا۔ اس کی جگہ وہ کسی ایسے شخص کو نہیں دے سکتی تھی جس کی کوئی شناخت نہ ہو۔ وہ جانتی تھی کہ خود اس کے کام کی صورتِ حال بھی تسلی بخش نہیں ہے۔ سوپ میں کام کرنے والوں کی فنی زندگی بے حد مختصر ہوتی ہے۔ اسکرپٹ رائٹر نے پہلے ہی اشارتاً کہہ دیا تھا کہ اس کا کریکٹر کسی بھی وقت ختم ہوسکتا ہے۔ اس متوقع خطرے سے بچنے کے لیے وہ خود ہی شو سے علیحدہ ہونے کا اعلان کرنا چاہ رہی تھی۔ ایسی صورت میں اسے کسی دوسری سیریز کی ضرورت ہوتی تاکہ وہ اپنا کیریئر آگے بڑھا سکے جبکہ مستقبل قریب میں اس کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ ایسے وقت میں اسے اپنے پارٹنر کی شہرت پر ہی انحصار کرنا پڑتا۔ اسے شوبزنس کا یہ فارمولا اچھی طرح یاد تھا کہ خود مشہور نہیں ہوسکتیں تو خبروں میں رہنے کے لیے کسی مشہور آدمی کا سہارا لو۔ اسی لیے وہ نہیں چاہتی تھی کہ کینی منظر سے غائب ہوجائے لیکن کینی نے اس کے تمام وسوسوں کو نظرانداز کردیا۔ اس کے ذہن کی سوئی بس ایک ہی نکتے پر اٹک گئی تھی کہ اسے چارلی کے دیے ہوئے چیلنج کو پورا کرنا ہے۔

اس مقصد کے لیے کینی کو کسی بھی طرح لندن گینگ میں داخل ہونا تھا جو حیران کن طور پر بہت آسان ثابت ہوا۔ اسے جرائم پیشہ افراد کے اڈوں کے گرد زیادہ عرصہ چکر نہیں لگانا پڑے۔ اسی دوران میں کسی نامعلوم شخص نے اس سے رابطہ کرکے دریافت کیا کہ کیا وہ منشیات خریدنا چاہتا ہے پھر اگلے دو ہفتوں تک وہ اس سے ہیروئن لیتا رہا۔ وہ منشیات کا عادی نہیں تھا لہٰذا اس نے یہ پیکٹ اپنے باتھ روم کے کیبنٹ میں چھپا دیے۔ پھر یوں ہوا کہ وقت پر ادائیگی نہ کرنے کی وجہ سے اسے اٹھا لیا گیا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور سیاہ شیشوں کی کار میں بٹھا کر اسے عظیم کے سربراہ کی خدمت میں پیش کردیا گیا۔

کینی سے رقم وصول کرنے کے لیے انہیں کوئی تشدد نہیں کرنا پڑا کیونکہ جیسے ہی پٹی کھولی گئی اس نے رقم کی ادائیگی کردی جو وہ اپنی جیب میں لیے پھر رہا تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی... شاید وہ کوئی گودام یا تہ خانہ تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو افراد کھڑے تھے اور سامنے قیمتی سوٹ میں ملبوس ایک کرخت صورت شخص بیٹھا تھا۔ کار میں ہونے والی گفتگو سے کینی سمجھ گیا تھا کہ ان دونوں افراد کے نام ویسلے اور ولادی میر ہیں اور وہ کرخت صورت والے کو فڈور کہہ کر بلا رہے تھے۔ وہ تینوں انگریزی میں باتیں کررہے تھے لیکن ان کا لہجہ روسیوں جیسا تھا۔

''اگر تمہارے پاس پیسے تھے تو تم نے ادائیگی کیوں نہیں کی؟'' فیڈور نے پوچھا۔ وہ اپنے حلیے اور بات چیت سے گروہ کا سرغنہ معلوم ہورہا تھا۔

''شاید اسے مار کھانے میں مزہ آتا ہے۔'' ویسلے نے کہا۔

''یہ بات نہیں ہے۔'' کینی نے پُرسکون انداز میں کہا

www.kahopakistan.com

پھر وہ فیڈور سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال تھا کہ تم سے ملنے کا یہی بہترین طریقہ ہوسکتا ہے۔“

”تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟“ فیڈور نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”میں صرف تمہارا نام جانتا ہوں لیکن یہ سمجھنے کے لیے زیادہ ذہانت کی ضرورت نہیں کہ تم اس تنظیم میں ان دونوں کے مقابلے میں اونچے درجے پر فائز ہو جو مجھے یہاں لے کر آئے ہیں۔“

کینی کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے دونوں آدمی بے چین نظر آنے لگے اور انہوں نے غصے کے مارے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ لگتا تھا کہ وہ دونوں اس پر تشدد شروع کر دیں گے۔

فیڈور نے ایک ہاتھ اٹھا کر اپنے آدمیوں کو پُرسکون رہنے کا اشارہ کیا اور کینی سے بولا۔ ”تمہارا خیال درست ہے، میں ہی اس تنظیم کو چلاتا ہوں۔“

”کیا میں اس تنظیم کا نام جان سکتا ہوں؟“

”دی سمفر پول بوائز۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے سمفر پول سے ہی اپنے کام کا آغاز کیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ یہ جگہ کہاں ہے؟“

کینی نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ”یالٹا کے نزدیک جنوبی یوکرائن کے شہر کریمیا میں۔ میرا خیال ہے کہ شاید تم کبھی وہاں نہیں گئے ہو گے۔“

کینی نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا تو وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ ایک چھوٹی جگہ ہے۔ وہاں آمدنی کے ذرائع محدود اور خطرات بے شمار تھے۔ یہاں لندن میں ہماری زندگی زیادہ آسان ہے۔“

”تمہارے گروہ میں کتنے افراد ہیں؟“

”بیس، کبھی تیس بھی ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات کچھ لوگ قابلِ بھروسا نہیں ہوتے تو انہیں تنظیم سے خارج کرنا پڑ جاتا ہے۔“

”کیا تم صرف منشیات کا کاروبار کرتے ہو؟“

فیڈور نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور فخریہ انداز میں بولا۔ ”منشیات، جسم فروشی، قرض کی وصولی، یہ ایک کثیر المقاصد تنظیم ہے لیکن تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟“

”میرا یقین کرو، میں پولیس والا نہیں ہوں۔“

”لیکن تمہارا انداز تو پولیس والوں جیسا تھا۔“

”آخر تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کر لیتے، میں پولیس والا نہیں ہوں۔ چاہو تو اپنے ذرائع سے تصدیق کر لو۔“

”مسٹر ماؤنٹ فورڈ! میرے پاس تمہاری دلیلیں سننے کے لیے وقت نہیں ہے۔“ اس نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کچھ ہی دیر بعد میری ہوم آفس میں ایک اہم سرکاری عہدے دار سے میٹنگ ہے۔ وہ میرے کچھ آدمیوں کی ویزا درخواستوں کے سلسلے میں مدد کر رہا ہے۔ تم مجھے سیدھی طرح بتا دو کہ تم نے مجھ تک پہنچنے کے لیے یہ راستہ کیوں اختیار کیا ورنہ میرے آدمی منٹوں میں تمہاری طبیعت صاف کر دیں گے۔“

کینی نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑے خطرے میں ڈال دیا تھا لیکن اب اسے گینگ لیڈر کے سامنے بے خوفی کا مظاہرہ کرنا تھا۔ ذرا سی لغزش اس کے لیے موت کا پروانہ ہو سکتی تھی۔ اس نے فیڈور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے گروہ میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔“

”تم سمفر پول بوائز میں شامل ہونا چاہتے ہو؟“ فیڈور نے حیران ہوتے ہوئے کہا جبکہ اس کے دونوں ساتھیوں نے ایک بار پھر کینی پر گھونسے تان لیے۔

کینی پر اس صورتِ حال کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے اطمینان سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔“

”لیکن میں تمہیں اپنے گروہ میں کیسے شامل کر سکتا ہوں جبکہ میں نے پہلے کہا کہ تم پولیس والے ہو سکتے ہو یا جرنلسٹ یا پھر کوئی جاسوس جس کا تعلق اوڈیسہ ریڈز سے بھی ہو سکتا ہے۔“

اس جملے پر ویسیلے اور ولادی میر نے جو ردِعمل ظاہر کیا اس سے کینی کو یقین ہو گیا کہ اوڈیسہ ریڈز ان کے حریف گروہ کا نام ہے۔ اس نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ”تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ تمہارے گروہ میں شامل ہونے کے لیے کیا قابلیت درکار ہے؟“

”اس گروہ میں شامل ہونے والے بیشتر لوگوں سے میرے خاندانی تعلقات ہیں اور ان میں زیادہ تر کا تعلق یوکرائن سے ہے۔“

”میں بھی یوکرائن والوں کی طرح بول سکتا ہوں۔“ کینی نے اپنی ایک اضافی خوبی بیان کی۔

اس کا یہ اندازِ بیان ویسیلے اور ولادی میر کو پسند نہیں آیا۔ ان دونوں نے اس کے ایک ایک کندھے پر اپنا بھاری ہاتھ رکھا اور دوسرے ہاتھ کی مٹھیاں بھینچ لیں لیکن ایک بار پھر انہیں باس کا اشارہ دیکھ کر اپنی پیش قدمی روکنا پڑی۔

”ہمارے گروہ میں شامل ہونے والے کو کچھ امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔“ فیڈور نے کہا۔

”میں ہر امتحان کے لیے تیار ہوں۔“ کینی نے جواب دیا۔

”بڑا امتحان سب سے آخر میں ہوگا۔ بہت سے لوگ اس مرحلے تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔ تم اگر چاہو تو کسی ایک ابتدائی امتحان میں حصہ لے سکتے ہو۔“

کینی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ فیڈور آگے بڑھا اور اس کی جانب جھک کر اسے پہلے امتحان کے بارے میں بتانے لگا۔

بہت سے اداکاروں کی طرح کینی بھی کوئی نیا کردار ملنے پر ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا تھا خواہ وہ کردار کتنا ہی سطحی اور معمولی کیوں نہ ہو لیکن اسکرپٹ کو پڑھنے، مکالمے یاد کرنے، کردار کا لہجہ اپنانے اور اس کی باڈی لینگویج اختیار کرنے میں گھنٹوں لگ جاتے تھے۔ فیڈور نے اسے جو کردار سونپا وہ بھی کم و بیش ایسا ہی تھا البتہ اس کا کوئی خاص اسکرپٹ نہیں تھا۔ کینی نے کریمیا کے علاقے اور بالخصوص سمفر پول کے بارے میں وہ سب کچھ پڑھ ڈالا جو اسے مل سکا۔ اس نے یوکرائن سے تعلق رکھنے والوں کی انگریزی بول چال کی ریکارڈنگ بھی سنی اور ان جیسا لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

اس کا پہلا امتحان نسبتاً آسان تھا۔ اسے شیفرڈ بش کے علاقے میں منشیات فروخت کرنا تھی اور گاہکوں پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ سمفر پول بوائز کی جانب سے یہ ڈیوٹی انجام دے رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے لہجے کو بھی بہتر بنانے کے لیے کوشش کرتا رہا۔ اس نے اس کردار کی مناسبت سے کپڑوں کا انتظام کرنے پر خاصا وقت صرف کیا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس کے اپنے کپڑے اس کردار کے لیے بالکل موزوں تھے اور اسے ٹی وی ڈراموں کی طرح کاسٹیوم ڈیزائنر کے پیچھے نہیں دوڑنا پڑا۔ اسے اس بارے میں زیادہ تردد کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ منشیات بیچنے والے کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا کہ وہ دیکھنے میں کیسا لگ رہا ہے لیکن کینی ایک اداکار تھا اور اس کے لیے یہ بات بہت اہم تھی کہ وہ اپنے کردار کے حوالے سے چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی نظر رکھے۔

منشیات فروش کی حیثیت سے اپنے پہلے کامیاب پھیرے کے بعد وہ سرِشام ہی گھر واپس لوٹ آیا۔ لیزے اس کے انتظار میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ اس نے قیمتی لباس زیبِ تن کر رکھا تھا جیسے کہیں جانے کے لیے تیار ہو۔ اسے دیکھتے ہی وہ اس پر برس پڑی۔

”تم کہاں رہ گئے تھے؟ جانتے نہیں کہ ہمیں آدھے گھنٹے کے اندر نام کروز کے پریمیئر میں پہنچنا ہے۔“

”سوری، میں بھول گیا تھا۔“

”خدا کے واسطے کوئی ڈھنگ کا لباس پہن لو۔ میں ٹیکسی بلاتی ہوں۔“

”میں لباس تبدیل کرنا نہیں چاہتا۔“ کینی نے اس سے پہلے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اچانک ہی اسے یاد آ گیا کہ چارلی نے اسے جو کام سونپا ہے۔ لباس تبدیل کرنے کی صورت میں وہ مقصد فوت ہو جائے گا جب تک وہ اسے اپنی پروڈکشن میں رول دینے پر آمادہ نہیں ہو جاتا، اسے سمفر پول بوائے کے روپ میں ہی رہنا ہوگا۔ اس نے یوکرائن والوں کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا ذہن تبدیل کرنے کی کوشش مت کرنا۔“

”یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو اور کیسا لہجہ اختیار کر رکھا ہے؟“ لیزے جھلاتے ہوئے بولی۔ ”اگر ہم اگلے پانچ منٹ میں روانہ نہیں ہوئے تو ہم وہاں آنے والے فوٹو گرافرز کی توجہ سے محروم ہو جائیں گے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ میں ٹام کروز کے پریمیئر میں تمہیں اس حلیے میں لے کر جاؤں گی تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔“

”سنو!“ کینی نے اسی لہجے میں گفتگو جاری رکھی۔ ”میرے پاس اس سے زیادہ اہم کام ہیں۔“

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کینی نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے کسی نے ہیلو کہا۔ کینی کو وہ آواز کچھ جانی پہچانی لگی لیکن وہ فوری طور پر اسے شناخت نہ کر سکا۔ اس نے بھی جواب میں ہیلو کہا لیکن اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

”تم کون ہو؟“ بولنے والے کی آواز میں شک کا پہلو نمایاں تھا۔ اب کینی اس آواز کو پہچان گیا، وہ چارلی تھا چنانچہ اس نے اپنا اصلی لہجہ اپناتے ہوئے کہا۔

”تمہاری آواز سن کر خوشی ہو رہی ہے۔“

”کیا تم کینی بول رہے ہو؟“ چارلی کے لہجے میں اب بھی شک جھلک رہا تھا۔

”ہاں، بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

چارلی سے فوری طور پر کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے لیزے سے بات کرنے کے لیے

www.kahopakistan.com

فون کیا تھا۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا پھر اسے بہانہ سوجھ ہی گیا۔

''میں نے صرف یہ جاننے کے لیے فون کیا تھا کہ تم کہاں تک اپنے مقصد میں کامیاب رہے ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں تین مہینے پورے ہونے سے پہلے مجھ سے رابطہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' کینی نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نہیں، اب میرا ذہن بدل گیا ہے۔ جاننا چاہ رہا تھا کہ تم پر کیا گزر رہی ہے۔''

کینی اس کی عیاری کو بھانپتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ہوگئی ہے اور میں ایک گروہ کے لیے کام کر رہا ہوں۔''

''اوہ! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' چارلی مکاری سے بولا۔

''وہ لوگ یوکرائن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اچھا ہوا کہ تم نے فون کرلیا۔ میں تم سے کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا۔''

''کس بارے میں؟''

''تمہارے خیال میں مجھے اس کردار کی گہرائی میں کس حد تک جانا ہوگا؟''

''جہاں تک ممکن ہو کینی۔'' ہدایت کار نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''میرے اداکاروں کے لیے لازم ہے کہ وہ مکمل طور پر اپنے آپ کو کردار میں ڈھال لیں۔''

''مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کیونکہ میں یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ اس مرحلے کے دوران مجھے اپنے گھر میں رہنا چاہیے یا نہیں کیونکہ ایک یوکرائن گینگسٹر کبھی بھی ناٹنگ ہل ہاؤس میں نہیں رہے گا۔''

''یقیناً!'' چارلی نے اس کی تائید کی۔

''میں تم سے یہی پوچھنا چاہ رہا ہوں۔ کیا مجھے اپنے گھر سے کسی اور جگہ منتقل ہو جانا چاہیے؟''

''بالکل، تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔'' چارلی نے دل سے امڈتی خوشی کو دباتے ہوئے کہا۔ کینی کے گھر سے چلے جانے کے بعد لیز سے تک رسائی آسان ہو جاتی۔

چارلی سے مشورہ کرنے کے بعد کینی نے ایک چھوٹا سا کمرا کرائے پر لے لیا۔ اس کے ساتھ اسے یہ احساس بھی ہوا کہ اس کردار میں خود کو پوری طرح ڈھالنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا نام بھی بدل ڈالے۔ چنانچہ ویسلے اور ولادی میر سے مشورہ کرنے کے بعد اس نے اپنا نیا نام اناطولی سیمانوف... رکھ لیا۔ اس نے برطانوی میڈیا سے رابطہ ختم کرنے کے علاوہ ٹی وی دیکھنا بھی چھوڑ دیا اور حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہنے کے لیے ریڈیو سننے لگا۔ اس نے یوکرائن سے شائع ہونے والے اخبارات خریدنا شروع کر دیے۔ اسی دوران میں فیڈور کی طرف سے عائد کردہ ذمے داریوں میں بھی اضافہ ہوگیا۔ اب اسے ویسلے، ولادی میر اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا تھا۔ منشیات خریدنے والے ادائیگی میں تاخیر کر رہے تھے۔ اس نوعیت کے اور بھی مسائل تھے جنہیں حل کرنے کے لیے کینی کو کام کرنا تھا۔ اس کے لیے اسے دھمکیاں دینے اور تشدد کرنے کا اختیار مل گیا تھا۔

اس دوران میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہیں آیا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے یہ غیر اخلاقی ہے۔ اگر وہ پکڑا گیا تو اسے طویل عرصے کے لیے جیل میں رہنا ہوگا۔ اپنے طور پر وہ اسے ایکٹنگ ہی سمجھ رہا تھا اور اناطولی کے روپ میں ڈھل کر اس کردار پر ریسرچ کرنا اس کے مشن کا حصہ تھا جس میں سرخرو ہونے کے بعد ہی وہ چارلی کے ڈرامے میں جگہ حاصل کر سکتا تھا۔ اگر کبھی اس کے ذہن میں ایسی کوئی بات آئی بھی تو اس نے اخلاقیات پر آرٹ کو ترجیح دی۔ جیسے جیسے وہ اپنے کردار میں ڈوبتا گیا لیز سے اس کے روابط بھی کم ہوتے چلے گئے لیکن اسے اس محرومی کا قطعاً احساس نہیں تھا۔ اس کی توجہ پوری طرح اپنے کام پر تھی اور اس کے ذہن میں کوئی اور بات سوچنے کے لیے بالکل گنجائش نہ تھی۔

ایک شام جب وہ ویسلے اور ولادی میر کے ساتھ ایک مہم سر کر کے واپس آیا تو فیڈور نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ دراصل ایک بیس بال کلب کا مالک ماہانہ بھتا دینے میں لیت و لعل سے کام لے رہا تھا۔ کئی بار کی دھمکیوں کے باوجود اس نے اپنے حصے کی ادائیگی نہیں کی تو انہوں نے اس کی ٹھیک ٹھاک مرمت کر دی اور اس کے کلب سے بیس بال کے سارے قیمتی بلے سمیٹ کر لے آئے۔ اب وہ کم از کم تین ہفتے کے لیے اسپتال میں داخل ہو چکا تھا۔

''شاباش! میں تم لوگوں کی کارکردگی سے بہت خوش ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ اناطولی کے آجانے سے ہماری کامیابی کا گراف بڑھ رہا ہے۔''

ویسلے اور ولادی میر کو یہ تعریف اچھی نہیں لگی لیکن کینی کا سینہ فخر سے چوڑا ہوگیا۔ وہ ایسے مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں فیڈور کی جانب سے کی گئی تعریف بالکل ایسی ہی تھی جیسے چارلی نے اسے آڈیشن میں پاس کر دیا ہو۔

''میرے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ اناطولی سے آخری امتحان کے لیے کہا جائے۔''

یہ سن کر کینی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ بہ مشکل اپنے ہیجان پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ اس امتحان میں پاس ہونے کے بعد میں باقاعدہ طور پر سمفر پول بوائز کا رکن بن جاؤں گا؟''

فیڈور نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ''ہاں، میرا بالکل یہی مطلب ہے۔'' پھر اس نے اپنے سر سے ایک مخصوص اشارہ کیا۔ ویسلے اور ولادی میر اشاروں کی زبان خوب سمجھتے تھے چنانچہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ کچھ دیر گہری خاموشی چھائی رہی پھر اس سکوت کو فیڈور نے توڑا۔

''ہاں! میں سمجھتا ہوں کہ تم اپنا کام بہتر طور پر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔''

کینی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں اس سے اچھا تبصرہ نہیں سنا تھا۔ وہ جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں آئندہ بھی تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ اب مجھے کیا کرنا ہے؟''

فیڈور نے اپنا منہ اس کے کان سے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں ایک آدمی کو قتل کرنا ہوگا۔''

☆☆☆

وہ تینوں ایک زیرِ زمین بار میں بیٹھے واڈکا سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ولادی میر نے دوسرا گلاس ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ کام کرلوگے یا پھر عین وقت پر تمہاری ہمت جواب دے جائے گی؟''

''تم پریشان مت ہو۔'' کینی نے اس کے طنز کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ البتہ ابھی تک میں یہ طے نہیں کر سکا کہ مجھے کس کو قتل کرنا ہوگا۔ کیا ایسے ہی کسی راستہ چلتے ہوئے کو مار ڈالوں۔ کیا ایسا کرنا مناسب ہوگا؟''

''تمہیں صرف ایک آدمی کو قتل کرنا ہے، چاہے وہ کوئی

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 350/-
جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا ''میں بت فروش نہیں بت شکن کہلانا چاہتا ہوں'' نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مسافر 325/-
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے لرزہ خیز مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی الم ناک داستان

ثقافت کی تلاش 150/-
ذہنی ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ گھنگروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

قیصر و کسریٰ 380/-
ظہورِ اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی 350/-
شیرِ میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کردی

گمشدہ قافلے 350/-
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیئے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز سچی داستان

داستانِ مجاہد 200/-
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکتہ الآرا داستان

پردیسی درخت 325/-
اسلام دشمنی پر تلے ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یوسف بن تاشفین 325/-
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

معظم علی 325/-
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون 350/-
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ 300/-
فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز 350/-
راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم 300/-
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی 180/-
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

انسان اور دیوتا 280/-
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک 160/-
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان 325/-
سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستانِ شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد 150/-
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ 225/-
بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین 325/-
اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

جہانگیر بک ڈپو
061-4781781 | 051-35539609 | 042-37220879
022-2780128 | 021-2765086 | 041-2627568

www.kahopakistan.com

بھی ہو لیکن میرے خیال میں کسی راہ چلتے کو مارنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' ویسلے نے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' کینی نے پوچھا۔

''مطلب بالکل صاف ہے۔ اگر تم کسی کو قتل کرنے جا رہے ہو تو تمہیں یقین ہونا چاہیے کہ یہ وہی شخص ہے جسے تم پہلے ہی راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔''

''میں اب بھی تمہاری بات کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہوں۔''

''خدا کے واسطے اناطولی۔'' ولادی میر نے بے صبری سے کہا۔ ''تم اپنے کسی دشمن کو کیوں نہیں قتل کر دیتے؟''

کینی سوچ میں پڑ گیا کہ کیا واقعی اس کا کوئی دشمن ہے؟ ایسے کئی لوگ تھے جنہوں نے ساری عمر اسے ناک رگڑنے پر مجبور کیا تھا۔ ان میں ایسے کئی ہدایت کار تھے جنہوں نے کبھی اس کی صلاحیتوں کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ کاسٹنگ ڈائریکٹرز بھی جنہوں نے اسے اپنے شوز میں کام دینے سے انکار کیا۔ بہت سے اداکار جنہوں نے جوڑ توڑ کر کے اس کے رول چھین لیے لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جسے وہ اپنا دشمن سمجھ کر راستے سے ہٹا دیتا۔

اس کی الجھن کو ولادی میر نے محسوس کر لیا اور بولا۔ ''ہر انسان کا کوئی نہ کوئی دشمن ہوتا ہے مثلاً بہن بھائیوں میں سے کوئی ایک جس نے تمہارا حق مارا ہو، کسی نے تمہارے ساتھ پیسوں کے معاملے میں بے ایمانی کی ہو یا کوئی ایسا شخص جس نے تمہاری گرل فرینڈ کو ورغلایا ہو۔''

''ہاں، یقیناً کوئی نہ کوئی ایسا ہوگا۔'' اس نے بے اختیار کہہ دیا لیکن وہ فوری طور پر یہ سمجھنے کے قابل نہیں تھا کہ کون سا شخص اس قتل کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد کچھ دیر تک ان کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ اس دوران میں وہ واڈکا سے دل بہلاتے رہے پھر ولادی میر گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اب مجھے چلنا چاہیے۔ آخر ہماری بھی کوئی پرائیویٹ لائف ہے۔''

اس کے جانے کے بعد ویسلے نے محسوس کیا کہ کینی کچھ بے چین نظر آ رہا ہے۔ اس نے ٹٹولنے کے لیے پوچھا۔ ''کیا تم قتل کرنے کے بارے میں پریشان ہو؟''

''شاید۔''

''یہ ایک عام سی بات ہے۔ پہلی بار سب ہی گھبراتے ہیں لیکن دو تین قتل کرنے کے بعد وہ اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔''

کینی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب ویسلے آگے جھکتے ہوئے نیچی آواز میں بولا۔ ''شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔''

''وہ کس طرح؟'' کینی چونکتے ہوئے بولا۔

''میں اپنی خدمات پیش کر سکتا ہوں لیکن اس کے لیے تمہیں معاوضہ دینا ہوگا جو کچھ زیادہ نہیں ہے۔ میں نے گروہ میں شامل ہونے والے کئی لوگوں کی اسی طرح مدد کی ہے۔ یعنی ان کی جگہ میں لوگوں کو قتل کرتا ہوں۔''

''اوہ۔'' کینی متاثر ہوتے ہوئے بولا۔ حالانکہ چارلی کی شرط کے مطابق اپنے آپ کو کردار میں پوری طرح ڈھالنے کے لیے اسے یہ قتل خود کرنا چاہیے تھا لیکن وہ کسی بے گناہ کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہ رہا تھا۔ اگر ویسلے اس کا مسئلہ حل کر دیتا... تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

''کیا لوگے؟'' اس نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

ویسلے نے اسے جو معاوضہ بتایا وہ کسی انسانی جان کی قیمت کے مقابلے میں بہت کم تھا اور اس کے پاس ڈراموں سے کمائے ہوئے پیسے بینک میں محفوظ تھے۔ وہ بہ آسانی یہ معاوضہ ادا کر سکتا تھا۔

''تم ٹارگٹ کا انتخاب کس طرح کرو گے اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ کہ کس طرح ظاہر ہوگا کہ یہ قتل میں نے کیا ہے؟''

''تم یہ سب باتیں مجھ پر چھوڑ دو۔ میں یہ کام پہلے بھی کرتا رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ جہاں تک فیڈور کا تعلق ہے تو وہ یہی سمجھے گا کہ یہ قتل تم نے کیا ہے اور پولیس تم پر اس لیے شک نہیں کر سکتی کہ کل شام کو تم جائے واردات سے غیر موجودگی ظاہر کرو گے۔''

''کل شام؟'' کینی نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ ویسلے اتنی جلدی یہ کام کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔

''جب میں کوئی کام کرنے کا ارادہ کر لیتا ہوں تو میں غیر ضروری تاخیر نہیں کرتا۔'' ویسلے نے کہا۔

''لیکن میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ تم مقتول کا انتخاب کس طرح کرو گے؟''

''میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں تمہارے کسی ایک دشمن کو ہی نشانہ بناؤں گا۔''

''اور اگر میرا کوئی دشمن نہ ہو تو؟'' کینی نے پوچھا۔

''ہر شخص کا کوئی نہ کوئی دشمن ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ سامنے سے نہیں بلکہ چھپ کر وار کرتے ہیں جن کے بارے میں تم بھی نہیں جانتے ہوگے۔ ویسے بھی تم ان دنوں اپنی دنیا سے دور ہو اور تمہیں نہیں معلوم کہ تمہاری عدم موجودگی میں کیا

کچھ ہو رہا ہے۔''

دوسری صبح اس نے ویسلے کو مقررہ معاوضہ ادا کیا اور اس سے قتل کے وقت کے بارے میں معلومات حاصل کیں تاکہ اس وقت وہ کسی دوسری جگہ پر اپنی موجودگی کا ثبوت فراہم کر سکے۔ اس مقصد کی خاطر اسے ایک دن کے لیے دوبارہ کینی ماؤنٹ فورڈ کا روپ دھارنا تھا۔ اس نے اپنے ایک اداکار دوست کو فون کر کے شام میں تھیٹر چلنے کی دعوت دی جس میں ایک ایسی اداکارہ مرکزی کردار ادا کر رہی تھی جسے وہ دونوں جانتے تھے۔ اس کا اداکار دوست پہلے تو اس کی آواز سن کر حیران ہوا پھر بولا۔

''تم لیزے کے ساتھ نہیں جا رہے؟''

''نہیں۔''

''یہ جان کر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔'' اس کا دوست معنی خیز انداز میں بولا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''کچھ نہیں کینی۔ کچھ نہیں۔''

عام حالات میں وہ شاید اس سے اس جملے کی وضاحت طلب کرتا لیکن اس وقت اس کا ذہن شام کے پروگرام میں الجھا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تھیٹر...... میں حاضرین کی تعداد بہت کم ہوتی ہے لیکن ان میں یقیناً کئی ایسے لوگ ہوں گے جو وہاں اس کی موجودگی کی گواہی دے سکیں گے۔ جبکہ عین اسی وقت ویسلے اس کی خاطر کسی کو قتل کر رہا ہوگا۔ اس کے خیال میں یہ سارا منصوبہ انتہائی فول پروف تھا اور اس میں کوئی جھول نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس کا موڈ اس وقت خراب ہو گیا جب سہ پہر میں اسے فیڈور کا فون موصول ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''اناطولی! میں چاہتا ہوں کہ تم ویسلے پر نظر رکھو۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ میرے ساتھ مخلص ہے۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟'' کینی نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''میں نے اس کے بارے میں اڑتی اڑتی خبر سنی ہے کہ وہ میرے کام کے علاوہ الگ سے بھی کچھ کر رہا ہے۔''

''مثلاً؟''

''وہ کرائے کا قاتل بن گیا ہے۔ اگر تم مجھے اس سلسلے میں ثبوت فراہم کر سکو تو میں اس کا پتا صاف کر دوں گا اور تمہیں اتنی دولت ملے گی جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گا۔''

اس کے بعد وہ خاصی دیر تک ویسلے سے اس کے

قیمت

''تمہیں علم ہے کہ کل رات تمہارے کتے نے میری ساس کی ٹانگ بھنبھوڑ ڈالی؟''

''اوہ، مجھے بہت افسوس ہے، ان کے علاج معالجے پر جو خرچ آئے گا میں ادا کرنے کو تیار ہوں۔''

''افسوس کی ضرورت نہیں ہے دوست، میں تو صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ اتنے اچھے کتے کی کیا قیمت لوگے؟''

بدرالدین کراچی

موبائل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ مسلسل بند تھا۔ مقررہ وقت پر وہ اپنے اداکار دوست سے ملنے تھیٹر پہنچ گیا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ اگر فیڈور کو معلوم ہو جاتا کہ اس نے ویسلے کو قتل کرنے کے لیے معاوضہ ادا کیا ہے تو اس کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی لیکن اس نے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے کسی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اندرونی طور پر کتنا مضطرب ہے۔ لہٰذا وہ پورے انہماک سے وہ خشک ڈراما دیکھتا رہا۔ شو کے اختتام پر وہ سب لوگ بار میں اکٹھے ہوئے اور کینی نے اپنی دوست اداکارہ کے کام کی بہت تعریف کی۔ وہ دوسرے ایکٹرز سے بھی گرم جوشی سے ملا۔ اس کی کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے تھیٹر میں دیکھ لیں۔

کینی کے اداکار دوست نے واپسی میں اسے اپنی کار میں گھر تک چھوڑنے کی پیشکش کی۔ راستے میں ہی اس نے کار ریڈیو پر وہ خبر سنی جس کا اسے انتظار تھا لیکن مقتول کا نام سن کر وہ حیران رہ گیا۔ اس کا نام چارلی تھا جسے رات دس بجے ناٹنگ ہل کے علاقے میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔

''اوہ میرے خدا!'' اس کے دوست نے کہا۔ ''اگر تم اس وقت میرے ساتھ نہ ہوتے تو سب سے پہلے میں ہی تم پر اس قتل کے حوالے سے شبہ کرتا۔''

''کیوں؟''

اس کے دوست نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ بہت کچھ بتا رہی تھی۔

☆☆☆

اگر کینی نے اپنے آپ کو اخبارات اور میڈیا سے دور نہ رکھا ہوتا تو اسے چارلی اور لیزے کے درمیان بڑھتی ہوئی قربت کا ضرور پتا چل جاتا۔ اخبارات و جرائد میں کئی ہفتوں

www.kahopakistan.com

تک ان دونوں کے بارے میں خبریں اور تصاویر شائع ہوتی رہیں۔ چارلی نے بڑی عیاری سے اسے کسی دوسری جگہ منتقل ہو جانے کا مشورہ دے کر اپنے لیے راستہ ہموار کرلیا تھا۔ ویسلے کو بھی اخبارات کے ذریعے چارلی اور لیز کے تعلق کی خبر ملی اور اس کے خیال میں چارلی کو ہی اس کی گولی کا نشانہ بننا چاہیے تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کینی کی عدم موجودگی میں چارلی باقاعدگی سے لیز سے ملنے آتا ہے۔ لہٰذا وقوعہ والی شب وہ ناٹنگ ہل کے باہر اس کا انتظار کررہا تھا۔ ٹھیک دس بجے ایک کار کینی کے گھر سے سوگز کے فاصلے پر آکر رکی اور اس میں سے چارلی برآمد ہوا۔ ویسلے کو اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس نے بڑے اطمینان سے اپنا بے آواز پستول نکالا اور چارلی کے سر کا نشانہ لے کر دو فائر کردیے۔

کام ختم ہونے کے بعد وہ بڑے اطمینان سے ٹہلتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ اسے یقین تھا کہ کسی نے اسے گولی چلاتے ہوئے نہیں دیکھا اور فیڈور یہی سمجھتا کہ چارلی کو اس کے رقیب کینی نے ہی قتل کیا ہے۔ ویسلے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ چارلی کی فطرت بھنورے جیسی ہے اور وہ کبھی ایک عورت کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارتا لیکن لیز سے یہ بات اچھی طرح جانتی تھی اور محسوس کررہی تھی کہ یہ ہرجائی بھنورا کسی بھی وقت اڑ سکتا ہے چنانچہ اس نے اسے مستقبل میں بلیک میل کرنے کے لیے اپنے طور پر کچھ انتظامات کیے تھے جن کے تحت اس وقت بھی مکان کی بالائی منزل والی کھڑکی میں وہ وڈیو کیمرا لیے اس کا انتظار کررہی تھی تاکہ چارلی کی آمد کا منظر عکس بند کرسکے۔ چارلی سوگز کا فاصلہ پیدل طے کرکے اس کے دروازے تک آتا تو اس کے لیے یہ ثابت کرنا بہت آسان ہو جاتا کہ وہ محض اس سے ملنے کے لیے وہاں آیا تھا۔

جیسے ہی چارلی کار سے باہر آیا تو لیز نے کیمرے کا بٹن دبا دیا اور اس طرح چارلی کے قتل کا منظر ریکارڈ ہوگیا۔ اس نے یہ فوٹیج پولیس کے حوالے کردی جس کی مدد سے پولیس نے قاتل کو نہ صرف شناخت کیا بلکہ اسے فوری طور پر حراست میں لے لیا۔

لیز ساتویں آسمان پر اڑ رہی تھی۔ اس قتل کا مرکزی کردار ہونے کی وجہ سے اسے بے تحاشا پبلسٹی ملنے کی امید تھی اور وہ اس نادر موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہ رہی تھی لیکن اس کی امیدوں پر اس وقت اوس پڑ گئی جب پولیس نے پریس کانفرنس میں اس کی جانب سے فراہم کی جانے والی وڈیو کا تذکرہ کرنا تو درکنار اس کا نام تک نہیں لیا بلکہ چارلی کے قتل کو اس کے کسی حاسد یا کاروباری حریف کی کارروائی قرار دیا۔ جس پر لیز سخت غصے میں تھی اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ جوابی پریس کانفرنس کرکے ساری حقیقت بیان کردے لیکن ایسی صورت میں اسے کینی سے ہاتھ دھونا پڑ جاتے لہٰذا اس نے خاموش رہنے کا فیصلہ کرلیا تاہم یہ احتیاط بھی اس کے کام نہ آئی۔ کینی کو تمام واقعات کا علم ہوچکا تھا لہٰذا اس نے بھی اسے اپنے گھر سے نکال دیا۔

☆☆☆

”تم واقعی بہت ہوشیار شخص ہو۔“ فیڈور نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”اپنی گرل فرینڈ کے محبوب کو راستے سے ہٹانے کے لیے تم نے بڑی خوب صورتی سے ویسلے کو استعمال کیا۔ اس طرح ہم دونوں کی اپنے اپنے دشمنوں سے جان چھوٹ گئی۔ میں تمہیں اپنے گروہ میں خوش آمدید کہتا ہوں۔“

کینی کو اس پیشکش پر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ اس نے تو محض چارلی کی شرط پوری کرنے کے لیے فیڈور کے گروہ میں شامل ہونے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ مکمل طور پر اپنے آپ کو گینگسٹر کے کردار میں ڈھال لے تاکہ اسے چارلی کے آئندہ ڈرامے میں کام مل جائے لیکن وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر وہ آشیانہ بناتا۔ چارلی کے دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد اس کا پروڈکشن ہاؤس بھی بند ہوگیا اور اس طرح کینی کی ساری محنت رائگاں چلی گئی۔

تاہم اسے اطمینان تھا کہ اس نے چارلی کے دیے ہوئے چیلنج کو بخوبی پورا کیا۔ اب وقت آگیا تھا کہ پچھلی باتیں بھلا کر وہ دوبارہ کینی ماؤنٹ فورڈ بن کر اپنا سفر شروع کرے۔ اس سلسلے میں جب اس نے اپنے ایجنٹ سے بات کی تو اس نے انکشاف کیا کہ وہ پچھلے کئی ہفتوں سے اس سے رابطے کی کوشش کررہا تھا کیونکہ بی بی سی چینل اسے اپنے نئے سٹ کام میں مرکزی کردار دینا چاہ رہا ہے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اسے اپنی محنت کا پھل کسی نہ کسی صورت مل رہا تھا چنانچہ اس نے فوراً ہی ہاں کردی۔ اس کے باوجود اس نے فیڈور اور اس کے گروہ سے تعلق ختم نہیں کیا۔ شیکسپیئر نے کہا تھا کہ یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب یہاں اپنا اپنا کردار ادا کرنے آتے ہیں۔ وہ بھی ایک اداکار تھا لہٰذا اسے ڈبل رول کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ ویسے بھی اداکاری ایک ناقابل اعتبار پیشہ ہے۔ کون جانے کب اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوسرے کردار کو مستقل اپنانا پڑ جائے جو تادم مرگ جاری رہ سکتا ہے۔

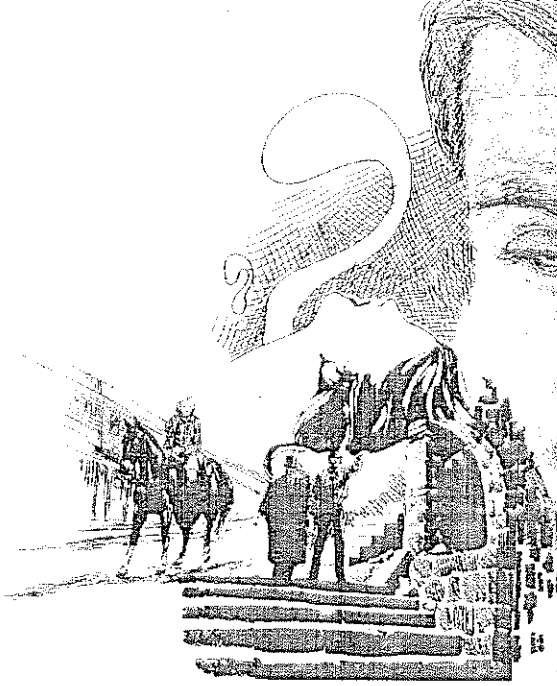

انجام بخیر

مختار آزاد

ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ جو بھی کام کرے... اس کا نتیجہ اچھا، مثبت اور دیرپا صورت میں اس کی زندگی پر سایہ فگن رہے... مگر کبھی ایک ہی فیصلہ زندگی کو کئی خانوں میں تقسیم کردیتا ہے... اور وہ لبِ دریا ہوتے ہوئے بھی پیاسا رہ جاتا ہے...

مالک اور نوکر کے مابین ذہنی ہم آہنگی کا قابل ستائش نمونہ... مغرب سے تازہ درآمد

میں نے کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ میں کسی کے اوپر چلا نہیں سکتا تھا۔ کئی بار ایسے مواقع آئے جب میں حلق پھاڑ پھاڑ کر کسی بھی شخص کو بے عزت کرنے کے لیے چیخ سکتا تھا مگر میں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ ایسا کرنا میرے مزاج کے خلاف تھا۔ حتیٰ کہ میں نے اپنے باس جارج کارسن سے بھی کبھی اونچی آواز میں گفتگو نہیں کی جبکہ وہ اس بات کا مستحق تھا کہ میں اس کے اوپر چلا چلا کر اپنے دل کی بھڑاس نکال سکوں۔ یہ اور بات ہے کہ ایسا کرنے کے نتیجے میں میری نوکری جاسکتی تھی مگر اب تک جو ہوچکا ہے، نوکری کا چلے جانا اس سے زیادہ برا نہیں ہوسکتا

www.kahopakistan.com

تھا۔

ہم نیو یارک میں واقع خیراتی ادارے بووری مشن کے سامنے لگی ہوئی قطار میں کھڑے تھے۔ یہاں مفت خورے، بیروزگار، نشے کے عادی بھک منگے اور بچت کرنے والے غریب لوگ مفت کا کھانا حاصل کرنے کے لیے قطار لگائے کھڑے تھے۔ میرا باس اور میں بھی قطار میں کھڑے تھے۔ کافی لمبی قطار تھی لیکن حسب عادت اس مرتبہ اُس نے مجھے ذلیل کرنے کی کوئی کوشش تو نہیں کی لیکن اس کے اندر کی بے چینی اس کی حرکات سے ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ مستقل سر ہلائے جا رہا تھا۔ وہ کبھی کندھے اُچکاتا تو کبھی بے قراری سے، قطار سے گردن باہر نکال کر یہ دیکھنے کی کوشش کرتا کہ اب اس کے آگے کتنے لوگ کھڑے رہ گئے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک عورت کھڑی تھی اور اس سے پیچھے میں کھڑا ہوا تھا اور ذہنی طور پر تیار تھا کہ وہ کب اپنے اندر کی بے چینی کو ختم کرنے کے لیے مجھ پر برستا ہے۔ کبھی کبھار وہ اپنے کندھے پر لٹکتے تھیلے میں سے بوتل نکالتا، دو چار گھونٹ بھرتا اور پھر بوتل واپس تھیلے میں ڈال دیتا۔ خبر نہیں کہ یہ بوتل اُس نے کسی سے اُدھار مانگی تھی یا کہیں سے اُچک لی تھی مگر ایک بات خوش کن تھی، شاید اسی بوتل کی وجہ سے وہ مجھ پر اب تک برسا نہیں تھا ورنہ تو عام حالات میں، اتنی دیر میں تو وہ کئی بار میرے سر پر اپنی ذلت بھری مغلظات کا ٹوکرا اُنڈیل چکا ہوتا۔ شاید وہ ہلکے ہلکے سرور میں تھا۔ اسی لیے میں اُس کے قہر سے بچا ہوا تھا۔ قطار کافی لمبی تھی اور اب بھی وہ کھڑکی ہماری پہنچ سے کافی دور تھی جو ہم دونوں ہی کی منزل تھی۔

کچھ دیر کے بعد جارج کارسٹن نے تھیلے سے ایک بار پھر بوتل نکالی اور چند گھونٹ بھرنے کے بعد ہلکے ہلکے تھرکنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ امریکی قومی ترانے کی دھن گنگنا رہا تھا اور کبھی کبھی ایسے بے تکے جملے ادا کر رہا تھا جو غور نہ کرنے پر تو قومی ترانے کے بول محسوس ہوتے تھے مگر جب توجہ سے سُنو تو اُن کا مطلب کچھ بھی نہیں تھا۔ میں خاموشی سے اُسے برداشت کر رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کی ان بے تکی حرکات پر دل ہی دل میں سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ”کم بخت خیرات لینے کے لیے بھی قطار میں خاموش کھڑا نہیں رہ سکتا۔ لعنت ہو اس پر۔“ میں نے دل ہی دل میں اس سے نفرت کا اظہار کیا تو ہونٹوں پر خود بخود ہی مسکراہٹ پھیل گئی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جس بے چینی کا اظہار کر رہا ہے جلد یا بدیر، خود ہی اس کا مزہ چکھ لے گا۔ اس کے مقابلے میں، میں اطمینان سے کھڑا تھا۔ یوں بھی مجھے قطار میں کھڑا رہنے سے کوئی پریشانی لاحق نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ جارج کارسٹن نے عالم سرور میں کچھ زیادہ بے چینی کا مظاہرہ کر دیا۔ اس بے چینی کے عالم میں وہ لڑکھڑا کر اپنے پیچھے کھڑی عورت سے ٹکرایا۔ وہ عورت دھکا لگنے سے پیچھے کی طرف گرنے لگی مگر گرتے گرتے بال بال بچی۔ اس عورت کے ٹکرانے سے قطار میں کھڑے کئی لوگ پیچھے کی طرف گرے۔ جارج کے پیچھے پوری قطار کا ستیاناس ہو گیا۔ اس ایک حرکت سے عجیب سا طوفان بدتمیزی مچ گیا۔ ویسے لڑھکے تو کئی لوگ تھے لیکن اس حرکت پر سب سے زیادہ وہ عورت تلملا رہی تھی۔ اس موٹی عورت کا حلیہ ویسے ہی مضحکہ خیز تھا اوپر سے وہ بک بک کیے جا رہی تھی۔ اس عورت کا لباس ایسا ہو رہا تھا۔ جیسے اُسے پہننے کے بعد گریس کے ڈرم میں ڈبو دیا گیا ہو۔ پھر اسے ڈرم سے باہر نکال کر مٹی میں اچھی طرح لتھڑا گیا ہو۔ جارج کی وجہ سے دھکا لگنے پر وہ گرنے سے تو بچ گئی تھی لیکن وہ خود اس سے نہ بچ سکا۔

”اے کروڑ پتی کے بچے...“ وہ جارج پر طنز کرتے ہوئے غرائی۔ ”تمہیں زیادہ بھوک لگی ہے تو دفع ہو جاؤ یہاں سے اور اپنے باپ کی کمائی سے شان دار ریستوران میں بیٹھ کر کھانا ٹھونس لو۔“ جتنی وہ باہر سے میلی تھی، اندر سے اس کا منہ بھی ظاہری حلیے جیسا ہی تھا۔ وہ اپنی پیلی پیلی بتیسی کی بھرپور نمائش کرتے ہوئے چلّائے جا رہی تھی۔ ”لائن میں چین سے کھڑے نہیں ہو سکتے تو خود کما کر کھاؤ مفت خورے...“ وہ عورت بدستور جارج پر برس رہی تھی۔

”معاف کیجیے...“ میں نے صورت حال کو بدترین ہونے سے بچانے کے لیے مداخلت کی تو وہ مجھ پر برس پڑی۔

”کون ہو تم؟“ وہ پلٹ کر مجھ پر چلّانے لگی۔

”بات یہ ہے کہ میرے ساتھی سے بس ذرا سی غلطی...“

”کیا کہا... اس کم بخت نے مجھے گرانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور تم اس بات کو ذرا سی غلطی کہہ رہے ہو۔“ لگتا تھا کہ معاملہ سلجھانے کے چکر میں اسے میری شکل میں دوسرا شکار ہاتھ لگ گیا ہے۔ ”نوکر ہو اس کے جو اُس کی طرف سے معافی مانگ رہے ہو؟“

”ہاں، یہ میرا نوکر ہے تو پھر...“ نوکر والی بات سن کر جارج نے میرے سینے پر اپنے ہاتھ سے دباؤ ڈالتے ہوئے پیچھے دھکیلا اور غصے سے بھرے لہجے میں اس عورت کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ معاملہ اب اور بھی بگڑنے والا ہے۔ اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو چکا تھا۔ پوری قطار ہجوم میں بدل چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ جارج کارسٹن کو اس عورت کے نئے حملے کا سامنا ہوتا، معقول حلیے کے ایک شخص نے مداخلت کی۔

”جو ہوا، اُس پر لعنت بھیجیں۔ بہتر ہے کہ ایک آدھ ڈالر اس عورت کو دے کر اپنی جان چھڑا لیں۔ ویسے آپ لوگ معقول نظر آتے ہیں۔ چھوڑیں اس فضول کے جھگڑے کو۔“ اجنبی نے صلح صفائی کروانا چاہی۔ ظاہر ہے، وہ بھی قطار میں کھڑا تھا اور اب نئی قطار میں نہ جانے اس کا نمبر کیا ہوتا۔ مجھے تو یقین تھا کہ بھوک سے اُس کا بھی بُرا حال ہوگا۔ جس وقت وہ اجنبی جارج کو مفید مشورہ دے رہا تھا، وہ عورت خاموشی سے اس آدمی کا منہ تکے جا رہی تھی۔ مجھے لگا کہ اس نے بھی یہ ہنگامہ ایک دو ڈالر ملنے کی امید میں ہی کیا تھا۔

”بکواس بند کرو۔“ جارج نے اپنی ضدی طبیعت کے مطابق شکست مان کر تاوان ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ سنتے ہی وہ عورت پھر شور مچانے لگی۔ اسی دوران ایک ہٹا کٹا سیاہ فام نہ جانے کس طرف سے نکل آیا۔ ابھی میں اس کے حلیے کا صحیح طرح سے جائزہ بھی نہیں لے پایا تھا کہ اس نے اچانک مجھ پر اور جارج پر بیک وقت اپنے گھونسوں سے حملہ کر دیا۔ میں تو اس اچانک اُفتاد سے بالکل گھبرا گیا اور حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے، گھونسے سے بچنے کے لیے ہلکی سے جھکائی دی۔ یوں میں گھونسے کی شدت سے تو بڑی حد تک بچ گیا لیکن جارج کے ساتھ بہت بُرا ہوا۔ اس سیاہ فام کا گھونسا سیدھا جارج کے جبڑے پر پڑا اور اگلے ہی لمحے وہ زمین پر اوندھا پڑا مٹی چاٹ رہا تھا۔ گھونسا اس قوت سے پڑا تھا کہ وہ فوری طور پر زمین سے اٹھ ہی نہیں پایا۔ جارج کے برعکس میں خوش قسمت ثابت ہوا۔ اس سے پہلے کہ ہم اس سے نمٹنے کی کوشش کرتے، اس نے اپنا پولیس بیج ہم دونوں کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ یہ دیکھتے ہی میرے تو جذبات بالکل ٹھنڈے ہو گئے۔

”آپ نے ٹھیک نہیں کیا آفیسر۔“ جارج نے بھرائی ہوئی آواز میں خود کو مہذب اور لہجے کو شائستہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”اور جو تم یہاں ہنگامہ کر رہے تھے، وہ ٹھیک تھا؟“ پولیس والے نے طنزیہ لہجے میں اُلٹا سوال کر ڈالا۔

یہ سُن کر جارج خاموش رہا۔ میں دم سادھے حالات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ پولیس والے کے ایک ہی گھونسے نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اس کا سارا طنطنہ ہوا ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ پولیس والا کچھ اور کارروائی کرتا، میں نے ایک بار پھر مداخلت کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے تشویش، خوف اور امید کے ملے جلے تاثرات چہرے پر طاری کیے اور لمبی سانس لی۔

”دیکھیے آفیسر! آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ہم کوئی چور اُچکے یا بدمعاش نہیں ہیں اور نہ ہی بھک منگے ہیں۔ دراصل...“

”اچھا... تو آپ خیرات دینے کے لیے قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔“ پولیس والے نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی لقمہ دیا۔

”آپ پوری بات تو سُن لیں۔“ میں نے نہایت لجاجت سے کہا تو اس کا دل پسیج گیا۔

”سناؤ، کیا بات ہے۔“ اس بار پولیس والے کا لہجہ ہمدردانہ تھا۔

”ہم اسٹاک بروکر ہیں۔ اسٹاک ایکسچینج مارکیٹ کریش کر گئی ہے جس کی وجہ سے ہمارا سب کچھ تباہ ہو گیا۔ ہمارے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں بچی۔ نہ تو رہنے کے لیے کوئی ٹھکانا بچا ہے اور نہ ہی کھانے کے لیے کچھ ہے۔ بھوک سے تنگ آ کر یہاں خیرات لینے کے لیے کھڑے تھے کہ ذرا سی بات کا جھگڑا بن گیا۔“

”یہ سب ہوا کیسے؟“ اس نے ہوا میں چاروں طرف ڈنڈا لہراتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔ جواب میں، میں نے پوری داستان تفصیل سے گوش گزار کر دی۔

”اوہ... تو یہ بات ہے۔“ میرا بیان سن کر پولیس والے کے چہرے پر ہمدردی کے جذبات اُمڈ آئے۔ ”ایسی بات ہے تو پھر میں تمہارے لیے دعا کرتا ہوں۔ ویسے تمہیں اپنے رویّے کو بہتر بنانا چاہیے۔“ اس نے جارج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو ایک طرف کھڑا ہو کر رومال سے منہ پونچھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ اس بار تو میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔ آئندہ کسی سے لڑنے کی کوشش نہیں کرنا، وہ بھی کسی غریب اور مجبور عورت سے۔“ اس نے باری باری میرے اور جارج کے سینے پر اپنا ڈنڈا رکھتے ہوئے تنبیہ کی اور سیٹی بجا کر لوگوں کو قطار میں کھڑا ہونے کی تلقین کرنے لگا۔

پولیس والے کی مداخلت کے بعد وہ عورت ویسے ہی ڈالر ملنے کی امید کھو چکی تھی۔ رہا مجمع تو ان کے لیے بھی ہم دونوں میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ کھانے کی فکر میں وہ سب لوگ ایک بار پھر قطار بنانے لگے۔ ہر شخص کی کوشش تھی

www.kahopakistan.com

کہ اُسے وہی جگہ ملے جہاں وہ ہنگامہ آرائی سے پہلے کھڑا تھا۔ البتہ پولیس والے کی موجودگی کے سبب ہر شخص شائستگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ رہے ہم دونوں قسمت کے مارے تو بدستور وہیں پر کھڑے تھے جہاں پولیس والے کا گھونسا لگنے سے پہلے کھڑے ہوئے تھے۔

چند لمحوں بعد جب ایک بار پھر قطار بن گئی تو پولیس والا بھی سیٹی بجاتا اور اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا واپس چل دیا۔ اُسے جاتا دیکھ کر میرے دل میں خواہش جاگی کہ اُسے آواز دے کر واپس بلاؤں اور کہوں کہ یہاں ایک دھوکے باز اور قاتل موجود ہے، اُسے گرفتار کرلو اور پھر جارج کارسٹن کی کلائی پکڑ کر اُس کے مضبوط ہاتھوں کے پنجوں میں تھما دوں۔ مگر کیا کروں، میرا جذبۂ تابع داری غالب آگیا۔ اُس وقت میں نے بڑی مشکل سے اپنی اس خواہش پر قابو پایا۔

ویسے تابع داری اور وفاداری میری گھٹی میں شامل ہے۔ میں نے لندن کے ایک یتیم خانے میں ہوش سنبھالا۔ وہاں حکم ماننا سب سے بڑی قابلیت تھی۔ بڑا ہونے پر فوج میں معمولی... سپاہی کی نوکری کی۔ وہاں بھی تابع داری سب سے بڑی خاصیت سمجھی جاتی تھی۔ فوج سے فارغ ہوا تو امریکا چلا آیا جہاں بڑے بڑے امیرزادوں کے ہاں بیرا گیری کرتے ہوئے عمر بتا دی۔ میں اب عمر کے جس حصے میں تھا، وہاں وفاداری اور تابع داری کی اس عادت سے جان چھڑانا ویسے ہی مشکل تھا۔ سو یہی بات تھی کہ میں نے لاکھ چاہنے کے باوجود بھی جاتے ہوئے پولیس والے کو آواز دے کر واپس بلانے اور اپنے آقا جارج کارسٹن کو گرفتار کروانے کی خواہش کا اپنے دل کے اندر ہی گلا گھونٹ دیا۔

☆☆☆

جب بندہ پریشان ہو تو وقت کا درست تعین کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ پھر بھی جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، یہ اُس سیاہ منگل کے کچھ ہفتوں بعد کی بات ہے۔ ایک دن میں جارج کارسٹن کی تلاش میں، جزیرہ نما زمین پر تعمیر شدہ اس کے وسیع و عریض بنگلے کی غلام گردشوں پر گھوم رہا تھا کہ اچانک ایک اوٹ سے مجھے وہ نظر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میرے لیے یہ اچنبھے کی بات تھی۔ پہلے کبھی بھی میں نے اسے کسی ہتھیار کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ جارج کو اپنی بیوی سے بے حد پیار تھا۔ ویسے تو میں مسز جارج کو زیادہ اچھی طرح نہیں جانتا تھا لیکن یہ بات مجھے معلوم تھی کہ وہ اپنی بیوی سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ اس نے جزیرے نما علاقے پر بنے ہوئے اس وسیع و عریض اور شان دار مینشن کو بھی صرف اپنی بیوی کی خواہش پر ہی خریدا تھا ورنہ اُسے اس طرح کے گھروں میں بالکل الگ تھلگ زندگی بسر کرنا زیادہ پسند نہیں تھا۔ حقیقت میں وہ عورت بڑی چڑچڑی اور مغرور تھی۔ جارج اس کے ساتھ اب تک کیسے نباہ کیے جا رہا تھا، اس بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ کوئی بھی نوکر دو چار دن سے زیادہ اُن کے ہاں ٹک نہیں پاتا تھا۔ خیر، اس میں زیادہ قصور اُن نوکروں کا ہی تھا۔ ایک اچھے نوکر کو گونگا اور بہرا ہونا چاہیے۔ یہ خوبی مجھ میں تو ہے مگر شاید وہ اس خوبی سے محروم تھے۔ بیگم صاحبہ اور صاحب کی کن سوئیاں کرنے کے باعث اُن کی پیٹھ اور پیٹ، دونوں پر لات پڑی البتہ میں کئی سال سے یہاں جما ہوا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس چڑچڑی عورت کی وجہ سے میں بھی ہر بار خطرہ محسوس کرتا تھا کہ نہ جانے کب وہ مجھے بھی نکال باہر کرے۔

تین دن پہلے ہی بیگم صاحبہ نے گھر کے سب نوکروں کو لات مار کر نکال باہر کیا تھا۔ میں جس دن کی بات کر رہا ہوں، اُس دن صبح جب میں ڈیوٹی پر واپس آیا تو گھر پر مسٹر اور مسز جارج تنہا تھے۔ میں دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ اب کوئی اور ملازم تو بچا نہیں اس لیے امکان ہے کہ اس بدمزاج عورت کے قہر کا نشانہ میں ہی بنوں گا۔ جتنی ذلت میں سہہ چکا تھا اور اس عورت کے ہاتھوں جتنی بے عزتی دوسرے ملازمین کی دیکھ چکا تھا، اس کے بعد اب میں خود اپنے دل میں کسی نئی ملازمت کی تلاش کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

اُس دن میں نے کام سے تھوڑا سا فارغ وقت نکال کر شہر جانے کا پروگرام بنایا۔ اس مقصد کے لیے گیراج میں کھڑی فورڈ کار مجھے شہر لے جا سکتی تھی۔ کار بہت پرانی تھی اور اس کا انجن جب چلتا تھا تو اس سے طرح طرح کی آوازیں پیدا ہوتیں۔ اس کے دروازے کھل جاتے تو پھر بند کرنا مشکل ہوتا مگر کیا کروں، اس کے سوا میرے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ میری مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ دوسری کار خریدنے کا سوچ بھی سکتا۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ غلام گردش کی ایک اوٹ سے جب میں نے ان دونوں کو دیکھا تو اسی وقت طے کر لیا کہ یہ وقت چھٹی مانگنے کے لیے مناسب نہیں ہے، وہ بھی اس وقت جب گھر میں کوئی اور ملازم ہی نہیں ہے۔ ہوسکتا تھا کہ جواب میں وہ عورت مجھے ذلیل کر ڈالتی۔ ویسے اس بدمزاج مالکن سے کسی بھی قسم کا سلوک ممکن تھا۔ اس لیے میں نے بغیر بتائے ہی کچھ دیر کے لیے باہر جانے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی یہاں سے دفتر ملازمت جانا، واپس آنا اور وہاں پر ملازمت کے لیے رجسٹریشن کروانے میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا ہی لگتا تھا۔ میں ان کی نظروں سے چھپتا چھپاتا گیراج کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ دوپہر کے کھانے سے بہت پہلے واپس پہنچ جاؤں گا۔ ویسے بھی اس وقت وہ دونوں ایک دوسرے میں مگن تھے۔ یوں وہ کافی دیر تک میری غیرموجودگی کو محسوس نہیں کرسکیں گے۔ البتہ ایک بات بے چین کر رہی تھی کہ مسٹر جارج کارسٹن کے ہاتھ میں پستول کیوں ہے اور وہ بھی اس وقت جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ چہل قدمی کر رہا ہے۔ اس نے پستول کمر کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کی بیوی کو بھی پتا نہیں تھا کہ شوہر کے ہاتھ میں پستول ہے۔ جارج نے اپنے سیدھے ہاتھ میں پستول تھاما ہوا تھا اور الٹا ہاتھ بیوی کی کمر کے گرد حمائل کر رکھا تھا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔

”ہوسکتا ہے کہ یہ کھلونا پستول ہو اور وہ اپنی بیوی کو اچانک پستول دکھا کر ڈرانا چاہتا ہو۔ شاید اسی مذاق کے لیے اس نے پستول چھپا رکھا ہو۔“ میرے دل میں لمحہ بھر کے لیے خیال آیا۔ ”خیر، مجھے کیا۔“ میں نے سر جھٹک کر اس کشمکش سے پیچھا چھڑانا چاہا۔ ”ویسے بھی میں ایک نوکر ہوں۔ مجھے کیا؟ وہ مالک ہیں، جو چاہیں کرتے پھریں۔ میرا انھیں بتادو تو پھر میں خوامخواہ اپنا سر کیوں کھپاؤں۔“ میں نے سر جھٹک کر دوبارہ اپنا دھیان ملازمت کی رجسٹریشن کی طرف لگانا چاہا۔

انھی خیالات میں منہمک چلتا ہوا میں گیراج تک پہنچ گیا۔ گیراج رہائشی احاطے سے کافی دور تھا۔ یہاں سے دور تک پھیلا ہوا سبزہ زار بالکل صاف نظر آتا تھا۔ رہائشی احاطے سے متصل گھوڑوں کا اصطبل تھا۔ مسز جارج کو گھوڑے پالنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے اعلیٰ نسل کے کئی گھوڑے پال رکھے تھے۔ کچھ دیر پہلے اُن دونوں میاں بیوی کو میں نے جس جگہ دیکھا تھا، وہ اصطبل کے بالکل قریب تھی۔ گیراج کے باہر ہی میری کھٹارا کار کھڑی تھی۔ کار کے قریب پہنچ کر میں نے احتیاط سے چاروں طرف نظریں گھمائیں کہ کہیں ان دونوں میں سے... کوئی مجھے باہر جاتے ہوئے دیکھ تو نہیں رہا ہے مگر دور دور تک مجھے وہ نظر نہیں آئے۔ ”اصطبل میں ہوں گے۔ چلو یہ بھی اچھا ہے۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا اور اطمینان سے دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور کار اسٹارٹ کرنے لگا۔ ابھی انجن اسٹارٹ ہی ہوا تھا کہ مجھے ایک دھماکا سنائی دیا۔ ویسے تو کار کے انجن سے بھی دھماکوں جیسی ہی آوازیں آرہی تھیں لیکن وہ آواز کچھ مختلف تھی۔ ایسا لگا کہ کہیں قریب میں گولی چلی ہے۔ میں نے اندر بیٹھے بیٹھے بے چینی سے اس طرف سر گھمایا، جدھر سے گولی کی آواز سنائی دی تھی۔ آواز اصطبل کی جانب سے آئی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ گھوڑے دوڑتے ہوئے اصطبل سے باہر کی طرف نکلے۔ وہ اصطبل کے سامنے والے بڑے میدان کے اندر دوڑ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اگر ان کے چاروں طرف لکڑی کی اونچی باڑ نہ ہوتی تو وہ سرپٹ دوڑتے ہوئے یہاں سے دور بھاگ جاتے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ آواز گولی کے چلنے کی تھی۔ یہ گولی اصطبل کے اندر یا اس کے بالکل قریب ہی چلی تھی جس کی آواز سے گھوڑے بدک کر باہر کی طرف بھاگے تھے۔ یہ گھوڑے تھان پر بندھے رہتے تھے لیکن صبح صبح خود مسز جارج جا کر انھیں کھول دیتی تھیں۔ اگر یہ بندھے ہوتے تو باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ میں نے گھبراہٹ میں ایک بار پھر گھوڑوں کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور اِدھر اُدھر دوڑ...... رہے تھے۔ میں بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس گھبراہٹ کے عالم میں مجھے کچھ نہیں سوجھا۔ میں نے فوراً گاڑی کا انجن بند کیا۔ چابی اگنیشن میں لگی رہنے دی اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔ گولی چلنے کی آواز سے لے کر گاڑی سے باہر نکلنے تک، بمشکل بیس سیکنڈ لگے ہوں گے۔ باہر نکلتے ہی میں نے اصطبل کی طرف دوڑ لگا دی۔ ابھی میں اصطبل سے کچھ دور ہی تھا کہ مجھے جارج نظر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں بدستور پستول موجود تھا۔

”سر! کیا ہوا... مسز کارسٹن کہاں ہیں؟“ اسے دیکھتے ہی میں نے بھرائی ہوئی آواز میں تقریباً چلاتے ہوئے سوال کیا لیکن وہ خاموش رہا۔ مجھے لگا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ میرے حواس بھی کچھ قابو میں آچکے تھے۔ جارج کی خاموشی مجھے معنی خیز محسوس ہوئی۔ میں نے اس پر نظر ڈالی تو ایک دھچکا لگا۔

جارج کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے حواس منتشر تھے اور پاؤں اس کا بوجھ بڑی مشکل سے اٹھا پا رہے تھے۔ اس نے پستول لان میں پھینک دیا اور جھک کر دونوں گھٹنوں کو پکڑ کر دوہرا ہوگیا۔ اس کا جسم تھرتھرا رہا تھا۔ میں یہ سب کچھ دیکھ کر اور گھبرا گیا۔ میں فطرتاً بزدلی کی حد تک شریف واقع ہوا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ اب پولیس کا چکر چلے گا اور میں اس میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔ جارج زمین پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے خود کو اس معاملے سے علیحدہ کرنے کے لیے یہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک نظر جارج پر ڈالی، وہ گھٹنوں کے بل گھاس پر بیٹھا ہوا ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ اس کی نظریں زمین پر تھیں۔ میرے لیے نکلنے

www.kahopakistan.com

کا یہ اچھا موقع ہے۔" میں نے اپنے دل میں سوچا اور فوراً پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گیراج کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت میری کُل متاع تن پر موجود کپڑے اور کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا ہوا بٹوا تھا جس میں آٹھ ڈالر اور کچھ سکّوں پر مشتمل نقدی تھی۔ ویسے بھی میں جن ناگہانی حالات میں فرار ہو رہا تھا، یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں سامان سمیٹنے پر توجہ دیتا۔

ابھی میں گاڑی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سُنی۔ مڑ کر دیکھا تو جارج پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اگرچہ اس وقت بھی، اس کی جسمانی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی لیکن شاید وہ محسوس کر چکا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے، اس سے بچنے کے لیے میں بے گناہ ہوتے ہوئے فرار ہو رہا ہوں، وہ تو پھر بھی قاتل ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ بے تاثر تھا۔ میں اس سے بہت ڈرتا تھا۔ اب جب وہ اس حالت میں میرے بالکل قریب پہنچا تو میرے حواس بالکل ہی جواب دے گئے۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ میرے قریب سے گزرا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور مجھے اشارے سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کا کہا۔ جارج کے ساتھ... وہ بھی ان حالات میں فرار ہونا میرے لیے سب سے بڑی پریشانی کی بات تھی مگر ایک دم مجھ پر میری فطری رحم دلی نے حملہ کر دیا۔ ایسے بُرے حالات میں اپنے مالک کو چھوڑنا مجھے بہت ہی بُرا فیصلہ لگا اور پھر ہم دونوں بھاگ کر مین بٹن آ گئے۔

اس واقعے کے بعد جارج بہت زیادہ چڑچڑا ہو گیا۔ ہر وقت نشے میں دُھت رہتا اور میں ایک غلام کی طرح اس کے ہر قسم کے حکم کی بجا آوری کرتا۔ وہ بھی اس وقت جبکہ مجھے یہ یقین تھا کہ ان خدمات کے عوض مہینے کی پہلی تاریخ کو میں تنخواہ بھی نہیں لے پاؤں گا۔

ہاں... جس سیاہ منگل کا میں نے ذکر کیا تھا، وہ جارج کارسٹن کی زندگی کا سب سے بُرا دن تھا۔ وہ اسٹاک بروکر تھا۔ اُس منگل کو اچانک مارکیٹ کریش ہو گئی اور پھر اس کے ساتھ ہی جارج بھی کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا۔ جس شان دار مینشن میں وہ رہتا تھا، وہ بینک کے پاس رہن رکھا ہوا تھا۔ اس کا بینک اکاؤنٹ رقم نہ ہونے کی وجہ سے بند کر دیا گیا۔ جن حالات میں ہم فرار ہوئے، اس وقت ہمارے تن پر موجود کپڑے اور چند ڈالر کتنے دن تک اس شہر میں ہمارا ساتھ دیتے۔

پہلے تو میں نے اپنی کھٹارا کار بیچی۔ جب وہ رقم بھی ختم ہو گئی تو ملازمت کی تلاش شروع کی تاکہ اپنے نواب مالک اور اپنا پیٹ بھر سکوں لیکن کامیابی نہ ملی۔ ہم دن بھر اِدھر اُدھر پھرتے اور رات کو کسی پُل کے نیچے یا کسی گرجا کے ہال میں پڑ کر سو جاتے۔ اچھی بات یہ تھی کہ ابھی گرمیوں کا موسم ختم نہیں ہوا تھا۔ کھانے کا حل تو خیراتی اداروں کی شکل میں مل ہی رہا تھا، البتہ جارج اِدھر اُدھر سے کسی نہ کسی طرح اپنے پینے کا بندوبست کر لیا کرتا تھا۔ اس کا تو مجھے پتا نہیں لیکن میرے لیے میں ہر وقت پولیس کا خوف سوار رہتا۔ میں سوچتا تھا کہ جارج کے پکڑے جانے کی صورت میں، کہیں میں خود بھی اعانتِ جرم میں اندر نہ چلا جاؤں... مگر کیا کروں، جارج میرے لیے ایسی ہڈی بن چکا تھا کہ جسے نہ نگل پاتا تھا، نہ ہی اُگل سکتا تھا۔ وہ کم بخت بھی ہر وقت مجھ پر ایسی نظریں رکھتا کہ جیسے ذرا ہو کہ کہیں وہ چُوکا تو میں چمپت نہ ہو جاؤں۔

☆☆☆

اُس روز شام سے ہی بہت شدید بارش ہو رہی تھی۔ ہم نے مضافات میں ایک ویران جگہ پر پناہ لی ہوئی تھی۔ کافی رات ہو چکی تھی۔ میں جس شیڈ کے نیچے بیٹھا تھا، وہ چپ بورڈ سے بنا ہوا تھا۔ نیچے اخبار بچھا کر اس پر سمٹا سمٹایا ہوا میں جارج کا منتظر تھا۔ وہ سرِ شام سے غائب تھا۔

''نہ جانے کم بخت کہاں جا کر مر گیا۔'' میں نے دل ہی دل میں جارج پر لعنت بھیجی۔ اچانک سامنے مجھے ایک دوڑتا ہوا سایہ نظر آیا۔ ''شاید وہ منحوس آ رہا ہے۔'' میں نے ایک بار پھر زیرِ لب جارج پر لعنت بھیجی۔ چند لمحوں میں ہی وہ پہنچ گیا۔ اس نے برساتی اوڑھی ہوئی تھی۔

''یہ کہاں سے ملی تمہیں؟'' برساتی دیکھ کر میں نے سوال کیا۔ ''نئی اور کافی قیمتی لگ رہی ہے۔ کہاں سے لی؟''

میری بات نظر انداز کرتے ہوئے وہ زمین پر بچھے اخبار پر بیٹھ گیا۔ وہ بدستور برساتی اوڑھے ہوئے تھا۔ برساتی کی جیب سے اُس نے بوتل نکالی۔ کاک کھولا اور دو گھونٹ بھر کر وہیں پر لیٹ گیا۔

ابھی چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ اچانک مجھے پولیس کار کا سائرن سنائی دیا۔ میں بے خوف تھا لیکن پھر بھی ہر شریف آدمی کی طرح پولیس کار کا سائرن سن کر ڈر گیا۔ میں نے نظریں گھمائیں۔ جارج خراٹے لے رہا تھا۔ اچانک پولیس کار شیڈ کے سامنے پہنچ کر رکی۔ دو پولیس والے گاڑی سے اُترے۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک اور جیپ آ کر رکی جس میں کئی لوگ سوار تھے۔ پولیس والوں نے اپنی طاقتور ٹارچ

www.kahopakistan.com

کی روشنی پہلے مجھ پر اور پھر جارج پر ڈالی۔ جارج کو دیکھ کر وہ چونک گئے۔ اسی دوران جیپ سے اور بھی کئی لوگ اتر کر نیچے آ گئے۔

''یہی ہے وہ شخص۔'' اُن میں سے ایک ادھیڑ عمر آدمی نے جارج پر نظر پڑتے ہی چلا کر کہا۔

''پکڑ لو اسے۔'' ایک پولیس والے نے زور سے کہا اور اگلے ہی لمحے نیم مدہوش جارج کی مشکیں کس کر اسے پولیس کار میں بٹھایا جا رہا تھا۔ پولیس نے اسے کار میں بٹھانے سے پہلے اس کی برساتی اتار کر اُن لوگوں کے حوالے کر دی۔ جارج کے پاس سے دو بوتلیں بھی برآمد ہوئیں۔

''ہوا کیا ہے؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پولیس والوں سے سوال کر دیا۔

''یہ شخص ان لوگوں کو لوٹ کر بھاگا ہے۔'' پولیس والے نے کار میں بیٹھتے ہوئے بتایا۔

''تم کون ہو؟'' جیپ سے اتر کر آنے والے اجنبی نے مجھ سے پوچھا۔

''میں اس کے ساتھ ہوں مگر چور لٹیرا نہیں۔''

''او کے... ویسے تم شکل سے کچھ معقول بندے لگتے ہو۔ مجھے راجر رابرٹ کہتے ہیں۔ ویسے سب لوگ مجھے ''آر آر'' پکارتے ہیں۔''

''شکریہ مجھے معقول شخص کہنے کا۔'' میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''ارے... تمہیں تو بخار ہو رہا ہے۔'' راجر نے مصافحے کے لیے میرا ہاتھ تھاما تو فوراً تشویش سے کہنے لگا۔ ''چلو تم ہمارے ساتھ چلو۔ یہاں پڑے رہے تو ٹھنڈ سے مر جاؤ گے۔''

''نہیں نہیں۔ بہت شکریہ آپ کا۔''

''کوئی بات نہیں۔ ویسے تم مجھے اس کمینے کے مقابلے میں شریف آدمی دکھائی دیتے ہو۔ چلو ہمارے ساتھ۔'' اس نے ضد کرتے ہوئے کہا تو اس کے ساتھیوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے نہایت فرماں بردار لہجے میں کہا اور اُن کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ جیپ میں بیٹھ کر میں نے پیچھے کی طرف نظریں دوڑائیں مگر پولیس کار کب کی وہاں سے جا چکی تھی۔ ''چلو اچھا ہے، بے چارے کو اس سرد رات میں خوار ہونے کے بجائے گھر تو مل گیا... چاہے وہ حوالات ہی کیوں نہ ہو۔'' میں بڑبڑایا۔

وہ رات میں نے شدید بخار میں گزاری۔ دوسرے دن میری طبیعت سنبھلی تو راجر نے بتایا کہ وہ لوگ کسی سروے کمپنی کے ملازم ہیں۔ کئی ہفتوں سے اس ویرانے میں سروے کر رہے ہیں۔ یہ جگہ شہر سے کافی دور ہے لہٰذا انہوں نے اشیائے خورونوش کا کافی انتظام کر رکھا ہے۔ رہائش خیموں میں تھی۔ کچن بھی ایک خیمے میں ہی تھا۔

''تمہاری جارج سے کیسے ملاقات ہوئی؟'' دوسرے دن اتوار تھا اور راجر اپنے ہاتھوں سے بنایا ہوا سوپ مجھے پلا رہا تھا۔

''کل شام کے وقت یہیں ملا تھا۔'' راجر نے مختصر سا جواب دیا۔

''مگر وہ تمہاری برساتی...''

''چھوڑو یار۔'' راجر نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ تو بتاؤ ہوا کیا تھا؟''

''وہ کل شام ہمیں یہیں آوارہ گھومتے ہوئے مل گیا تھا۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ ہمارے قریب آ گیا اور یونہی باتیں شروع ہو گئیں۔'' راجر نے جارج کا کارنامہ بیان کرنا شروع کیا۔ ''اس کی باتوں سے ہمیں لگا کہ وہ قسمت کا مارا ہے۔ اس وقت ہم رات کے کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہم نے اسے پینے اور کھانے کی دعوت دی۔ وہ راضی ہو گیا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ برتن سمیٹنے لگے۔ اسی دوران بارش ہونے لگی۔ اچانک جب جارج کارسٹن نے محسوس کیا کہ اُس پر کسی کی نظر نہیں ہے تو اس نے میرے خیمے میں رکھی ہوئی نئی برساتی اور دو بوتلیں اٹھائیں اور فرار ہو گیا۔ ابھی اسے بھاگے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی ہو گی کہ مجھے اس کارروائی کا احساس ہو گیا۔ میں نے پولیس کو فون کیا۔ شام کو باتوں باتوں میں جارج نے ہمیں اس جگہ کا پتا بتا دیا تھا جہاں تم تھے۔ پولیس نے سب سے پہلے اسی جگہ چھاپا مارنے کا فیصلہ کیا۔ نتیجے میں وہ پکڑا گیا۔'' راجر نے کہانی بیان کی۔ ''ویسے یہ بھی اچھا ہوا۔ ورنہ کل رات جتنی ٹھنڈ پڑی ہے، اگر تم وہیں پڑے رہتے تو کب کے مر چکے ہوتے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

''اب تو بخار نہیں لگ رہا۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہاں، ماتھا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' راجر نے جواب دیا۔ ''ویسے تمہارا حلیہ بہت خراب ہو رہا ہے۔ کپڑے بھی بہت گندے ہو گئے ہیں۔ تم ایسا کرو کہ شیو بناؤ۔ میں تمہیں کپڑے دیتا ہوں، وہ پہن لو۔ انہیں اتار کر پھینک دو۔''

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لے رہا تھا۔ فرار کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے شیو کی، نہایا، کپڑے تبدیل کیے اور سکون سے سویا تھا۔

ابھی میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوا گزرے دنوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک خیمے کا پردہ کھلا اور راجر کے ساتھ دو پولیس والے خیمے میں داخل ہوئے۔ پولیس والوں کو دیکھتے ہی میں گھبرا گیا۔ ان میں سے ایک وہی سیاہ فام پولیس والا تھا جو کل رات جارج کو بازو سے پکڑ کر اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے گیا تھا۔

''خیریت...'' پولیس والوں کو دیکھتے ہی میں نے ہکلاتے ہوئے راجر کی طرف دیکھتے ہوئے اُن لوگوں کی آمد کا سبب پوچھا۔

''ہاں سب خیریت ہے۔ یہ لوگ تم سے ملنا چاہتے تھے۔'' اس نے دونوں پولیس والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں... میں نے کیا کیا ہے؟'' نہ جانے کہاں سے مجھ میں یہ سوال کرنے کی ہمت آ گئی۔

''بات یہ ہے کہ جارج کارسٹن پکڑا تو گیا ہے ڈکیتی کے الزام میں لیکن معاملہ کچھ اور بھی ہے۔'' ایک پولیس والے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ چلو۔ ہمیں تمہاری مدد چاہیے۔''

''میری... لیکن میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ میں تو جارج کا ملازم تھا۔ وہ بھی اُن دنوں جب وہ میری تنخواہ دینے کے قابل تھا۔ اب تو وہ میرے لیے ایک مصیبت تھا۔ شکر ہے تمہاری وجہ سے مجھے آزادی ملی۔'' میں نے راجر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ کہیں پولیس کو تفتیش کے دوران اُس واقعے کا تو نہیں پتا چل گیا جس میں گولی چلی تھی اور جس کے بعد سے اب تک جارج اور میں بدستور خوار ہو رہے تھے۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں اس نے شریکِ جرم کے طور پر تو مجھے نامزد نہیں کر دیا۔ یہ سوچ کر ہی مجھے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔

''ویسے ابھی تو ہم بھی یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ تم نے کچھ کیا ہے۔ ہم تو صرف تفتیش میں تم سے تعاون کی درخواست لے کر آئے ہیں۔'' پولیس والے نے شریفانہ لہجے میں جواب دیا۔ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ میری اندرونی پریشانی اور خوف کو بھانپ چکا ہے۔ یہ سن کر میں بالکل خاموش ہو گیا۔

''تو پھر چلیں؟'' پولیس والے نے چند لمحے تک میرے جواب کا انتظار کیا اور پھر خاموشی توڑتے ہوئے سوال کیا۔

''چلیں۔'' میرے پاس اُن کے ساتھ جانے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا اس لیے میں نے مزید بحث کرنے کے بجائے ہتھیار ڈالنا مناسب سمجھا۔ جب ہم پولیس اسٹیشن پہنچے تو بارش ایک بار پھر شروع ہو چکی تھی۔

☆☆☆

''انہیں جانتے ہو؟'' پولیس کے تفتیشی روم میں مجھے لے جایا گیا اور ایک طرف اشارہ کر کے آفیسر اتھونی نے پوچھا۔

''جی ہاں... یہ جارج کارسٹن ہے۔'' میں نے اس طرف دیکھتے ہوئے کہا جہاں اس نے اشارہ کیا تھا۔ جارج سر جھکائے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ چہرے پر تھکن، مایوسی اور خوف کے ملے جلے اثرات تھے۔ اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ جیسے اسے کچھ دیر بعد موت کی سزا دی جانے والی ہے۔

''تم انہیں کب سے جانتے ہو؟'' اس نے ایک بار پھر سوال کیا۔

''پچھلے سات سال سے۔ میں ان کے گھر پر ملازم تھا۔''

''اوہ...'' اتھونی نے چونکتے ہوئے کہا اور مجھے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''رابرٹ... اسے لے جاؤ۔'' اس نے اپنے ماتحت کو کہا۔ یہ سنتے ہی اس نے جارج کو بازو سے پکڑا اور کمرے سے باہر لے جانے لگا۔

''تمہارا پورا نام کیا ہے؟'' اس نے جارج کے کمرے سے باہر جانے کے بعد مجھ سے سوال کیا۔

''الیگزینڈر تھامس۔ عام طور پر سب لوگ مجھے نک کے نام سے پکارتے ہیں۔'' میں نے دبے دبے لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

''او کے مسٹر نک... یہ بتاؤ تم اگر اُن کے ملازم تھے تو پھر یہ آوارہ گردوں کی سی زندگی کیوں بسر کر رہے تھے... مسٹر جارج کارسٹن اور... تم بھی؟'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر میں چند لمحوں تک خاموش رہا تو اس نے ایک بار پھر میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''دیکھو نک! اگر تم سب کچھ سچ سچ بتا دو گے تو اس میں تمہارا ہی بھلا ہے اور تمہارے مالک کا بھی۔ یاد رکھو، یہ امریکی پولیس ہے۔ سچ نہیں بتاؤ گے، تب بھی ہمیں سچ معلوم ہو جائے گا لیکن تم ایک شریف آدمی ہو۔ مجھے امید ہے کہ تم ہمیں مایوس نہیں کرو گے۔ ویسے بھی اس معاملے میں تمہارا تو کوئی قصور بھی نہیں ہے۔''

www.kahopakistan.com

''میں کچھ نہیں چھپا رہا۔ واقعی اس سارے معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' میں اس کی دھمکی سے مرعوب ہوگیا اس لیے سب کچھ صاف صاف بتانے کا فیصلہ کیا۔

''شاباش... ذرا کھل کر بتاؤ پوری بات۔'' انتھونی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ پہلے ایک ایک کپ کافی ہوجائے۔ بڑی سردی ہورہی ہے۔ کافی پیتے ہوئے بات کرتے ہیں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ کافی سے بھرے دو مگ لے آیا۔ ایک میرے سامنے رکھ دیا اور دوسرے سے خود گھونٹ بھرنے لگا۔

''ہاں تو اب بتاؤ کہ حقیقت کیا ہے؟'' اس نے نہایت سکون سے سوال کیا۔ اس کا لہجہ دوستانہ تھا۔

''یہ کوئی سات سال پہلے کی بات ہے۔ اُن دنوں میں بیروزگار تھا۔ ایک دن میں نے مقامی اخبار میں گھریلو ملازم کی نوکری کا اشتہار دیکھا۔ میں نے درخواست دی اور تیسرے ہی دن جارج کارسٹن نے مجھے انٹرویو کے لیے بلوالیا۔ میری آل اولاد تو ہے نہیں۔ انہوں نے مجھے رہائش بھی دے دی۔ میں نے جب مسٹر جارج کے پاس نوکری شروع کی تھی، اُس وقت یہ خاصے مال دار تھے لیکن لگ بھگ ڈیڑھ دو ماہ ہونے کو آئے ہیں، مارکیٹ کریش ہونے کے باعث یہ کوڑی کوڑی کے محتاج ہوگئے۔'' اُس کے دوستانہ رویّے سے میرا اعتماد کافی حد تک بحال ہوگیا تھا اس لیے میں نے اسے تفصیل سے وہ سب کچھ بتانے کا فیصلہ کیا جو میں جانتا تھا۔

''تو تم اُن کے کافی پرانے ملازم ہو؟''

''جی ہاں۔''

''پھر تو مسٹر جارج کی گھریلو زندگی کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتے ہوگے۔ اُن کے گھر کا ماحول کیسا تھا؟''

''یہ بات ٹھیک ہے کہ میں اُن کے گھر پر سات سال سے کام کررہا ہوں لیکن میری عادت ہے کہ مالکان کی سن گن نہیں لیتا۔ ویسے اُن کے بارے میں جو کچھ میرے علم میں ہے، وہ آپ کو ضرور بتاؤں گا۔''

''چلو ٹھیک ہے... تو پھر بتاؤ۔'' پولیس افسر نے میری بات سن کر کہا۔

''جارج اور ان کی بیوی ریڈی ہر وقت خوش گوار مزاج میں رہتے تھے مگر جب سے اسٹاک مارکیٹ کریش ہوئی تھی، تب سے جارج کارسٹن تو پریشان تھے ہی لیکن ان کی بیوی ریڈی بھی بہت چڑچڑی ہوگئی تھیں۔ بات بات پر ملازمین کو ذلیل کرتیں۔ گھر کے سب ملازمین کو وہ نکال چکی تھیں۔ اگر وہ واقعہ اُس دن نہ ہوا ہوتا تو میں خود بھی وہ ملازمت چھوڑ کر جانے والا تھا۔''

''کون سا واقعہ؟'' اس نے فوراً سوال کر دیا۔ میں نے یہ سوال سن کر تفصیل سے اُس دن کی روداد بیان کردی جس کے بعد سے ہم دونوں دربدر ہورہے تھے۔

''بہت خوب... ویسے نک! تم اچھے انسان ہو جو تم اتنا کچھ ہونے کے باوجود اس کڑے وقت میں بھی اپنے مالک کا ساتھ دے رہے تھے... جبکہ تمہیں اس سے ایک پھوٹی کوڑی کا فائدہ حاصل ہونے کی امید نہیں تھی۔''

''بہت شکریہ سر... میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔ ویسے بھی میں کبھی بھی کسی مجبور کو مجبوری کے عالم میں تنہا چھوڑنے کا سوچ نہیں سکتا۔'' انتھونی کی بات سن کر میرا کئی سیر خون بڑھ چکا تھا۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب کوئی شخص میرے رویّے کی تعریف کررہا تھا ورنہ تو آج تک کبھی کسی نے میرے اچھے رویّے کی ذرہ بھر بھی تعریف نہیں کی تھی۔

''تمہارا جذبہ قابلِ تعریف ہے۔'' انتھونی نے میرے خیالات سُن کر کہا۔ ''نک! مجھے افسوس ہے کہ تمہیں فی الوقت ہمارے ساتھ رہنا ہوگا۔''

''تو کیا میں خود کو گرفتار سمجھوں؟'' میں نے یہ سنتے ہی فوراً گھبرا کر پوچھا۔

''ارے نہیں بھئی۔'' وہ ہنس دیا۔ ''تم نے کوئی جرم تھوڑی کیا ہے جو ہم تمہیں گرفتار کریں گے۔''

''تو پھر...'' میں نے قطع کلامی کی۔

''بات یہ ہے کہ رات تک تو یہ معاملہ صرف چھوٹی سی ایک واردات کا تھا۔ ممکن تھا کہ ہم جارج کارسٹن کو تنبیہ کرکے چھوڑ دیتے مگر جب ہم نے تھوڑی تفتیش کی تو بات کہیں آگے تک جاپہنچی ہے اس لیے ہم نے تمہیں بھی شاملِ تفتیش کرلیا ہے...'' انتھونی ابھی مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تو پھر مجھے یہاں رکھنے اور تفتیش کرنے کا کیا تعلق بنتا ہے؟''

''بنتا ہے... پریشان مت ہو، فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔'' انتھونی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ شاید میرے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں دیکھ چکا تھا اس لیے اس نے میرا خوف کچھ کم کرنے کی کوشش کی۔ ''دیکھو نک... تم ایک اچھے انسان اور ذمے دار شہری ہو اور بس۔ اسی لیے ہمیں تم سے کچھ مدد چاہیے۔ ویسے تم جب تک یہاں ٹھہرے رہو گے، تمہیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''چلو۔''

''کہاں؟'' میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے لیے ریسٹ روم کھلوادیا گیا ہے۔ وہاں آرام کرو۔ ہاں جب کافی، لنچ یا کسی اور چیز کی ضرورت محسوس کرو تو وہاں موجود افسر کو بتادینا، تمہیں ضرورت کی ہر چیز مل جائے گی۔''

☆☆☆

''ہیلو مسٹر نک! کیا آپ جاگ رہے ہیں؟'' شام کے ساڑھے پانچ چھ بجے کا وقت ہوگا جب کسی نے میرے شانے ہلا کر مجھے جگانا چاہا۔

''ہاں ہاں... میں جاگ رہا ہوں۔'' میں نے بڑبڑا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ایک پولیس والا میرے بیڈ کے سرہانے کھڑا تھا۔

''انتھونی صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔'' مجھے اٹھتا ہوا دیکھ کر وہ بولا۔ ''میں نے آپ کے لیے کافی منگوائی ہے۔ اس وقت تک آپ فریش ہوجائیں تو پھر کافی پی کر چلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا اور واش روم میں گھس گیا۔ آج بہت دنوں کے بعد اتنا اچھا لنچ نصیب ہوا تھا۔ پیٹ بھر کے کھانے کے بعد ایسا نشہ چڑھا کہ کئی گھنٹوں تک سوتا رہا۔

''آیئے آیئے مسٹر نک!'' میں کمرے میں داخل ہوا تو انتھونی نے نہایت احترام سے کہا۔ اس وقت مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ مجھے اس طرح کوئی نہیں پکارتا تھا۔ ویسے بھی میں نے پوری زندگی لوگوں کی تابع داری کرتے ہوئے گزاری تھی۔ ہم جیسے کم تر لوگوں کو اس طرح عزت کے ساتھ کون پکارتا ہے۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے وہاں موجود لوگوں پر سرسری نظر ڈالی۔ اس وقت وہاں انتھونی کے علاوہ دو اور لوگ بھی موجود تھے۔ تینوں وردی میں تھے اور بڑے پولیس افسر لگ رہے تھے۔ وہ لوگ ایک گول میز کے کنارے لگی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ میں آگے بڑھا تو نک نے خالی کرسی پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ہاں تو اُس روز... میرا مطلب ہے کہ جس دن مسٹر جارج کارسٹن اور تم، اُس کے گھر سے فرار ہوئے تھے، کیا واقعہ ہوا تھا؟ وہ سب کچھ تفصیل سے ایک بار پھر بیان کردو۔''

میں نے انتھونی کی بات کو دھیان سے سنا اور اُس منحوس دن جو کچھ ہوا تھا من وعن بیان کرڈالا۔ وہ تینوں میری بات دھیان سے سُنتے رہے۔

''تو تمہارا کہنا ہے کہ تم نے مسٹر جارج کے ہاتھوں میں اُس وقت پستول دیکھا، جب وہ اصطبل کے قریب اپنی بیوی کے ساتھ چہل قدمی کررہے تھے؟''

''جی ہاں مگر پستول والا ہاتھ انہوں نے اس طرح پیچھے کررکھا تھا کہ ان کی بیوی کو نظر نہ آسکے۔ میں بھی اگر انہیں سامنے سے دیکھتا تو وہ پستول مجھے بھی نظر نہیں آتا۔'' میں نے وہاں موجود ایک پولیس افسر کا سوال سن کر وضاحت پیش کی۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے میری بات سُن کر سر ہلایا۔ ''اُس کے کچھ دیر بعد تم نے گولی چلنے کی آواز سنی؟''

''جی ہاں۔ اُس وقت میں اپنی کار اسٹارٹ کررہا تھا۔''

''اچھا... یہ بتاؤ کہ کیا تمہارے خیال میں یہ گولی جارج کارسٹن نے ہی چلائی تھی؟''

''یہ مجھے نہیں پتا۔ البتہ جب میں گولی چلنے کے بعد اندازہ لگا کر اُس جگہ پہنچا جہاں سے آواز آئی تھی تو اُس وقت وہاں مسٹر جارج تنہا تھے اور اُن کی حالت غیر ہورہی تھی۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''البتہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ گولی انہوں نے ہی چلائی تھی مگر جب میں وہاں پہنچا تو ان کے ہاتھ... میں پستول موجود تھا جسے انہوں نے میرے سامنے ہی زمین پر پھینک دیا تھا۔''

''اُس کے بعد کیا ہوا؟'' ایک اور پولیس افسر نے سوال کیا۔

''پھر میں نے وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے کہ میں وہاں سے نکل کر بھاگتا، مسٹر جارج بھی پہنچ گئے اور زبردستی میری کار میں بیٹھ گئے۔ اس کے بعد سے اب تک ہم دونوں مسلسل دربدری کے عالم میں روز و شب بسر کررہے تھے کہ پرسوں جارج نے کوئی واردات کی اور یوں ہم پکڑے گئے۔'' میں نے روداد ختم کی اور اُن کے چہروں کی طرف دیکھنے لگا۔

''جارج کو بلواؤ۔'' ایک افسر نے حکم دیا۔ کچھ ہی دیر بعد جارج کو کمرے میں لے آیا گیا۔ تب مجھے پتا چلا کہ سامنے والی دیوار میں لگے بہت بڑے شیشے کے پیچھے کمرا تھا جہاں بیٹھا ہوا جارج میرا بیان سُن رہا تھا۔ گول میز کے گرد ایک اور کرسی لگادی گئی تھی جس پر جارج بیٹھ گیا۔

''تم نے نک کا بیان سُن لیا؟'' اس افسر نے جارج سے سوال کیا۔

''جی ہاں۔''

www.kahopakistan.com

''تم اس کی باتوں سے اتفاق کرتے ہو؟''

''جی ہاں۔''

''تو پھر یہ سمجھا جائے کہ تم نے اپنی بیوی پر گولی چلائی تھی؟''

''جی نہیں۔'' یہ سُن کر جارج تلملا گیا۔ ''گولی میں نے نہیں، کیٹس نے مجھ پر چلائی تھی۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ میں اپنی بیوی کو کیوں ماروں گا؟'' اُلٹا جارج نے سوال کر دیا۔

''مگر پستول تو تمہارے پاس تھا؟'' اس افسر نے پھر سوال کیا۔

''ہاں، میرے پاس پستول تھا اور اس میں گولیاں بھی تھیں لیکن سچ یہ ہے کہ میں نے آج تک کسی پر گولی نہیں چلائی۔'' جارج نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''تو تم کہنا چاہتے ہو کہ تمہارے پاس بھرا ہوا پستول تھا لیکن تم نے گولی نہیں چلائی بلکہ وہاں ایک شخص موجود تھا جس نے تم پر گولی چلائی۔ تم اُس شخص کو جانتے بھی ہو اور اس کے نام سے بھی واقف ہو... درست؟''

''جی ہاں... یہی بات ہے۔''

''تو وہ گولی کس کو لگی تھی؟ یہ تو ظاہر ہے کہ گولی تمہیں تو نہیں لگی تھی۔''

''جب گولی چلی تو میں نے جھکائی دی۔ اس وقت میری بیوی رینڈی میرے پاس کھڑی تھی۔ گولی چلتے ہی میں نیچے گرا اور رینڈی بھی چیخ مارتے ہوئے نیچے گر گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اُسے گولی لگ چکی ہے۔''

''جب تم نے رینڈی پر گولی چلائی ہی نہیں تو پھر وہاں سے فرار کیوں ہوئے تھے؟'' افسر نے ایک اور سوال کیا۔

''میں کاروباری آدمی ہوں۔ کبھی اس طرح کے حالات سے نہیں گزرا اس لیے سخت خوفزدہ ہو گیا۔ میں نے اپنی ساکھ بچانے کے لیے ہر چیز فروخت کر ڈالی تھی۔ اب اگر قتل کے جرم میں پکڑا جاتا تو زندگی بھر کاروباری حلقے میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے خوفزدہ ہو کر فرار ہوا۔ جب میں نے نک کو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تو مجھے لگا کہ یہاں رکنے سے بہتر ہے کہ بھاگ جاؤں۔ نک بھی وہاں سے بھاگ رہا تھا۔ یہ میرا نمک خوار نوکر ہے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ بھی مجھے دھوکا نہیں دے گا۔ اس لیے اس لمحے مجھے پوری دنیا میں یہی ایک سہارا نظر آیا۔'' جارج نے تفصیل سے وہ واقعات بیان کیے جو میرے علم میں بھی نہیں تھے۔

''ویسے گولی چلنے سے پہلے کیا ہوا تھا اور تم نے پستول کیوں اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا؟'' پولیس افسر نے ایک بار پھر سوال کیا۔

''بات یہ ہے کہ اسٹاک مارکیٹ کریش ہونے کے بعد میں بالکل تباہ ہو گیا۔ نادہندہ ہو جاتا تو میرا لائسنس ختم ہو جاتا اور میں پھر کبھی بھی مارکیٹ میں کاروبار نہیں کر سکتا تھا۔'' جارج نے تفصیل سے سارے واقعات بیان کرنا شروع کیے۔ ''اس لیے میں نے اپنے سارے اثاثے فروخت کر کے تمام ادائیگیاں کر دی تھیں۔ اس وجہ سے میرا لائسنس تو بچ گیا لیکن کاروبار شروع کرنے کے لیے مجھے کچھ سرمائے کی ضرورت تھی۔ یہ رقم میرے پاس نہیں تھی۔ لے دے کر ایک گھر تھا جو پہلے ہی بینک کے پاس رہن رکھا ہوا ہے۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' پولیس افسر نے ہنکارا بھرا۔ اُس وقت سب لوگ دم سادھے جارج کا اعترافی بیان سُن رہے تھے۔ اُس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ ایسا بارا ہوا جواری لگ رہا تھا جو آخری بازی میں صرف اثاثے ہی نہیں بلکہ اپنی زندگی بھی ہار گیا ہو۔

''پھر کیا ہوا؟'' پولیس افسر نے پوچھا۔

''میری بیوی کو گھوڑے پالنے کا شوق تھا۔ اس کے شوق کی خاطر میں نے اپنے گھر میں شان دار اصطبل بھی بنوایا جہاں اعلیٰ نسل کے دس گھوڑے موجود تھے۔ ان گھوڑوں کی مجموعی مالیت بارہ لاکھ ڈالرز سے زائد ہے۔ کئی شوقین لوگ میرے ان گھوڑوں کو خریدنے کی پیشکش کر چکے تھے مگر میں سب کو مسترد کر چکا تھا۔ صرف اس لیے کہ یہ میری بیوی کا شوق تھا اور میں ان گھوڑوں کو بیچ کر اسے دکھی نہیں کر سکتا تھا۔''

''تم اپنی بیوی سے اتنا پیار کرتے تھے؟'' ایک افسر نے لقمہ دیا۔

''جی ہاں۔''

''تو پھر ایسا کیا ہوا کہ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا؟''

''جس دن یہ واقعہ ہوا، اس سے کچھ روز پہلے میں نے رینڈی سے کہا تھا کہ اگر ہم یہ گھوڑے فروخت کر کے اُس سرمائے سے ازسرِ نو کاروبار شروع کر دیں تو اس مالی بحران سے نکل سکتے ہیں۔ یہ بات سن کر اسے طیش آ گیا۔ اس وقت تو میں نے اس پر زور نہیں ڈالا لیکن بعد میں کئی بار رینڈی کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ گھوڑے فروخت کر دیتے ہیں۔ گھوڑے بیچنے کی بات سن کر وہ اس قدر طیش میں آ جاتی تھی کہ پھر اس سے کچھ کہنا سننا فضول ہوتا تھا۔ جس دن یہ واقعہ ہوا، اس دن میں نے اسے کسی سے فون پر بات کرتے ہوئے سنا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں کل صبح جارج کو اصطبل میں لے آؤں گی۔ تم کاغذات تیار رکھنا۔ وہیں پر اس سے دستخط کروا لیں گے۔ اس کی بات سے مجھے لگا کہ وہ گھوڑے بیچ کر ساری رقم لے کر، مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔ اس بات سے مجھے بہت افسوس ہوا۔ واقعے والے دن جب اس نے مجھ سے اصطبل میں چلنے کو کہا تو میں پہلے ہی اپنا پستول بھر کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ چکا تھا۔ جب ہم اصطبل کی طرف جا رہے تھے تو میں نے نہایت احتیاط سے اپنا پستول نکال کر سیدھے ہاتھ میں پکڑا اور بازو موڑ کر پستول والا ہاتھ کمر کے پیچھے کر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ کچھ گڑبڑ ہونے والی ہے اس لیے میں چونکا۔''

''جب تم اصطبل میں پہنچے تو پھر کیا ہوا؟'' جارج اپنے سامنے رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر پانی پینے لگا تو اس پولیس افسر نے سوال کر ڈالا۔ ''میں دیکھ رہا تھا کہ جارج کا حوصلہ بالکل ٹوٹ چکا ہے اور وہ بدقت تمام اپنی آنکھوں میں اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''جب میں اصطبل میں پہنچا تو وہاں کیٹس موجود تھا۔''

''یہ کیٹس کون ہے؟ کیا تم اسے پہلے سے جانتے تھے؟'' پولیس افسر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''یہ ایک ریس کورس کا مالک ہے اور اس کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ کئی بار وہ مجھے گھوڑے خریدنے کی پیش کش کر چکا تھا۔''

''اُس دن کیٹس نے تم سے کیا بات کی تھی؟''

''جب ہم اندر پہنچے تو وہاں وہ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جس کی نال میرے سینے کی طرف تھی۔ اسے دیکھ کر رینڈی نے میرا بازو اپنی کمر سے نکالا اور مجھ سے چند قدم دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ کیٹس نے فائل میری طرف بڑھائی اور کہا کہ اس میں موجود کاغذات پر دستخط کر دوں۔ میں اپنے اُلٹے ہاتھ سے لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں۔ سیدھے ہاتھ میں پستول تھا جسے میں نے پیٹھ کے پیچھے کیا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ رینڈی اور کیٹس میرے پاس پستول کی موجودگی سے بے خبر تھے۔ میں نے اُلٹا ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کے ہاتھ سے فائل لے لی۔ اس فائل میں صرف ایک ہی کاغذ لگا ہوا تھا۔''

''کیا لکھا ہوا تھا اس کاغذ پر؟'' پولیس افسر نے قطع کلامی کی۔

''وہ فروخت کا معاہدہ تھا جس کی رُو سے میں ساڑھے نو لاکھ ڈالرز فقد کے عوض اپنے دس گھوڑے کیٹس کو فروخت کر رہا تھا۔ اس نے مجھے کاغذ پر دستخط کرنے کو کہا۔ اس نے پستول کی نال میری پیشانی سے لگا دی تھی۔''

''تو تم نے دستخط کر دیے؟'' پولیس افسر نے سوال کیا۔

''جی ہاں... جیسے ہی میں نے دستخط کیے، اس نے میرے ہاتھ سے فائل جھپٹ لی۔ اسی وقت رینڈی آگے بڑھی اور اس کے ہاتھ سے فائل لینے لگی لیکن اس نے فائل نہیں دی بلکہ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ رینڈی بدستور کہے جا رہی تھی کہ یہ فائل مجھے دے دے۔ اس وقت میرا ماتھا ٹھنکا جب کیٹس نے کہا کہ کیسی فائل۔ یہ گھوڑے میں خرید چکا ہوں۔ یہ سنتے ہی رینڈی چلائی، دھوکے باز اور پھر وہ اس کی طرف لپکی۔ اسی دوران گولی چل گئی۔ رینڈی زمین پر گر پڑی۔'' یہ کہہ کر جارج خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

''رینڈی نے ایسا کیوں کیا؟'' کچھ دیر بعد پولیس افسر نے اس سے سوال کیا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' جارج نے بھرّائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''چلو پھر رینڈی سے ہی پوچھ لیتے ہیں۔'' پولیس افسر نے ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔

''کیا...؟'' یہ سنتے ہی جارج چونک گیا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ وہ ہی کیا، یہ بات سن کر تو میں بھی حیرت زدہ رہ گیا۔

''رینڈی کو لے کر آؤ۔'' پولیس افسر نے حکم دیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ لڑکھڑاتی ہوئی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی جارج بے تابی سے اٹھ کھڑا ہوا مگر اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ رینڈی آگے بڑھی اور اس کے گلے لگ گئی۔ وہ اونچی آواز سے رو رہی تھی۔

''مجھے معاف کر دو ہنی۔ پلیز! مجھے معاف کر دو۔ میں بے وقوف بن گئی تھی۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔'' وہ اِرد گرد سے بے خبر ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

''معاف کر دوا سے۔ اس میں اس کی کوئی غلطی نہیں۔ ہم نے سب تفتیش کر لی ہے۔ اس سے جو کچھ ہوا، وہ نادانی میں ہوا۔ بے چاری اپنے پالتو گھوڑوں کی محبت میں اندھی ہو گئی تھی۔'' پولیس افسر ساکت کھڑے جارج کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ یہ سن کر اس نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔

www.kahopakistan.com

کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا۔

کچھ دیر بعد ایک پولیس افسر کافی لے کر آ گیا۔ رینڈی بھی اب چپ ہو چکی تھی۔ جارج بدستور خاموش تھا لیکن اس کا چہرہ پرسکون نظر آ رہا تھا۔

''لیجیے... کافی آ گئی۔'' پولیس افسر نے ماحول کو خوش گوار بنانے کے لیے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر میں ماحول پر چھایا ہوا تناؤ ختم ہو گیا۔

کافی دیر گزر گئی۔ جب پولیس افسر نے دیکھا کہ ماحول پر چھایا ہوا تناؤ ختم ہو چکا ہے تو اس نے اشارے سے ایک پولیس والے کو بلایا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ اس کے بعد پولیس والا چلا گیا۔

''کیا اب ہم واپس جا سکتے ہیں؟'' رینڈی نے اُس پولیس افسر سے پوچھا۔

''ابھی نہیں۔ ابھی کچھ کام باقی ہے۔'' اس کی بات سُن کر رینڈی تو خاموش ہو گئی لیکن جارج کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آنے لگے۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کل رات والی واردات کی وجہ سے اب اسے رینڈی کے ساتھ جانے سے روکا جائے گا۔

ابھی کچھ ہی دیر گزری ہو گی کہ پولیس والا ایک شخص کو ساتھ لیے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ یہ کیٹس تھا... ہماری خواری کا اصل ذمے دار۔

''لیجیے مسٹر جارج کارسٹن... ملزم مل گیا۔'' کیٹس کو دیکھتے ہی جارج کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اُسے دیکھ کر رینڈی کے چہرے پر بھی نفرت کے آثار نمودار ہو گئے۔ کیٹس کمرے میں پہنچ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ ایک سپاہی اس کے پیچھے بدستور بندوق تانے کھڑا تھا۔

''حقیقت تو اب سامنے آ ہی چکی ہے اس لیے مسٹر جارج کارسٹن بہتر ہے کہ جو باتیں سامنے نہیں آ سکی ہیں، وہ میں آپ لوگوں کے گوش گزار کر دوں۔'' پولیس افسر نے ہم سب کے چہروں پر نظر ڈالتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''بات یہ ہے کہ جب کاروبار کی تباہی کے بعد جارج کارسٹن نے گھوڑوں کو بیچنے کی بات کی تو اس سے رینڈی پریشان ہو گئی۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنے پیارے پالتو گھوڑے بیچنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک دن رینڈی ریس کورس گئی تو وہاں اسے کیٹس مل گیا۔ اسے علم تھا کہ جارج کو کاروبار میں بدترین خسارہ ہوا ہے اس لیے اس نے گھوڑے بیچنے کی بات کی لیکن رینڈی نے ایک بار پھر سختی سے اس کی بات مسترد کر دی۔ اس دوران اس کے منہ سے نکل گیا کہ جارج بھی گھوڑے بیچنا چاہتا ہے لیکن وہ اسے ایسا نہیں کرنے دے گی۔ یہ سن کر کیٹس نے فوراً پینترا بدلا اور کہنے لگا کہ گھوڑے جارج کی ملکیت ہیں۔ وہ انہیں بیچ سکتا ہے۔ کیٹس نے رینڈی کو مشورہ دیا کہ اگر وہ کسی طرح جارج کارسٹن سے فروخت کے ایسے معاہدے پر دستخط کروا لے جس کی رُو سے وہ گھوڑے کسی تیسری پارٹی کو فروخت کر چکا ہے اور پھر وہ معاہدہ اپنے پاس رکھ لے تو یوں وہ بھی بھی گھوڑے نہیں بیچ سکے گا۔ رینڈی دل ہی دل میں گھوڑے بیچے جانے کے خیال سے بہت پریشان تھی..... کیٹس کی بات نے اسے اور بھی پریشان کر دیا کہ اگر جارج چاہے تو اپنی مرضی سے گھوڑے فروخت کر سکتا ہے۔

کیٹس کی بات رینڈی کے دل کو لگی اور پھر کافی دیر کی گفتگو کے بعد دونوں نے ایک منصوبہ بنا لیا۔ منصوبے کے تحت کیٹس، رینڈی سے تین ہزار ڈالرز لے کر تیسری پارٹی بننے پر تیار ہو گیا۔ اس منصوبے کے تحت، واقعے والے دن رینڈی جارج کو لے کر اصطبل میں پہنچی۔ جب دستخط ہو گئے تو کیٹس کا اصل منصوبہ سامنے آیا اور اس نے کاغذات رینڈی کو دینے سے انکار کر دیا جس پر وہ بپھر گئی۔ اس دوران میں گولی چلی۔ کیٹس کہتا ہے کہ اس نے گولی صرف خوفزدہ کرنے کے لیے چلائی تھی لیکن وہ گولی رینڈی کی ران پر لگی اور وہ گر گئی جس پر جارج... سمجھا کہ اس کی بیوی مر گئی ہے اور اب وہ اس کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو جائے گا۔'' پولیس افسر سارا ماجرا بیان کر رہا تھا۔ جارج اور میں منہ کھولے داستان کا وہ حصہ حیرت سے سُن رہے تھے جو ہمارے علم میں نہیں تھا۔ پولیس افسر چند لمحے تک چاروں طرف نظریں گھما گھما کر دیکھتا رہا اور پھر کچھ توقف کے بعد اس نے دوبارہ اپنی بات شروع کی۔

''پھر یہ ہوا کہ رینڈی کو گرتا ہوا دیکھ کر کیٹس بدحواس ہو گیا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ بھاگتے ہوئے اسے فائل کا بھی ہوش نہیں رہا۔ فائل وہیں اصطبل میں رہ گئی۔ رینڈی نے گولی لگنے کے بعد اپنے حواس قابو میں رکھے اور کسی نہ کسی طرح رہائشی کمپاؤنڈ میں پہنچ کر پولیس کو فون کر دیا۔ اس کے بعد رینڈی کی ران کا آپریشن ہوا۔ گولی گوشت میں پھنس گئی تھی اور ہڈی محفوظ رہی تھی۔ پھر بھی زخم کی وجہ سے اسے کئی روز تک اسپتال میں رہنا پڑا۔ دوسری طرف پولیس نے اسی دن کیٹس کو گرفتار کر لیا۔ اس نے اعترافِ جرم بھی کر لیا۔ اب اسے اقدامِ قتل اور جعلسازی کے مقدمے کا سامنا ہے۔''

لیکن آپ لوگ مجھ تک کیسے پہنچے؟'' جارج نے قطع کلامی کی۔

''جب واقعے کے بعد تم دونوں لاپتا ہو گئے تو پولیس نے تمہاری تلاش میں تمام تھانوں کو مطلع کر دیا۔ تمہاری تصاویر بھی فیکس کے ذریعے تھانوں کو بھجوا دی گئی تھیں۔ اسی وجہ سے کل رات تمہاری شناخت ہوئی۔ وہ تو بھلا ہو راجر کا کہ تم نے اس کے ہاں کل واردات کی اور اناڑیوں کی طرح پکڑے گئے۔ ورنہ تو نہ جانے ابھی کتنے اور دن تمہاری تلاش میں گزر جاتے۔'' پولیس افسر نے مسکراتے ہوئے، جارج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں مسٹر جارج... تمہارے لیے ایک اور اچھی خبر ہے۔''

''وہ کیا؟'' جارج نے بے تابی سے پوچھا۔

''راجر نے تمہیں معاف کر دیا ہے اور اپنی شکایت واپس لے لی ہے۔ اب تم تینوں اپنے گھر جا سکتے ہو۔''

''کیا؟'' جارج نے حیرت سے کہا۔

''ہاں... تم آزاد ہو۔ ویسے یہ کہنے کی اب کوئی ضرورت نہیں کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرنا۔'' پولیس افسر کی بات سُن کر جارج نے شرمندگی سے نظریں نیچے جھکا لیں۔

جب ہم باہر نکلے تو ایک کار ہماری منتظر تھی۔ یہ کار پولیس نے ہمیں گھر تک پہنچانے کے لیے مہیا کی تھی۔ جب جارج اور رینڈی گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے تو میں نے کار کا دروازہ بند کیا اور خدا حافظ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

''تم گھر نہیں چل رہے؟'' رینڈی نے زور سے کہا۔

''جی نہیں۔ میں اب آپ کا ملازم نہیں ہوں۔'' میں رُکا اور پلٹ کر جواب دیا۔

''کیا کہا تم نے؟'' میرا جواب سنتے ہی جارج چلّایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور میرے پاس آ کر کہنے لگا۔ ''یہ بات آئندہ مت کہنا۔ جو بُرے دن گزرے ہیں، اُن میں جس طرح تم نے میرا ساتھ دیا ہے، وہ میں زندگی بھر نہیں بھلا سکتا۔ تم میرے نوکر نہیں، آج سے میرے گھر کے ایک فرد ہو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور کار کی اگلی نشست کا دروازہ کھول کر مجھے بٹھایا اور دروازہ بند کر کے خود پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

دوسری صبح میں نے ناشتا تیار کیا۔ ناشتے کے بعد جارج اور رینڈی لان میں آ کر بیٹھ گئے۔ مجھے بھی انہوں نے اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ ہم تینوں مستقبل کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ جارج کی بنیادی پریشانی یہ تھی کہ اس کے پاس رقم نہیں تھی اور سرمائے کے بنا کاروبار کرنا ممکن نہیں تھا۔ جارج کا خیال تھا کہ فوری طور پر تین سے چار لاکھ ڈالرز سرمائے کا انتظام ہو جائے تو وہ ایک بار پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہے۔

''میرا خیال ہے کہ تم گھوڑے بیچ دو۔ اس سرمائے سے ہم کاروبار شروع کر دیں گے۔'' رینڈی نے تجویز پیش کی۔

''ہرگز نہیں... ان گھوڑوں کے چکر میں، میں پہلے ہی بہت خواری اٹھا چکا ہوں۔ ویسے بھی یہ تمہارا شوق ہے۔ میں تمہارے شوق کی قیمت پر کاروبار شروع کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''مگر میں خوش دلی سے تمہیں یہ پیش کش کر رہی ہوں۔ میرے لیے تم اہم ہو، یہ گھوڑے نہیں۔'' رینڈی نے ایک بار پھر اصرار کیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر...'' ابھی جارج نے اپنی بات مکمل بھی نہیں کی تھی کہ ڈرائیوے میں گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ سامنے نئے ماڈل کی کار سے سوٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر شخص اتر رہا تھا۔ اگرچہ کل رات سے رینڈی اور جارج کا رویّہ مجھ سے یکسر تبدیل ہو چکا تھا لیکن میں جذبہ تابع داری سے مغلوب ہو کر فوراً اٹھا اور اس شخص کے پاس پہنچا۔

جھوٹا سا اشتہار

ایک سو ڈالر بچائیے

ہیرے کی انگوٹھی: قیمت سات سو ڈالر۔
تین انگوٹھیاں: قیمت صرف دو ہزار ڈالر۔

سیب کو سو اسیب

امریکن سیاح (تربوز اٹھاتے ہوئے) ''بس تمہارے ہاں سب سے بڑے سیب اتنے ہی چھوٹے ہوتے ہیں؟''

پاکستانی پھل فروش۔ ''ارے ارے، اس انگور کو انگلی سے دباؤ نہیں۔''

راحیلہ نسیم، کوٹ ادو

خوب صورت

ایک محفل میں ایک نہایت خوب صورت عورت نے اونچی آواز میں کہا۔ ''مرد لباس کے معاملے میں بڑے بے پروا ہوتے ہیں۔ اب دیکھیے نا، اس محفل کے سب سے خوب صورت آدمی نے ٹائی ٹھیک سے نہیں باندھی ہوئی۔''

یہ سنتے ہی بیک وقت دو درجن آدمیوں نے اپنی ٹائیوں کو درست کرنا شروع کر دیا۔

کاشان عباس کی بزلہ سنجی پشاور سے

www.kahopakistan.com

''مجھے ایڈورڈ کہتے ہیں۔ میں بیمہ کمپنی کی طرف سے آیا ہوں اور مسز جارج کارسٹن سے ملنا چاہتا ہوں۔'' نو وارد نے مصافحہ کرتے ہوئے تفصیل سے اپنا تعارف کروایا۔

''آیئے...'' میں نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ساتھ لے کر لان میں پہنچ گیا۔

تعارف اور رسمی گفتگو کے بعد نو وارد نے اپنا بریف کیس کھولا۔ ایک فائل نکال کر اس میں رکھا ہوا لفافہ نکالا اور اسے رینڈی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لیجیے... یہ آپ کے بیمے کی رقم۔ وصولی کی اس رسید پر دستخط کر دیں۔'' رینڈی نے لفافہ لے کر دستخط کیے۔

''شکریہ آپ کا۔''

''شکریہ کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو ہمارا فرض ہے۔'' نو وارد نے بالکل کاروباری انداز میں کہا۔ ''اب مجھے اجازت دیجیے۔'' اس نے فائل واپس بریف کیس میں رکھتے ہوئے کہا۔

''بہت بہت شکریہ آپ کا۔'' رینڈی نے بیٹھے بیٹھے کہا۔ اس کی ران کا زخم ابھی پوری طرح خشک نہیں ہوا تھا۔ اس لیے وہ اٹھنے بیٹھنے میں اب بھی تکلیف محسوس کرتی تھی۔

بیمہ ایجنٹ کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر وہیں بیٹھ گیا۔ رینڈی نے لفافہ کھولا اور پھر مسکراتے ہوئے اس میں سے چیک نکالا۔ چند لمحے تک وہ چیک کو دیکھتی رہی اور پھر کچھ توقف کرتے ہوئے جارج سے بولی۔

''تو تم گھوڑے فروخت نہیں کرو گے؟''

''ہرگز نہیں۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔ اب اس بارے میں کوئی اور بات نہیں کرنا۔'' جارج نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے سچ کہوں، مجھے تم اور تمہاری خوشیاں اپنے کاروبار سے زیادہ عزیز ہیں۔'' اس کا لہجہ خاصا رومانی ہو چکا تھا۔ ''اس لیے اب آئندہ اپنی زبان پر گھوڑے فروخت کرنے کی بات نہ لانا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ یہ لو اور اپنا کاروبار ایک بار پھر شروع کر دو مگر میری ایک شرط ہے۔'' یہ سن کر جارج نے سر اٹھایا تو رینڈی نے اس کی آنکھوں کے سامنے چیک لہرایا۔ جارج نے چیک تھام لیا۔

''اوہ میرے خدا... یہ کیا؟ ساڑھے چار لاکھ ڈالرز۔ یہ بیمہ تم نے کب کروایا تھا؟'' چیک دیکھتے ہی وہ چلّا کر بولا۔

''تم سے شادی کرنے سے بھی بہت پہلے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''اسے سنبھالو اور اس رقم سے کاروبار شروع کر دو۔''

''یہ تو غیب سے مدد ہو گئی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر ابھی تم نے میری شرط نہیں سنی۔''

''وہ کیا؟'' جارج خوشی اور حیرت کے ملے جلے لہجے میں بولا۔

''نک تمہاری کمپنی میں ڈائریکٹر ہوگا۔''

''کیا؟'' اس بار حیران ہونے کی باری میری تھی۔

''ہاں... تم نے میری غلطی کی سزا بھگتی اور پھر بھی اپنے مالک سے وفادار رہے۔ یہ تمہاری خدمات کا اعتراف اور تمہیں ہمیشہ جارج کارسٹن کے ساتھ رکھنے کا جواز ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''نہیں... یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا؟''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' میں جانتا تھا کہ رینڈی ضدی عورت ہے اس لیے میں نے بحث کرنے کے بجائے ہامی بھر لینے میں ہی اپنی عافیت جانی۔

''یہ ہوئی نا بات۔'' دونوں میاں بیوی یک زبان ہو کر بولے۔

''تو پھر اس خوشی کے موقع پر کافی پی جائے۔'' جارج نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ سنتے ہی میں فوراً اٹھنے لگا۔ اسی دوران میں رینڈی بھی کرسی کے ہتھے کا سہارا لیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم کہاں چلے؟'' مجھے کھڑا ہوتے دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

''کافی بنانے۔''

''تم اِدھر بیٹھو۔ کافی میں بناؤں گی۔ اب تم گھر کے ملازم نہیں، ہماری کمپنی کے ڈائریکٹر ہو۔''

''اوہ ہاں...'' یہ سن کر میں نے جواب دیا مگر جناب کیا کروں... پوری زندگی تابع داری میں گزری ہے۔ اب کمپنی کا ڈائریکٹر بن چکا ہوں تو اس پرانی عادت سے بھی جان چھڑانا ہوگی لیکن مجبور ہوں... بچپن سے پڑی ہوئی عادتوں سے بڑھاپے میں جان چھڑانا آسان نہیں ہوتا۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ کافی آپ ہی بنایئے گا لیکن میں کچن تک پہنچنے میں آپ کی مدد تو کر سکتا ہوں۔''

''یہ ٹھیک ہے۔'' رینڈی نے سہارے کے لیے میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

ویسے آپس کی بات ہے۔ یہ تابع داری نہیں تھی مگر انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے۔ اب خود ہی سوچو اگر رینڈی لڑکھڑاتے ہوئے، بنا سہارے کے کچن کی طرف جاتے ہوئے گر پڑتی تو...

●●●

قسمت بدلنے کا نادر موقع بہت مشکل سے میسر آتا ہے... اور کبھی کبھی اس کی دستک اتنی آہستگی سے ہوتی ہے... کہ ہماری عقل اسے سمجھنے اور کان سننے سے قاصر رہتے ہیں... مغربی دنیا کے ہزار رنگ میں سے ایک کی یادگار جھلک...

اس لڑکی کا فسانہ جس کا بوائے فرینڈ کوئی اور لے اڑا تھا

سعیِ رائگاں

سلیم انور

جینی نے ٹرک سے نیچے چھلانگ لگائی اور نیچے رکھے ہوئے کوڑے دانوں میں سے ایک کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ پھر ایک جھٹکے سے اس کا ڈھکن علیحدہ کیا اور اسے زمین پر رکھ دیا۔ کوڑے دان خاصا وزنی تھا لیکن اسے دوسروں کے کوڑے کا بوجھ اٹھاتے ہوئے اب تین سال ہو گئے تھے۔ کام بھی زیادہ مشکل نہیں تھا اور یونین کی مہربانی سے اب اس کی تنخواہ بھی خاصی معقول تھی۔

جینی نے کوڑے دان کو اٹھا کر ٹرک کے عقبی حصے میں الٹ دیا اور پھر خالی کوڑے دان کو زمین پر رکھ دیا۔ جب وہ دوسرا کوڑے دان اٹھانے لگی تو اسے اس کے پیچھے کپڑوں کا ایک ڈھیر سا دکھائی دیا۔

وہ بڑبڑانے لگی۔ ''لوگ یہ کب سیکھیں گے کہ ہم صرف وہ اٹھاتے ہیں جو کوڑے دان کے اندر ہوتا ہے۔ آپ تو کوڑا کرکٹ زمین پر پھینک دیں اور ہم سے یہ توقع کریں کہ...''

www.kahopakistan.com

لیکن وہ کپڑوں کا ڈھیر نہیں تھا۔

وہ ایک آدمی تھا!

اس نے سوٹ پہنا ہوا تھا جو پھٹا ہوا، بے حد گندہ اور مٹی میں لت پت تھا۔ البتہ وہ شخص بہ ذاتِ خود قدرے ہینڈسم تھا۔ اس کی عمر پچیس تیس برس کے درمیان دکھائی دے رہی تھی... غالباً وہ جینی کا ہم عمر تھا۔

''ہے بڈی...'' جینی نے اسے پکارا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تم ٹھیک تو ہونا؟'' جینی نے آگے بڑھ کر اس کے شانے کو چھوتے ہوئے پوچھا۔

اس نے شانے اچکا دیے جیسے کہہ رہا ہو۔ ''مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

''کیا یہ شخص نشے میں دھت ہے؟ اور وہ بھی صبح کے سات بجے؟''

''اچھا بس یہیں پڑے رہنا۔ اوکے؟ میں چند منٹوں میں واپس آکر تمہیں اٹھالوں گی۔'' جینی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اس شخص نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

جینی پلٹ کر ٹرک کے کیبن کے پاس چلی گئی۔ ''ہے، فلپ۔''

فلپ نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ ریڈیو سننے میں مگن تھا۔ ساتھ ہی شکم پور روٹی کے ساتھ اپنا دوسرا انڈا اندیدوں کی طرح ہڑپ کرنے میں لگا ہوا تھا۔

''فلپ!''

فلپ نے ریڈیو کی آواز دھیمی کر دی۔ ''کیا ہے؟'' اس نے منہ چلاتے ہوئے پوچھا تو انڈے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس کے منہ سے نکل کر اڑتا ہوا جینی کے سر پر سے گزر گیا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ کیا تم میری خاطر ڈسپیچ کو فون کر دو گے، پلیز؟''

''ہیری کو یہ بات پسند نہیں آئے گی۔''

''مجھے اس کی پروا نہیں کہ ہیری کو یہ بات پسند آتی ہے یا نہیں... میں بیمار ہوں اور مجھے فوری طور پر گھر جانے کی ضرورت ہے۔ اگر ہیری کو یہ بات پسند نہیں آتی تو وہ اس معاملے کو یونین کے سامنے اٹھا سکتا ہے۔''

''ویل، میں اسے نہیں بتاؤں گا۔ تم خود ہی اطلاع کر دو۔''

''فلپ! تم بہت بڑے ڈرپوک ہو۔'' جینی نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تم کچھ بھی کہہ سکتی ہو، جینی۔''

جینی اچھل کر ٹرک کی سائڈ والی سیڑھی پر چڑھ گئی۔ ''لاؤ، مائک مجھے تھما دو۔''

☆☆☆

جب جینی نے اپنی پرانی کار گلی میں داخل کی تو دعا مانگ رہی تھی کہ کوڑے دان کے پاس پڑا ہوا وہ شخص اب بھی وہاں موجود ہو۔

وہ وہاں موجود تھا۔

جینی نے اپنی کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا اور اس شخص کو اٹھانے کے لیے اس کے پاس جا پہنچی۔

''آؤ چلیں، میں تمہارے لیے نہانے دھونے، صاف ستھرے لباس اور کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں۔'' جینی نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

''ہوں؟''

اس شخص کے منہ سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے جس نے جینی کا جی متلا دیا۔ لیکن وہ دوسرے لوگوں کے کوڑے کرکٹ کی بُو سونگھنے کی عادی ہو چکی تھی اس لیے اسے ابکائی نہیں آئی۔ ''اٹھو، میں تمہاری مدد کرتی ہوں۔''

☆☆☆

''تمہارے پاس بستر ہے؟''

''کیا گرما گرم باتھ لینے کے بعد بھی تم خود کو بہتر محسوس نہیں کر رہے ہو؟'' جینی نے پوچھا۔

''میرے خیال میں، میں بہتر ہوں۔ مجھے واقعی کچھ یاد نہیں آرہا۔''

جینی کے سابقہ بوائے فرینڈ کی جینز اور ٹی شرٹ اسے خاصی فٹ آگئی تھی۔ جینی کو اسے نہلانے اور اس کے جسم پر صابن ملنے میں خاصا لطف آیا تھا اور اب وہ اسے ستائشی نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے کچن کی میز پر بیٹھا ہوا وہ شخص اس کے سابقہ بوائے فرینڈ جیسا لگ رہا تھا۔ البتہ یہ شخص اس سے کہیں زیادہ ہینڈسم تھا۔

جینی نے گوشت، انڈے اور توس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''آؤ ناشتا کرلو۔''

''میرا بھوک سے بُرا حال ہو رہا ہے۔'' اس نے یہ کہہ کر جلدی جلدی لقمے مارنا شروع کر دیے۔

''اب بتاؤ، تمہارا نام کیا ہے؟'' جینی نے پوچھا۔

وہ قدرے الجھن میں پڑ گیا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔ میں یہ امید کر رہا تھا کہ تم بتاؤ گی۔''

''ویل، یہ قدرے شرمندگی کی بات ہے۔ میں عام طور پر ایسا نہیں کرتی۔''

''کیا؟''

''ایسے شخص سے بے تکلف ہو جاؤں جس کا مجھے نام تک معلوم نہ ہو۔'' جینی نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ''تم رات بھر کسی معصوم بچے کی طرح مجھ سے چمٹ کر سوتے رہے ہو۔''

''واقعی؟ میری یادداشت واضح نہیں ہے۔ حقیقت میں کچھ بھی یاد نہیں آرہا۔''

جینی نے ناراضی کے اظہار کے طور پر اپنے ہونٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ کسی لڑکی کے جذبات کو کس طرح ٹھیس پہنچائی جاتی ہے؟ میں رات بھر تمہیں جگانے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن تم بے سدھ پڑے رہے۔''

''اوہ! آئی ایم سوری، مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ ''شاید میرا سر ہیڈ بورڈ سے ٹکرا گیا ہوگا یا... میں بستر سے نیچے گر پڑا تھا؟''

جینی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ''اوہ نہیں۔ میرے خیال سے ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

☆☆☆

جینی نے دو دن تک اپنا ہر پل اپنے اس نئے بوائے فرینڈ کے ساتھ گزارا۔ یہ اس خواب کی تعبیر تھی جو وہ اب تک دیکھتی چلی آئی تھی۔ اس کی آرزو تھی کہ اس کی یادداشت کبھی واپس نہ آئے۔ البتہ کبھی نہ کبھی اسے ملازمت تو کرنا ہی پڑے گی۔ صرف جینی کی اپنی تنخواہ پر ان دونوں کا گزارہ نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

جب جینی نے آنکھیں کھولیں تو الارم کلاک اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ جینی نے الارم لگانے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔

''بدحواس! اب اٹھ بھی جاؤ۔ نو بج چکے ہیں۔''

کوئی جواب نہیں آیا۔

''ہم لنچ پیک کر کے آج پارک جائیں گے۔ اتوار کے روز لوگ وہاں جانا اور پتنگیں اڑانا پسند کرتے ہیں۔ میرے پاس بھی چند رنگ برنگی پتنگیں ہیں۔ خوب لطف آئے گا۔ ہیں نا؟''

اب بھی کوئی جواب نہیں آیا۔

جینی نے کروٹ بدل لی اور بولی۔ ''ہنی؟''

لیکن وہ بیڈ پر سے غائب تھا۔

جینی بوکھلا گئی اور اس کی تلاش میں پورا گھر چھان مارا، وہ کہیں موجود نہیں تھا۔

جب جینی کی نگاہ کچن کی کھڑکی سے باہر کی طرف گئی تو وہ دکھائی دے گیا۔ وہ باہر فٹ پاتھ پر کھڑا کار میں بیٹھی ہوئی ایک عورت سے بات کر رہا تھا۔

جینی اپنے داخلی دروازے کی طرف دوڑ پڑی۔

وہ اس عورت کی کار میں سوار ہو رہا تھا۔

جینی نے پوری طاقت سے کار کی جانب دوڑ لگا دی۔ ساتھ ہی وہ چلا رہی تھی۔ ''اے! رک جاؤ۔ یہ میرا بوائے فرینڈ ہے۔''

لیکن وہ عورت کار تیزی سے بھگا کر لے گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے کار نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

جینی فٹ پاتھ پر کھڑی روتی رہ گئی۔ کار کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔

''وہ مجھے کیونکر چھوڑ کے جا سکتا ہے؟ میں نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا اس کے باوجود بھی؟ ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے... کیا وہ مجھ سے پیار نہیں کرتا تھا؟''

وہ دیر تک خالی سڑک کو دیکھتی رہی پھر تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنے گھر کی جانب پلٹ گئی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے دہلیز پر پڑا ہوا اخبار اٹھا لیا۔

اس نے اخبار کچن کی میز پر اچھال دیا اور گزشتہ روز کی بنی ہوئی کافی گرم کرنے کے لیے مائیکرو ویو میں رکھ دی۔

جینی جب سے اس نوجوان کو گھر لائی تھی، اس نے اخبار کی جانب نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

اس نے سوچا کہ اخبار بینی سے شاید اس کا دھیان اس شخص کی جانب سے ہٹ جائے۔ اس شخص کی بے وفائی کا صدمہ اس کے ذہن پر بوجھ بنا ہوا تھا۔

وہ کچن کی میز پر بیٹھ گئی اور اخبار اٹھا لیا۔ اس نے پہلے صفحے پر نگاہ دوڑائی تو ایک شہ سرخی کے ساتھ چھپی ہوئی تصویر نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا دی۔ وہ تصویر اسی نوجوان کی تھی۔ خبر یہ تھی:

''مقامی بینکار کے بیٹے کی گمشدگی۔''

ایک مقامی بینکار جون رچی نے اپنے بیٹے بوب رچی کو تلاش کرنے والے کے لیے ایک لاکھ ڈالرز کے انعام کی پیشکش کی ہے۔ بوب رچی کو آخری بار جمعرات کی شب ایک مقامی بار میں دیکھا گیا تھا۔ وہ بار میں ہونے والی ایک لڑائی میں شامل تھا اور اس کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ وہ زخمی ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہو۔''

جینی کے ہاتھ سے کافی کا کپ نیچے گر پڑا۔ اس نے اخبار کھینچ کر دیوار پر دے مارا اور پوری قوت سے چیختے ہوئے اپنے بال نوچنے لگی۔

www.kahopakistan.com

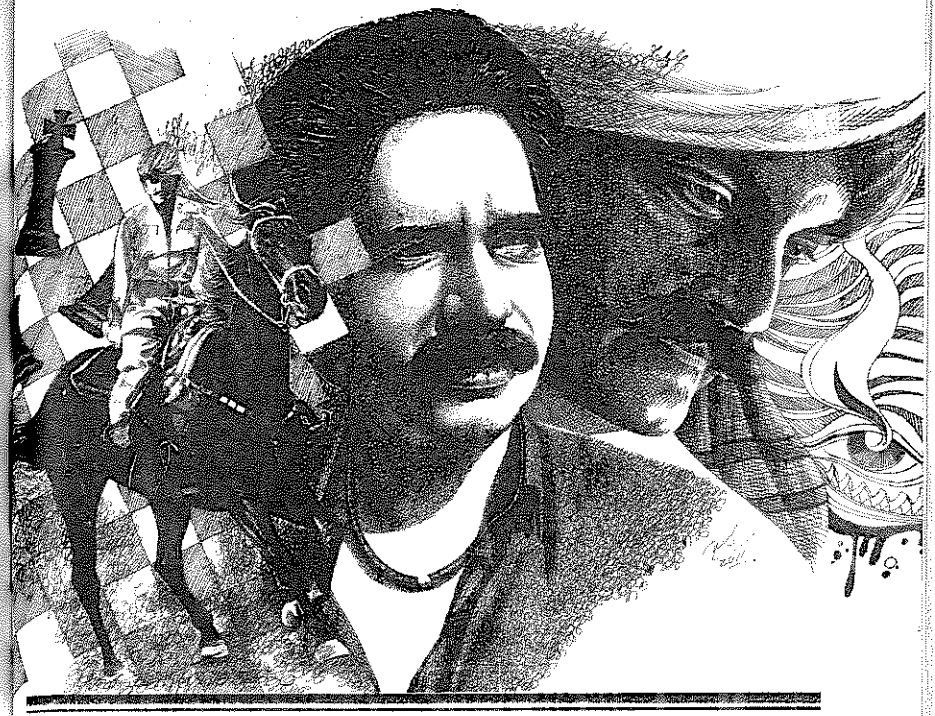

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں...... مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے...... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے...... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے - پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے...... نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کرکے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہوجاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں...... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے...... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے...... جرم، افسرشاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

اسما قادری

قسط 24

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل سے اور بکھر جانے والوں کی کہانی

www.kahopakistan.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہر یار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرنگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیرآباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہر یار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا ہے اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہوجاتا ہے۔ پیرآباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہر یار کا سہارا پاکر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ آفتاب اور کشور خفیہ نکاح کر لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیرآباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ چودھری اسے اغوا کروالیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ شہر یار اپنے ڈرائیور مشابرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاندے منتقل کردیتا ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کرلیتے ہیں۔ گوراجس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کرلیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چودھری ماہ بانو کی تلاش میں ہے، وہ اسے ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے مگر عمران ایک جگہ ایوالانچ کی زد میں آجاتا ہے اور اس میں دب کر اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ ادھر مشابرم خان ماہ بانو کی تلاش میں اس برف زار تک پہنچ جاتا ہے اور دشمنوں کا پتا لگا لیتا ہے اور وہاں ایمونیشن بلاسٹ ہونے سے کافی تباہی ہوتی ہے۔ چودھری افتخار کو کشور کے غیاب کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چودھری، ماسٹر آفتاب کو اغوا کرالیتا ہے۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہوجاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کلا مخبر ہوتا ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ادھر مشابرم خان لڑائی کے دوران زخمی ہوجاتا ہے اور پاکستان آرمی والوں کے وہاں پہنچنے سے ان کی تحویل میں پہنچ جاتا ہے۔ شہر یار ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جگو کا سہارا لیتا ہے اور جگو آفتاب کو چودھری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ ماہ بانو کو بچانے والا مہربان شخص اپنے واقف کار کے توسط سے اسے ایک میجر سے ملوا دیتا ہے جو ماہ بانو کی فراہم کردہ معلومات کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہر یار کو بھی اس واقعے کی اطلاع میجر کے ذریعے مل جاتی ہے اور شہر یار فوراً اسکردو پہنچ جاتا ہے اور مشابرم خان اور ماہ بانو کو آرمی کی کسٹڈی سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ماہ بانو کو چھڑانے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور اسے کراچی منتقل کردیتا ہے۔ صحافی افضل قاتلانہ حملے میں مارا جاتا ہے۔ ماہ بانو کراچی میں میڈیکل کالج میں مہرین کے نام سے داخلہ لے لیتی ہے۔ وہاں اسے راحیلہ نامی ایک لڑکی ملتی ہے جو اس سے کافی گھل مل جاتی ہے۔ ماہ بانو کو اس کی سہیلی راحیلہ اپنے بھائی سے ملوانے گھر لے جاتی ہے۔ وہاں ماہ بانو پڑوس کے بنگلے میں مہاگرو کو دیکھ لیتی ہے اور شہر یار کو مطلع کرتی ہے۔ شہر یار فوراً کراچی آجاتا ہے۔ نگرانی کے دوران اسے سرمد نظر آتا ہے۔ وہ اس سے مل کر مہاگرو کا پتا لگاتا ہے اور ماہ بانو کی مدد سے اس پر قابو پالیتا ہے۔ ادھر چودھری کے کارندے بابر کو مار کر آفتاب اور کشور کا پتا لگا لیتے ہیں لیکن وہ وہاں سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ ادھر کشور کی ملازمہ خاص رانی کا منگیتر اکو جنگل میں پوست کی کاشت کا پتا لگا لیتا ہے۔ اسے وہاں چودھری کے کارندے دیکھ لیتے ہیں اور اس کا پیچھا کرکے اسے مار دیتے ہیں۔ مہاگرو (ورما) کے لوگ ایک سینئر ڈاکٹر کی فیملی کو یرغمال بنا کر ڈاکٹر کو ساتھ دینے پر آمادہ کرتے ہیں اور ورما کو اسپتال سے نکال لے جاتے ہیں۔ ادھر شہر یار کے ماموں لیاقت رانا پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ شہر یار خبر سن کر پریشان ہوجاتا ہے اور انہیں دیکھنے کے لیے لاہور جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر ماریا بھی اس کے ساتھ لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے۔ راستے میں ڈاکٹر ماریا کی طبیعت کی خرابی کے باعث انہیں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں مختصر قیام کرنا پڑتا ہے اور اس قیام کے دوران وہ ماریا کے قریب ہوجاتا ہے۔ ماہ بانو ایک بار پھر چودھری کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ ادھر شہر یار اپنے قدم بہکنے پر خود کی اور ماریا کی نظروں میں گرجاتا ہے اور ماریا کی طنزیہ گفتگو سن کر اس سے شادی کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ وڈی چودھرائن اپنے داماد سے ماہ بانو کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کرتی ہے اور اشرف شاہ ماہ بانو کو چودھری کی قید سے نکال کر ڈاکوؤں کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ ادھر آفتاب جمعے کی نماز کے لیے جاتا ہے تو وہاں اسے امام مسجد کا چہرہ شناسا لگتا ہے اور کسی کی صورت ذہن میں آنے کے بعد وہ اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہے۔ ماہ بانو ڈاکوؤں کے چنگل میں ہوتی ہے اور ان کے کام کاج کرتی ہے۔ وہاں موجود ڈاکو اسلم کے مطابق اس نے سردار سے ماہ بانو سے متعلق اجازت لے لی ہوتی ہے کہ ماہ بانو پر صرف اس کا حق ہے۔ مگر وہ ماہ بانو کو غلط نظر سے نہیں دیکھتا۔ وہ ماہ بانو کو پسند کرنے لگتا ہے۔ وہ ماہ بانو کو کھلی فضا میسر کرنے کے لیے اپنی بنائی ہوئی ایک پھلواری میں لے جاتا ہے۔ ادھر شہر یار ماہ بانو کی تلاش کے سلسلے میں کوشاں رہتا ہے مگر اسے ناکامی ہوتی ہے۔ مشابرم خان آرمی کسٹڈی سے چھوٹ کر واپس آجاتا ہے۔ آفتاب شہر یار کو فون کرکے اسے را کے ایجنٹ کی وہاں موجودگی کا بتاتا ہے۔ ایک رات غلام محمد نامی را کا ایجنٹ آفتاب کے گھر پر دھاوا بول دیتا ہے۔ اس لڑائی میں کشور کو گولی لگتی ہے اور وہ زخمی ہوجاتی ہے تاہم غلام محمد پکڑا جاتا ہے۔ شہر یار، مشابرم خان اور فورس کی مدد سے اس پر قابو پاتا ہے۔ ادھر ماہ بانو پھلواری میں بیٹھی ہوتی ہے کہ اسے نسوانی چیخوں کی آواز آتی ہے۔ وہاں موجود ڈاکو جمرو للی نامی عورت کی عزت پامال کررہا ہوتا ہے۔ ماہ بانو اسے اس سے چھڑانے کی کوشش کرتی ہے۔ جمرو، للی کو چھوڑ کر ماہ بانو کو پکڑ لیتا ہے۔ جمرو کے بوجھ تلے اس کا نازک بدن حرکت کرنے سے بھی قاصر تھا۔ پھر اسلم بروقت پہنچ کر ماہ بانو کو بچا لیتا ہے۔ اسلم اور جمرو میں زبردست لڑائی ہوتی ہے پھر سردار کے آنے پر دونوں کو خاموش ہونا پڑتا ہے۔ للی غلط بیانی کرتی ہے۔ ادھر کشور کی زندگی بچالی جاتی ہے۔ اس دوران آفتاب کو پتا چلتا ہے کہ چودھری کے گرگے اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ آفتاب اور کشور میرپور خاص آجاتے ہیں۔ ادھر فریدہ چودھرائن کی سازش کا شکار ہوکر سیڑھیوں سے گر جاتی ہے، اس کی جان بچ جاتی ہے اور اس کے ہاں ایک بیٹے کی پیدائش ہوتی ہے۔ راحیلہ کو ڈاکٹر طارق ہوٹل میں چھوڑ کر امریکا چلا جاتا ہے۔ راحیلہ واپس اپنے گھر آجاتی ہے۔ اس کی نگرانی پر مامور شہر یار کا آدمی اسے رپورٹ دیتا ہے۔ شہر یار جگو کو فون کرکے چودھری کی مرمت کرانا چاہتا ہے۔ وہ اسٹڈی میں بات کررہا ہوتا ہے کہ اچانک اسے دروازے کے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ دروازے کے پاس جاکر اچانک دروازہ کھولتا ہے۔ سامنے موجود منظر اس کے لیے ناقابلِ یقین ہوتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اس کے سامنے ماریا کھڑی تھی۔ اس کے جسم پر سفید رنگ کی نہایت مہین کپڑے کی نائٹی تھی۔ یہ نائٹی کچھ اس انداز میں سلی ہوئی تھی کہ اس میں آستینوں کا نام ونشان بھی نہیں تھا اور شانے پر دو پتلی پتلی ڈوریوں کی مدد سے ٹکی ہوئی تھی۔ ایک تو اس کا حلیہ، دوسرے اس کی دروازے پر موجودگی نے شہر یار کا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ ان دونوں کی شادی جیسے بھی حالات میں ہوئی تھی لیکن اب حقیقت یہ تھی کہ وہ اس کی بیوی کہلاتی تھی اور وہ ہرگز بھی یہ بات پسند نہیں کرسکتا تھا کہ اگر کوئی ملازم اتفاق سے اس طرف آجائے تو اس حلیے میں اس کی نظر اس کی بیوی پر پڑے۔ دوسرے اس کے ذہن میں یہ اندیشہ بھی سرسرایا کہ کیا ماریا چپکے سے میری گفتگو سننے کی کوشش کررہی ہے؟

''تم اس وقت یہاں کیا کررہی ہو؟'' اس نے نہایت سرد لہجے میں ماریا سے پوچھا۔

''یہ تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہیے اے سی صاحب کہ آپ اس وقت یہاں اسٹڈی میں کیا کررہے ہیں؟'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔

''تمہارے اس سوال کا میں کیا مطلب سمجھوں؟'' اس کا لہجہ بدستور سرد ہی تھا۔

''مطلب بہت واضح ہے۔ آپ کو رات کے اس پہر اسٹڈی میں نہیں، اپنے بیڈروم میں ہونا چاہیے۔''

''مجھے کب کیا کرنا ہے، یہ میں خود طے کرتا ہوں۔ مجھے اپنے کاموں کے لیے کسی سے ڈکٹیشن لینا پسند نہیں۔'' اس نے گویا ماریا کو اس کی حدود کے اندر رہنے کی تنبیہ کی۔

''لیکن میں کسی نہیں ہوں۔ آپ نے مجھ سے شادی کی ہے اور آپ کو میرے حقوق ادا کرنے ہوں گے۔'' وہ تلملا کر بولی۔

''کون سے حقوق..... میں نے تمہیں کیا نہیں دے رکھا؟ زندگی کی ہر سہولت تو حاصل ہے تمہیں۔'' اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر ماریا کو اندر آنے کا راستہ دیا اور خود پر نہایت ضبط کرتے ہوئے لہجے کو قدرے نرم کرکے اسے جواب دیا۔

''مجھے آپ حاصل نہیں ہیں شہر یار! میرے پاس ہر شے موجود ہے لیکن آپ مجھے نہیں ملتے۔'' وہ ہسٹیریٹ ہونے لگی۔

''بیٹھو۔'' شہر یار نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ اب وہ کچھ کچھ ماریا کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ رات کے اس پہر، اس قسم کے لباس میں اس کے پاس کیوں آئی ہے۔ اس نے جو نائٹی پہن رکھی تھی، اس میں سے اس کا شاداب جسم چھلکا پڑ رہا تھا۔ وہ اپنے حسن کا جلوہ دکھا کر شوہر کو اپنی طرف راغب کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اس طرح کی اداؤں کے جال میں پھنسنے والا آدمی تھا ہی نہیں۔ اسے عریانیت میں کبھی حسن محسوس ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک بار بھی جانے کیسے ماریا کے سامنے بے بس ہوگیا تھا۔ آج بھی اسے کبھی وہ رات یاد آتی تھی تو وہ حیران رہ جاتا کہ آخر اتنی بڑی غلطی اس سے سرزد کیسے ہوئی؟ اس رات جانے اس کا نفس اتنا سرکش کیسے ہوگیا کہ اس نے ماریا کے وجود کو روند ڈالا۔ اپنی اس غلطی، اس گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اس نے کوئی قلبی لگاؤ نہ ہونے کے باوجود ماریا کو اپنی زندگی کا ساتھی بنا ڈالا لیکن اپنی تمام تر اچھائی کے باوجود اسے وہ محبت اور توجہ دینے سے قاصر تھا جس کی وہ ایک بیوی کی حیثیت سے طلب گار و حق دار تھی۔ اس وقت بھی وہ جس طرح اس کے جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کرنے آئی تھی، اس پر اس کی کوشش کا بالکل بھی اثر نہیں ہوا تھا بلکہ عریانیت کے اس مظاہرے پر اسے بے ساختہ ہی نیلے پھولوں والی سیاہ چادر کے حلقے میں لپٹا وہ سادہ سا چہرہ یاد آیا تھا جو بنا ہار سنگار کے بھی اس کے دل کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ ماہ بانو..... جانے کہاں تھی وہ چھوٹی سی لڑکی جس سے وہ اپنی زندگی میں حقیقی معنوں میں متاثر ہوا تھا لیکن اسے یہ بات بتا نہیں سکا تھا اور اب حالات اس نہج پر تھے کہ وہ مل بھی جاتی تو وہ اسے کچھ بتا نہیں سکتا تھا۔ اسے اپنے دل کی بات اب ہمیشہ اپنے دل میں ہی رکھنی تھی۔ ماہ بانو دل کے چاہے جتنے بھی قریب تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اب صرف ماریا کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اس کی توجہ اور محبت کی حق دار ٹھہرے۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر وہ اگر اسے محبت نہیں بھی دے سکتا تھا تو خوش خلقی سے پیش آنا تو اس کا فرض تھا۔ چنانچہ ماریا کے کرسی پر بیٹھنے کے بعد خود بھی ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر نہایت رسان سے بولا۔

''دیکھو ماریا! تم ایک پڑھی لکھی اور سمجھ دار عورت ہو۔ تم جانتی ہو کہ میں جس پوسٹ پر کام کررہا ہوں، وہ کس ذمے داری کی حامل ہے۔ اپنی ان ذمے داریوں کو نبھانے کے لیے مجھے زیادہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے اور میرے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ میں ایک عام آدمی کی طرح گھر اور بیوی کو وہ توجہ دے سکوں جس کی تم مجھ سے خواہش کررہی ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ مجھے تمہیں یہ بات سمجھانی نہیں پڑے گی لیکن آج

www.kahopakistan.com

تم نے مجھے بڑا مایوس کیا ہے۔''

''میں آپ کی مجبوریوں کو سمجھتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ ایک بے حد مصروف آدمی ہیں۔ میں آپ کی اس روٹین کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کی پوری کوشش کرتی بھی رہی ہوں لیکن مجھے آپ کا اپنے آپ کو بالکل ہی اگنور کر دینا اچھا نہیں لگتا۔ یہ رویہ مجھے احساس دلاتا ہے کہ آپ نے مجھے مجبوراً اپنا لائف پارٹنر بنایا ہے۔'' اس نے اپنے دل میں پلتا شکوہ اس سے بیان کیا۔

''تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟ میں نے تو کبھی تمہارے ساتھ کوئی مس بی ہیو نہیں کیا۔''

''میں مس بی ہیو کی بات کر بھی نہیں رہی ہوں۔ میں اگنورینس کی بات کر رہی ہوں۔ آپ مجھے بتائے بغیر شہر سے باہر تک چلے جاتے ہیں اور پھر وہاں سے ایک فون تک کرنا گوارا نہیں کرتے۔'' اس نے شکایت کی تو وہ سمجھ گیا کہ ماریا اس کے پچھلے دنوں لاہور جانے کا ذکر کر رہی ہے..... بلکہ لاہور کا تو نام ہی تھا حقیقت میں تو وہ آشیش کمار کی گرفتاری کے لیے اس پسماندہ گاؤں گیا تھا جہاں آفتاب اور کشور نے چودھری سے چھپنے کے لیے پناہ لے رکھی تھی۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جو وہ ماریا سے کسی صورت شیئر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ماریا کو ایک اچھی عورت سمجھنے کے باوجود ابھی تک ایسا کوئی موقع نہیں آیا تھا کہ وہ اس کی سچائی اور ایمان داری کو آزما سکے چنانچہ فی الحال اس سے سب کچھ پردے میں رکھنا ہی مناسب تھا۔

''سوری ڈیئر! مجھے بہت ایمرجنسی میں جانا پڑا تھا اس لیے تمہیں نہیں بتایا تھا لیکن عبدالمنان سے تو میں نے کہہ دیا تھا کہ تمہیں انفارم کر دے۔ کیا اس نے تمہیں انفارم نہیں کیا تھا؟'' اپنے لہجے کو پہلے سے کہیں زیادہ نرم کر کے اس نے اس کے سامنے اپنی صفائی دیتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں، اس نے مجھے انفارم کیا تھا کہ آپ لاہور گئے ہیں لیکن جب میں نے رانا ہاؤس فون کر کے آپ کے بارے میں پوچھا تو وہاں سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ وہاں پہنچے ہی نہیں ہیں۔ میں آپ سے آپ کے موبائل پر بھی رابطہ کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ بھی نہیں ہو سکا۔ آخر آپ ایسی کس جگہ پر تھے جہاں کوئی آپ سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا؟'' وہ کچھ جھنجلاہٹ کا شکار نظر آ رہی تھی۔

''میں لاہور گیا ضرور تھا لیکن ماموں جان اور ممانی سے ملنے کے لیے نہیں۔ مجھے اپنے کچھ آفیشل کام نمٹانے تھے لیکن تم یہ بتاؤ کہ تمہیں مجھ سے ایسا کیا کام تھا جو اتنی شدومد سے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں؟'' اس نے سرسری سی وضاحت دے کر اس سے پوچھا۔

''میرے اور آپ کے درمیان جو رشتہ ہے، وہ مجھے حق دیتا ہے کہ میں بغیر کسی کام کے بھی آپ سے رابطہ کر سکوں۔'' ماریا نے اسے جتایا۔

''میں مانتا ہوں۔ چلو اب چل کر سو جائیں ورنہ یہیں بیٹھے بیٹھے گلے شکوے کرنے میں رات گزر جائے گی۔ صبح مجھے آفس بھی جانا ہے۔'' اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ماریا کو دونوں شانے تھام کر کھڑا کیا اور اپنے بازو کے حلقے میں لے کر اسٹڈی سے باہر نکلا۔ قلبی جذبات جو بھی تھے، اسے اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے میں ڈالے جانے والے ڈھول کو بہرحال بجانا تو تھا ہی۔ فی الحال تو وہ اس لیے بھی ریلیکس ہو گیا تھا کہ ماریا کو اسٹڈی کے دروازے کے باہر پا کر جن شکوک و شبہات نے جنم لیا تھا، وہ دور ہو گئے تھے چنانچہ اب وہ محبت کو ترسی ہوئی اس عورت کو جو قسمت کے الٹ پھیر سے اس کی بیوی کے عہدے پر فائز ہو گئی تھی، بہلانے کا فریضہ سرانجام دینے جا رہا تھا۔

☆☆☆

''آپ کے لیے کچھ اہم خبریں ہیں سر!'' شہریار کو دفتر پہنچے دیر نہیں گزری تھی کہ عبدالمنان اس کے کمرے میں چلا آیا اور کچھ جوش سے بولا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کے پاس جو بھی خبریں ہیں، وہ بڑی زبردست ہیں۔ شہریار نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''ماہ بانو کے بارے میں علم ہو گیا ہے کہ وہ کہاں ہے۔'' اسے متوجہ دیکھ کر عبدالمنان نے سنسنی خیز لہجے میں انکشاف کیا۔

''کہاں ہے؟'' شہریار کا جسم یہ خبر سن کر تن گیا اور اس نے سرسرائے لہجے میں پوچھا۔

''جنگل میں ڈاکوؤں کے ڈیرے پر۔''

''وہ وہاں کیسے پہنچ گئی؟'' عبدالمنان کے جواب نے اسے حیران کیا۔

''حویلی میں کی جانے والی زنانہ سازشوں کے نتیجے میں۔''

''کیا مطلب؟ کھل کر بتاؤ۔'' اس نے وضاحت چاہی۔

''آپ کو یہ تو علم ہے ہی کہ میں نے حویلی کی ایک ملازمہ کو وہاں ہونے والی گفتگو اور واقعات کی سن گن لینے پر لگا رکھا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ماہ بانو حویلی سے غائب ہونی ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ حویلی ہی کا کوئی مکین اس کام میں شامل ہے۔ میری ہدایت پر وہ ملازمہ کوشش میں لگی رہی کہ اسے کسی طرح کچھ علم ہو جائے لیکن شروع میں اس کا زیادہ زور مردانے پر تھا اس لیے وہ کچھ پتا نہیں کر سکی لیکن پھر بہزاد شاہ کی بیوی فریدہ کے ساتھ ہونے والے حادثے نے اسے لیڈیز پارٹی کی طرف متوجہ کر دیا۔ فریدہ والے معاملے کا تو آپ کو علم ہو گا ہی؟'' بات کرتے کرتے اس نے سوال کیا۔

''ہاں، مجھے ماریا سے معلوم ہوا تھا۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ رات کو ہی تو اسے ماریا نے بتایا تھا کہ فریدہ سیڑھیوں سے پھسل کر گر گئی تھی جس کی وجہ سے اس کے ہاں قبل از وقت بچے کی پیدائش ہوئی ہے اور اس نے دستیاب وسائل کے ساتھ کامیاب ڈیلیوری کروانے کے بعد ماں اور بچے دونوں کو لاہور کے کسی بڑے اسپتال میں منتقل کروا دیا ہے۔ ماریا نے شک ظاہر کیا تھا کہ فریدہ کے ساتھ پیش آنے والا حادثہ کسی سازش کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ شہریار خود بھی اس بات سے متفق تھا اور اب عبدالمنان بھی اسے کچھ بتانے جا رہا تھا۔

''میں نے جس ملازمہ کو ذمے داری سونپ رکھی تھی، اس نے بتایا ہے کہ جب فریدہ سیڑھیوں سے گری، اس وقت وہ خود بھی وہاں موجود تھی اور اس نے صاف یہ بات محسوس کی تھی کہ فریدہ کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اتر کر آنے والی ملازمہ نے جان بوجھ کر خود کو اس انداز میں گرایا تھا کہ اس کا دھکا لگنے سے فریدہ بھی گر پڑے۔ یہ حرکت کرنے والی ملازمہ بڑی چودھرائن کے بہت قریب ہے چنانچہ میرے لیے کام کرنے والی عورت تجسس میں مبتلا ہو گئی کہ کسی طرح حقیقت معلوم کرے۔ اس نے کوشش شروع کر دی کہ وڈی چودھرائن کے آس پاس رہ کر اس کی باتیں سن سکے۔ اس کی یہ کوشش کامیاب رہی اور چودھرائن اور اس کی بیٹیوں کی گفتگو سے اس پر یہ انکشاف ہوا کہ ان ماں بیٹیوں نے مل کر یہ سازش کی تھی کہ کسی طرح فریدہ کا ہونے والا بچہ ضائع ہو جائے۔ ان ماں بیٹیوں کی خواہش تھی کہ ان کے اور ان کی اولادوں کے سوا چودھری کا کوئی اور وارث پیدا نہ ہو سکے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ بہزاد شاہ کے ہاں اولاد ہونے والی ہے، انہوں نے سازش تیار کی کہ کسی طرح بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے لیکن وہاں وہی معاملہ پیش آیا کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ فریدہ اور اس کے بچے کے بچ جانے پر ماں بیٹیاں بہت بھنائی ہوئی تھیں اور ارادہ ظاہر کر رہی تھیں کہ اگر بچہ اسپتال سے صحت یاب ہو کر واپس حویلی آ بھی گیا تو کسی نہ کسی طرح اسے ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ اسی گفتگو کے دوران ان بیٹیوں کے درمیان ماہ بانو کا بھی ذکر چھڑ گیا۔ اس ذکر سے چوری چھپے گفتگو سننے والی ملازمہ کو علم ہوا کہ ماہ بانو سے چودھری کے شادی کرنے کا ارادہ جان کر وڈی چودھرائن کو یہ تشویش ہو گئی تھی کہ کہیں ماہ بانو حویلی کو کوئی نیا وارث نہ دے دے چنانچہ چودھرائن نے اپنے بڑے داماد اشرف شاہ کی مدد سے اسے حویلی سے نکال کر ڈاکوؤں کے ڈیرے پر پہنچا دیا۔ ہر طرف اپنی حکمرانی کا سکہ چلانے والے چودھری کو حویلی میں ہونے والی اس سازش کا علم ہی نہیں ہو سکا اور وہ ابھی تک بیٹھا لکیر پیٹ رہا ہے کہ ماہ بانو حویلی سے نکلی تو کس طرح؟''

عبدالمنان نے صبح صبح اسے واقعی بہت زبردست خبریں دی تھیں۔ ایک طرف یہ کنفرم ہوا تھا کہ فریدہ کے ساتھ پیش آنے والا حادثہ سچ مچ ایک سازش کا نتیجہ تھا تو دوسری طرف قطعی لاپتا ہونے والی ماہ بانو کے بارے میں علم ہو گیا تھا۔ ماہ بانو، جو اس کے دل میں بسنے والی ایسی خاموش مکین تھی جس نے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا لیکن دل خود اس کے لیے مطالبے کرتا تھا۔ یہ بڑا عجیب اور انوکھا معاملہ تھا۔ دنیا کا اصول ہے کہ مکین مکان کو سجاتا سنوارتا ہے لیکن یہاں مکانِ دل خواہش کرتا تھا کہ اس کا مکین ہنستا بستا، خوش و خرم اور آباد رہے۔ اب بھی بظاہر پُرسکون بیٹھے شہریار کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا دل کس بُری طرح مچل رہا ہے کہ ابھی اڑ کر جائے اور کسی طرح ماہ بانو کو ڈاکوؤں کی قید سے آزاد کروا لائے۔

''یہ بہت بڑی کامیابی ہے عبدالمنان اور اسے میں تمہاری خلوصِ نیت کا نتیجہ سمجھتا ہوں ورنہ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ جس سازش کا علم چودھری کو نہیں ہو سکا، وہ ہم جان گئے۔ کوشش تو چودھری نے بھی کم نہیں کی ہو گی لیکن اسے کامیابی نہیں ملی۔ اس نے غصے میں کیا کچھ نہیں کیا۔ مجھے ہرگز بھی وہ بہن بھائی نہیں بھولے جن کے ماں باپ کے جرم کی پاداش میں چودھری نے انہیں بے عزت کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔'' اس کا اشارہ اس ملازم جوڑے کے بچوں کی طرف تھا جس نے ماہ بانو کو حویلی کے مہمان خانے سے فرار کروایا تھا اور بعد میں خود بھی مُردہ پایا گیا تھا۔

''چودھری کے ظلم کی داستانیں کون بھول سکتا ہے سر! آپ تو ابھی یہاں آئے ہیں، میں تو برسوں سے اس کی فرعونیت کے مظاہرے دیکھ رہا ہوں۔ وہ انسانوں کو اپنے

www.kahopakistan.com

سامنے جھکائے رکھنے کا شوقین ہے اور جو جھکنے کے لیے تیار نہ ہو، اسے کسی صورت بخشنے کو تیار نہیں ہوتا۔'' عبدالمنان نے تبصرہ کیا۔

''کوئی بات نہیں عبدالمنان! کہتے ہیں نا کہ اللہ نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ اتارا ہے..... تو یقین رکھو کہ چودھری کے لیے بھی وقت یوم حساب لے کر ضرور آئے گا۔ جو سمجھانے پر نصیحت نہیں پکڑتے پھر انہیں عذاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اللہ کچھ لوگوں کی رسی ڈھیلی ضرور چھوڑ دیتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اپنی مخلوق کی طرف سے غافل ہو گیا ہے۔''

''بے شک سر! اب آپ بتائیں کہ کیا اقدامات کرنے ہیں؟ دونوں ہی لڑکیوں کا معاملہ گمبھیر ہے۔ اگر ہم نے تاخیر کی تو کہیں کچھ بُرا نہ ہو جائے۔'' اس کی تائید کرتے ہوئے عبدالمنان نے آئندہ کا لائحہ عمل جاننا چاہا۔

''فریدہ کے معاملے میں تو مجھے چودھری بختیار سے بات کرنی ہو گی۔ اپنی بہن کے تحفظ کے لیے اسے خود چودھری سے بات کرنی ہو گی۔ میں دیکھتا ہوں کہ چودھری بختیار اس کام کے لیے راضی ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ راضی ہو گیا تو ہمیں دخل اندازی کی ضرورت نہیں پڑے گی ورنہ دوسری صورت میں ہمیں فریدہ سے بات کر کے اسے قانونی تحفظ فراہم کرنا پڑے گا۔ رہا مسئلہ ماہ بانو کا تو اس کا واحد حل جنگل میں ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن کرنا ہے۔ میں شروع سے اس آپریشن کا خواہش مند رہا ہوں لیکن کچھ مجبوریوں کی وجہ سے اب تک یہ کام نہیں ہو سکا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اب اس معاملے کا مزید ٹالا جانا مناسب نہیں ہے۔'' وہ متنوں میں سارے فیصلے کر چکا تھا۔

''میرے لیے کیا حکم ہے سر؟'' عبدالمنان نے دریافت کیا۔

''تم اسٹاف پر نظر رکھو۔ ہمیں اندازہ ہونا چاہیے کہ ہمارے اسٹاف میں سے کوئی اور فرد تو چودھری کا وفادار نہیں ہے۔'' جب سے اس کی اور آفتاب کی ٹیلی فونک گفتگو لیک آؤٹ ہوئی تھی، وہ اپنے اسٹاف کے معاملے میں سخت کانشس ہو گیا تھا۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ٹیلی فون آپریٹر چودھری کے لیے جاسوس کے فرائض انجام دے رہا ہے لیکن وہ لوگ اسے چھیڑے بغیر خاموشی سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ ایسا شہریار کی ہدایت پر ہی کیا گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ آپریٹر کے خلاف کوئی کارروائی کر کے دوسروں کو چوکنا کیا جائے۔ اگر اسٹاف میں آپریٹر کے علاوہ بھی کوئی جاسوس تھا تو وہ اس صورت میں ہوشیار ہو جاتا۔

''میں اس سلسلے میں پہلے ہی ایکٹیو ہوں۔ ایک کلرک پر مجھے شک بھی ہے لیکن کنفرم ہونے سے پہلے کچھ کہنا بیکار ہے۔''

''او کے! جیسا تم مناسب سمجھو کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تم یہ معاملہ اچھی طرح سنبھال لو گے۔'' اس نے عبدالمنان پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔

''تھینک یو سر! میں آپ کے اس یقین کو ٹوٹنے نہیں دوں گا۔'' جواباً وہ بڑے عزم سے بولا۔ پھر شہریار کا اشارہ پا کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جانے کے بعد شہریار نے آئی جی مختار مراد کا نمبر ملایا۔ اس کا نام سن کر ان کے پی اے نے فوراً ہی اس کی ان سے بات کروا دی۔

''کیسے ہو شیری بیٹا!'' مختار مراد نے کال ریسیو کر کے پُرجوش انداز میں پوچھا۔

''فائن انکل! آپ سنائیں۔''

''میں ٹھیک ہوں۔ تم کہو کیسے یاد کیا ہے؟'' وہ سمجھتا تھا کہ دفتری اوقات میں اس کے کال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کسی نہ کسی خاص کام سے اسے یاد کیا ہے چنانچہ مزید رسمی گفتگو میں الجھنے اور الجھانے کے اس سے دریافت کیا۔

''میں نے آپ سے کافی دن پہلے ایک بات کہی تھی، اسی کی یاد دہانی کروانی تھی۔'' اس نے تمہید باندھی۔

''کیسی بات؟''

''جنگل میں ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن کی۔''

''کیا پھر کوئی مسئلہ ہو گیا ہے؟'' وہ چونکا۔ شہریار کے اس ایشو کو دوبارہ چھیڑنے سے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی نیا واقعہ پیش آیا ہے۔

''جب تک ہم ڈاکوؤں کو ان کے ڈیرے میں آرام سے رہنے دیں گے، مسائل تو پیش آتے رہیں گے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ کافی بڑا آپریشن ہو گا۔ اتنے وسیع علاقے کو کور کرنا اور وہاں ڈاکوؤں کو گھیرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کام کے لیے بہت بڑی فورس اور جدید اسلحے کی ضرورت ہے۔ میں اس معاملے کو بھولا نہیں ہوں۔ یہ کیس انڈر پروسس ہے۔ ہم جلد اس آپریشن کے لیے اپنی تیاری مکمل کر لیں گے۔'' مختار مراد نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا۔

''آپ کی تیاریاں مکمل ہونے سے قبل اگر اسے کچھ ہو گیا تو؟'' وہ وہی پرانی کہانی سن کر تھوڑا سا چڑ گیا تھا اس لیے جذباتی ہو گیا۔

''کون؟ کس کی بات کر رہے ہو تم؟'' اس نے چونک کر سوال کیا۔ اس کا سوال سن کر اسے اپنے جذباتی پن کا احساس ہوا چنانچہ خود کو سنبھال کر لہجے کو ہموار کیا اور بولا۔

''آپ کو وہ لڑکی تو یاد ہو گی جسے میں نے سجاد بھائی کے گھر میں ٹھہرایا تھا اور جس کے ذریعے ہم شینا تک پہنچے تھے۔''

''ماہ بانو۔'' مختار مراد فوراً ہی بولا۔ ماہ بانو کو بھولنے کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہی تو تھی جس نے اسے اس کی پیاری نواسی تک پہنچایا تھا۔ بس بدقسمتی یہ تھی کہ وہ شینا کو زندہ حالت میں نہیں پا سکا تھا۔ وہ ہندو خواجہ سراؤں کے اس جنونی گروپ کے جنون کا شکار ہو گئی تھی جس کا سرغنہ رانا کا ایجنٹ ورما تھا۔ ورما خود بھی خواجہ سرا کا روپ دھار کر ان خواجہ سراؤں کا مہا گرو بنا بیٹھا تھا اور عجیب و غریب رسمیں رائج کر کے گروپ کے تمام ارکان کے دل و دماغ اپنے قابو میں کر رکھے تھے۔ وہ ان خواجہ سراؤں کو عیش پرست سرکاری افسران اور دیگر اہم شخصیات کے پاس بھیج کر ان سے جاسوسی کے کام لیتا تھا۔ اس نے ہی یہ رسم رائج کی تھی کہ اگر وہ لوگ پورن ماشی کی رات میں دیوی ماں کے چرنوں میں ایک کنواری لڑکی کو بھینٹ چڑھا کر یہ پرارتھنا کریں گے کہ اب بھگوان ان جیسے نامکمل انسانوں کو اس سنسار میں نہ بھیجے تو بھگوان ان کی سن لے گا۔ اپنی اس رسم کو پورا کرنے کے لیے چند خواجہ سراؤں نے شینا کو کالج جاتے ہوئے راستے میں اغوا کر لیا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ شینا ڈی آئی جی سجاد رانا کی بیٹی اور آئی جی مختار مراد کی نواسی ہے۔ انہوں نے اس ادھ کھلی کلی جیسی لڑکی کی دیوی کے چرنوں میں بھینٹ دے دی۔ ماہ بانو نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ خود بھی ان دنوں ان ظالموں کی قید میں تھی۔ قسمت سے جب وہ اس قید سے فرار ہوئی اور شہریار تک پہنچی تو شینا کی تصویر دیکھ کر اسے شناخت کر لیا۔ اس شناخت کے بعد ان لوگوں کی شینا کو تلاش کرنے کی جدوجہد تو اپنے اختتام کو پہنچی لیکن اس کے قاتلوں کی تلاش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تلاش کے اس سفر میں سجاد رانا اپنی جان سے چلا گیا جبکہ شہریار کی جدوجہد ابھی جاری تھی اور وہ خود کئی بار خطرات سے دوچار ہو چکا تھا۔

''کیا ماہ بانو ڈاکوؤں کی قید میں ہے؟'' مختار مراد نے اندازہ لگایا۔

''جی ہاں۔'' اس کا جواب مختصر تھا۔

''وہ وہاں کیسے پہنچی؟'' اس نے شہریار سے دریافت کیا تو جواباً اس نے مختصراً سارے حالات سمجھا دیے۔

بارش

تاریک براعظم افریقا کے ایک علاقے میں کئی ماہ تک بارش نہیں ہوئی ---- تو نے ٹوٹکے آزما لیے گئے۔ جادو جگائے گئے۔ لڑکیوں کو، دیوی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھایا گیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

سارے سردار، سارے پجاری، سارے جادوگر اور سارے سیانے اکٹھا ہوئے کہ بارش ہونے کی کوئی مناسب ترکیب سوچی جائے۔

''جب میں انگلینڈ میں تھا۔'' ایک سیانے نے کہا۔ ''اس وقت میں نے وہاں کے لوگوں کو ایک ٹوٹکا کرتے دیکھا تھا۔ اس ٹوٹکے کے نتیجے میں ہمیشہ بارش ہونے لگتی تھی۔ ہم چاہیں تو اسے آزما سکتے ہیں۔''

سب کی سوالیہ نظریں سیانے کے چہرے پر جم گئیں۔

''ٹوٹکے کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے سفید کوٹ پہن کر اور ہاتھوں میں چھ ڈنڈے لے کر دو آدمی میدان میں جاتے ہیں۔ پھر ان ڈنڈوں کو میدان میں گاڑ دیا جاتا ہے۔ سفید کپڑوں میں دو آدمی اور آتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چوڑی لکڑیاں ہوتی ہیں۔ پھر گیارہ آدمی آتے ہیں۔ وہ بھی سفید کپڑے پہنے ہوتے ہیں۔ وہ سب کے سب میدان میں پھیل جاتے ہیں۔ پھر ایک آدمی ہاتھ میں گیند لے کر تھوڑا سا بھاگتا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ گیند پھینکے، بارش شروع ہو جاتی ہے۔''

محمود احمد، سیالکوٹ

''او کے، میں کوشش کرتا ہوں کہ کچھ کر سکوں لیکن ایک لڑکی کے لیے جو کہ کوئی خاص سوشل اسٹیٹس بھی نہیں رکھتی، فوری طور پر اتنا بڑا آپریشن شروع کرنا مشکل ہو گا۔'' مختار مراد نے صاف گوئی سے اس پر صورتِ حال واضح کی۔ اس جواب پر وہ اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اسے نہیں بتا سکتا تھا کہ بے شک ماہ بانو کسی خاص سماجی رتبے کی حامل نہیں ہے لیکن خود اس کے لیے بڑی خاص ہے۔

''میں نے تمہیں انکار نہیں کیا ہے، صرف یہ واضح کیا ہے کہ یہ کام مشکل ثابت ہو گا۔ باقی میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔'' شہریار کی خاموشی کو محسوس کر کے وہ اس سے بولا۔

''تھینک یو انکل! مجھے آپ سے پورے تعاون کی امید ہے۔'' شہریار نے اس پر اپنے بھروسے کا اظہار کیا۔

''اور مجھے امید ہے کہ میں جلد تمہیں خوش خبری سناؤں

www.kahopakistan.com

گا۔'' مختار مراد نے اسے یقین دہانی کرائی۔

''میں بہت بے چینی کے ساتھ انتظار کروں گا۔'' اس نے یہ کہنے کے بعد اجازت لے کر فون بند کر دیا۔ سلسلہ منقطع کرتے ہی وہ اپنی کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا اور اپنے سامنے موجود دیوار کو گھورنے لگا۔ مختار مراد سے بات کرتے ہوئے اسے اپنی قلبی کیفیات کو چھپانے کے لیے بڑے ضبط سے کام لینا پڑا تھا ورنہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس سے گھڑی کی چوتھائی میں آپریشن کا آغاز کر دینے کی فرمائش کر ڈالے۔ ایسا ہونا ممکن بھی نہیں تھا لیکن دل ایسی باتیں کب سمجھتا ہے۔ اس کا کام تو اپنی بے چینی کو جسم کے باقی حصوں میں منتقل کر دینا ہوتا ہے۔ شہریار کے دل نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ وہ بظاہر پُرسکون بیٹھا ہوا تھا لیکن درحقیقت اس کے سارے عضلات تنے ہوئے تھے اور اس کا دماغ مسلسل گھوڑے دوڑانے میں مصروف تھا کہ ایسی کیا تدبیر کرے کہ ماہ بانو کی آزادی کا سامان ہو سکے۔

☆☆☆

آج صبح سے ماہ بانو کو ڈیرے پر کچھ غیر معمولی سی ہلچل محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی اپنی رائفل کو تیل دے رہا تھا تو کوئی میگزین کی پٹی چیک کر رہا تھا۔ اسلم سمیت آٹھ دس افراد ایسے تھے جو زیادہ مصروف نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے صبح اٹھتے ہی ٹھیک ٹھاک ورزش کی تھی اور پھر ڈٹ کر ناشتا کرنے کے بعد اپنے اسلحے کے ساتھ مصروف ہو گئے تھے۔ دوپہر کا کھانا معمول سے کچھ جلدی کھایا گیا تھا اور کھانے کے بعد قیلولہ کر کے وہ آٹھ دس افراد لباس کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اپنے جسم پر اسلحہ سجانے لگے تھے۔

آج اسلم نے بھی اپنی جینز اور ٹی شرٹ کو ترک کر کے سب کی طرح سیاہ گھیر دار شلوار قمیص پہنا تھا۔ اس تبدیلی کی وجہ صاف سمجھ آ رہی تھی۔ یقیناً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس کے حلیے کی وجہ سے اس کے باقی ساتھیوں سے الگ شناخت کیا جا سکے۔ ان ساری تیاریوں کو دیکھ کر ماہ بانو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ ڈاکوؤں کے ڈیرے پر تھی اس لیے اس کے لیے ان تیاریوں کو دیکھ کر یہ سمجھنا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ وہ لوگ کسی واردات کے لیے جا رہے ہیں۔ اسے اسلم کا اس مہم میں شامل ہونا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اگرچہ حقیقت یہ تھی کہ اسلم بھی ایک ڈاکو تھا اور کافی عرصے سے ان ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر ڈاکے ڈال رہا تھا لیکن اس نے اسلم کا جو اصل روپ دیکھا تھا، اسے دیکھنے کے بعد اس کا دل اسے ڈاکو ماننے کے لیے قطعی تیار نہیں ہوتا تھا۔ حالات کی ستم ظریفی اسے یہاں لے آئی تھی تو یہ بھی ممکن تھا کہ قسمت کی مہربانی اسے یہاں سے نکال لے جاتی۔ قسمت کی اس مہربانی تک اگر وہ اپنے کھاتے میں مزید جرائم درج نہ کرواتا تو یہی بہتر ہوتا لیکن وہ اسلم کو روک بھی کس ناتے سے سکتی تھی۔ بے شک وہ اسے بہت چاہتا تھا اور اس چاہت میں کچھ بھی کر سکتا تھا لیکن کسی کی چاہت سے فائدہ اٹھانے یا اپنی بات منوانے کا حق تو اسی کو ہوتا ہے جو خود بھی جواب میں اسے اتنا ہی چاہے۔ کم از کم ماہ بانو تو یہی سمجھتی تھی چنانچہ اسے اسلم کو روکنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ اسلم خود ہی روانگی سے کچھ دیر قبل اس کے پاس آیا۔ جینز اور ٹی شرٹ کی طرح اس پر سیاہ گھیر دار شلوار قمیص بھی کافی جچ رہا تھا لیکن ماہ بانو نے اسے اس لباس میں پسند نہیں کیا۔ یہ لباس ان ڈاکوؤں کی پہچان تھا جو بلاتفریق ہر کسی کو لوٹ لیتے ہیں۔ لٹنے والا کوئی سرمایہ دار ہے یا وہ ریٹائرڈ باپ جس نے اپنی کل پونجی بیٹی کی رخصتی کے لیے سنبھال رکھی ہے، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔

''تم سمجھ تو گئی ہو گی کہ یہاں کیا سلسلہ چل رہا ہے۔ بس کچھ دیر بعد میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہونے والا ہوں۔'' اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑا وہ یہ جملے کہتے ہوئے اس سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔

''تمہارا جانا ضروری ہے کیا؟'' ماہ بانو نے اس سے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''ہاں، ضروری ہے۔ کب کس جگہ کس کو جانا ہے، اس بات کا فیصلہ سردار کرتا ہے اور ہم میں سے کوئی سردار کے فیصلے کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔'' اس نے بتایا پھر کچھ چونک کر پوچھنے لگا۔ ''کہیں تم میرے جانے سے اس لیے تو پریشان نہیں ہو کہ میری غیر موجودگی میں کوئی یہاں تم سے بدتمیزی کرے گا؟''

''نہیں..... جس سے زیادہ خطرہ رہتا ہے وہ تو تمہارے ساتھ ہی جا رہا ہے۔'' اس کا اشارہ جمرو کی طرف تھا۔ سردار نے اس مہم کے لیے اس کا نام بھی منتخب کیا تھا۔

''پھر..... پھر تم کیوں نہیں چاہتیں کہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ جاؤں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کیونکہ تم جنہیں اپنا ساتھی کہتے ہو، وہ حقیقت میں تمہارے ساتھی نہیں ہیں۔ تم ان سب سے بہت مختلف ہو۔''

''میں ان سے مختلف تھا لیکن اب نہیں رہا۔ اب تو میں انہی کا حصہ ہوں۔'' اس نے فوراً ہی ماہ بانو کی تردید کی۔

''تم نے کبھی تیل اور پانی کو ایک ہوتے دیکھا ہے اسلم؟ ان دونوں چیزوں کو اگر ایک برتن میں ڈال بھی دو تو یہ ایک نہیں ہوتے۔ پانی پر تیل کی تہ الگ نظر آنے لگتی ہے۔ تم بھی ان کے درمیان رہ ضرور رہے ہو لیکن حقیقت میں ان کے ساتھ یکجان نہیں ہوئے ہو۔ تم چاہو تو اب بھی ان سے الگ ہو سکتے ہو۔'' وہ اسے اپنی محبت کا واسطہ دے کر نہیں روک سکتی تھی لیکن جو سچ تھا، وہ تو سمجھا سکتی تھی۔ چنانچہ کہے بغیر رہ نہیں سکی۔

''میں ابھی اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ ابھی سردار سے آخری ہدایات لینے کے لیے اس کے پاس بھی جانا ہے اس لیے بہتر ہے کہ تم اس بحث کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھو۔''

اسلم نے اس کے پاس مزید گفتگو کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ اس کا جواب سن کر وہ چپ سادھ گئی۔ وہ خود ہی ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ ''اب اجازت دو۔ جانے پھر دوبارہ ہماری ملاقات ہو بھی سکے یا نہیں۔ میں روانگی سے پہلے تم سے ملنے اسی لیے آیا تھا کہ تمہارا چہرہ اپنی آنکھوں میں سما کر لے جا سکوں۔'' اس کے لہجے میں وہی آنچ تھی جو اس کی دیوانی محبت کا اظہار بن جاتی تھی۔ ماہ بانو کی مجبوری تھی کہ اسے اس محبت سے نظریں چرا کر ہی رہنا پڑتا تھا البتہ اس نے اتنا ضرور پوچھ لیا۔

''کیا کسی بہت خطرناک کام کے لیے جا رہے ہو؟''

''ہمارا کام ہے ہی خطرے کا۔ بس اتنا ہوتا ہے کہ کہیں خطرہ زیادہ ہوتا ہے اور کہیں کم۔ آج ہم جہاں جا رہے ہیں، وہاں ذرا زیادہ مشکل پیش آ سکتی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''افسوس کہ میں تمہیں یہ دعا بھی نہیں دے سکتی کہ جس کام کے لیے جا رہے ہو اس میں کامیابی حاصل کرو۔'' ماہ بانو نے تاسف کا اظہار کیا۔

''میں تمہیں مجبور بھی نہیں کروں گا۔ یوں بھی دعا ہونٹوں پر بہت بعد میں آتی ہے، دل پہلے سے خود ہی دعا گو ہو جاتا ہے اور اصل بات ہوتی ہی دل کی ہے۔ میرا تمہارے دل پر تو یوں بھی اختیار نہیں ہے۔'' وہ اپنی بات کہہ کر فوراً ہی اس کے سامنے سے ہٹ گیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔ ماہ بانو کی نظریں اس کے دور ہوتے وجود پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ خوب صورت شخصیت کے مالک اسلم کے قدموں کی جنبش میں بڑی مضبوطی تھی۔ اس کا اٹھتا ہر قدم بتا رہا تھا کہ وہ اپنے جسم میں شیر کا سا دل رکھتا ہے اور کوئی خطرہ اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ پیدا نہیں کر سکتا۔

''اے اللہ..... اس شخص کو زندہ سلامت یہاں واپس لانا۔'' ماہ بانو کے دل نے بے ساختہ ہی دعا کی۔ اگر اسلم کو اس کی دعا کی خبر ہو جاتی تو وہ بھولے نہیں سماتا۔ وہ تو اس وقت صرف دو باتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایک آج کی مہم کے بارے میں جو یقیناً کچھ دشوار ثابت ہوتی اور دوسرے ماہ بانو کے بارے میں۔ اگر آج اسے کچھ ہو جاتا تو ماہ بانو کے لیے ڈیرے پر بڑی مشکلات کھڑی ہو جاتیں۔ عورت کے وجود کو تر سے ہوئے اس کے ساتھی اس کی موت کی صورت میں کبھی بھی ماہ بانو کو نہیں بخشتے اور اسلم جانتا تھا کہ اس لڑکی کے لیے اپنی عزت کا جوہر کھو دینا سب سے زیادہ اذیت ناک تجربہ ہو گا۔ سردار کی جھونپڑی میں ہدایتیں سنتے ہوئے بھی اس کا ذہن مسلسل اس مسئلے پر غور و فکر کر رہا تھا۔

''آج کی کارروائی میں اسلم تم لوگوں کا سردار ہو گا۔'' ساری ہدایات جاری کر دینے کے بعد سردار نے اعلان کیا اور مزید بولا۔ ''تم میں سے ہر ایک کو اسلم کی گل بالکل ایسے ہی سننی ہو گی جیسے یہ اسلم نہیں میں ہوں۔'' یہ جملہ کہتے ہوئے سردار نے بطورِ خاص جمرو کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اس ہدایت کو سن کر اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

''تم سب باہر جاؤ، میں اسلم سے اکیلے میں بات کروں گا۔'' آخر میں سردار نے حکم سنایا تو سب لوگ ایک ایک کر کے باہر نکل گئے۔ صرف اسلم اپنی جگہ پر رکا رہا۔

''خیال رکھنا اسلم! اس کارروائی میں زیادہ مال ہاتھ آئے یا نہیں، کام اس طرح سے کرنا کہ واردات بڑی نظر آئے۔ اس کام کے لیے اپنا معاوضہ ہم وصول کر چکے ہیں۔ جو مال اوپر سے ہاتھ لگے گا وہ ہمارا بونس ہو گا۔ اس کے لیے کسی کو بھی زیادہ لالچ میں نہیں پڑنے دینا۔ جمرو اور جیدا ذرا زیادہ لالچی فطرت کے ہیں۔ ان دونوں پر خاص نظر رکھنا۔ عورت کے معاملے میں، میں پہلے ہی سختی سے کہہ چکا ہوں کہ کسی کو لالچ نہیں دکھانا ہے۔ اگر ان لوگوں میں سے کوئی زیادہ سرکشی دکھائے تو میری طرف سے تجھے اجازت ہے کہ اس سے جتنی چاہے سختی سے نمٹنا۔'' سردار نے اسے اختیارات سونپے۔

''فکر نہیں کرو سردار! جیسا تم نے کہا ہے، سب ویسے ہی ہو گا۔ میں کسی کو تمہاری ہدایات کے خلاف پر بھی نہیں مارنے دوں گا۔ لیکن تمہیں بھی میری ایک بات ماننی پڑے گی۔''

''وہ کیا؟'' اسلم کا مطالبہ سن کر سردار چونکا۔

''کوئی زیادہ بڑی فرمائش نہیں ہے۔ میں تم سے ماہ بانو کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''واپس آ کر گل کر لینا۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں

www.kahopakistan.com

ہے۔'' سردار نے کچھ جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔
''یہی تو وقت ہے بات کرنے کا..... بعد میں جانے کیا ہو؟ ہمارے کام کا کوئی بھروسا تو ہے نہیں۔ کیا خیر واپس آنا نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں۔''
''تو ڈر رہا ہے اسلم؟'' سردار نے اچنبھے سے پوچھا۔
''ڈر نہیں رہا، حقیقت پسندی سے کام لے رہا ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
''اچھا بول، کیا گل ہے؟'' سردار نے بے نیازی سے پوچھا۔
''میں چاہتا ہوں کہ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو تم ماہ بانو کا پورا خیال رکھنا۔ میرے بعد اس کی عزت پر کوئی آنچ نہیں آنا چاہیے۔ اگر کبھی تمہیں لگے کہ یہ کام مشکل ہے تو پھر بے شک ماہ بانو کو گولی مار دینا لیکن اسے للی اور حمیداں نہ بنانا۔'' سردار سے یہ سب کہتے ہوئے اسلم کی آواز لرز رہی تھی۔
''تو فکر نہ کر..... میں خیال رکھوں گا۔ ہور یہ تو مجھے بھی ملوم ہے کہ میرا شیر ناکام نہیں رہے گا۔ ابھی کسی ماں نے وہ لال نہیں جنا جو میرے شیر کے مقابلے میں کھڑا ہو سکے۔ تو جا، میں ادھر تیرا انتظار کر رہا ہوں۔ تجھے تیری ماہ بانو بالکل چنگی بھلی ملے گی۔'' سردار نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر یقین دہانی کروائی تو وہ مطمئن ہو کر باہر نکل گیا۔ باہر اس کے ساتھی اس کے منتظر تھے۔ قریب ہی وہ گھوڑے بھی کھڑے تھے جن پر سوار ہو کر انہیں یہاں سے جانا تھا۔ ان تازہ دم گھوڑوں کو مالش وغیرہ کر کے خصوصی طور پر تیار کیا گیا تھا۔
جیسے ہی اسلم باہر نکل کر اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا، باقی ساتھی بھی الرٹ ہو گئے اور اس کے رکاب میں پیر رکھتے ہی خود بھی اپنے گھوڑوں پر سوار ہونے لگے۔ جنگل کے ماحول سے آشنا گھوڑوں نے تیزی سے اپنا سفر شروع کر دیا۔ رات کا اندھیرا اس سفر میں قطعی رکاوٹ نہیں تھا کہ سواری اور سوار دونوں اس ماحول میں رچ بس چکے تھے اور انہیں ان راستوں پر چلنے کے لیے روشنی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ گھپ اندھیرے میں اپنے تجربے کی بنیاد پر سفر جاری رکھ سکتے تھے اور آج تو خوش قسمتی سے چاندنی رات تھی۔ گھنے جنگل میں درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر آتی چاندنی نے ان کے راستے کو نیم روشن کر رکھا تھا۔
وہ بڑی خاموشی سے سفر کر رہے تھے۔ ان کی منزل طے شدہ تھی اور کام کا طریقہ کار بھی، اس لیے فی الحال انہیں ایک دوسرے سے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جنگل کی ان راہوں میں جنگلی جانوروں کے بولنے اور ہوا کی سرسراہٹوں کے علاوہ اگر کوئی آواز سنائی دے رہی تھی تو وہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز تھی۔ ایک آہنگ سے سنائی دینے والی ان آوازوں نے فطرت کی آوازوں کے ساتھ مل کر موسیقی کا روپ دھار لیا تھا لیکن یہ وہ موسیقی نہیں تھی جس سے سننے والے کو خوشی اور سکون کا احساس ہو۔ یہ ہارر فلموں میں ماحول کی خوفناکی کے تاثر کو مزید گہرا کر دینے والی موسیقی تھی لیکن وہ سارے کے سارے اس کی خوفناکی سے بے نیاز تھے کیونکہ وہ خود بہت خوف ناک تھے اور ان کی دہشت اردگرد کے دیہاتوں کے رہائشیوں کے دل لرزا دیتی تھی۔ وہ جہاں جاتے تھے، وہاں کے لوگوں کی جان، مال اور عزت خطرے میں پڑ جاتی تھی۔
ڈیڑھ گھنٹے کے قریب سفر کرنے کے بعد وہ ایک مقام پر رک گئے۔ رکنے کے بعد اسلم نے اپنی جیب سے ٹارچ نکالی اور اس کا رخ شمال کی طرف کر کے وقفے وقفے سے تین بار جلائی بجھائی۔ جب تیسری بار جلنے کے بعد ٹارچ بجھی تو شمال کی طرف سے روشنی کی ایک لکیر سفر کرتی ہوئی ان کی طرف آئی۔ یہ کسی کے ہاتھ میں روشن پنسل ٹارچ کی روشنی تھی۔ اس روشنی کے نظر آتے ہی اسلم اور اس کے دو تین ساتھیوں نے اپنی ٹارچیں روشن کر لیں۔ اب ماحول اتنا روشن تھا کہ وہ ایک دوسرے کی شکلیں بھی دیکھ سکتے تھے۔ پنسل ٹارچ روشن کرنے والا تنہا نہیں تھا، اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی موجود تھا۔
''جیپیں ریڈی ہیں؟'' اسلم نے دریافت کیا۔
''ہنڈریڈ پرسنٹ۔'' جواب ملا اور اس کی طرف چابیاں اچھال دی گئیں۔ اسلم نے پھرتی سے انہیں کیچ کر لیا اور ایک چابی اپنے پاس رکھنے کے بعد دوسری جمرو کی طرف اچھال دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ایک جیپ وہ خود چلائے گا جبکہ دوسری جمرو کو چلانی ہوگی۔ چابیوں کی وصولی کے بعد وہ لوگ گھوڑوں سے نیچے اترے اور ایک طرف کھڑی جیپوں کی طرف بڑھ گئے۔ یہاں سے آگے انہیں جیپوں میں سفر کرنا تھا۔ ان کی واپسی تک ان کے گھوڑے یہیں رہتے۔ جن افراد نے انہیں جیپیں فراہم کی تھیں، وہ ان کی واپسی تک گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتے اور پھر ان کے حوالے کر دیتے۔ یہ ان لوگوں کا مخصوص طریقہ کار تھا۔ اگر انہیں اردگرد کے کسی دیہات میں کارروائی کرنی ہوتی تو اپنے گھوڑوں پر دندناتے ہوئے دیہاتوں میں گھس جاتے لیکن اگر دیہاتوں سے ہٹ کر کسی چھوٹے یا بڑے شہر میں جانا ہوتا تو جیپوں کا استعمال لازمی تھا۔ ان جیپوں کا انتظام وہ کسی نہ

کسی طرح کر لیتے تھے۔ ان کے اپنے ذرائع بھی تھے اور کبھی کام لینے والی پارٹی بھی سہولت فراہم کر دیتی تھی۔ اسلم نے اشارہ کیا تو وہ سب ایک ایک کر کے جیپوں میں سوار ہونے لگے۔ اسلم کھڑا نگرانی کرتا رہا اور آخر میں ان دونوں افراد سے جنہوں نے انہیں جیپیں فراہم کی تھیں، ہاتھ ملا کر خود بھی ایک جیپ میں سوار ہو کر اس کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ کچھ دیر کے لیے رک جانے والا ان کا سفر دوبارہ شروع ہوا تو بے شک سواری بدل گئی تھی لیکن ان کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ سب اب بھی بالکل خاموش تھے۔ ماحول کی ہولناکی بھی قائم تھی، فرق پڑا تھا تو صرف اتنا کہ اب گھنے درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اور چونکہ وہ جنگل سے باہر نکلتے جا رہے تھے اس لیے جنگلی جانوروں کی آوازیں آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھیں اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی جگہ انجن کی گھرر گھرر نے لے لی تھی۔ وہ اپنے اس سفر کو اتنا خفیہ رکھنا چاہتے تھے کہ انہوں نے احتیاطاً ہیڈ لائٹس بھی آن نہیں کی تھیں اور صرف چاند کی روشنی میں سفر کر رہے تھے۔ تیز رفتار جیپیں راستے کی طوالت کو بڑی خوبی سے طے کرتی چلی جا رہی تھیں۔
آخرکار وہ نورکوٹ کی حدود میں داخل ہو گئے۔ نورکوٹ میں ان کا رخ اس بنگلے کی طرف تھا جس میں شہریار رہائش پذیر تھا۔ بنگلے سے کچھ فاصلے پر انہوں نے اپنی جیپیں روک لیں۔ دونوں جیپیں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھیں۔ چونکہ وہ طے شدہ منصوبے پر عمل کر رہے تھے اس لیے انہیں کسی پریشانی کا سامنا نہیں تھا۔ جس جیپ کو جمرو ڈرائیو کر رہا تھا، اس میں سے تین افراد اترے اور بنگلے کی عقبی دیوار کی طرف بڑھ گئے۔ دیوار کی اونچائی اچھی خاصی تھی اور کوئی شخص اکیلا اپنے بل بوتے پر اسے نہیں پھلانگ سکتا تھا۔ ان تین میں سے ایک اکڑوں بیٹھ گیا اور دوسرا اس کے شانوں پر پیر جما کر کھڑا ہو گیا۔ اکڑوں بیٹھا ہوا شخص آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے کھڑے ہونے کے نتیجے میں اس کے شانوں پر سوار آدمی کے ہاتھ بلند دیوار کی منڈیر کو پکڑنے کے لائق ہو گئے لیکن دیوار پر خاردار تار بچھے ہوئے تھے چنانچہ جیسے ہی اس نے منڈیر کو پکڑ کر خود کو اوپر اٹھانا چاہا، اس کی انگلیوں میں لوہے کے کئی تار چبھ گئے۔ اس نے زیرلب ایک بڑی سی گالی دیتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو جھٹکے سے پیچھے ہٹایا اور پھر اپنے سر پر موجود بڑے سے پگڑ کو کھولنے لگا۔ پگڑ کھول کر اس نے اسے دیوار پر بچھایا۔ پگڑی کے تہ دار کپڑے نے کافی آسانی پیدا کر دی اور وہ زور لگا کر

قابلِ شوہر

نئی نویلی دلہن کو اپنے شوہر سے محبت تو بہت تھی لیکن اسے یہ بات کچھ زیادہ اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی کہ ہر جگہ اسے سرکار میاں کی دلہن کہا جائے۔
ایک روز اس نے شوہر کے دفتر میں اپارٹمنٹ کے کرائے کے لیے فون کیا۔ اتفاق سے شوہر موجود نہیں تھا۔ فون دفتر کے بوڑھے سپرنٹنڈنٹ نے وصول کیا۔
پوری بات سن کر اس نے کہا۔ ''اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو مجھے سرکار میاں کی دلہن سے گفتگو کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔''
نئی نویلی دلہن نے بگڑ کر کہا۔ ''میرا نام افروزہ ہے۔'' اور فون رکھ دیا۔
سرکار میاں دفتر واپس آیا تو اسے میز پر سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ کا پرچہ رکھا ہوا ملا، لکھا تھا۔
''کسی افروزہ نے تمہیں اپارٹمنٹ کا کرایہ ادا کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ کتنی شرم کی بات ہے۔ میں تو تمہیں اچھا آدمی سمجھتا تھا۔''

عمران اللہ، ایبٹ آباد

اوپر کی طرف اٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ دیوار کے اوپر تھا۔ دیوار پر چڑھنے سے قبل اس نے بنگلے کے گیٹ پر بجنے والی گھنٹی کی آواز سنی تھی اور وہ سمجھ گیا تھا کہ فرنٹ پر موجود اس کے ساتھی حرکت میں آ گئے ہیں۔ ڈور بیل بجانے کا مقصد بنگلے کے چوکیدار کا دھیان بٹانا تھا۔ چوکیدار کے بارے میں انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ رات بھر بنگلے کے احاطے کا وقفے وقفے سے چکر کاٹتا رہتا ہے۔ بیل کی آواز سن کر وہ مین گیٹ کی طرف چلا جاتا تو وہ آسانی سے عقبی دیوار پھاند کر بنگلے کے احاطے میں داخل ہو جاتا۔
بنگلے میں چوکیدار ہی وہ واحد شخص تھا جو مسلح رہتا تھا۔ باقی ملازمین روزمرّہ کے کام انجام دیتے تھے اور انہیں اسلحہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چوکیدار کے علاوہ مزید حفاظتی عملہ رکھنا شہریار نے خود پسند نہیں کیا تھا چنانچہ انہیں بس اسے ہی سب سے پہلے قابو کرنا تھا۔ عقبی سمت میں چوکیدار کی غیر موجودگی کی یقین دہانی ہو جانے کے بعد اس نے دیوار پر سے چھلانگ لگا دی۔ یہ ایک نپی تلی چھلانگ تھی چنانچہ معمولی سی ہی آواز پیدا ہوئی۔ اس کے دیوار پھلانگ جانے کے بعد

www.kahopakistan.com

ان کا تیسرا ساتھی بھی اسی ترکیب کے مطابق اوپر چڑھا اور اس کے قریب ہی چھلانگ لگا کر بنگلے کے اندر پہنچ گیا۔ اب ان کا رخ بنگلے کے مین گیٹ کی طرف تھا۔ وہ دبے قدموں سے چلتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ چند قدم آگے جاتے ہی انہیں چوکیدار نظر آ گیا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا ان شریر لڑکوں کو کوس رہا تھا جن کو رات کے اس پہر بھی چین نہیں تھا۔ اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ اس طرح گھنٹی بجا کر اسے گیٹ تک دوڑانے والے علاقے کے شریر لڑکے نہیں بلکہ گھاگ ڈاکو ہیں۔ اپنی ہی دھن میں چلتا ہوا وہ بالکل بے خبری میں گھات لگا کر بیٹھے ان ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا جو اس کے لیے پروانۂ اجل بن کر آئے تھے۔ ان میں سے پہلے دیوار پھلانگنے والے نے جھپٹ کر اس کی گردن پکڑی اور اس زور سے جھٹکا دیا کہ وہ دوسرا سانس بھی نہیں لے سکا اور کھٹ کی آواز کے ساتھ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ قاتل ڈاکو لاش کو سنبھال کر ایک طرف دیوار کے ساتھ لٹانے میں مصروف ہو گیا جبکہ اس کا ساتھی تیزی سے مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا اور گیٹ کی کنڈی کھول کر اسے پوری طرح سے وا کر دیا۔ گیٹ کھلتے ہی باہر منتظر ان کے ساتھی ڈاکو تیزی سے اندر آنے لگے۔ اندر آ کر ان میں سے کچھ تو سرونٹ کوارٹرز کی طرف بڑھ گئے جبکہ کچھ نے بنگلے کی مرکزی عمارت کا رخ کیا۔ پیدل اندر داخل ہونے والوں میں اسلم اور جمرو شامل نہیں تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کے اندر آنے کے بعد آخر میں بھیوں سمیت اندر آئے۔ بھیوں اندر آتے ہی گیٹ ایک بار پھر بند کر دیا گیا۔ اسلم اور جمرو بھیوں سے چھلانگ لگا کر اترے اور اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ جا ملے جو مرکزی عمارت کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے پاس موجود ساز و سامان کی مدد سے دروازے کا لاک بڑی مہارت سے کھول لیا تھا اور اب مزید ہدایات کے منتظر تھے۔

''تم دونوں پیچھے کی طرف جا کر دھیان رکھو۔ باقی لوگ میرے ساتھ اندر جائیں گے۔'' اسلم نے اپنے دو ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے حکم دیا اور خود دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ اس کے باقی ساتھی اس کے پیچھے تھے۔

''تم کچن کی طرف جاؤ۔'' اندر پہنچ کر اس نے جیدے نامی ڈاکو کو حکم دیا۔ جیدے کو اس نے کچن کی طرف اس لیے بھیجا تھا کہ ان کے پاس موجود معلومات کے مطابق ملازمین میں سے صرف بلڈر وہ واحد شخص تھا جو سرونٹ کوارٹر کے بجائے کچن سے ملحق کمرے میں رہتا تھا اور دن رات کے کسی بھی حصے میں خدمت بجالانے کو تیار رہتا تھا۔ بلڈر کی طرف سے کسی گڑبڑ سے بچنے کے لیے اسے پہلے سے قابو کر لینا ضروری تھا۔

''تم لوگ نیچے کے کمروں کی تلاشی لے کر جو بھی قیمتی مال ہاتھ لگے، اسے جمع کر لو۔ ہم تینوں اوپر جائیں گے۔'' جمرو اور ایک دوسرے ساتھی کو اپنے ساتھ اوپر جانے کا فیصلہ سنا کر اس نے باقی لوگوں کو حکم دیا تو وہ سب خودکار انداز میں حرکت میں آ گئے۔ اسلم نے اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد خود اوپر کا رخ کیا۔ جمرو اور دوسرا فرد اس کے حکم کے غلام بنے اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

وہ ابھی سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچے ہی تھے کہ انہیں شب خوابی کے لباس میں ملبوس شہریار ایک کمرے کے دروازے سے باہر آتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹے سائز کا پسٹل تھا۔ یقیناً اس نے بنگلے میں جاری سرگرمیوں کے نتیجے میں ہونے والی معمولی کھٹ پٹ کی آہٹ پا لی تھی اور اب پسٹل ہاتھ میں لیے جائزہ لینے باہر نکل رہا تھا۔ باہر آتے ہی اس کی نظر اسلم اور اس کے ساتھیوں پر پڑ گئی تھی۔ تین نقاب پوشوں کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ بُری طرح ٹھٹکا اور قریب تھا کہ ردِعمل کے طور پر فوراً فائر کر دیتا کہ اسلم نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اس کی چلائی ہوئی گولی نے شہریار کے ہاتھ میں موجود پسٹل کو دور جا گرایا۔ فائر بے آواز تھا اس لیے کسی بیرونی مداخلت کا امکان پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''اسمارٹ بننے کی ہرگز بھی کوشش مت کیجیے گا اے سی صاحب! میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ آپ کو اپنی کسی بھی حرکت کے نتیجے میں گولی کھانی پڑے گی اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ کسی ہتھیار سے نکلنے والی گولی آدمی کے جسم میں چھید کر کے اسے عالمِ بالا بھی پہنچا سکتی ہے، ورنہ کم از کم بھی زخمی ہونے اور خون بہنے کا امکان تو ہوتا ہی ہے۔'' شہریار کی نظروں نے پسٹل ہاتھ سے نکلتے ہی اس سمت میں سفر کیا تھا جہاں پسٹل جا کر گرا تھا۔ چنانچہ اسلم نے فوراً ہی اسے تنبیہہ کر ڈالی۔

''کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟'' نہایت ہموار لہجے میں اس سے یہ سوال کرتے ہوئے شہریار کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کی دھمکی سے قطعی خوف زدہ نہیں ہوا ہے۔

''ہم کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں یہ آپ ہمارے واپس جانے تک جان لیں گے۔ فی الحال آپ واپس اندر چلیں۔''

اس نے ریوالور کی نال سے اشارہ کرتے ہوئے اسے حکم دیا جس کی شہریار نے خاموشی سے پیروی کی۔ اسلم اور جمرو اسے زد میں لیے ہوئے خود بھی پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے جبکہ ان کا تیسرا ساتھی پہلے ہی اندر جا چکا تھا اور اس نے بیڈ پر ٹانگیں سمیٹ کر خوف زدہ سی بیٹھی ہوئی ماریا کو زد میں لیا ہوا تھا۔ گلابی مہین نائٹی میں اپنے سنہری کھلے بالوں کے ساتھ بیٹھی ماریا کے وجود میں کسی مرد کی توجہ کھینچ لینے کا پورا سامان تھا۔ جمرو کی نظر اس کے وجود پر پڑی تو وہیں چپک کر رہ گئی۔

''لاکر کی چابیاں ہمارے حوالے کر دیں۔ ہم یہاں سے صرف نقدی اور زیور لے کر جائیں گے۔ آپ نے ہمارے کام میں مداخلت نہیں کی تو مالی نقصان کے علاوہ دوسرا کوئی نقصان نہیں اٹھائیں گے۔ دوسری صورت میں ہر قسم کے نتائج کی ذمے داری آپ پر ہی ہو گی۔'' رواں لہجے میں بولتا ہوا وہ شہریار کو مسلسل چونکا رہا تھا لیکن اس نے اپنے چہرے کے تاثرات سے اس بات کا اظہار نہیں ہونے دیا اور پُرسکون لہجے میں بولا۔

''او کے، تم جو لے جانا چاہتے ہو لے جاؤ۔ ہم تمہارے لیے کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کریں گے۔'' اسلم سے یہ کہنے کے بعد اس نے ماریا کی طرف رخ کیا اور بولا۔

''چابیاں دے دو۔''

اس کا حکم سن کر ماریا نے جھک کر بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی دراز کھولی اور اس میں سے سیاہ رنگ کا اسٹائلش سا پرس نکالا۔ پرس نکالنے کے لیے جھکنے کے نتیجے میں اس کی ٹانگ کا کشادہ گریبان مزید کشادہ ہو گیا تھا۔ اس پر نظریں گاڑ کر رکھے جمرو کے جذبات اس نظارے کے بعد مزید متلاطم ہو گئے۔ ماریا نے پرس سے چابیوں کا گچھا باہر نکالا تو اس نے سب سے پہلے جھپٹ کر اس سے چابیاں لے لیں۔ چابیاں لینے سے قبل اس نے جان بوجھ کر ماریا کے ہاتھ کو زور سے دبایا اور نرم گداز ہاتھ کی گرماہٹ سے مزید اپنے جذبات کو برانگیختہ کر بیٹھا۔

''لاکر کہاں ہے؟'' جمرو کی حرکت کو نظر انداز کرتے ہوئے اسلم نے ماریا سے پوچھا۔

''اندر ڈریسنگ روم میں۔'' اس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ڈاکٹر صاحبہ کے ساتھ ان کے ڈریسنگ روم میں جاؤ اور نقدی اور زیورات لے آؤ۔'' یہ حکم بھی جمرو کے لیے تھا۔

''چل بی بی!'' اس نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ ماریا کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ وہ کچھ سہمی ہوئی سی اس کے ساتھ چل پڑی۔

''تم لوگ اپنے حق میں کچھ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ شاید تمہیں پوری طرح سے اندازہ نہیں ہے کہ تم نے ڈاکا زنی کی اس واردات کے لیے کس جگہ کا انتخاب کیا ہے۔'' جمرو اور ماریا کے دروازے کے پیچھے غائب ہوتے ہی شہریار، اسلم سے مخاطب ہوتا ہوا سنجیدگی سے بولا۔

''آپ ہماری فکر نہ کریں اے سی صاحب! ہم سارا حساب کتاب گر کے ہی اپنا کام کرتے ہیں۔'' اسلم نے ناک پر سے مکھی اڑانے والے انداز میں اس کی دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جواب دیا۔

''بعض اوقات آدمی کا حساب غلط بھی ہو جاتا ہے۔'' شہریار بولا۔

''ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے کام میں غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی اس لیے بہت محتاط رہتے ہیں۔'' اسلم کی طرف سے ترنت جواب آیا۔ شہریار سے باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس پر گہری نظر بھی رکھے ہوئے تھا اور اس کے پاس حرکت کرنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

''احتیاط کے باوجود جانے کب آدمی کی قسمت ساتھ چھوڑ جائے، کچھ کہا تو نہیں جا سکتا۔'' شہریار نے اسے ڈرایا۔

''قسمت کے لکھے سے کون بچ سکتا ہے۔ جب سر پر پڑے گی تو ہم بھی بھگت لیں گے۔'' وہاں غضب کا اطمینان تھا۔

اس وقت دو ایسے افراد مدِمقابل تھے جو اپنی اپنی جگہ بے حد پُراعتماد تھے اس لیے کوئی کسی کو نہیں ڈرا سکتا تھا۔

شہریار صرف اس لیے ایکشن میں نہیں آیا تھا کہ موجودہ صورتِ حال میں بہادری دکھانا بے وقوفی کے زمرے میں آتا۔ وہ محسوس کر سکتا تھا کہ جو تین افراد اس کے بیڈ روم تک آئے ہیں، ان کے علاوہ بھی کئی افراد بنگلے میں موجود ہیں۔ وہ کسی طرح ان تین سے نمٹ بھی لیتا تو باقی کا کیا کرتا؟ اسے ان میں سے کسی کی صحیح پوزیشن تو معلوم نہیں تھی البتہ اتنا طے تھا کہ اس کے بنگلے پر ڈاکا ڈالنے کے لیے وہ لوگ بے حد تیاری کے ساتھ آئے ہوں گے۔ وہ ماریا کی وجہ سے بھی خاموش تھا۔ ڈاکا زنی کی وارداتوں میں خواتین کے ساتھ بدسلوکی کے متعدد واقعات اس کے علم میں تھے چنانچہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کوئی حرکت ان لوگوں کو ماریا کے ساتھ بدسلوکی کا جواز فراہم کر دے۔ لیکن اس کی یہ احتیاط پسند بیکار گئی اور ڈریسنگ روم سے ماریا کی چیخ سنائی دی۔ شہریار نے مضطرب ہو کر بے ساختہ ہی اس طرف قدم

www.kahopakistan.com

بڑھائے۔ اسلم نے اسے روکا نہیں بلکہ خود بھی تیزی سے اس جانب لپکا۔ اندر حسبِ توقع جمرو کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ ماریا کی نائٹی کا کشادہ گلا چاک ہونے کے بعد بالکل غائب ہو چکا تھا اور سارے پوشیدہ راز عیاں کر رہا تھا۔ پھر بھی وہ جمرو کی زبردستی سے بچنے کے لیے بھرپور مزاحمت کر رہی تھی۔

''ڈاکٹر صاحبہ کو چھوڑ دو۔'' شہریار کے کچھ کرنے سے قبل اسلم نے جمرو پر ہتھیار تانتے ہوئے اسے سرد لہجے میں حکم دیا۔

''تم اس معاملے میں نہ پڑو۔'' عورت کی طلب میں مبتلا وہ اس کی بات سننے کو قطعی تیار نہیں تھا۔

''تم سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہو اور اس کا انجام اچھی طرح جانتے ہو۔'' اسلم غرایا۔

''سردار کو میں خود جواب دے لوں گا۔ تم میری فکر نہ کرو۔'' اس نے باغیانہ لہجے میں جواب دیا۔

''جواب مجھے بھی سردار کو دینا ہے اس لیے ضروری ہے کہ یہاں کوئی بھی کام اس کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔'' اسلم نے اسے دھمکی دی۔

''مار سکتا ہے تو مار دے۔'' وہ گویا ضد میں آیا ہوا تھا۔ چنانچہ اس کی دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ماریا کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اس کی حرکت پر تلملا کر اسلم نے لبلبی دبا دی۔ اس کے ہتھیار سے نکلنے والی گولی جمرو کے کان کی لو اڑاتی ہوئی ایک الماری میں پیوست ہو گئی۔

''تو جانتا ہے کہ میرا نشانہ خطا نہیں جاتا۔ یہ میں نے تجھے لاسٹ وارننگ دی ہے۔ اگلی گولی تیری کھوپڑی میں چھید کرے گی۔'' کچھ گولی کی دہشت تھی اور کچھ اسلم کے لہجے کی خونت کی کہ جمرو ماریا کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ خوف زدہ ماریا فوراً ہی ایک طرف سمٹ کر کھڑی ہو گئی۔ شہریار اس ساری کارروائی کے دوران خاموش تماشائی بنا رہا تھا۔ اس کی خاموشی کے پیچھے ایک وجہ تو یہ تھی کہ اسلم خود ہی اس صورتِ حال سے نمٹ رہا تھا اور دوسرے یہ کہ وہ مسلسل ان کے تیسرے ساتھی کے نشانے پر تھا۔ آپس میں جھگڑنے کے باوجود وہ اس کی طرف سے غافل نہیں ہوئے تھے۔

''زیور اور نقدی کہاں ہے؟'' جمرو، ماریا کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا تو اسلم نے اس سے دریافت کیا۔ جواب میں اس نے ایک جانب رکھے بیگ کی طرف اشارہ کر دیا۔

''بیگ اٹھا کر باہر جاؤ۔'' اسلم نے اپنا نیا حکم سنایا جس کی اس نے اندر ہی اندر کھولنے کے باوجود فوراً تعمیل کی۔

اسلم کے انداز نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اس سے اب مزید جھگڑا مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ وہ جس موڈ میں تھا، اسے گولی مارنے سے ہرگز دریغ نہیں کرتا۔

''تعاون کے لیے شکریہ اے سی صاحب! امید ہے کہ آپ نے اپنی بیگم کو شادی میں قیمتی زیورات گفٹ کیے ہوں گے اور ہماری محنت ضائع نہیں جائے گی۔ اب آپ کو ہم سے آخری تعاون کرنا ہوگا، آپ کو بے ہوش ہونا پڑے گا۔ صبح تک آپ دونوں آرام سے ہوش میں آ جائیں گے اور ہم بھی بغیر کسی مداخلت کے آپ کی پہنچ سے دور نکل جائیں گے۔'' جمرو کے باہر نکلتے ہی وہ شہریار سے مخاطب ہوا اور بالکل اچانک ہی اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی بوتل باہر نکالی۔

شہریار کچھ سمجھتا، اس سے قبل ہی وہ بوتل کا رخ اس کی طرف کر کے بے ہوشی کی دوا اسپرے کر چکا تھا۔ دوا نہایت سریع الاثر تھی چنانچہ وہ فوراً ہی بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بے ہوش ہونے کے بعد انہوں نے ماریا کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا اور پھر تیزی سے الماریوں کو الٹ پلٹ کرنے لگے۔

آدھے گھنٹے بعد جب وہ سب وہاں سے روانہ ہوئے تو اپنے کام کی کوالٹی سے پوری طرح مطمئن تھے اور نقدی اور زیورات کے علاوہ اور بھی کئی قیمتی اشیا اپنے ساتھ مالِ غنیمت کی طرح بٹور کر لے جا رہے تھے۔

☆☆☆

نورکوٹ کی وہ صبح خاصی ہنگامہ خیز تھی۔ اسسٹنٹ کمشنر شہریار کے بنگلے پر ہونے والی ڈاکازنی کی واردات کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا جسے نظرانداز کیا جا سکتا۔ پولیس کو واردات کی اطلاع کافی تاخیر سے ملی تھی، وہ بھی اس طرح کہ جب شہریار مقررہ وقت پر دفتر نہیں پہنچا تو عبدالمنان کو تشویش ہوئی۔ اپنی تقرری کے بعد سے وہ ہمیشہ وقت پر دفتر پہنچتا تھا اور اگر کبھی تاخیر کا اندیشہ ہوتا تھا تو پہلے ہی سے فون کر کے آگاہ کر دیتا تھا۔ آج ایسا کچھ بھی نہ ہوا تو تقریباً ایک گھنٹا انتظار کرنے کے بعد عبدالمنان نے بنگلے کے فون پر کال کی۔ دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی گئی۔ وہ مسلسل کوشش کرتا رہا لیکن نتیجہ ایک ہی تھا۔ اسے کوئی رسپانس نہیں مل رہا تھا۔ اس نے تشویش محسوس کرتے ہوئے شہریار کا موبائل نمبر ملایا، نتیجہ اب بھی وہی تھا۔ اس بار اس کی تشویش میں کئی گنا اضافہ ہو گیا اور اس نے مشابرم خان کے ساتھ خود بنگلے پر جانے کا فیصلہ کیا۔ دفتر آنے جانے کے لیے شہریار عام طور پر خود ہی گاڑی ڈرائیو کرتا تھا اس لیے اس نے مشابرم خان کو اپنے

بنگلے پر مستقل رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور وہ دفتر ہی میں رہتا تھا۔ راستے میں عبدالمنان نے اسے شہریار کے بنگلے کی صورتِ حال بتائی تو وہ بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ دفتر سے بنگلے کا فاصلہ یوں بھی زیادہ نہیں تھا۔ مشابرم خان کی برق رفتاری نے اسے اور بھی مختصر کر دیا۔ بنگلے کے گیٹ پر گاڑی روکنے کے بعد اس نے ہارن دیا لیکن حسبِ معمول اندر سے چوکیدار نے ذیلی دروازہ کھول کر نہیں جھانکا جس سے انہیں مزید یقین ہو گیا کہ اندر کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔

''آپ ٹھہریں جناب..... میں اندر دیکھ کر آتا ہوں۔'' مشابرم خان نے عبدالمنان سے کہا اور گاڑی سے اتر گیا۔ خود عبدالمنان سے بھی اندر بیٹھا نہیں گیا، سو وہ بھی باہر نکل آیا۔ بند گیٹ کے قریب پہنچ کر مشابرم خان نے ذیلی دروازے کو ہلکے سے دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اپنے بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں تھامتے ہوئے وہ محتاط انداز میں اندر داخل ہوا۔ عبدالمنان غیر مسلح تھا پھر بھی اس کے پیچھے ہی اندر گھس گیا۔ گیٹ کے قریب چوکیدار کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

''پچھلی طرف جا کر چوکیدار کو دیکھو۔'' عبدالمنان نے اسے حکم دیا تو وہ آگے بڑھ گیا۔ خود عبدالمنان نے مرکزی عمارت کا رخ کیا۔ یہاں کا دروازہ بھی صرف بھڑا ہوا تھا چنانچہ ذرا سا دھکا دینے پر کھل گیا۔ عبدالمنان متذبذب سا اندر داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے وہاں پھیلی بے ترتیبی نظر آ گئی۔ یوں لگتا تھا کہ وہاں کوئی جنگلی جانور گھس آیا تھا جس نے ہر شے تہس نہس کر کے رکھ دی تھی۔ نچلی منزل کا یہ حال دیکھ کر وہ اوپر کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ اچھی طرح واقف تھا کہ شہریار کا بیڈروم اوپری منزل پر ہے اور یہ تو ممکن نہیں تھا کہ نیچے اتنی گڑبڑ ہو تو اوپر سب ٹھیک رہے۔ وہ مضطرب سا سیڑھیوں کی طرف بڑھا پھر اسے بٹلر کا خیال آیا۔ اس کا خیال آتے ہی وہ رخ موڑ کر کچن کی طرف مڑ گیا۔ بنگلے میں پھیلی خاموشی سے یہ تو صاف ظاہر تھا کہ یہ ساری تباہی پھیلانے والے وہاں سے رخصت ہو چکے ہیں اور اب ان لوگوں کا حال معلوم کرنا ہے جو اس بنگلے کے رہائشی ہیں۔ وہ کچن کے ساتھ ملحق کمرے میں پہنچا تو وہاں اسے بستر پر بٹلر کی لاش پڑی نظر آئی۔ اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر گولی کا سوراخ تھا جس نے اس کے لباس کو داغ دار کر دیا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ بے چارہ سوتے میں مارا گیا ہے۔ حقیقت میں ہوا بھی یہی تھا۔ اسلم کے حکم پر جیدا اسے بے ضرر بنانے آیا تھا اور لاش میں تبدیل کر کے چلا گیا تھا۔ حالانکہ اس

کنوارا خاندان

لارڈ خاندان کے معزز فرد کو اپنی خاندانی روایات پر بڑا ناز تھا۔ وہ ان کے متعلق ایک دوست سے بات چیت کر رہے تھے اور انہیں بتا رہے تھے کہ ہمارے خاندان میں سیاسی، ثقافتی اور دیگر روایات کیا کیا ہیں۔ ان صاحب کی عمر کوئی چالیس سال تھی مگر وہ اب تک کنوارے تھے۔ دوست نے دریافت کیا۔ ''اور کیا اس عمر تک شادی نہ کرنا بھی آپ کی خاندانی روایات میں شامل ہے؟''

لارڈ نے نہایت فخر سے برجستہ جواب دیا۔ ''آپ نے خوب سمجھا، میرا باپ بھی کنوارا تھا..... اور دادا پردادا تک کنوارے ہی مر گئے۔''

(مرسلہ: اریبہ کنول، کوئٹہ)

سوتے ہوئے شخص کو ہاتھ پیر باندھ کر یا بے ہوش کر کے بھی گزارہ ہو سکتا تھا لیکن جیدے کی فطرت میں تشدد کا رجحان زیادہ تھا۔ وہ انسانوں کی اس قسم سے تعلق رکھتا تھا جن کے منہ کو خون لگ جاتا ہے اور وہ انسان کے بجائے درندے بن جاتے ہیں بلکہ شاید درندوں سے بھی زیادہ گئے گزرے..... کہ درندے بھی بہرحال بے وجہ قتل نہیں کرتے۔ ان کے پیشِ نظر بھی اپنے پیٹ کی آگ بجھانا یا محسوس ہونے والے خطرے سے نمٹنا ہوتا ہے۔ جیدے نے تو بے چارے بٹلر کو بے وجہ ہی قتل کر ڈالا تھا۔

''باہر چوکیدار کی لاش پڑی ہے جناب۔ اسے گردن کی ہڈی توڑ کر ہلاک کیا گیا ہے۔'' وہ بٹلر کی لاش کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ مشابرم خان وہاں پہنچ گیا اور اسے اطلاع دی۔ پھر اس کی نظر بھی لاش پر پڑ گئی۔

''خانہ خراب..... یہ بھی گیا۔'' وہ بے ساختہ ہی بولا۔

''ہاں، آؤ اوپر چل کر اے سی صاحب اور ان کی بیگم کو دیکھتے ہیں۔'' عبدالمنان نے گہری سنجیدگی کے ساتھ جواب دیتے ہوئے ایک بار پھر اس راستے کا رخ کیا جہاں سے سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر جا سکتے تھے۔ اس بار مشابرم خان اس کی پیروی کرتے رہنے کے بجائے نہایت پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس کی شہریار سے بے پناہ محبت کا تقاضا بھی یہی تھا اور یہ محبت یونہی نہیں تھی۔ شہریار نے خود کو اس کا اہل بھی ثابت کیا تھا۔ یہ وہی تھا جو اس کی غیر موجودگی میں بلتستان کے اسپتال میں زیرِ علاج اس کی ماں کو

www.kahopakistan.com

اسلام آباد کے ایک جدید اسپتال میں لے آیا تھا اور اس کے علاج کے سارے اخراجات اپنی جیب سے ادا کر رہا تھا۔

وہ پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا شہریار کے بیڈ روم تک پہنچا تو اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا، البتہ کمرے کی حالت ضرور مچھلی منزل کی طرح خراب تھی۔ اسے بے جان چیزوں سے کچھ لینا دینا بھی نہیں تھا، اصل فکر شہریار کی تھی لیکن وہ اور اس کی بیگم توقع کے خلاف وہاں موجود نہیں تھے۔

''اندر ڈریسنگ روم میں دیکھتے ہیں۔'' کچھ لمحوں کے توقف سے عبدالمنان بھی وہاں پہنچ گیا اور اندر کی صورتِ حال دیکھ کر بولا۔ پھر وہ دونوں ایک ساتھ ڈریسنگ روم کے دروازے کی طرف بڑھے۔ شہریار اور ڈاکٹر ماریا ڈریسنگ روم کے فرش پر رسیّوں سے بندھے بے حس و حرکت پڑے تھے۔ کسی نے جاتے جاتے ماریا کے جسم پر ایک چادر ڈال دی تھی جو اسے گردن سے پیروں تک ڈھانپے ہوئے تھی۔ مشابرم خان تڑپ کر شہریار کی طرف بڑھا۔ اس کے جسم پر کوئی زخم نظر نہ آنے کے باوجود وہ اسے بے حس و حرکت دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ قریب جا کر اس نے اس کی نبض تھامی تو زندگی کے آثار مل گئے۔

''صاحب زندہ ہیں۔ ایمبولینس بلائیں منان صاحب.... انہیں فوراً اسپتال لے جانا ضروری ہے۔'' وہ ہیجان خیز آواز میں چیخا تو پہلی بار عبدالمنان کو اپنی جیب میں موجود موبائل کو استعمال کرنے کا خیال آیا۔ ورنہ یہاں کی صورتِ حال دیکھ کر اس کا دماغ اس بُری طرح ماؤف ہو چکا تھا کہ وہ ابھی تک پولیس کو کال کرنے کا بھی نہیں سوچ سکا تھا۔ مشابرم خان کے کہنے پر اس نے یکے بعد دیگرے اسپتال اور پولیس اسٹیشن فون کر ڈالے۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر بنگلے کی خاموش فضا میں ہنگامے جاگ اٹھے۔ شہریار اور ماریا کو طبّی امداد کے لیے لے جانے کے علاوہ چوکیدار اور بٹلر کی لاشیں بھی اسپتال منتقل کر دی گئیں۔ پولیس نے پورے بنگلے کی تلاشی لی تو سرونٹ کوارٹرز میں موجود ملازموں کو بھی نجات ملی۔ ان بے چاروں کو ہتھیاروں کے زور پر بے بس کر کے ہاتھ پیر باندھنے کے بعد منہ میں کپڑا ٹھونس کر معذور کر دیا گیا تھا۔ وہ نہ تو اپنے ہاتھ پیر ہلا سکتے تھے اور نہ ہی مدد کے لیے چلّا سکتے تھے۔ ہوش میں ہوتے ہوئے کئی گھنٹے اس حالت میں پڑے رہنے سے ان پر بہت بُرا اثر پڑا تھا اور ایک دو تو باقاعدہ آنسوؤں کے ساتھ دہاڑیں مار مار کر رونے لگے تھے۔ خصوصاً چوکیدار اور بٹلر کی موت کی اطلاع نے ملازمین میں خاصی سراسیمگی پھیلا دی تھی۔ پولیس نے ملازمین سے جو بیانات لیے اور بنگلے کی جو صورتِ حال نظر آئی، اس سے وہ یہی نتیجہ اخذ کر سکے کہ بنگلے پر ڈاکا زنی کی بڑی منظم واردات کی گئی ہے۔

اصل صورتِ حال جاننے کے لیے انہوں نے شہریار اور ماریا کے ہوش میں آنے کا انتظار کیا اور ان دونوں کے بیان نے بھی تصدیق کر دی کہ یہ ڈاکا زنی کی ہی واردات تھی۔ پولیس اپنے ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے لگی۔ ایس پی ضلع، شہریار کی آئی جی صاحب سے خصوصی وابستگی سے واقف تھا چنانچہ اس نے ایفی شینسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں اطلاع کر دی تھی۔ کرنے کو تو عبدالمنان بھی یہ کام کر سکتا تھا لیکن اس نے شہریار کی اجازت کے بغیر ایسا کوئی قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ وہ جانتا تھا کہ شہریار کوئی بھی پریشان کن خبر اپنے فیملی ممبرز سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا تھا لیکن ایس پی کی مہربانی سے مختار مراد کو فوراً ہی خبر مل گئی۔ میڈیا والوں کو فی الحال اس معاملے سے الگ رکھا گیا تھا، اس لیے نیوز چینلز فی الحال خاموش تھے۔ ویسے بھی اس پسماندہ ضلع کی خبریں تفصیل کے ساتھ چینلز پر چلنے تک خاصا وقت لگ جاتا تھا الّا یہ کہ خبر کو نشر کرنے کے لیے خصوصی اہتمام کیا جاتا۔

مختار مراد کو واقعے کی اطلاع ملی تو اس نے فوراً شہریار کو فون کیا۔ وہ ہوش میں آچکا تھا لیکن ابھی اسپتال میں ہی تھا۔ بے ہوش کرنے کے لیے جو دوا استعمال کی گئی تھی، وہ بہت طاقتور تھی اس لیے وہ کئی گھنٹے تک ہوش میں نہیں آسکا تھا اور اب بھی ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ اسے اور ماریا کو کچھ وقت اسپتال میں گزارنا چاہیے۔ اپنی عادت سے ہٹ کر اس نے یہ مشورہ مان لیا تھا چنانچہ اس وقت اسپتال کے ایک بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔

عبدالمنان اس کے ساتھ کمرے میں موجود تھا۔ ماریا کو دوسرے کمرے میں رکھا گیا تھا کیونکہ واقعے کی اطلاع ملتے ہی کئی لوگ شہریار سے ملنے اسپتال کی طرف دوڑے آئے تھے۔ فی الحال کسی کو ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی تھی لیکن چند منٹ کے لیے ہی، اسے ان لوگوں سے ملنا تو پڑتا۔

''کیا بات ہے ینگ مین! یہ ہر تھوڑے عرصے بعد اسپتال کو رونق بخشنے کیوں پہنچ جاتے ہو؟'' مختار مراد کی کال عبدالمنان نے ریسیو کی تھی' اس کے ہاتھ سے موبائل سیٹ شہریار کے ہاتھ میں پہنچا تو اس کی ہیلو سنتے ہی مختار مراد بولا۔

''میں تو نہیں آنا چاہتا لیکن کچھ کرم فرماؤں کی مہربانیاں پہنچا دیتی ہیں۔'' اس نے بھی انہی کے انداز میں جواب دیا۔

''اسی لیے میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ محتاط رہو اور ہر معاملے میں اپنی ٹانگ نہ اڑاؤ لیکن تمہیں بھی تو چین نہیں ہے۔'' اس نے محبت بھری خفگی کا اظہار کیا۔

''آپ نے صحیح کہا اور یقین جانیں کہ شینا اور سجاد بھائی کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے بغیر مجھے کسی صورت چین نہیں آئے گا..... بلکہ سچ پوچھیں تو یہ معاملہ نمٹ بھی گیا تو میں پھر بھی چین سے اس لیے نہیں بیٹھ سکوں گا کہ مجھے اپنے وطن اور ہم وطنوں سے محبت ہے۔ میں ناانصافی اور ظلم کا ساتھ دینے کی اہلیت نہیں رکھتا اس لیے ہمیشہ ظالموں کی نظر میں کھٹکتا رہوں گا۔''

''تم تو جذباتی ہو گئے یار! چلو فی الحال اس بحث کو جانے دو اور حالیہ واقعے پر بات کرو۔ ایس پی نے مجھے جو رپورٹ دی ہے، اس کے مطابق تو یہ خالصتاً ڈاکا زنی کی واردات تھی اور یقیناً اس وجہ سے کی گئی تھی کہ کسی طرح ڈاکوؤں کو یہ سن گن مل گئی ہوگی کہ تمہاری شادی پر ماریا کو بہت قیمتی زیورات چڑھائے گئے تھے۔ ایس پی کے مطابق بنگلے میں کوئی بھی قیمتی شے نہیں چھوڑی گئی ہے۔'' مختار مراد نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے خود ہی گفتگو کا رخ حالیہ واقعے کی طرف موڑ دیا۔

''لیکن میرے خیال میں یہ خاص ڈاکا زنی کی واردات نہیں ہے۔ میرے دشمن نے اس واردات کی آڑ میں مجھے پیغام دیا ہے کہ جس طرح ہم تمہارے گھر میں گھس کر تمہارا مال و اسباب لوٹ سکتے ہیں اور تمہارے ملازمین کو ہلاک کر سکتے ہیں، اسی طرح تمہاری جان اور عزت بھی ہمارے ہاتھ میں ہے۔'' اس نے مختار مراد کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا خیال پیش کیا۔

''تم یہ بات کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟ کیا تمہیں غیر ملکی ایجنسی پر شک ہے؟'' اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''نہیں، یہ اندر کے دشمنوں کا کام ہے اور میں یہ بات بے بنیاد نہیں کہہ رہا ہوں۔ میرے پاس اس کی ٹھوس وجہ موجود ہے۔ آپ کو وہ واقعہ تو یاد ہوگا جب مجھے اغوا کروا لیا گیا تھا اور میں نے بعد میں یہ شک ظاہر کیا تھا کہ میں جنگل میں ڈاکوؤں کی قید میں تھا۔'' اس نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں..... ہاں بالکل یاد ہے۔ وہ کوئی بھولنے والی بات تو ہے بھی نہیں۔'' مختار مراد نے فوراً جواب دیا۔

''میرے اغوا کے وقت جو شخص اغوا کاروں کو لیڈ کر رہا تھا، وہی شخص حالیہ واردات میں بھی ان کا لیڈر تھا۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''کیا تم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہو؟ میں یہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ تم نے دونوں وارداتوں میں جو بیان دیا ہے، اس کے مطابق تمام ڈاکو نقاب پوش تھے پھر تم کس بنیاد پر یہ دعویٰ کر رہے ہو؟'' اس نے شہریار سے وضاحت چاہی۔

''میں نے اس شخص کو اس کی شکل و صورت کی بنیاد پر نہیں بلکہ لب و لہجے سے پہچانا ہے۔ پہلی بار جب وہ مجھ سے مخاطب ہوا تھا تو میں اس کی گفتگو سن کر چونک گیا۔ اس کا لب و لہجہ صاف بتاتا ہے کہ وہ پنجاب سے تعلق نہیں رکھتا۔ جہاں تک میں اندازہ لگا سکا ہوں، وہ سندھ کے کسی علاقے کا رہنے والا ہے لیکن میں یہ بات بھی پورے یقین سے اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ وہ بہت صاف ستھری اردو بول رہا تھا اور اس کے طرزِ گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ میری رہائش گاہ پر جب وہ دوبارہ مجھ سے ٹکرایا تو میں چونک پڑا اور میں نے اس کی قد و قامت اور باڈی لینگویج پر غور کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی شخص ہے جو میرے اغوا میں بھی ملوث تھا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ڈاکوؤں کے جتھے میں موجود کسی منفرد خصوصیات کے شخص کو شناخت کرنا میرے لیے اتنا مشکل ثابت نہیں ہوا ہوگا۔'' اس نے اپنے دعوے کے حق میں دلائل دیے تو مختار مراد بھی قائل ہو گیا۔

''میں تمہاری بات بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ یہ دشمنی کا وہی سلسلہ ہے جو شاید تم نے اپنی جاب کے پہلے دن سے مول لیا تھا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن میں آپ کو صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ پہلے تو میں نے مصلحتاً کافی مروت سے کام لیا تھا مگر اب میرے پاس ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں اپنے اوپر پے در پے کیے جانے والے اٹیکس کے بعد بھی خاموش رہ کر یہ تاثر نہیں قائم کرنا چاہتا کہ میں کسی سے کمزور ہوں۔ میرے پاس اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے قانونی راستہ بھی ہے اور دوسرا بھی۔ اگر قانون نے میرا ساتھ نہیں دیا تو مجھے مجبوراً دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔'' یہ ایک واضح دھمکی تھی جسے سمجھنا مختار مراد کے لیے مشکل نہیں تھا۔

''کوئی بھی جذباتی قدم نہیں اٹھانا شہریار! میں آپریشن کی تیاریاں کروا رہا ہوں اور یقین کرو کہ تمہارے گھر پر ہونے والی واردات آپریشن کے فیصلے کے لیے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی ہے۔ اب میرے پاس اتنے ٹھوس جواز جمع ہو گئے ہیں کہ کوئی مجھے کارروائی کرنے سے

www.kahopakistan.com

نہیں روک سکتا۔'' وہ اسے کسی بھی عمل سے باز رکھنے کے لیے سمجھانے لگا۔

''مجھے آپ سے یہی امید تھی انکل! بس اب آپ جلدی سے ایکشن میں آجائیں۔ میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے یہاں تیار بیٹھا ہوں۔'' اس نے مختار مراد کے فیصلے کو سراہا اور ایک طرح سے یہ اشارہ بھی دے دیا کہ ان کی طرف سے کارروائی شروع ہونے تک وہ خود خاموش رہے گا لیکن خود اس کا ذہن سوال کر رہا تھا کہ ڈاکوؤں کے ڈیرے پر آئی جی مختار مراد آپریشن شروع کروا بھی دے گا تو اس سے چودھری کی صحت پر کیا اثر پڑے گا؟ وہ ایک گروہ کی پیخ کنی کے بعد دوسرا گروہ پال لے گا۔ دوسرے یہ کہ آپریشن شروع ہوتے ہوئے بھی کچھ دن لگ جاتے جبکہ وہ چودھری کو فوری طور پر منہ توڑ جواب دینا چاہتا تھا۔ یہ جواب دینے کے لیے اس کے پاس ایک بہت ہی اچھا ہتھیار تھا۔۔۔۔ جگو!

☆☆☆

''سرکار! نورپور سے چودھری بختیار آپ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔'' وہ اپنے مخصوص تخت پر مخملی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے حقے کے کش لے رہا تھا کہ منشی اللہ رکھا نے اسے اطلاع دی۔ اس اطلاع پر اس نے حقے کی نے ہونٹوں سے ہٹا کر پشت پر کھڑے ملازم کی طرف بڑھائی اور کچھ اس انداز میں منشی کی طرف دیکھنے لگا جیسے اس کی بات سن نہ سکا ہو۔

''چودھری بختیار ملاقات کے لیے آیا ہے سرکار!'' اس کی ایک ایک ادا سے واقف منشی نے اطلاع کو دہرایا۔

''میں نے سن لیا ہے منشی، پر اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا کہ سدھی صاحب خود چل کر حویلی کی چوکھٹ تک آئے ہیں۔ وہ تو اتنے ناک والے ہیں کہ اپنی بہن کا ولیمہ کھانے بھی ادھر نہیں آئے تھے۔'' اس کی حیرت پر تمسخر کا رنگ غالب تھا۔

''ناک والوں کی ناک کٹنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے سرکار! چودھری بختیار کی آپ کے آگے اوقات ہی کیا ہے۔ ایک نہ ایک دن تو اسے گھٹنے ٹیکنے ہی تھے۔'' منشی نے خوشامدانہ لہجے میں جواب دیا۔

''تو ٹھیک بولا منشی، پر تجھ سے اور مجھ سے کچھ غلطی ہو رہی ہے۔ میں نے کہا وہ خود چل کر حویلی آیا ہے ہو تو نے گھٹنے ٹیکنے کی گل کی۔۔۔۔۔ پر بے چارہ بختیار اتو دونوں ہی کم (کام) نہیں کر سکتا۔ چلنا ہو رگھٹنے ٹیکنا اس لنگڑے کے بس میں ہے ہی کدھر؟'' اپنی بات کہہ کر اس نے خود ہی زوردار قہقہہ لگایا تو منشی نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

''چل بلالے اسے۔ ملوم تو ہو کہ وہ لنگڑا کیوں آیا ہے۔۔۔۔۔ پر نہیں، ابھی فوراً نہ بلانا۔ ذرا بیس پچیس منٹ انتظار کروا کر ادھر لانا۔ میں کوئی ایسا فارغ بھی نہیں بیٹھا کہ ہر ملاقاتی سے فوراً ملنے بیٹھ جاؤں۔'' اجازت دیتے دیتے اس نے اچانک اپنا فیصلہ تبدیل کر لیا اور ایک شان سے اپنا بایاں بازو پھیلایا۔ حقے کی نے تھام کر ایک طرف ہو جانے والا ملازم فوراً آگے بڑھا اور اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں دوبارہ سے نے تھما دی۔ چودھری بڑی فرصت سے کش لگانے لگا۔ اس کے حقے کی گڑگڑاہٹ سنتا منشی کمرے سے باہر نکل کر اس طرف بڑھ گیا جہاں چودھری بختیار اپنی گاڑی میں اس کا منتظر تھا۔ حویلی پہنچ کر اس نے گاڑی سے اترنا پسند نہیں کیا تھا اور منشی کو اپنی آمد کا مقصد بتا کر گاڑی میں ہی بیٹھا رہا تھا۔ شاید اسے بھروسا نہیں تھا کہ چودھری افتخار اس سے ملنا پسند بھی کرے گا یا نہیں۔ چودھری کی کم ظرفی پر بھروسا کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

''آپ اندر چل کر بیٹھیں، چودھری صاحب اس وقت ذرا مصروف ہیں۔ تھوڑی دیر بعد آپ سے ملاقات کریں گے۔'' منشی نے گاڑی کے قریب جا کر اسے اطلاع دی تو وہ کچھ دیر کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد نیچے اترنے کے لیے راضی ہو گیا۔ ویسے بھی یہ بات تو اسے خود بھی تسلیم کرنی پڑ رہی تھی کہ جب یہاں تک آ ہی گیا ہے تو انا کیسی؟ فریدہ سے بے حد ناراضگی کی وجہ سے اس نے یہ فیصلہ کر تو لیا تھا کہ اب ساری زندگی اس سے تعلق نہیں رکھنا ہے لیکن پھر دل میں دبی بہن کی والہانہ محبت نے اسے اپنا یہ فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ فیصلے کی اس تبدیلی میں شہریار کا بھی خاصا ہاتھ تھا۔ اس نے اسے قائل کر لیا تھا کہ فریدہ کتنی بھی قصوروار سہی لیکن ہے تو اس کی بہن ہی، اس لیے اسے کسی طور یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی بہن کو چودھری کی حویلی میں مرنے کے لیے بے یارومددگار چھوڑ دے۔ کچھ بہن کی محبت نے اور کچھ شہریار کے اصرار نے اسے اس حویلی تک آنے پر مجبور کر دیا تھا ورنہ وہ کبھی چودھری افتخار جیسے آدمی سے ملنے آنا گوارا نہ کرتا۔

''آپ کچھ پینا پسند کریں گے؟'' منشی اسے ایک بیٹھک میں بٹھا کر غائب ہو گیا تھا۔ کافی دیر بعد واپس آیا تو اس سے دریافت کیا اندر ہی اندر بُری طرح کھولتے چودھری بختیار نے خود پر ضبط کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کی معذوری نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ اپنے ملازم کا سہارا لے کر حرکت کرے چنانچہ اسے ملازم کو بھی اپنے ساتھ بیٹھک تک

www.kahopakistan.com

لانا پڑا تھا لیکن اندر سے سخت خفت محسوس کر رہا تھا کہ اس کا ملازم بھی اس کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کا نظارہ کر رہا ہے۔

''جیسی آپ کی مرضی۔ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ آپ لمبے سفر سے آئے ہیں، پیاسے ہوں گے۔'' بظاہر تو منشی ادب سے ہی بات کر رہا تھا لیکن اس کے مؤدبانہ الفاظ کے ساتھ لہجے میں جو طنز کے تیر پوشیدہ تھے، ان کے گھاؤ چودھری بختیار کس طرح برداشت کر رہا تھا، وہی جانتا تھا۔

''میری پیاس کی فکر نہ کرو اور چودھری صاحب سے جا کر پوچھو کہ اور کتنی دیر لگے گی انہیں فارغ ہونے میں۔ اگر وہ آج سارا دن ہی مصروف ہیں تو میں کل کسی وقت آجاؤں گا۔'' کچھ کھردرے پن سے اس نے منشی کو جواب دیا۔

''کل کا کیا بھروسا؟ چودھری صاحب اتنے مصروف آدمی ہیں، ہوسکتا ہے کل ان کے پاس بالکل ہی وقت نہ ہو۔ آپ تھوڑی دیر انتظار کرلیں، وہ جیسے ہی فارغ ہوتے ہیں میں آپ کو ان سے ملانے لے جاؤں گا۔'' منشی نے اسے تسلی دی اور وہاں سے چلا گیا۔ ناچار اسے ایک بار پھر انتظار کی اذیت سے گزرنا پڑا۔ اس بار منشی پندرہ منٹ بعد واپس آیا۔ کہنے کو یہ اتنا طویل دورانیہ نہیں تھا لیکن چودھری افتخار کی بیٹھک میں بیٹھ کر اسے خاصا طویل لگا۔

''آیئے، چودھری صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' منشی نے اس سے کہا تو وہ اپنے ملازم کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ معذور ہونے کے بعد بھی وہ عرصے تک اپنے کام خود ہی کرلیتا تھا اور کسی سے سہارا لینے کی کوشش نہیں کرتا تھا لیکن اب وہ پہلے سی ہمت نہیں رہی تھی۔ خصوصاً فریدہ نے اسے بُری طرح توڑ دیا تھا۔ وہ اس کی بے حد لاڈلی اور چہیتی بہن تھی جسے اس نے بہن سے بڑھ کر بیٹی سمجھا تھا۔ اپنی چہیتی کی وجہ سے اسے پہلا صدمہ اس وقت پہنچا جب اس نے یہ جانا کہ وہ اس کے جانی دشمنوں کے خاندان سے محبت کا ناتا جوڑ بیٹھی ہے۔ ابھی وہ اس صدمے سے سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ فریدہ اس کی عزت اور محبت کا خیال کیے بغیر اس لڑکے کے ساتھ گھر کی دہلیز پار کرگئی۔ یہ اور بات تھی کہ اپنی اس حرکت کے بعد اس نے کچھ بھی نہیں پایا اور وہ لڑکا اسے چودھری کے قبضے میں چھوڑ کر خود الگ ہو گیا اور دوسری جگہ بیاہ بھی رچا بیٹھا۔ لیکن چودھری بختیار اس بے عزتی کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا جو اس نے فریدہ کی شادی چودھری افتخار کے ذہنی معذور بیٹے سے کرتے ہوئے محسوس کی تھی۔ اپنے طور پر وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اب زندگی بھر فریدہ سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا لیکن خون کی کشش نے اسے مجبور کر دیا۔ وہ اپنی بہن کو مرنے کے لیے دوسروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا چنانچہ نہ چاہنے کے باوجود حویلی میں موجود تھا۔

''آؤ چودھری بختیار! یہاں آکر بیٹھو۔ تم میری حویلی میں آئے، سن کر وڈا چنگا لگا۔ آخر تم ہمارے سمدھی ہو، پر تمہاری یہ گل ہمیں اچھی نہیں لگی کہ تم نے ادھر کچھ کھانا پینا پسند نہیں کیا۔'' اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی چودھری نے بولنا شروع کر دیا۔ وہ اس وقت بھی گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر ہی بیٹھا ہوا تھا اور حقے کی نے تھامے ملازم اس کے اشارے کا منتظر تھا۔

''ہمارے ہاں دھی کے گھر کھانے پینے کا رواج نہیں ہے۔'' چودھری بختیار نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ ویسے مجھے تمہیں دیکھ کر حیرت ہوئی ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ تمہارے ہاں دھی کے سسرال میں آنے جانے کا بھی رواج نہیں ہے۔'' چودھری نے طنز کا تیر چلایا۔

''میں فریدہ کو لے جانے کے لیے آیا ہوں۔'' اس نے کسی بحث میں پڑنے کے بجائے مختصراً اپنا مدعا بیان کیا۔

''اتنے عرصے بعد تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟ تم نے تو شاید فریدہ کے لیے اپنے گھر کے دروازے بند کر دیے تھے؟'' چودھری کب باز آنے والا تھا۔

''گھر کے دروازے بند کر بھی لو تو دل کے دروازے بند نہیں ہوتے۔ فریدہ میری وڈی لاڈلی بہن ہے، ہور میں اسے یہاں بے بسی سے مرنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا۔'' اس نے بنا کسی لاگ لپیٹ کے سیدھی سیدھی بات کی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا تم یہ الزام لگا رہے ہو کہ ہم تمہاری بہن کا خیال نہیں رکھتے اور وہ یہاں ظلم و ستم کا شکار ہے؟'' چودھری بُرا مان گیا لیکن اس نے پروا نہیں کی اور کوئی وضاحت دیے بغیر خاموش بیٹھا رہا۔

''ہم ایسے گئے گزرے لوگ نہیں ہیں چودھری بختیارا! اگر ہم ایسے ویسے ہوتے تو آج تمہاری بہن اور بھانجا علاج کے لیے لاہور کے مہنگے ترین اسپتال میں داخل نہیں ہوتے۔'' اس نے گویا اپنے حق میں دلیل دی۔

''پر میرا خیال ہے کہ اگر اس حویلی میں اتنے گئے گزرے لوگ نہیں ہوتے تو میری بہن اسپتال تک پہنچتی ہی نہیں۔'' چودھری بختیار نے بھی دوبدو جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ کیا تم الزام لگا رہے ہو؟'' چودھری طیش میں آیا۔

''صرف الزام نہیں، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس حویلی میں میری بہن کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ کوشش دوبارہ بھی کی جاسکتی ہے، اس لیے میں اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔'' اس نے سکون سے جواب دیا۔

''تم اتنے وثوق سے ایسا کیسے کہہ سکتے ہو؟ آخر یہاں کسی کو فریدہ کو قتل کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟'' چودھری یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

''یہ ضرورت اسی شخص کو پڑسکتی ہے جو حویلی کے وارثوں میں اضافے کو پسند نہیں کرتا ہو۔ بہرحال، یہ حویلی کا اندرونی معاملہ ہے۔ مجھے تو اپنی بہن اور بھانجے کی زندگی عزیز ہے اس لیے میں انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں اور یہ اطلاع دینے آیا ہوں کہ فریدہ اور اس کے بچے کو میں اسپتال سے سیدھا اپنے گھر لے جاؤں گا۔'' اس نے چودھری کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ دوسری طرف چودھری سوچ میں پڑ گیا تھا۔ فریدہ کے ساتھ ہونے والا حادثہ اب اسے بھی سازش محسوس ہو رہا تھا اور اس سازش کے تانے بانے جوڑنے والی کا نام بھی اس کے ذہن میں آگیا تھا۔

''کیا سوچنے لگے چودھری صاحب! آپ کے پاس سوچنے کی گنجائش نہیں ہے۔ میں چاہتا تو فریدہ کو اسپتال سے بھی سیدھا اپنے گھر لے جاسکتا تھا لیکن میں نے آپ کو پہلے اطلاع دینا مناسب سمجھا۔ اب آپ مجھے اجازت دیں۔ اور ہاں، دوبارہ فریدہ کو اسی وقت لینے آیئے گا جب آپ یہاں اس کی زندگی کی حفاظت کا انتظام کرلیں۔''

یہ وہی چودھری بختیار تھا جس کو کچھ دیر قبل سمدھی کی عزت دینے کے بجائے ایک عام ملاقاتی کی طرح انتظار کی اذیت سے گزارا گیا تھا۔ اب وہ پورے اعتماد کے ساتھ چودھری سے بات کر رہا تھا اور چودھری کوئی جواب دینے کے بجائے سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چودھری بختیار اپنی بات کہنے کے بعد وہاں رکا نہیں اور ملازم کے سہارے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

''میں تجھے چھوڑوں گا نہیں چودھرائن! تو نے مجھے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اگر فریدہ مرجاتی تو آج میں مشکل میں پڑ جاتا۔'' وہ دانت کچکچاتا ہوا اپنے دل میں بولا۔ برسوں کی حکمرانی نے اس کے اندر جو غرور و تکبر بھر دیا تھا، وہ کسی صورت اسے خود کو نیچا دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا لیکن بار بار اسے اسی صورتِ حال سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ اپنی ناکامیوں اور ذلت کے اس سلسلے کو وہ شہریار سے منسوب کرتا تھا کیونکہ جب وہ اس سے ٹکرایا تھا، تب ہی سے وہ مشکلات کا شکار تھا۔ اس کے خیال میں یہ شہریار ہی تھا جس کی شہ پاکر بہت سے لوگ اس کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کرنے کی جرأت کرنے لگے تھے۔ اگر شہریار نہ ہوتا تو ماہ بانو پیر آباد کی حدود سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ وہ نہ ہوتا تو ماسٹر آفتاب اتنا مضبوط نہ ہو پاتا کہ اس کی بیٹی کو ہی حویلی سے لے اڑتا۔ یہ شہریار ہی تھا جس کی وجہ سے لوگوں میں تعلیم اور صحت کا شعور اجاگر ہونے لگا تھا اور وہ اپنی ضرورتوں اور مسائل کے لیے چودھری کے علاوہ بھی کسی اور طرف دیکھنے لگے تھے۔ پہلے وہ چودھری کو ہی سب کچھ سمجھتے تھے چنانچہ اس کا بدترین سلوک بھی سر جھکا کر سہہ لیتے تھے اب انہیں ایک اور در نظر آنے لگا تھا۔ وہ اپنے اور اپنی اولاد کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ یہ عمل بہت برق رفتار نہیں تھا لیکن چودھری آنے والے وقت کی بُو سونگھ رہا تھا اور اسے لگتا تھا کہ اگر اس نے اپنے دشمن کو کھلی چھوٹ دے دی تو آنے والے وقت میں اس کی حکمرانی کا تختہ الٹ دیا جائے گا۔ وہ اپنے تخت، اپنی حکومت کو بچانے کی کوششوں میں مصروف تھا اور جو تدبیر ذہن میں آتی تھی، اس پر عمل کر ڈالتا تھا لیکن مسائل تھے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

اب یہ چودھری بختیار ایسے ہی تو حویلی نہیں آیا تھا۔ یقیناً اس کے پاس پکی خبر تھی کہ فریدہ کے ساتھ کیا سازش کی گئی اور کمال یہ تھا کہ وہ خود اپنی حویلی میں ہونے والی اس سازش کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کی اپنی بیوی اس کے ساتھ ایسی چال چلے گی لیکن اسے چودھری بختیار کی دلیل میں جان محسوس ہوئی تھی کہ اپنے مفاد کے لیے وہ ایسا کر بھی سکتی تھی۔ اولاد کی محبت کسی سے بھی کچھ بھی کروا سکتی ہے۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جب عورتوں نے اپنی اولاد کو تخت و تاج کا مالک بنانے کے لیے سازش کے خونی جال تیار کیے تھے۔ اس کی حویلی میں کچھ نیا تو نہیں ہو رہا تھا، بس اسے خبر کچھ دیر سے ہوئی تھی اور اب اسے سازشیوں کے لیے سزا تجویز کرنی تھی۔ حقے کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ وہ اس سزا پر غور کر ہی رہا تھا کہ اس کا موبائل گنگنانے لگا۔ اس نے نمبر دیکھے بغیر بٹن دبا کر کال ریسیو کرلی۔

''یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو چودھری؟'' اپنی ''ہیلو'' کے جواب میں اسے دوسری طرف سے یہ جملہ سنائی دیا۔ بات اگرچہ اردو میں ہی کہی گئی تھی لیکن لب و لہجے نے اسے چونکا دیا اور اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دوسری طرف ڈیوڈ

www.kahopakistan.com

موجود ہے اور کافی غصے میں ہے۔

''میں کیا کر رہا ہوں جس پر تمہیں اعتراض ہے؟'' ڈیوڈ کے انداز پر ناگواری محسوس کرتے ہوئے اس نے خود بھی قدرے غصیلے لہجے میں سوال کیا۔ ڈیوڈ کی طاقت اور اس سے ملنے والی رقم اگرچہ اسے اس کے آگے جھکائے رکھتی تھی لیکن تھا تو وہ بہرحال چودھری افتخار عالم شاہ۔۔۔ جس سے کسی اور کا اپنے سامنے اونچی آواز میں بولنا برداشت نہیں ہوتا تھا۔

''میں تمہارے حالیہ کارنامے کی بات کر رہا ہوں۔ تمہیں کیا ضرورت پڑی تھی اے سی کو چھیڑنے کی؟'' ڈیوڈ بدستور غصے میں تھا۔

''یہ میرا پرسنل معاملہ ہے اور اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ تم مجھے جس کام کی پے منٹ کر رہے ہو وہ میں صحیح طریقے سے کروا رہا ہوں۔ باقی میں کیا کرتا ہوں کیا نہیں، اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔'' اس نے اکڑ کر جواب دیا۔

''کیسے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے؟ تمہارے اس کارنامے کی وجہ سے جنگل میں آپریشن کلین اپ شروع کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ میں کیسے چپ رہ سکتا ہوں؟ تمہاری حرکت کی وجہ سے ہمارا اتنا اہم پروجیکٹ خطرے میں پڑ گیا ہے اور تم کہتے ہو کہ مجھے تمہارے معاملات سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔'' ڈیوڈ دہاڑا۔ اس بار چودھری کو بھی اسے فوری طور پر کوئی جواب دینے کی جرأت نہیں ہوسکی۔ اس نے تو شہریار کو نیچا دکھانے کے لیے اس کے بنگلے پر ڈاکا ڈلوایا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا اتنا شدید ری ایکشن سامنے آئے گا۔

''اب چپ کیوں ہو؟ مجھے بتاؤ کہ تمہاری حماقت کا جو نتیجہ نکلنے والا ہے، اس سے بچاؤ کے لیے کیا تدبیر ہوسکتی ہے؟'' ڈیوڈ کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''آپ پریشان مت ہوں مسٹر ڈیوڈ۔ جنگل کے جس حصے میں ڈاکو پناہ گزین ہیں اور جہاں ہمارا پروجیکٹ جاری ہے، وہ ایک دوسرے سے بہت الگ الگ ہیں۔'' آخر اسے ڈیوڈ کی تسلی کے لیے ایک دلیل مل ہی گئی۔

''اور اس بات کی کیا گارنٹی دے سکتے ہو تم کہ پولیس جنگل کے صرف اسی حصے تک محدود رہے گی جہاں ڈاکوؤں کا ڈیرا ہے؟ وہ سرچ آپریشن کریں گے تو سرچنگ کے دوران لازمی ہے کہ جنگل کے ہر حصے کو کھنگالیں گے۔ ڈاکوؤں کا ڈیرا ان کی خالہ کا گھر تو ہے نہیں کہ وہ سیدھے وہاں جائیں گے اور سب کو کان سے پکڑ کر لے آئیں گے۔'' ڈیوڈ طنز پر طنز کر رہا تھا۔ ''کیا یہ سوچنے کی بات نہیں ہے کہ جب پولیس آپریشن کے لیے جنگل میں داخل ہوگی تو پھر اس کے قدم کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں؟ تمہیں وہ لڑکا اکو یاد نہیں ہے جو اچانک ہی ہمارے علاقے میں جا نکلا تھا۔ اگر وہ لڑکا عابد انصاری تک پہنچنے کے بجائے کسی اور طرف بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا تو ہمارا راز کھل جاتا۔ وہ ایک اکیلے لڑکے کا معاملہ تھا اس لیے آسانی سے ہینڈل کرلیا گیا لیکن اتنی بڑی فورس کا کیا کریں گے ہم؟'' وہ پریشان بھی تھا اور غضب ناک بھی اس لیے چودھری سے بلالحاظ بات کر رہا تھا۔

''پولیس فورس کے لیے ڈاکوؤں کا ڈیرا خالہ کا گھر بنایا جاسکتا ہے۔ میں اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں کہ پولیس ناک کی سیدھ میں وہاں جائے گی اور اپنا کام مکمل کرکے ناک کی سیدھ میں ہی واپس آجائے گی۔'' ڈیوڈ کی غصے بھری تقریر کے جواب میں چودھری نے اسے اطمینان دلایا۔

''اپنی بات کی وضاحت کرو۔'' ڈیوڈ نے اسے حکم دیا۔

''ہمارے ہاں پولیس کا آدھا کام مخبروں کی مدد سے ہوتا ہے۔ میں پولیس کو وہ مخبر فراہم کروں گا جو انہیں سیدھا ڈیرے پر پہنچا دے گا۔ پولیس آسانی سے ڈیرے پر پہنچ گئی تو اسے جنگل میں اِدھر اُدھر منہ مارنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔''

وہ اس قبیل کے لوگوں سے تعلق رکھتا تھا جو اپنے مطلب کے حصول کے لیے دوسرے کے گلے پر چھری پھیرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ ڈاکوؤں سے اگر اس کی دوستی تھی یا وہ اس کے کام آتے تھے تو اس کے نزدیک ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اہمیت تھی تو صرف اس بات کی کہ اس کے اپنے مفاد پر ضرب نہ پڑے۔ جنگل میں پوست کی کاشت سے اسے جتنا بڑا فائدہ حاصل ہو رہا تھا، اتنا ڈاکوؤں سے نہیں تھا۔ چنانچہ اپنے ان ہمدردوں کو آسانی سے بھینٹ چڑھایا جاسکتا تھا۔

☆☆☆

''آپ ایڈمٹ ہوجائیں۔ آپ کی کنڈیشن ایسی نہیں ہے کہ ہم آپ کو گھر جانے دیں۔'' وہ اپنی طبیعت میں خرابی محسوس کر رہی تھی اس لیے آفتاب اسے چیک اپ کے لیے اسپتال لایا تھا۔ چیک اپ کے فوراً بعد لیڈی ڈاکٹر نے یہ الفاظ ادا کیے تو وہ دونوں میاں بیوی ہی پریشان ہوگئے۔

''کیا کوئی پیچیدگی ہے ڈاکٹر صاحبہ جو آپ انہیں

میڈی کیم ڈینٹل کریم

Pakistan's No.1 Toothpaste
Silver Jubilee
MEDICAM DENTAL CREAM
25 Years
Celebrating 25 Years of Trust

MEDICAM
MEDICAM

لونگ
نمکیات
یوکلپٹس
اسپیئرمنٹ
سائلوبلینک

MEDICAM
MEDICAM

کیا آپ کے ٹوتھ پیسٹ میں فلورائیڈ کے علاوہ یہ پانچ اجزاء شامل ہیں؟

احتیاط علاج سے بہتر ہے

www.kahopakistan.com

ایڈمٹ کرنے کی بات کر رہی ہیں۔ ورنہ ہمارے حساب سے تو ابھی کافی وقت باقی ہے؟'' آفتاب نے پریشانی سے سوال کیا۔

''ظاہر ہے کوئی مسئلہ ہے جب ہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ اس لڑکی کی حالت ایسی ہے کہ اس کے ہاں نارمل ڈیلیوری ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ جانے آپ لوگ عورتوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں جو وہ مَردوں جیسی حالت کو پہنچ جاتی ہیں اور پھر اس مُردہ بدن سے آپ اپنی اولادیں بھی پیدا کرواتے ہیں۔ ذرا رحم نہیں آتا آپ لوگوں کو عورت ذات پر۔ یہ سوچنے کی زحمت نہیں کرتے کہ جس کے بطن سے نئی زندگی کو جنم لینا ہے، اس کا بھی خیال رکھا جائے۔ اپنی بیوی کی حالت دیکھی ہے آپ نے؟ ایسا لگتا ہے کہ فاقے کرتی رہی ہے یہ۔ خون تو ہے ہی نہیں اس کے جسم میں۔'' لیڈی ڈاکٹر نے اسے لتاڑ کر رکھ دیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے ڈاکٹر صاحبہ! میرے شوہر بہت خیال رکھنے والے ہیں۔'' کشور نے اپنی طرف سے آفتاب کی صفائی پیش کی۔

''تم چپ رہو بی بی! تم عورتوں کو بہت شوق ہوتا ہے نیک پروین بننے کا۔ تمہاری انہی فضول طرف داریوں کی وجہ سے تو مردوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ اتنا ہی اچھا آدمی ہے تمہارا شوہر تو اب سے پہلے چیک اپ کے لیے یہاں کیوں نہیں لایا؟ آج پہلی بار میں تمہیں یہاں دیکھ رہی ہوں۔'' ڈاکٹر صاحبہ کا تعلق شاید حقوقِ نسواں کے لیے کام کرنے والی کسی تنظیم سے تھا جو کسی بھی وضاحت و صفائی کو خاطر میں لائے بغیر بے نقط سنا رہی تھیں۔

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں ڈاکٹر صاحبہ! میں اپنے شوہر کی بے جا حمایت نہیں کر رہی ہوں۔ یہ سچ مچ بہت خیال رکھنے والے آدمی ہیں۔ میرا چیک اپ بھی پابندی سے کرواتے رہے ہیں۔ آپ کے پاس ہم پہلی بار اس لیے آئے ہیں کہ ہمیں یہاں اس شہر میں شفٹ ہوئے بہت تھوڑے دن گزرے ہیں۔'' اتنی سی بات کرنے میں کشور کی سانس پھولنے لگی تھی۔ اگر یہ آفتاب کی صفائی دینے کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ ہرگز بھی اتنا نہیں بول سکتی تھی۔

''خیر، جو بھی بات ہو مجھے اس سے کیا۔ میں تو آپ کو صرف یہ بتا رہی ہوں کہ آپ فوری طور پر ایڈمٹ ہو کر چارجز وغیرہ جمع کروا دیں۔ بچے کی دھڑکن بہت کم ہے، ہمیں آپریشن کرنا پڑے گا۔'' ڈاکٹر ان لوگوں میں سے تھی جو ہر حال میں اپنی ہی بات کو اوپر رکھتے ہیں چنانچہ اس کی دی ہوئی صفائی کو قبولیت کا درجہ دینا پسند نہیں کیا اور منہ بناتے ہوئے اپنی ہی کہی۔

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحبہ! آپ فکر نہیں کریں۔ میں ابھی چارجز وغیرہ جمع کروا دیتا ہوں۔ آپ کو جو مناسب لگتا ہے، آپ ویسا ہی کریں۔'' کشور اور لیڈی ڈاکٹر کے دوران ہونے والی بحث اس کے لیے قطعی بے مقصد تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کشور کتنی عزیز ہے۔ باقی کوئی اور اس حقیقت کو تسلیم کرتا یا نہیں، اس بات سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ کشور خود اس کی محبت سے واقف تھی اور اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اب بھی اس نے لیڈی ڈاکٹر کی کسی بھی بات کا بُرا مانے بغیر نہایت معتدل لہجے میں اس سے یہ سب کہا اور خود تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ کشور نے جتاتی ہوئی نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا تو وہ بے نیازی سے منہ موڑ گئی۔

کشور نے بھی تھک کر آنکھیں موند لیں اور اس کا ذہن اپنے آنے والے بچے کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ بچہ اس کی محبت کی نشانی تھا۔ وہ اس نشانی کو ایک تحفے کی صورت آفتاب کو دینا چاہتی تھی۔ یقیناً دنیا کی ہر عورت ماں بننے کے مرحلے سے گزرتے ہوئے اپنے بچے کی خیر و عافیت کی دعا مانگتی ہو گی اور اس کی زندگی کو اپنی زندگی پر ترجیح دیتی ہو گی لیکن اس کی خواہش کی شدت دگنی تھی۔ صرف اپنے بچے کی محبت میں نہیں بلکہ اس شخص کی محبت میں بھی بے تحاشا مبتلا تھی جو اس بچے کا باپ تھا۔ اس کا دل بڑی شدت سے خواہش کرتا تھا کہ وہ آفتاب کو اس کی محبت کے بدلے میں کوئی ایسا تحفہ دے جو انمول ہو اور اولاد سے بڑھ کر انمول نعمت اور کون سی ہو سکتی تھی؟ اپنی ہر سانس کے ساتھ وہ بچے کی سلامتی کی دعا کرتی رہی۔ آخر کار وہ وقت آ پہنچا جب اسے آپریشن تھیٹر میں لے جایا جانے لگا۔

''آپ میرے لیے اس دنیا میں موجود ہر شے سے بڑھ کر قیمتی ہیں۔ میں اس یقین کے ساتھ آپ کو اس دروازے کے پار بھیج رہا ہوں کہ جب دوبارہ یہ دروازہ کھلے گا تو آپ میرے بچے کے ساتھ اس دروازے سے باہر آئیں گی۔''

آپریشن تھیٹر کے دروازے پر آفتاب نے اسٹریچر کے قریب کھڑے ہو کر اس کا ہاتھ تھام کر یہ الفاظ کہے تو اس کے سارے وجود میں توانائی کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور آنکھوں میں دیے سے جلنے لگے۔ جواب میں زبان سے کچھ کہے بغیر اس نے اپنے ہونٹوں پر ایک پیاری سی مسکراہٹ سجالی۔ اس مسکراہٹ کی روشنی کے ہالے میں اس کا اسٹریچر پر موجود وجود آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ اس کے نظروں سے غائب ہوتے ہی آفتاب ایک دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور سراپا دعا بن گیا۔ انتظار کا یہ وقت منٹوں پر محیط تھا یا گھنٹوں پر، وہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ خود اس پر تو ایک ایک لمحہ صدی بن کر گزر رہا تھا۔

''مبارک ہو مسٹر! اللہ نے آپ کو بڑی پیاری سی بیٹی دی ہے۔'' آپریشن تھیٹر سے برآمد ہونے والی نرس نے جب یہ خوش خبری سنائی تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ بہنے والے یہ آنسو خود گواہی دے رہے تھے کہ ہم خوشی اور شکر گزاری کا نتیجہ ہیں چنانچہ نرس کو ایسا کوئی شک نہیں گزرا کہ تنگ نظر مردوں کی طرح وہ بھی بیٹی کی پیدائش پر مایوسی اور اداسی میں مبتلا ہے۔

''پھر آپ اسٹاف کے لیے مٹھائی پہنچا رہے ہیں ناسر؟'' اس کی کیفیت کو پوری طرح محسوس کرتی نرس نے اس سے فرمائش کی۔

''کیوں نہیں؟ آپ کی مٹھائی ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گی۔ آپ پہلے مجھے یہ بتائیں کہ میری مسز کا کیا حال ہے اور میں اپنی بچی کو کب دیکھ سکوں گا؟'' اس نے مسکرا کر ہامی بھرتے ہوئے ایک ساتھ دو سوال کیے۔

''آپ کی مسز بالکل ٹھیک ہیں۔ تھوڑی دیر میں انہیں ہوش آ جائے گا تو ہم انہیں روم میں شفٹ کر دیں گے..... بے بی کو ابھی نرسری میں رکھا جائے گا۔ بچی کمزور ہے اس لیے کچھ دن اسے وہیں رکھنا ہو گا۔ جیسے ہی بچی وہاں شفٹ ہوتی ہے، میں آپ کو بتا دوں گی۔'' نرس نے بااخلاق لہجے میں اسے جواب دیا اور وہاں سے ہٹ گئی۔

نرس کی باتوں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ابھی اسے اپنی بیٹی اور کشور کو دیکھنے میں کچھ وقت لگے گا چنانچہ خود بھی باہر نکل گیا اور مسجد کا رخ کیا۔ اسپتال کے ساتھ بنی مسجد میں شکرانے کے نفل ادا کرنے کے بعد وہ مٹھائی کی دکان پر گیا اور ڈھیروں مٹھائی کے ساتھ اسپتال واپس لوٹا۔ پہلی بار باپ بننے کے تجربے نے اس کے دل میں مسرت کی کلیاں کھلا دی تھیں اور بس نہیں چل رہا تھا کہ ساری دنیا کو اپنی اس خوشی میں شریک کر لے۔ لیکن افسوس کا مقام یہ تھا کہ وہ اور کشور دونوں ہی عام لوگوں کی طرح اپنے کسی پیارے سے اس خوشی کو نہیں بانٹ سکتے تھے۔ وہ خود رشتوں کے معاملے میں قلاش تھا اور کشور کا اپنا خاندان جانی دشمن بنا ہوا تھا لیکن آج وہ ان سب باتوں کو بھلا کر اپنی خوشی کو منانا چاہتا تھا۔ چنانچہ خوشی خوشی اسپتال پہنچا اور مٹھائی عملے کے افراد کے حوالے کر کے خود نرسری کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر قبل اسے بیٹی کی اطلاع دینے والی نرس نے اس کے واپس اسپتال لوٹتے ہی اسے یہ اطلاع بھی دے دی تھی کہ بچی کو نرسری میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ وہ نرسری پہنچا تو وہاں موجود ایک نرس نے اس کی اس کاٹ تک راہنمائی کی جس میں اس کی بیٹی لیٹی ہوئی تھی۔ وہ کاٹ کے قریب جا کر کھڑا ہوا اور بچی کا جائزہ لینے لگا۔ بہت نازک سی گندمی رنگت والی وہ بچی گلابی تولیے میں لپٹی آنکھیں موندے سو رہی تھی۔ بچی نے اپنی ماں کے نین نقش چرائے تھے اس لیے وہ اسے کچھ اور بھی پیاری لگی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بے حد احتیاط سے اسے کاٹ سے باہر نکالا اور کچھ دیر دیکھتے رہنے کے بعد اس کے ماتھے پر نرمی سے بوسہ دیا۔ باپ کا پیار بھرا لمس پا کر بچی سوتے میں مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ نے آفتاب کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھیر دی اور وہ مسکراتے ہوئے اس کے کان میں اذان دینے لگا۔ اس فریضے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے بچی کو ایک بار اور پیار کیا اور پھر اسے کاٹ میں لٹا کر نرسری سے باہر نکل گیا۔ اب اسے کشور کو دیکھنا تھا۔ جب وہ بچی کو دیکھنے آ رہا تھا تو اسے اطلاع دی گئی تھی کہ کشور کو ہوش آ چکا ہے اور کچھ دیر بعد اسے روم میں منتقل کیا جا رہا ہے۔

اس کے اندازے کے مطابق اب تک یہ کام ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ پرائیویٹ روم میں پہنچا تو اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ سامنے ہی کشور بیڈ پر سیدھی لیٹی ہوئی تھی اور اس کے دائیں ہاتھ میں پیوست سوئی سے گلوکوز کی شکل میں

لطیفہ

ملٹری کے ایک سپاہی کو شراب پینے کے جرم میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا مگر وہ ایک اچھا سپاہی تھا اس لیے کیپٹن نے مناسب سمجھا کہ پیار کے ساتھ اسے سمجھائے۔

''دیکھو ڈیوڈ! ایک دن تم سارجنٹ بن سکتے ہو بلکہ ترقی کر کے لیفٹیننٹ تک بن سکتے ہو، بشرطیکہ تم شراب پینے سے باز آ جاؤ۔''

''سچ کہتے ہو کیپٹن۔'' سپاہی نے کہا۔ ''لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ میں حلق سے نیچے چند قطرے اترتے ہی کیپٹن بن جاتا ہوں۔''

ارجمند خان، کاکول

www.kahopakistan.com

قطرہ قطرہ توانائی جسم میں داخل ہورہی تھی۔ نرس جو گلوکوز کی بوتل میں کوئی دوا انجیکٹ کررہی تھی، اسے دیکھ کر مسکرائی اور اپنا کام مکمل کرکے باہر نکل گئی۔ اس کے نکلتے ہی وہ کشور کی طرف بڑھا۔

''مبارک ہو، ہم بڑی ہی پیاری بیٹی کے اماں ابّا بن گئے ہیں۔'' اس نے ایک ہاتھ سے کشور کا بایاں ہاتھ تھاما اور دوسرے ہاتھ سے اس کے ماتھے پر آئے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے محبت سے بولا۔

''آپ کو بھی مبارک ہو۔'' کشور کے ہونٹوں پر مسرت بھری شرمیلی مسکراہٹ تھی۔ ''آپ نے بیٹی کو دیکھ لیا... کیسی لگی آپ کو؟'' شدید نقاہت کے باوجود وہ بڑی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پُراشتیاق لہجے میں اس سے پوچھنے لگی۔

''بہت پیاری، بالکل آپ جیسی ہے۔'' اس نے برجستگی سے جواب دیا تو وہ مزید شرما گئی۔ خوشی کے یہ پل ایسے تھے جس میں وہ ہر دکھ اور پریشانی کو بھول گئے تھے۔ آج انہوں نے وہ انمول موتی پایا تھا جس سے قیمتی شے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

''اس کا نام کیا سوچا ہے آپ نے؟'' کشور نے ایک اور سوال کیا۔

''امید ---- ہماری بیٹی کا نام امید ہوگا اور ہم اس امید کے ساتھ اس کی پرورش کریں گے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب ہم اپنی بیٹی کے ساتھ بلاخوف وخطر خوشیوں بھری زندگی گزاریں گے۔'' اس نے بنا کسی توقف کے جواب دیا پھر کوئی خیال آنے پر چونک کر پوچھنے لگا۔

''آپ کو اس نام پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ اگر آپ کو اس کے سوا کوئی اور نام پسند ہو تو رکھ سکتی ہیں۔ میں بغیر مُرادمانے آپ کے حق میں دست بردار ہوجاؤں گا۔''

''نہیں، مجھے آپ کے رکھے نام پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ماشاءاللہ سے بہت پیارا نام ہے۔'' کشور نے اس کی پسند سے اتفاق کیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

''بچی کو فیڈ کروانا ہے۔'' آفتاب کی ''کم اِن'' کے جواب میں ایک نرس دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور اپنے آنے کی وجہ بتائی۔

''بالکل کروائیں۔ میں باہر جانے ہی والا ہوں۔'' نرس کی گود میں موجود بچی پر محبت بھری نظر ڈالتے ہوئے اس نے جواب دیا تو وہ کشور کے بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔ آفتاب ماں بیٹی کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوست وملگن چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ اسپتال سے باہر اس کا رخ ایک کوریئر سروس کے آفس کی طرف تھا کہ خوشی کی خبر دوستوں کے ساتھ ساتھ دشمن تک نہ پہنچے تو خوشی ادھوری لگتی ہے۔

☆☆☆

اپنے حصے کا کام نمٹانے کے بعد اس نے پھلواری کا رخ کیا تو جسم کا جوڑ جوڑ دکھتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ وہ تھکن کے اس احساس کو مٹانے کے لیے ہی پھلواری کی طرف جارہی تھی۔ اس پورے ماحول میں وہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں جاکر اپنی قید اور بے بسی کا احساس ماند پڑتا محسوس ہوتا تھا۔ رنگ برنگے پھولوں کا نظارہ اور خوشبو کچھ دیر کے لیے ہی سہی، جسم وجان میں تازگی کی لہر دوڑا دیتا تھا۔ اپنی ہی دھن میں چلتی وہ پھلواری کی طرف جانے والے راستے پر چل رہی تھی کہ اچانک ہی جمرو اس کے راستے میں حائل ہوگیا۔ قوی الجثہ جمرو کو اچانک ہی اپنی راہ میں کھڑے ہوکر مونچھوں کو تاؤ دیتا دیکھ کر وہ ٹھٹک سی گئی۔ جمرو اس کے لیے دورخی دشمن تھا۔ اوّل اس کی ہوس پرست فطرت اس کے حسن کی طرف لپکتی تھی تو دوم وہ اسلم کی من پسند ہونے کے ناتے جمرو کی دشمنی کی حق دار ٹھہری تھی۔ اب بھی اس نے اس کی راہ روکی تو وہ اندر سے ہل کر رہ گئی کہ جانے یہ شیطان فطرت شخص اپنا کیا رنگ دکھاتا ہے لیکن اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کی اور کچھ دیر اسے کینہ توز نظروں سے گھورتے رہنے کے بعد ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ راستے سے ہٹا تو ماہ بانو نے اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ اس کا رخ اب بھی پھلواری کی طرف ہی تھا اور ایسا اس لیے تھا کہ اس نے کچھ دیر قبل اسلم کو بھی اسی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اگر اسے وہاں اسلم کی موجودگی کا یقین نہیں ہوتا تو موجودہ صورتِ حال میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اس طرف قدم بڑھا سکتی۔

''جتنی ملاقاتیں کرسکتی ہے اپنے یار سے کرڈال۔ ہو سکتا ہے چند دن بعد تو اس کی شکل ہی نہ دیکھ سکے۔'' وہ چند قدم ہی آگے چلی تھی کہ اسے اپنی پشت سے جمرو کی آواز سنائی دی۔ وہ ایسے لہجے میں بول رہا تھا جیسے کوئی سانپ پھنکار رہا ہو۔ اسے اپنے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی اور پلٹ کر دیکھے بغیر تیزی سے پھلواری کی طرف بڑھ گئی۔ پیر میں بندھی زنجیر نے اسے مجبور نہ کیا ہوتا تو وہ دوڑتی ہوئی وہاں سے جاتی۔ جمرو کے لہجے نے اس پر ایسی ہی دہشت طاری کی تھی جیسے کسی سانپ کو دیکھ کر محسوس ہوتی ہے۔

''کیا بات ہے کچھ گھبرائی ہوئی سی لگ رہی ہو؟''

پھلواری میں اسلم موجود تھا اور ایک پودے کی چھٹائی کررہا تھا۔ وہ وہاں پہنچی تو اس کی طرف متوجہ ہوا اور ایک نظر میں ہی بھانپ گیا کہ کوئی مسئلہ ہے۔

''ہاں بس ..... اصل میں یہاں آرہی تھی تو جمرو اچانک میرا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا تھا۔'' اس نے الجھے ہوئے انداز میں بتایا۔

''اس نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی؟'' اسلم کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ اپنا کام چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''بدتمیزی تو ایسی کوئی خاص نہیں کی۔ بس راستہ روک کر پہلے گھورتا رہا، بعد میں تمہاری جان لینے کی دھمکی دینے لگا۔'' اس نے بتایا۔

''کھسیانی بلی کھمبا نوچنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہے۔ ابھی میرے ہاتھوں کن کٹا ہوا ہے کل کو اپنی انہی حرکتوں کی وجہ سے سرکٹا بن جائے گا۔'' مطمئن سے لہجے میں کہتا ہوا وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ اس کے انداز میں ایسی بے نیازی تھی کہ جیسے جمرو کی دھمکی کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔ ماہ بانو البتہ اس کی بات سن کر چونک پڑی۔ جمرو کا زخمی کان اس نے بھی دیکھا تھا اور اسے یہ بھی علم تھا کہ یہ زخم گولی کا ہے لیکن وہ یہی سمجھی تھی کہ وہ لوگ جس واردات کے لیے گئے تھے، یہ اس کی ہی نشانی ہے۔ یہ تو اب اسلم کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ یہ اس کا کارنامہ تھا۔

''تم نے جمرو پر گولی کیوں چلائی تھی؟'' اس نے دریافت کیا۔

''حکم کی تعمیل نہ کرنے والوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ مجھے سردار نے اختیار دیا تھا کہ اگر کوئی سرکشی کرے تو میں اس کے ساتھ جو چاہے سلوک کرسکتا ہوں۔ یہ تو تم میری مہربانی سمجھو کہ میں نے جمرو کا صرف کان اڑایا۔ میں چاہتا تو اس کے سینے میں گولی بھی مار سکتا تھا۔'' وہ اپنے کام میں مصروف اسی اطمینان کے ساتھ جواب دے رہا تھا۔

''کہیں ایسا تم نے جان بوجھ کر دشمنی نکالنے کے لیے تو نہیں کیا؟'' ماہ بانو نے اپنے شک کا اظہار کیا۔

''میں نہ تو اتنا گھٹیا ہوں اور نہ ہی اتنا کمزور کہ اپنے دشمن پر چھپ کر یا دھوکے سے وار کروں۔ مجھے ذاتی دشمنی کی بنیاد پر جمرو کو نقصان پہنچانا ہوتا تو علی الاعلان ایسا کروں گا۔'' اس نے کچھ مُرادمان کر جواب دیا۔

''تو آخر ایسا کیا ہوا تھا کہ تمہیں اس پر گولی چلانی پڑی؟'' وہ بھی بال کی کھال اتارنے پر تلی ہوئی تھی۔

''ہونا کیا ہے؟ حسبِ معمول جمرو کی نیت عورت پر خراب ہوگئی تھی۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا نا کہ میرے ساتھی عورت کے معاملے میں بڑے حریص ہیں اور اگر کسی ڈاکے کے دوران انہیں کوئی جوان عورت بھی مل جائے تو اسے کسی صورت نہیں چھوڑتے۔ لیکن اس بار سردار نے سختی سے تاکید کی تھی کہ صرف مال واسباب سمیٹنا ہے اور تھوڑی توڑ پھوڑ مچانی ہے لیکن کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھنا، پر جمرو کو یہ بات کہاں سمجھ آتی ہے۔ جوان اور خوب صورت عورت دیکھ کر تو وہ سب بھول جاتا ہے۔ وہاں بھی اس کی نیت خراب ہوگئی اور میرے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود وہ اپنی ہوس پوری کرنے پر اڑا رہا۔ آخرکار مجھے اس کا ایک کان اڑا کر اسے قابو میں کرنا پڑا۔'' ایک طرف بیٹھ کر اپنے ہاتھ جھاڑتے ہوئے اس نے ماہ بانو کو ساری تفصیل بتائی۔

''جب تمہارے لوگوں کا معمول ہے کہ وہ زر کے ساتھ زن کو بھی نہیں چھوڑتے تو اس بار سردار نے پابندی کیوں لگائی؟'' وہ خود بھی اس کے برابر میں آبیٹھی اور سوال کیا۔

''یہ سب تو سردار خود ہی جانتا ہوگا۔ ہم میں سے کسی نے سوال نہیں کیا البتہ میرا اندازہ ہے کہ طاقتور پارٹی دیکھ کر سردار نے یہ فیصلہ کیا ہوگا۔ مالی نقصان تو عام طور پر لوگ خاموشی سے برداشت کرلیتے ہیں لیکن عزت پر ہاتھ ڈالا جائے تو انتقامی کارروائی شروع ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ کسی اسسٹنٹ کمشنر کو چھیڑنا جبکہ اس کا تعلق بھی بہت اونچے خاندان سے ہو، کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ سردار نے اے سی کے بنگلے پر ڈاکا ڈالنے کا سوچا ہی کیسے؟ اگر ہمارے ہاں سوال کرنے کی اجازت ہوتی تو میں اس سے یہ بات ضرور پوچھتا۔ ویسے میرا خود کا خیال ہے کہ سردار نے یہ کام کسی اور کے کہنے پر کیا ہوگا۔ کسی دوسری بڑی پارٹی نے سردار کو اس واردات کے لیے ہائر کیا ہوگا۔'' وہ قیاس آرائیاں کررہا تھا جبکہ ماہ بانو کے کان اسسٹنٹ کمشنر کا ذکر سن کر کھڑے ہوگئے تھے۔

''کس اسسٹنٹ کمشنر کی بات کررہے ہو تم؟ نام کیا ہے ان کا؟'' اس نے بے تابی سے سوال کیا۔

''اسی ضلع کے اے سی ہیں۔ شہریار عادل نام ہے ان کا۔'' اسلم نے بتایا۔

''اے سی شہریار عادل .....'' ماہ بانو نے زیرلب وہ نام دہرایا جسے سن کر ہی اس کی دھڑکنوں میں ارتعاش سا پیدا ہوگیا تھا اور پھر ذرا سخت لہجے میں پوچھنے لگی۔ ''تم نے انہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟''

www.kahopakistan.com

"مالی نقصان کے علاوہ تو کوئی دوسرا نقصان نہیں پہنچایا اور میرے خیال میں اس سے اے سی صاحب کو تو کوئی فرق نہیں پڑا ہوگا۔ سنا ہے بڑا مال ہے ان کے پاس۔" ماہ بانو کی دلی کیفیت سے بے خبر وہ مزے سے بولتا جارہا تھا۔

"شہریار صاحب کے بنگلے پر جمرو کی نیت کس عورت پر خراب ہوئی تھی؟" وہ جانتی تھی کہ شہریار خاندان کے بغیر تنہا وہاں رہ رہا ہے اس لیے کھوجنے والے انداز میں پوچھا۔

"ان کی بیگم پر۔ بڑی اچھی شکل وصورت کی عورت ہے۔ شاید تم نے خود بھی اسے دیکھا ہو۔ پیرآباد کے مرکز صحت میں کام کرتی ہے۔ ڈاکٹر ماریا نام ہے اس کا۔" اسلم نے گویا اس کی سماعتوں میں کوئی دھماکا کردیا۔

"لیکن اے سی صاحب تو غیر شادی شدہ ہیں۔" اس نے کسی مبہم سی امید کے سہارے یہ جملہ کہا۔

"غیر شادی شدہ تھے، اب نہیں رہے۔ کچھ عرصہ قبل ہی ان کی شادی ہوئی ہے۔ بری میں بہت بھاری زیور چڑھایا تھا انہوں نے اپنی بیگم کو۔ سب کا سب ہم لوگ وہاں سے اٹھا لائے ہیں۔ موقع ملنے پر کبھی بیچنے نکلیں گے تو اس کی صحیح قیمت معلوم ہوسکے گی۔" وہ اسے تفصیل بتارہا تھا لیکن اس کے حواس تو گویا اس خبر کو سن کر ساتھ ہی چھوڑتے جارہے تھے۔ شہریار کو ہمیشہ ناقابل حصول سمجھنے کے باوجود ہر محبت کرنے والے کی طرح اس کے دل میں آس کا دیا جلتا تھا کہ شاید وہ اسے پالے۔ اسلم سے ملنے والی اطلاع نے اس دیے کو بجھا دیا تھا اور نتیجے میں اس کے دل میں دھواں سا بھر گیا تھا۔ یہ دھواں اس کا دم گھونٹ رہا تھا۔ وہ سانس لینے میں مشکل محسوس کررہی تھی۔

"تمہاری باتوں سے مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم اے سی صاحب کو کافی اچھی طرح جانتی ہو۔" اس کی حالت سے بے خبر اسلم نے قیاس آرائی کی لیکن وہ اسے کوئی جواب دینے کے قابل رہی ہی کب تھی۔ رکتی ہوئی سانسوں نے اسے اس حال تک پہنچا دیا تھا کہ وہ مزید بیٹھی نہ رہ سکی اور دھڑام سے گر پڑی۔ اسے اس طرح بے ہوش ہوتے دیکھ کر اسلم بھونچکا رہ گیا اور پھر اسے آوازیں دیتے ہوئے ہلانے جلانے لگا لیکن وہ تو ٹس سے مس نہیں ہورہی تھی۔ پریشان سا اسلم اپنی کوشش میں ناکام ہوکر تیزی سے اس درخت کی طرف بڑھا جس کی شاخوں پر اس نے اپنا مچان نما ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ رسی کی سیڑھی سے مچان پر پہنچنے کے بعد اس نے وہاں رکھی صراحی اٹھائی اور واپس سیڑھیاں اتر کر ماہ بانو کی طرف بھاگا۔ صراحی الٹی کرکے اس نے اس میں موجود سارا پانی ماہ بانو پر انڈیل دیا۔ اتنا ڈھیر سارا پانی چہرے اور جسم پر گرنے سے وہ ہڑبڑا کر بے ہوشی سے ہوش میں آئی لیکن اس کی آنکھیں اب بھی بالکل ویران تھیں اور یوں لگتا تھا کہ وہ آنکھیں کھول لینے کے باوجود ہوش وحواس کی دنیا میں واپس نہ لوٹی ہو۔

"آر یو او کے ماہ بانو! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ اچانک تمہیں کیا ہوگیا تھا؟" اس کے رخسار نرمی سے تھپکتے ہوئے اسلم نے دریافت کیا۔

"میں اپنی جھونپڑی میں واپس جاؤں گی۔" اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ کسمساتی ہوئی اٹھ کر بیٹھی اور فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ اسلم نے بھی اسے اس وقت چھیڑنا اور کچھ دریافت کرنا مناسب نہیں سمجھا اور سہارا دے کر پھلواری سے باہر لے آیا۔ اسے ماہ بانو کو اس طرح سہارا دے کر جھونپڑی تک لے جاتے دیکھ کر بہت سی آنکھوں میں سوال جاگے لیکن ان دونوں ہی کے پاس کسی کی نظروں میں موجود سوالوں کو پڑھنے کی فرصت نہیں تھی۔ ایک اپنے سب سے بڑے نقصان کے لیے دل میں ماتم کناں تھا تو دوسرے کو فکر تھی کہ وہ جس لڑکی کو سہارا دے کر لے جارہا ہے، اسے کچھ ہو نہ جائے۔ ماہ بانو کی اچانک بے ہوشی نے اسے بے حد تشویش میں مبتلا کردیا تھا لیکن وہ یہ بھی محسوس کررہا تھا کہ اس وقت اس سے کوئی سوال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مناسب یہی تھا کہ وہ کچھ دیر آرام کرے۔

"تم آرام کرو۔ میں دو گھنٹے بعد آکر تمہاری خیریت معلوم کروں گا۔" جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ کر اس نے مکمل سکوت میں موجود ماہ بانو سے کہا اور خود نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے پلٹنے لگا۔

"ایک منٹ رکو اسلم۔" ماہ بانو کی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

"ہاں بولو، کوئی کام ہے کیا؟" وہ اس کی طرف واپس پلٹا۔

"تم سے ایک بات پوچھنی تھی۔" وہ اس پر نظر جما کر سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

"پوچھو۔" وہ ذرا حیرت زدہ سا ہمہ تن گوش ہوا۔ اگلے ہی لمحے ماہ بانو نے اس سے جو سوال کیا، اس نے اس کی حیرت کو دوچند کردیا اور وہ بھونچکا سا کھڑا سوچنے لگا کیا میری قوت سماعت ٹھیک طرح سے کام کررہی ہے؟

یہ پُرپیچ وسنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

www.kahopakistan.com

ان پُراسرار عورتوں کی گمشدگی کا قصہ جو کسی نہ کسی شخص کی بیویاں تھیں... کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کب اور کیسے غائب ہوئیں... متواتر رونما ہونے والے پُراسرار واقعات نے ان کی واپسی کو مخدوش بنادیا تھا...

سرزمین افریقہ سے درآمد سنسنی خیز سوغات ـــ ایک وچ ڈاکٹر کی ناقابل یقین کرامات

گمشدہ بیویاں

مریم کے خان

تنزانیہ میں مغربی شہر تابورا سے کوئی سو میل دور جنوب مغرب میں ایم پانانڈا کے علاقے میں جھیل سے کچھ ہی فاصلے پر انگریز کمشنر سرجان جیفری کی رہائش گاہ پر اس وقت پانچ افراد جمع تھے۔

ان پانچ افراد میں ایک سرجان جیفری خود بھی تھا، وہ تقریباً ساٹھ برس کا صحت مند شخص تھا۔ دوسرا ادھیڑ عمر چیف انسپکٹر کارلائل لینکر تھا، وہ چالیس برس کا تھا۔ تیسرا فرد چارلس فرانز لندن کا رہائشی تھا اور ایک مہینے پہلے یہاں آیا تھا۔ وہ جوان تھا اور اس کی عمر بتیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ چوتھا فرد سیاہ فام تھا، اس نے صرف ایک جانگیا پہن رکھا تھا۔ اس کے بال سخت مینڈیوں کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔ اس کے کان کم سے کم ایک درجن جگہوں سے چھدے ہوئے تھے جن میں اس نے تقریباً ہر دھات کے چھوٹے بڑے بالے پہن رکھے تھے۔ ایک چھوٹی سی چاندی کی سلاخ اس کی ناک کے آر پار جارہی تھی۔ اس کا نچلا ہونٹ گدا ہوا تھا اور گلے میں بے شمار موتیوں اور رنگوں والے ہاروں کے ساتھ ایک چھوٹا سا

سبز رنگ کا سانپ بھی موجود تھا۔ یہ حلیہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ وہ ایک وچ ڈاکٹر تھا۔ اس کا نام تو کافی طویل تھا لیکن سب لوگ اسے نکیبا کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کا جسم استخوانی تھا اور عمر چالیس سے پچاس برس تک کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ پانچواں شخص بھی ایک نوجوان افریقی تھا لیکن وہ صاف ستھرا اور مہذب حلیے میں تھا۔ ایم پول نامی یہ افریقی اصل میں ترجمان تھا۔

سر جان جیفری کی کوٹھی کی جس نشست گاہ میں وہ سب موجود تھے، وہ پُرتعیش اور وکٹورین اسٹائل کے فرنیچر سے سجی ہوئی تھی۔ وہ سب صوفوں پر بیٹھے تھے سوائے نکیبا کے۔ اس نے صوفے پر بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کبھی زمین کے علاوہ کسی نرم... چیز پر نہیں بیٹھا۔ بہرحال، کسی نے اسے مجبور نہیں کیا۔ وہ فرش پر بیٹھا رہا۔ اسے بالکل پروا نہیں تھی کہ چارلس فرانز اسے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ فرانز اصل میں جرمن نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ جرمن تھا اور ماں برطانوی۔ طلاق کے بعد وہ چارلس کو اپنے ساتھ لے آئی اور وہ ماں کے پاس پرورش پا کر جوان ہوا۔ اب وہ صرف نام کا جرمن تھا ورنہ سر سے پاؤں تک انگریز ہی لگتا تھا۔ سر جان جیفری نے اپنا پائپ سلگایا اور کہا۔

''میرا خیال ہے کارروائی شروع کی جائے۔''

''یس سر۔'' انسپکٹر کارلائل مستعدی سے بولا۔ ''لیکن تمام فریقوں پر واضح کیا جاتا ہے کہ اس کارروائی کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی اور یہ میٹنگ دونوں معزز فریقوں کو عزت کے ساتھ اپنا معاملہ نمٹا لینے کا ایک موقع دینے کے لیے کی جا رہی ہے۔ مسٹر چارلس! کیا تم میری بات سے متفق ہو؟''

''میں متفق ہوں۔'' وہ بولا۔

''مسٹر نکیبا! کیا تم میری بات سے متفق ہو؟'' کارلائل نے وچ ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ایم پول نے ترجمہ کیا اور نکیبا نے بھی رضامندی ظاہر کر دی۔ کارلائل نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے سر... آپ کارروائی شروع کر سکتے ہیں۔''

سر جان نے پہلے چارلس فرانز کی طرف دیکھا۔ ''مسٹر چارلس! تم اپنی بات کہہ سکتے ہو۔''

چارلس فرانز سنبھل کر بیٹھ گیا اور اس نے کہنا شروع کیا۔ ''سر! میں اور میری بیوی لیز لی فرانز سولہ اپریل کے دن لندن سے روانہ ہوئے۔ ہمارا مقصد تنزانیہ کی سیر کرنا تھا۔ ہم دو مئی کو تابورا پہنچے جہاں ہم سر ابراہام جیک کے مہمان بنے۔ سر ابراہام جیک میری والدہ کے دور کے چچا لگتے ہیں۔''

ایم پول دھیمی آواز میں چارلس فرانز کی بات کو ترجمہ کر کے نکیبا تک پہنچا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''ہم دو ہفتے سر ابراہام جیک کے پاس رکے اور پھر ہم نے اندرون ملک سیر کا پروگرام بنایا۔ ابراہام نے تجویز پیش کی کہ ہمیں رافٹ ویلی کی سیر ضرور کرنی چاہیے، یہ جگہ افریقا کے چند حسین ترین علاقوں میں شامل ہے۔ اس لیے میں اور لیز لی یہاں کے لیے روانہ ہوئے۔ سر ابراہام کا کہنا ہے کہ مئی جون ان علاقوں کی سیر کے لیے بہترین مہینے ہیں۔ ہم بیس مئی کو یہاں پہنچے اور ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ اس جگہ کی سیر کے لیے ہم نے ایک مقامی ٹور آپریٹر سے رابطہ کیا۔ جان کیرم اس علاقے کا سب سے اچھا ٹور آپریٹر ہے اور اس نے ہمارے لیے دس دن کا ایک بہترین ٹور ترتیب دیا۔

بائیس مئی کو ہم ٹور پر نکلے۔ ہمارے ساتھ ایک گھوڑا گاڑی بھی جس پر میں اور لیز لی بیٹھے تھے۔ ایک گائیڈ اور دو خدمت گار بھی ہمارے ساتھ تھے۔ بگھی کو گائیڈ ہی چلاتا اور وہی ہمیں علاقے کے بارے میں بتاتا۔ دونوں خدمت گار پیدل چل رہے تھے۔ ایک دن کے سفر کے بعد ہم رافٹ ویلی میں اس مقام پر پہنچ گئے جہاں اس شخص کا قبیلہ آباد ہے۔'' چارلس نے نکیبا کی طرف اشارہ کیا۔ ''لیز لی کو یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ اس نے دو دن کے لیے یہاں رکنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے ایک بلند ٹیلے پر خیمہ لگایا۔ ملازموں نے اس کے چاروں طرف بانسوں کی مدد سے حفاظتی احاطہ بنا دیا تاکہ کوئی درندہ اندر نہ آ سکے۔ ہم دو دن سے سفر میں تھے اس لیے ہم نے غسل کر کے کپڑے بدلے اور شام کے وقت احاطے میں بیٹھے موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ یہ شخص آن پہنچا۔'' چارلس فرانز نے ایک بار پھر نکیبا کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا نکیبا احاطے کے اندر آیا تھا؟'' انسپکٹر کارلائل نے سوال کیا۔

''نہیں، یہ باہر ہی تھا اور اس نے آتے ہی ایک بھیانک آواز والا سینگ بجانا شروع کر دیا۔ لیز لی تو ڈر گئی اور اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ گرتے گرتے بچا۔ پہلے میں نے خود جانے کا سوچا لیکن پھر اسے مناسب نہ سمجھتے ہوئے اپنے گائیڈ نگیلا کو بھیج دیا۔ اسے یہاں کی تمام مقامی زبانیں آتی ہیں۔ نگیلا گیا تو سینگ کی آواز رک گئی اور کچھ دیر بعد نگیلا نے آ کر بتایا کہ ایک مقامی وچ ڈاکٹر مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔''

''مسٹر چارلس! تم سے ملنے جو وچ ڈاکٹر آیا، کیا وہ یہی تھا؟'' انسپکٹر کارلائل نے نکیبا کی طرف اشارہ کیا۔

''بالکل یہی شخص تھا۔'' چارلس نے پورے یقین سے کہا۔ ''یہ خود بھی تھا اور اس کے ساتھ کوئی درجن بھر بندریاں

بھی تھیں۔ وہ سب اس کے پیچھے خاموشی سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے گائیڈ کے توسط سے پوچھا کہ یہ کون ہے اور یہاں کیوں شور کر رہا ہے۔ اس پر یہ گرجنے والے انداز میں بولنے لگا۔ اس کی باتیں نگیلا کی سمجھ میں بھی مشکل سے آ رہی تھیں۔ نگیلا نے مجھ سے کہا کہ یہ کہہ رہا ہے، مجھ پر آفت آنے والی ہے اور اگر میں نے اسے نذرانہ نہ دیا تو بعد میں میرے پاس پچھتانے کے سوا کچھ نہیں رہے گا۔''

انسپکٹر کارلائل نے پھر مداخلت کی۔ ''اس پر تمہارا ردِعمل کیا تھا؟''

''وہی جو ہونا چاہیے تھا، یہ سن کر مجھے غصہ آ گیا اور میں اندر جا کر اپنی رائفل لے آیا اور میں نے اس شخص کو خبردار کیا کہ وہ ایک منٹ کے اندر یہاں سے نہیں گیا اور اس نے مجھے پھر کوئی دھمکی دی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔ نگیلا نے یہ وارننگ اس تک پہنچا دی۔''

''نکیبا نے کیا کہا؟''

''اس سے پہلے کہ یہ کچھ کہتا، پیچھے سے لیز لی بھی آ گئی اور اس نے لیز لی کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ اس کے دیکھنے کے انداز سے وہ سہم گئی اور میرے پیچھے ہو گئی۔ میں نے اپنی وارننگ دُہرائی۔''

''اس پر نکیبا نے کیا کہا؟''

کارلائل کے اس سوال پر چارلس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''اس نے بہت واہیات اور اخلاق سے گری ہوئی بات کی تھی۔ میں اسے اپنی زبان سے دُہرانا نہیں چاہتا۔''

''مسٹر چارلس! ہم ایک تفتیش کے لیے جمع ہوئے ہیں۔'' انسپکٹر کارلائل نے اسے یاد دلایا۔

''یہ بہت دیر تک لیز لی کو ہوس ناک نظروں سے گھورتا رہا اور پھر اس نے... اس نے مجھ سے کہا کہ مجھ پر بہت بڑی آفت آنے والی ہے اور ممکن ہے میں اپنی کسی قیمتی چیز سے محروم ہو جاؤں۔ لیکن یہ مجھے بچا سکتا ہے اگر...'' چارلس بولتے بولتے رکا۔

''اگر...'' سر جان نے اس کی طرف دیکھا۔

''اگر میں لیز لی کو ایک دن کے لیے اس کے پاس بھیج دوں تو آنے والی مصیبت ٹل سکتی ہے۔ یہ سن کر میں پاگل ہو گیا اور اگر لیز لی مجھ سے لپٹ نہ جاتی تو میں اسے قتل کر چکا ہوتا۔ میں نے ایک فائر بھی کیا لیکن وہ ہوائی فائر تھا تاکہ یہ ڈر کر وہاں سے چلا جائے لیکن یہ ڈھیٹ شخص اپنی جگہ جما رہا اور جب لیز لی نے مجھ سے رائفل چھین لی تو اس نے کہا کہ اس کی یہ پیش کش چوبیس گھنٹے کے لیے ہے۔ اگر میں نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا تو وہ بھی مجھے آنے والے نقصان سے نہیں بچا سکے گا۔ یہ کہہ کر یہ شخص پورے اطمینان سے ٹیلے سے اتر کر چلا گیا۔ لیز لی بہت خوف زدہ تھی۔ میں اسے اندر لایا اور ملازموں سے کہا کہ وہ رات کو پوری طرح ہوشیار رہیں۔ پھر میں نے نگیلا سے اس شخص کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ رافٹ ویلی میں آباد سب سے طاقت ور افریقی قبیلے کا وچ ڈاکٹر ہے اور اس کے بارے میں مشہور ہے کہ جو عورت اسے پسند آ جائے، وہ اسے بندریا بنا کر اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟ کوئی جادو انسان کو بندر نہیں بنا سکتا۔'' میں نے نگیلا سے کہا۔

''میں آپ سے متفق ہوں جناب لیکن مقامی لوگ اس بات پر آنکھیں بند کر کے یقین رکھتے ہیں۔ ویسے آپ نے دیکھا کہ اس کے ساتھ درجن بھر بندریاں تھیں؟''

''وہ اس نے یقیناً سدھا کر ساتھ رکھی ہوئی ہوں گی تاکہ لوگوں کو یقین دلا سکے کہ وہ عورت کو بندریا بنا سکتا ہے۔ یہ وچ ڈاکٹر اپنی جادوگری کا سکہ بٹھانے کے لیے اسی قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔ اب یہ اس طرف آیا تو میری رائفل کی گولی اس کی ساری جادوگری نکال دے گی۔''

''یہ سن کر نگیلا نے کچھ کہا تو نہیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ خوف زدہ نظر آنے لگا تھا۔ صرف وہی نہیں بلکہ باقی دو ملازمین بھی ڈرے ہوئے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ افریقی شیر اور چیتے سے بھی اتنا نہیں ڈرتے جتنا کسی وچ ڈاکٹر سے ڈرتے ہیں۔ لیز لی بھی سہمی ہوئی اور خاموش تھی۔ ہم نے ڈنر بہت ٹینشن میں کیا اور ہم نے صحیح سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ جب ہم سونے کے لیے اپنے خیمے میں آئے تو لیز لی نے مجھ سے کہا۔

''چارلس! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''اگر تمہیں اس گندے وچ ڈاکٹر سے ڈر لگ رہا ہے تو بے فکر رہو۔ اس کے لیے میری رائفل کی ایک گولی کافی ہو گی۔'' میں نے لیز لی کو تسلی دی۔

''نہیں چارلس... تم نے دیکھا نہیں، وہ مجھے کن نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے آنکھوں سے نگل جانا چاہتا ہو۔''

''میں نے خود بھی یہی محسوس کیا تھا۔ لیز لی کے لیے اس شخص کی آنکھوں میں بہت گندگی تھی۔'' چارلس نے نکیبا کی طرف دیکھا۔ ایم پول اسے چارلس کی باتوں کا ترجمہ کر کے

www.kahopakistan.com

سنا رہا تھا اور اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، اس کے علاوہ وہ بالکل ساکت تھا۔ چارلس نے بات جاری رکھی۔

''میں نے لیزلی کو تسلی دی کہ وہ بالکل فکر نہ کرے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے لیکن اس وقت مجھ پر ضد سی سوار ہو گئی تھی اور میں نے لیزلی سے کہا۔ ہم دو دن کے لیے یہاں رکے ہیں اور دو دن پورے کر کے ہی جائیں گے۔ کاش! میں اس کی بات مان جاتا اور وہ غائب نہ ہوتی۔'' چارلس نے سرد آہ بھری۔ ''اب مجھے لگتا ہے کہ میں نے اسے اپنی ضد پر قربان کر دیا۔''

''مسٹر چارلس! لیزلی کس طرح غائب ہوئی؟'' سر جان نے پوچھا۔ ''اگرچہ میں پولیس رپورٹ دیکھ چکا ہوں پھر بھی تمہاری زبان سے سننا چاہوں گا۔''

''اس رات لیزلی نے مجھے بیدار کیا۔ اسے حاجت محسوس ہو رہی تھی اور اسے اکیلے باہر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ ٹیلے کے پچھلے حصے تک آیا جہاں جھاڑیاں تھیں۔ ان کے پاس ملازمین نے بانسوں کی دیوار کھڑی کر دی تھی، یعنی خطرہ نہیں تھا۔ لیزلی جھاڑیوں میں چلی گئی اور میں اس کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک اس کی چیخ سنائی دی اور میں اس کی طرف بھاگا۔ میرا خیال تھا کہ لیزلی کو کوئی خطرہ ہے۔ جب میں اس کے پاس پہنچا تو وہ اپنا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ اس کی ہتھیلی سے خون رس رہا تھا۔ میں نے پوچھا کیا ہوا تو اس نے بتایا کہ وہ اٹھ رہی تھی کہ جھاڑی کا کانٹا اس کی ہتھیلی میں گھس گیا۔ میں اسے خیمے میں لایا اور اس کے ہاتھ سے کانٹا نکال کر زخم کو شراب سے دھو دیا پھر ہم سو گئے۔

''اگلے دن موسم اچھا تھا لیکن ہم میں سے کوئی بھی باہر نہیں نکلا۔ میں نے لیزلی سے کہا تو اس نے احاطے سے باہر جانے سے انکار کر دیا... مجھے ڈر لگ رہا ہے اور پلیز تم بھی نہیں جاؤ گے۔''

''یوں ہم سارا دن احاطے میں رہے۔ میں اور ملازمین چوکس تھے۔ شام تک میں مطمئن ہو گیا کہ اس وچ ڈاکٹر نے جو کہا تھا وہ صرف بکواس تھی مگر لیزلی پہلے سے زیادہ خوف زدہ تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وچ ڈاکٹر کی بتائی ہوئی مدت ختم ہونے والی ہے۔ اس نے نگیلا کی بات سن لی تھی کہ اسے جو عورت پسند آ جائے، یہ اسے بندریا بنا کر اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور اس نے بندریاں بھی دیکھ لی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ زیادہ خوف زدہ تھی۔ کاش میں اس کے خوف کو اہمیت دیتا اور رکنے کے بجائے یہاں سے چلا جاتا۔''

''مسٹر چارلس فرانز۔'' انسپکٹر کارلائل نے کہا۔ ''تم نے پولیس کو بتایا کہ تمہیں نہیں معلوم لیزلی کس طرح غائب ہوئی؟''

''یہ بالکل درست ہے۔ اس رات وہ میرے برابر میں سوئی تھی اور صبح کے قریب میری آنکھ کھلی تو وہ غائب تھی۔ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ وہ رات کس وقت نکلی اور خود سے گئی یا کوئی اسے اٹھا کر لے گیا۔ وہ میرے بغیر باہر نہیں جا سکتی تھی پھر بھی میں نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ اس نے مجھے گہری نیند سے جگانا مناسب نہ سمجھا اور اکیلی باہر چلی گئی۔ میں اٹھ کر باہر آیا اور اسے تلاش کیا لیکن وہ احاطے میں کہیں نہیں تھی۔ گائیڈ اور دونوں ملازم گہری نیند میں تھے۔ حالانکہ ان میں سے ایک کو پہرے کے لیے جاگنا چاہیے تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے ان کو بیدار کیا۔ لیزلی کے غائب ہونے کا سن کر وہ بھی پریشان ہو گئے۔ انہوں نے قسمیں کھا کر کہا کہ وہ بیدار تھے اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سو گئے اور ان کو نہیں معلوم کہ اس دوران میں کیا ہوا ہے۔ ہم نے اسلحہ نکالا اور سب سے پہلے احاطے کی مکمل تلاشی لی۔ لیزلی بنا کوئی نشان چھوڑے غائب ہوئی تھی۔ اس کی تمام چیزیں مع اس کی چپلوں کے موجود تھیں اور وہ اپنے شب خوابی کے لباس میں غائب تھی۔ میں پاگل ہو گیا اور میرا پہلا شک اسی پر گیا۔ میں اپنے ملازموں کو لے کر نکل گیا۔ گائیڈ نگیلا جانتا تھا کہ وچ ڈاکٹر جھیل کے کنارے رہتا ہے۔ ہم سورج نکلنے تک اس کے جھونپڑے کے پاس پہنچ گئے تھے۔''

''کیا تمہیں وہاں لیزلی یا اس کی کوئی چیز ملی؟'' سر جان نے پوچھا۔

''نو سر! وہاں نہ تو لیزلی تھی اور نہ ہی اس کی کوئی چیز تھی لیکن مجھے پورا یقین ہے لیزلی کی گم شدگی میں اسی شخص کا ہاتھ ہے۔'' چارلس نے نگیلا کی طرف غضب ناک نظروں سے دیکھا۔

''ٹھیک ہے، ہم نے تمہاری بات سن لی ہے مسٹر چارلس۔'' سر جان نے سکون سے کہا۔ ''اب وچ ڈاکٹر کی بات سنتے ہیں، یہ کیا کہتا ہے۔''

ایم پول نے نگیلا سے کہا کہ وہ اب اپنی بات کر سکتا ہے۔ اس نے کہنا شروع کیا اور ایم پول اس کی بات کا ترجمہ کرنے لگا۔ ''مجھ پر دیوتاؤں کا کرم ہے اور میں آنے والے وقت کے بارے میں جان جاتا ہوں...''

''اپنی گفتگو کو موضوع تک محدود رکھو۔'' انسپکٹر کارلائل نے اسے ٹوکا۔

وچ ڈاکٹر نے اس کی بات کا بُرا منایا لیکن اس کے بعد وہ موضوع پر آ گیا۔ ''ایک رات پہلے میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے علاقے میں دو سفید خرگوش آئے ہیں اور کوئی چیز ان کی تاک میں ہے۔ میرے علم نے بتایا کہ خطرہ مادہ خرگوش کو ہے اور وہ جو چیز بھی ہے، اصل میں اس کی تاک میں ہے۔ بیدار ہونے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے جو خواب دیکھا ہے، وہ بالکل درست ہے۔ میں نے معلوم کرایا کہ میرے علاقے میں دو اجنبی تو نہیں آئے ہیں؟ اور مجھے معلوم ہوا کہ ایک سفید فام جوڑا آیا ہے اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے ان کے بارے میں ہی خواب دیکھا تھا۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ ایک سفید فام جوڑا آیا ہے اور اس ٹیلے پر ٹھہرا ہوا ہے؟'' انسپکٹر کارلائل نے اس سے سوال کیا۔

''میں نے اپنے قبیلے والوں کو اس کام پر لگایا تھا اور انہوں نے مجھے بتایا تھا۔'' نگیلا نے کہا۔ ''اگرچہ میں کسی کے پاس نہیں جاتا بلکہ جسے کام ہوتا ہے، وہ میرے پاس آتا ہے لیکن معاملہ باہر والوں کا تھا اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ خود جا کر ان سے بات کروں۔''

'''تمہارے ساتھ ایک درجن بندریاں بھی تھیں؟'' سر جان جیفری نے سوال کیا۔ ''کیا یہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہتی ہیں؟'' -

''ہاں، یہ نیک روحیں ہیں جو میری اور میرے دوستوں کی حفاظت کرتی ہیں۔''

''مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ بندریاں اصل میں وہ عورتیں ہیں جو تمہیں پسند آ گئی تھیں اور تم نے انہیں حاصل کرنے کے لیے بندریا بنا کر اپنے پاس رکھ لیا۔''

وچ ڈاکٹر مسکرایا تو اس کے پیلے دانت نمایاں ہونے لگے۔ ''جنابِ عالی! کیا آپ بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں؟''

سر جان نے کوئی جواب نہیں دیا تو نگیلا نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں خود ان لوگوں کے پاس گیا۔ سفید فام جوڑا ٹیلے پر رکا ہوا تھا۔ میں نے وہاں بھی خطرہ محسوس کیا۔ اس لیے میں نے اپنا سینگ بجایا، اس سے بد روحیں بھاگ جاتی ہیں۔ اس دوران میں سفید فاموں کا نوکر باہر آیا اور اس نے مجھ سے آمد کی وجہ پوچھی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس کے آقا سے ملنے آیا ہوں اور اسے خطرے سے خبردار کرنا چاہتا ہوں۔ ملازم اندر گیا اور پھر آیا تو یہ شخص اس کے ساتھ تھا۔'' وچ ڈاکٹر نے چارلس فرانز کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں یہاں آ کر کیوں شور کر رہا ہوں... میں اسے سمجھانے لگا کہ میں اسے خطرے سے بچانے آیا ہوں اور اگر وہ میری بات مانے گا تو خطرے سے بچ سکتا ہے۔ اس پر یہ اندر گیا اور بندوق نکال لایا۔''

''کیا مسٹر چارلس نے تمہیں دھمکانے کی کوشش کی تھی؟''

نگیلا نے کڑی نظروں سے چارلس کی طرف دیکھا۔ ''اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو اس کی عقل مند... بیوی نے اسے روک لیا۔ پھر بھی اس نے ایک ہوائی فائر کیا لیکن یہ نہیں جانتا، نگیلا ان معمولی چیزوں سے ڈرنے والا نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں حقارت آ گئی۔

''بکواس مت کرو۔'' چارلس غصے سے بولا۔ ''جب تم نے لیزلی کو دیکھا تھا، تب ہی تمہاری نیت اس پر خراب ہو گئی اور تم نے موقع پا کر کسی طرح اسے کیمپ سے اغوا کر لیا۔''

''یہ جھوٹ ہے، پولیس نے میری جھونپڑی اور اس علاقے کی پوری طرح تلاشی لی ہے اور تمہاری بیوی ان کو کہیں نہیں ملی... مجھے یقین ہے کہ وہ اسی خطرے کا شکار ہوئی جسے میں نے خواب میں دیکھا تھا۔''

''تم جھوٹے ہو تم نے...'' چارلس نے بے قابو ہو کر کہنا چاہا کہ انسپکٹر کارلائل نے اسے روک دیا۔

''ایک منٹ مسٹر چارلس... طے ہوا تھا تم دونوں براہِ راست کوئی بات نہیں کرو گے اس لیے خیال رکھو۔''

''ٹھیک ہے۔'' چارلس نے گہری سانس لی۔ ''اس سے پوچھو کہ یہ کس نام نہاد خطرے کی بات کر رہا ہے... اور اگر اس کے پاس سچ مچ کوئی جادوئی طاقت ہے تو یہ میری بیوی کو تلاش کیوں نہیں کر لیتا؟''

اس سوال کے جواب میں نگیلا نے کہا۔ ''میری مددگار روحیں مجھ پر لگائے گئے جھوٹے الزام سے غصے میں آ گئی ہیں اور انہوں نے اس معاملے میں میری مدد کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ شخص اس قابل نہیں ہے کہ اس کی مدد کی جائے۔''

''تم پہلی بار مسٹر چارلس کے کیمپ تک گئے تھے۔'' انسپکٹر کارلائل نے پوچھا۔ ''دوسری بار تم کب گئے؟''

''میں صرف ایک بار وہاں گیا اور میں نے دوسری بار جانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میری مددگار روحوں نے مجھے روک دیا تھا۔''

''انہوں نے تمہیں کیوں روکا؟'' یہ سوال سر جان نے کیا۔

''ان کا کہنا ہے، یہ شخص اس قابل نہیں ہے کہ اس کی

www.kahopakistan.com

مدد کی جائے اور درحقیقت اس خوب صورت خاتون پر مصیبت اسی شخص کی وجہ سے آنے والی تھی۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' چارلس فرانز انسپکٹر کارلائل کی طرف دیکھ کر غرایا۔ ''لیزلی میری پیاری بیوی ہے اور میں کیوں چاہوں گا کہ اس پر میری وجہ سے مصیبت آئے؟ یہ شخص اپنا جرم چھپانے کے لیے روحوں کا نام لے رہا ہے۔''

''اس سے کہو کہ روحوں کی توہین نہ کرے ورنہ یہ اس سے بھی بڑی کسی مشکل میں پھنس سکتا ہے۔'' نگیا نے کہا۔

''کیا تم اسے دھمکی دے رہے ہو؟'' انسپکٹر کارلائل نے پوچھا۔

''نہیں، میں اسے خبردار کر رہا ہوں۔'' نگیا نے بے پروائی سے کہا۔ ''مجھے تو اس حسین خاتون کا افسوس ہے جو اس کی وجہ سے مصیبت میں پڑی ہے۔''

''جب تم ٹیلے پر گئے تو تم نے مسٹر چارلس سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو چوبیس گھنٹے کے لیے تمہارے حوالے کر دے تو اس پر آنے والی مصیبت ٹل سکتی ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟'' انسپکٹر نے اگلا سوال کیا۔

''بالکل درست ہے۔'' نگیا نے بلا تامل تسلیم کر لیا۔ ''لیکن میرا وہ مقصد نہیں تھا جو یہ سمجھا تھا۔ میں اس خاتون کو اپنی حفاظت میں رکھنا چاہتا تھا کیونکہ ایک دن اور رات کے بعد اس کو لاحق خطرہ شدید ہو جاتا اور میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ ایک دن اور رات کے بعد غائب ہوئی ہے۔''

''تم اس کی کس طرح حفاظت کرتے؟'' سرجان نے پوچھا۔

نگیا مسکرایا۔ ''تم سفید فام لوگ اس بات کو نہیں مانتے لیکن میں ایک وچ ڈاکٹر ہوں اور میرے پاس ایسی طاقتیں ہیں جو میرا یا میری تحویل میں آئے شخص کا دفاع کر سکتی ہیں۔ اگر یہ میری بات مان جاتا تو آج اس کی بیوی اس کے پاس ہوتی۔''

انسپکٹر کارلائل کچھ سوچ رہا تھا۔ ''تم وچ ڈاکٹر ہو لیکن تم معلوم نہیں کر سکتے کہ مسز چارلس پر کیا گزری اور وہ کہاں ہے؟''

''انسپکٹر۔'' چارلس بولا۔ ''تم کس کی باتوں میں آ رہے ہو۔ یہ شخص سراسر فراڈ اور مجرم ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس علاقے میں اس سے پہلے بھی کئی سفید فام عورتیں غائب ہو چکی ہیں۔ ان میں سے کوئی عورت پھر نہیں ملی اور وہ سب کی سب اسی علاقے میں غائب ہوئی ہیں۔''

''یہ درست ہے۔'' انسپکٹر کارلائل نے تسلیم کیا۔

''گزشتہ چھ سالوں میں یہاں چار سفید فام عورتیں غائب ہو چکی ہیں اور وہ سب انگریز ہیں۔ ان میں سے دو کا تعلق برطانیہ سے، ایک کا جنوبی افریقا سے اور ایک کا تعلق کینیا سے ہے۔ یہ سب شادی شدہ اور جوان تھیں۔ پولیس ان میں سے کسی ایک کا بھی سراغ لگانے میں ناکام رہی ہے۔''

''تم کیا سمجھ رہے ہو... کیا اس وچ ڈاکٹر نے ان کو بندریا بنا کر اپنے پاس رکھ لیا ہے؟'' چارلس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' انسپکٹر کارلائل نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم ان عورتوں کا سراغ لگانے میں ناکام رہے ہیں۔''

''یعنی میری بیوی کے ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے؟''

''یہ کہنا قبل از وقت ہوگا۔'' سرجان نے مداخلت کی۔ ''ابھی پولیس تفتیش کر رہی ہے اور ممکن ہے اس معمے سے پردہ اٹھ جائے۔ مسٹر چارلس! تم جانتے ہو میں نے مسٹر ابراہام جیک کے کہنے پر اس غیر سرکاری میٹنگ کا انتظام کیا ہے تاکہ اس مسئلے کو نسلی فساد بننے سے روکا جائے۔ علاقے میں بسنے والے سفید فام مشتعل ہیں اور سیاہ فام بھی غصے میں ہیں۔ پھر معاملہ ایک خاتون اور ایک وچ ڈاکٹر کا ہے۔ دونوں طرف سے حساسیت کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ مسٹر نگیا کا کہنا ہے کہ اسے تمہاری بیوی کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے اور نہ وہ اس کی... گمشدگی میں کسی طرح سے بھی ملوث ہے۔ پولیس رپورٹ بھی یہی کہتی ہے۔''

چارلس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے مقامی پولیس پر قطعی اعتماد نہیں ہے۔ اس علاقے میں رہنے والا ہر سیاہ فام اس وچ ڈاکٹر سے ڈرتا ہے اور وہ اس کی مرضی یا اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا... چاہے وہ پولیس میں کیوں نہ شامل ہو۔''

''اس کیس کی تفتیش میں نے خود کی ہے۔'' انسپکٹر کارلائل نے کہا۔ ''سب سے پہلے تو اس بات کا کوئی سراغ نہیں ملا کہ تمہاری بیوی کیمپ سے باہر کیسے گئی۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی، سوائے تمہاری بیوی کے۔ پھر ہم نے مسٹر نگیا کے جھونپڑے اور ان تمام جگہوں کو دیکھا جہاں تمہاری بیوی کے ہونے کا امکان ہو سکتا تھا۔ لیکن نہ تو تمہاری بیوی ملی اور نہ ہی اس کی گمشدگی پر کوئی روشنی پڑی۔''

''تمہارا مطلب ہے انسپکٹر کہ وہ بالکل غائب ہو گئی۔''

''ہاں... ایک ایسی گمشدگی جس کی کوئی وضاحت پیش نہیں کی جا سکتی۔''

''ممکن ہے وہ کسی وجہ سے کیمپ سے باہر گئی ہو اور کسی درندے نے اس پر حملہ کر دیا ہو؟'' سرجان نے خیال ظاہر کیا۔

''پولیس نے اس نقطۂ نظر سے بھی تفتیش کی اور آس پاس کا سارا علاقہ باریک بینی سے چھانا گیا لیکن کہیں سے ایسا کوئی سراغ نہیں ملا کہ تمہاری بیوی پر کسی درندے نے حملہ کیا ہو۔''

''تب وہ کہاں جا سکتی ہے؟'' چارلس کا صبر رفتہ رفتہ جواب دے رہا تھا۔ ''ایک طرف تم کہتے ہو کہ لیزلی پُراسرار طور پر غائب ہے اور دوسری طرف تم اس وچ ڈاکٹر کو کچھ نہیں کہتے۔''

''مسٹر چارلس فرانز۔'' انسپکٹر کارلائل کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''تم کیا چاہتے ہو، کیا ہم اس شخص کو گرفتار کر کے اس پر مقدمہ چلائیں؟ جبکہ نہ تو کوئی ثبوت ہے اور نہ ہی کوئی گواہ ہے کہ تمہاری بیوی کو مسٹر نگیا نے اغوا کیا ہے یا اسے کسی قسم کا نقصان پہنچایا ہے۔''

سرجان نے چارلس سے کہا۔ ''مسٹر چارلس! پولیس کی گاڑی ثبوت اور گواہوں پر چلتی ہے۔ بدقسمتی سے مسز چارلس کو کسی نے کیمپ سے باہر بھی نہیں دیکھا تو اب تم خود سوچو کہ ہم کسی کے خلاف کس طرح کارروائی کر سکتے ہیں؟''

چارلس نے خوں خوار نظروں سے وچ ڈاکٹر نگیا کی طرف دیکھا۔ ''یعنی تم لوگ کچھ نہیں کر سکتے؟''

''مجھے افسوس ہے، ہم تمہاری بیوی کو تلاش نہیں کر سکے لیکن ابھی تفتیش جاری ہے اور امید ہے کہ کوئی مثبت نتیجہ نکل آئے گا۔'' انسپکٹر کارلائل نے کہا اور کمشنر سرجان کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا مطلب سمجھ گیا اور اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔

''ویل جنٹلمین... مجھے امید ہے آج کی اس میٹنگ کو مدِنظر رکھ کر دونوں فریق کیس کی حتمی تفتیش تک کسی قسم کی جذباتیت سے گریز کریں گے۔''

''صاحب! تم میری طرف سے اطمینان رکھو۔'' نگیا نے کھڑے ہو کر سرجان سے کہا۔ ''میں اپنے لوگوں کو قابو میں رکھوں گا۔''

سرجان نے اشارے سے انسپکٹر کارلائل کو روک لیا۔ اس کا ملازم چارلس، نگیا اور ترجمان ایم پول کو چھوڑنے باہر تک آیا جہاں کوٹھی کے احاطے میں ایک طرف نگیا کی بندریاں سکون سے ایک طرف بیٹھی تھیں۔ اندر آنے سے پہلے اس نے انہیں اسی جگہ بیٹھنے کا حکم دیا تھا۔ چارلس ان کے پاس رک گیا۔ اس نے غور سے انہیں دیکھا۔ اس نے نگیا سے پوچھا۔

''تمہارے پاس مختلف نسلوں اور رنگوں والی بندریاں ہیں؟''

''ہاں۔'' اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''ان کو میں نے بڑی محنت سے جمع کیا ہے۔''

ایک گلابی منہ اور سفید رنگ کی بندریا بیٹھی پاؤں سے اپنا سر کھجا رہی تھی۔ وہاں سرجان کی کوٹھی کی محافظ پولیس فورس کے جوان اور دوسرے ملازم بھی موجود تھے اور ان سب کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک سر کھجانے والی بندریا نے انگڑائی لی اور اپنا سیدھا ہاتھ سامنے کیا تو چارلس بُری طرح چونکا۔ بندریا کی ہتھیلی پر زخم کا نشان نظر آ رہا تھا۔ بالکل ویسا ہی زخم اور ٹھیک اسی جگہ جہاں لیزلی کو کانٹا چبھا تھا۔ چارلس بے ساختہ اس کی طرف بڑھا۔

''لیزلی۔'' اس نے کہا اور بندریا کے قریب ہونے کی کوشش کی تو وہ بھڑک کر پیچھے ہوئی اور پھر اچھل کر نگیا پر چڑھ گئی، نگیا نے اپنی زبان میں کچھ کہا تو بندریا دانت نکال کر خوخیانے لگی۔ اس کا انداز دھمکانے والا تھا۔ چارلس نے نگیا سے کہا۔ ''اس بندریا کا ہاتھ دکھاؤ۔''

نگیا نے ایم پول کی مدد سے اس کی بات سمجھی اور بولا۔ ''کیوں... تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟''

''تعلق کے بچے۔'' چارلس نے بے قابو ہو کر بندریا کو اس سے چھیننے کی کوشش کی۔ بندریا اچھل کر نگیا کے سر پر چڑھ گئی اور چیخنے لگی۔ نگیا نے ہاتھ سے چارلس کو پیچھے دھکیل دیا مگر وہ بے قابو ہو رہا تھا۔ اس نے پھر نگیا کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو ایم پول اور ایک مقامی پولیس والے نے اسے روک لیا۔ چارلس نے ایم پول کو گھونسا مارا۔ وہ بے چارہ پیچھے جا گرا۔ ایک ہنگامہ مچ گیا۔ اب بندریا کے ساتھ چارلس بھی چلا رہا تھا۔ شور سن کر کمشنر جان اور انسپکٹر کارلائل بھی باہر نکل آئے تھے۔ کارلائل نے چارلس کا بازو پکڑ لیا۔ ''مسٹر چارلس! یہ کیا ہنگامہ ہے؟'' اس کے لہجے میں ناگواری تھی۔

''یہ بندریا... اس کے ہاتھ میں بالکل ویسا زخم ہے... جیسا لیزلی کے ہاتھ میں تھا۔''

سرجان اور انسپکٹر کارلائل نے چارلس کو یوں دیکھا جیسے انہیں اس کے دماغی توازن پر شبہ ہو۔ ''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو مسٹر چارلس؟'' سرجان نے پوچھا۔

''یہ بندریا... مجھے شبہ ہے یہ لیزلی ہے۔ اس سے کہو کہ اسے میرے حوالے کر دے ورنہ میں اسے قتل کر دوں گا۔'' چارلس نے چیخ کر کہا۔

www.kahopakistan.com

"یہ بکواس کر رہا ہے۔" نکیبا گرج کر بولا۔ "یہ میری پالتو بندریا ہے۔ اس کا اس کی بیوی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"دیکھو، اس کے ہاتھ پر نشان ہے۔ لیزلی کے ہاتھ میں اسی جگہ کانٹا لگا تھا۔" چارلس نے کہا اور انسپکٹر کارلائل سے التجا کی۔ "پلیز انسپکٹر! تم خود دیکھ سکتے ہو۔"

لیکن انسپکٹر کارلائل معنی خیز نظروں سے کمشنر سر جان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے چارلس سے کہا۔ "ہاں، میں دیکھ رہا ہوں مسٹر چارلس... تم میرے ساتھ آؤ۔"

وہ چارلس کو اندر لے گیا۔ حالانکہ وہ مزاحمت کر رہا تھا لیکن لمبے تڑنگے انسپکٹر کارلائل کی گرفت اتنی نرم نہیں تھی کہ وہ خود کو چھڑا سکتا۔ اس نے چارلس کو ایک کمرے میں دھکیل دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ وہ چیختا چلاتا اور دروازہ پیٹتا رہ گیا لیکن اس کی کسی نے نہیں سنی۔ کئی گھنٹے بعد اسے اس کمرے سے نکالا گیا اور دو مقامی پولیس والوں نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک گاڑی میں بٹھایا اور یہ گاڑی تابورا کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کا اور لیزلی کا سامان پہلے ہی تابورا میں سر ابراہام کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ اس نے چارلس سے کچھ کہا نہیں لیکن اس کے انداز میں سرد مہری آ گئی تھی۔ سر ابراہام نے رشتے داری کا خیال کرتے ہوئے خود سر جان سے درخواست کر کے چارلس اور نکیبا کو بیٹھ کر بات کرنے کا کہا تھا مگر چارلس کی حرکت نے اسے سر جان کے سامنے شرمندہ کر دیا تھا۔ چارلس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی لیکن سر ابراہام نے اس کی بات سننے سے انکار کر دیا۔

"چارلس! بہتر ہوگا تم پولیس انکوائری مکمل ہونے تک سکون سے یہاں ٹھہرو۔"

دوسرے الفاظ میں سر ابراہام نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ انکوائری مکمل ہوتے ہی ان کے گھر سے رختِ سفر باندھ لے۔ اس نے بہتر سمجھا کہ اس سے پہلے ہی یہاں سے رخصت ہو جائے۔ اس نے ایک ہوٹل میں کمرا لے لیا اور پولیس کو اپنے نئے پتے سے آگاہ کر دیا۔ دو مہینے بعد پولیس نے باضابطہ طور پر لیزلی کو گم شدہ قرار دے کر اس کا کیس داخل دفتر کر دیا اور چارلس فرانز کو اس کی تحریری رپورٹ بھیج دی۔ وہ یہ رپورٹ لے کر واپس لندن چلا گیا۔

☆☆☆

نومبر میں سرما شدید ہو گیا تھا اور گزشتہ دو دن سے مسلسل برف باری جاری تھی۔ اپنے عالی شان پیلس میں آتش دان کے سامنے اسکاچ وہسکی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے چارلس کو بٹلر نے انسپکٹر کارلائل کی آمد کے بارے میں بتایا تو وہ حیران رہ گیا۔ چونکہ آمد کی وجہ سرکاری تھی اس لیے وہ انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دس منٹ بعد وہ تیار ہو کر اس سے ملنے نشست گاہ میں موجود تھا۔ انسپکٹر کارلائل نے اس سے ہاتھ ملایا اور ستائشی انداز میں بولا۔

"تمہارا گھر بہت شان دار ہے مسٹر چارلس... یقیناً تمہیں ورثے میں ملا ہے؟"

"نہیں۔" چارلس نے بادل ناخواستہ جواب دیا اور غمگین لہجے میں بولا۔ "یہ لیزلی کی جائداد کا ایک حصہ ہے جو اس نے میرے نام وصیت کی تھی۔ تم شاید جانتے نہیں، وہ لارڈ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔"

"اوہ... مجھے نہیں معلوم تھا۔" انسپکٹر کارلائل نے تسلیم کیا۔

"کیا تم اس کے بارے میں کوئی نئی بات کرنے آئے ہو؟" چارلس نے پوچھا۔

انسپکٹر کارلائل نے سر ہلایا۔ "ہاں، میں نے بعد میں بھی اس کیس پر کام جاری رکھا تھا۔ خاص طور سے اس الزام کے حوالے سے کہ وچ ڈاکٹر اپنی پسند کی عورت کو بندریا میں تبدیل کر کے اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔"

چارلس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "کیا تم اس بات کو مانتے ہو کہ وہ واقعی ایسا کر سکتا ہے؟"

"نہیں، میں اس بات کو نہیں مانتا لیکن اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی بات تو تھی۔ دیکھو... کچھ بھی ایسے ہی مشہور نہیں ہو جاتا۔"

چارلس کچھ بے چین نظر آنے لگا۔ "پھر تم نے کچھ معلوم کیا؟"

"ہاں، میں نے یہ جانا کہ جب وہاں پر کوئی سفید فام عورت غائب ہوئی تو وچ ڈاکٹر کے پاس ایک سفید بندریا کا اضافہ ہو گیا جس میں غائب ہونے والی عورت جیسی کوئی نہ کوئی بات ہوتی تھی۔ جیسے تمہاری بیوی کے ہاتھ میں زخم کا نشان تھا اور ویسا ہی نشان اس بندریا کے ہاتھ میں پایا گیا۔ ایک عورت کے ماتھے پر زخم کا پرانا نشان تھا اور ویسا ہی نشان وچ ڈاکٹر کے پاس موجود بندریا میں پایا گیا۔ باقی دو عورتوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ان کی بھی کوئی ایک نشانی ان کے غائب ہونے کے بعد وچ ڈاکٹر کے پاس پائی جانے والی بندریا میں پائی گئی تھی۔"

چارلس کی بے چینی بڑھ گئی۔ "تو تمہارے خیال میں وہ سچ عورت کو بندریا میں تبدیل کر دیتا ہے؟"

"مسٹر چارلس! مجھے تم جیسے پڑھے لکھے آدمی سے اس بات کی امید نہیں تھی۔" انسپکٹر کارلائل نے شائستگی سے کہا۔ "درحقیقت وچ ڈاکٹر ایک فراڈ اور دھوکے باز آدمی ہے۔ ان تمام عورتوں کی گم شدگی میں اس کا ہاتھ تھا اور ایک اہم بات یہ ہے کہ جنگل میں اس نے بندروں کا پورا قبیلہ اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ وہ انہیں نشہ آور بوٹی کھلاتا تھا اور نشے کی خاطر وہ اس کے غلام بنے ہوئے تھے۔ اپنے مطلب کی بندریا، وہ وہیں سے لاتا تھا۔"

"تو تم نے اسے گرفتار کر لیا؟"

"بالکل مسٹر چارلس! وہ دو مہینے سے پولیس کی تحویل میں ہے اور اس نے اپنے تمام جرائم کا اعتراف کر لیا ہے۔ اس نے چار نہیں چھ عورتوں کو قتل کیا ہے اور ان کی لاشیں اس نے جھیل میں موجود مگرمچھوں کو کھلا دیں۔ اس طرح ان کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ باقی دو عورتیں اس نے بارہ سال پہلے قتل کی تھیں جب یہ علاقہ برطانوی حکومت کی عمل داری میں نہیں آیا تھا۔"

چارلس اب بالکل ساکت تھا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے سوال کیا۔ "آخر وہ ان عورتوں کو کیوں قتل کرتا تھا؟"

"اس کی عورتوں سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور نہ ہی وہ سفید فام عورتوں کا شوقین ہے۔ اس نے یہ سارے قتل دولت کی خاطر کیے۔"

"دولت کی خاطر؟" چارلس نے کراہنے کے انداز میں کہا۔

"ہاں مسٹر چارلس... دولت کی خاطر... جوان عورتوں کے شوہر اسے دیتے تھے تاکہ وہ انہیں بیویوں سے چھٹکارا دلا دے۔ وجوہات مختلف تھیں لیکن سارے قتل ان کے شوہروں نے کرائے۔ وہ خود یہ کام نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے وچ ڈاکٹر کی خدمات حاصل کر لیں۔ جیسے کہ تم نے کی تھی۔"

"میں نے؟" چارلس ہڑبڑا کر بولا۔ "یہ بکواس ہے۔"

"یہ درست ہے مسٹر چارلس!" انسپکٹر کارلائل نے کہا اور اچانک پستول نکال لیا۔ "اپنے ہاتھ سامنے کرو، میں تمہیں تاجِ برطانیہ کے حکم سے گرفتار کرتا ہوں۔" چارلس کے پاس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ آگے کیے اور انسپکٹر کارلائل نے اسے ہتھکڑی پہنا دی۔ "وچ ڈاکٹر نکیبا نے پورا منصوبہ بتا دیا کہ تم نے کس طرح اس سے رابطہ کیا تھا۔ تم گزشتہ سال اس سے ملنے آئے تھے۔ تم اس وقت چھپ کر آئے تھے لیکن ریکارڈ میں تمہاری آمد موجود ہے۔ تم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ تمہیں تمہارے ایک دوست نے اس وچ ڈاکٹر کے بارے میں بتایا تھا اور پھر تم نے اپنے طور پر کھوج لگایا اور جان لیا کہ وہ کرائے کا قاتل ہے۔ تمہارے دوست کا بیان بھی میرے پاس ہے۔ پھر تم نے لیزلی کو راضی کیا کہ تم دونوں گھومنے پھرنے افریقا جاؤ گے۔ تم نے اپنی ماں کے حوالے سے سوسائٹی میں ایک مقام بنا لیا تھا اور لیزلی جیسی حسین اور دولت مند لڑکی سے شادی کرنے میں بھی کامیاب رہے تھے لیکن خود تمہارے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس لیے تم نے دولت حاصل کرنے کے لیے اپنی بیوی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔

"ایم پانانڈا پہنچ کر تم نے وچ ڈاکٹر سے مل کر منصوبے کو حتمی شکل دی اور اسے آدھی رقم پیشگی دی۔ باقی آدھی رقم تم نے لیزلی کے قتل کے بعد اسے دی تھی۔ لیزلی کی گم شدگی کے بعد تم نے وچ ڈاکٹر پر الزام لگایا اور اس نے تردید کی۔ یہ تم دونوں کا مشترکہ ڈراما تھا۔ پھر سر جان کی کوٹھی میں بندریا والا ہنگامہ کیا۔ اس سے دو مقاصد حاصل کیے۔ ایک تو عام لوگوں کا ذہن اس طرف کر دیا کہ وچ ڈاکٹر نے تمہاری بیوی کو بندریا میں تبدیل کر دیا ہے، دوسرے تم دونوں نے ہنگامہ کر کے مجھے اور سر جان کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ تم دونوں آپس میں دشمن ہو اور لیزلی کی گم شدگی میں تم دونوں کے کردار پر توجہ نہ جانے پائے۔ لیکن تمہارے اسی ہنگامے نے مجھے اس طرف متوجہ کر دیا اور بالآخر مسلسل تفتیش سے ایسے شواہد سامنے آئے کہ ہمیں وچ ڈاکٹر کو گرفتار کرنے کا موقع مل گیا۔ ایک بار وہ ہماری گرفت میں آیا تو اسے پھر اپنی زبان کھولنا پڑی۔"

چارلس فرانز کے شانے جھک گئے اور چند منٹ میں وہ اپنی عمر سے دس سال بڑا نظر آنے لگا۔ اس نے مُردہ لہجے میں پوچھا۔ "اب تم کیا کرو گے؟"

"میں تمہیں واپس تنزانیہ لے جانے آیا ہوں تاکہ وہاں تم پر مقدمہ چلے اور وہاں کے لوگ دیکھیں گے کہ صرف ان کے سیاہ فام وچ ڈاکٹر کو سزا نہیں دی جا رہی بلکہ ان عورتوں کے شوہروں کو بھی سزا ہوگی جنہوں نے اپنی بیویوں کو قتل کروایا تھا اور اصل مجرم وہی ہیں۔" انسپکٹر کارلائل نے اس کا بازو پکڑا۔ "میں نہیں جانتا کہ تم نے اتنا بڑا فیصلہ کیوں کیا لیکن اگر تم اپنی بیوی کو قتل نہ کرواتے تو آج اس مکان میں سکون سے رہ سکتے تھے۔ بہرحال، مسٹر چارلس! آخری بار اس گھر کو غور سے دیکھ لو۔ اب تمہیں یہاں آنا نصیب نہیں ہوگا۔"

www.kahopakistan.com

عام آدمی

آصف ملک

خوبصورتی... حسن کسی بھی نوعیت کا ہو... ہر شخص اسے محسوس کرکے اس میں کھو جاتا ہے... ایسے ہی ایک بے ضرر... عام آدمی کی کہانی... جس کی شخصیت ہی نہیں زندگی بھی حسن ودلکشی سے عاری تھی...

زندگی کو سنوارنے اور خاص بنانے کے خواب دیکھنے والے قناعت پسند کا ماجرا

پیٹر جوزف ایک عام سا آدمی تھا۔ چالیس سال تک اس نے ایک عام سی زندگی گزاری۔ ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کی، ایک کالج سے عام سے نمبروں سے گریجویشن کیا۔ ایک فرم میں ملازم ہوگیا اور گزشتہ پندرہ سال سے اسی فرم میں اور تقریباً اسی عہدے پر کام کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ نوکری شروع کرنے والے کہیں سے کہیں جا چکے تھے۔ اس کے ساتھیوں کا کہنا تھا کہ وہ اسی عہدے سے ریٹائر ہوگا۔ پیٹر نے ایک بار شادی بھی کی۔ جولیا عام سی عورت تھی لیکن وہ بھی اس کے ساتھ گزارا نہ کرسکی اور شادی کے چند سال بعد اس نے یہ کہہ کر پیٹر سے طلاق لے لی کہ وہ مزید اس کے ساتھ بے رنگ زندگی نہیں گزار سکتی۔

پیٹر کا ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا۔ یہ تیسری منزل پر تھا اور اس میں صرف دو کمرے تھے لیکن اس کے لیے یہ کافی تھا اور پھر اچھے اور پُرسکون علاقے میں تھا۔ کسی زمانے میں یہاں پرانے طرز کی تین چار منزلہ عمارتیں تھیں جن میں چھوٹے چھوٹے اپارٹمنٹ تھے لیکن پھر اس علاقے کی ویلیو بڑھی تو یہ عمارتیں گرا کر ان کی جگہ خوب صورت مکانات بننے لگے اب چند ایک عمارتیں باقی رہ گئی تھیں۔ ان میں ایک وہ عمارت بھی تھی جس میں پیٹر کا اپارٹمنٹ تھا۔ اس کے مکین منتظر تھے کہ ان کی عمارت کی بھی اچھی قیمت لگے تو وہ یہاں سے دریا کے کنارے بننے والے جدید، کشادہ اور خوب صورت اپارٹمنٹ میں منتقل ہوجائیں۔ لیکن فی الحال عمارت کا کوئی گاہک نہیں آیا تھا جو ان کی مطلوبہ قیمت لگاتا۔

پیٹر کی خواہش تو یہ تھی کہ اس علاقے میں اس کا بھی کوئی عالی شان مکان ہوتا، اس کی خوب صورت بیوی ہوتی اور اس کے پاس بہترین ملازمت اور لگژری کار ہوتی۔ لیکن یہ سب صرف خواہشات تھیں۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ پیٹر کا اصل مسئلہ یہی تھا کہ اس میں ہمت کی کمی تھی، وہ کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتا اور پھر اس کی مشکلات کا سوچ کر ارادہ ترک کر دیتا۔ تعلیم سے لے کر ملازمت تک اور شادی سے لے کر رہائش تک اس کا یہی رویہ رہا تھا۔ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے اس نے بہت سے مواقع گنوا دیے تھے۔

وہ برسوں سے ہمت کر رہا تھا کہ اپنے باس سے تنخواہ بڑھانے کی بات کرے۔ اس کے پاس ایک معمولی سا گھر تھا۔ اس گھر میں کوئی عورت نہیں تھی۔ کوئی خاص جمع پونجی نہیں تھی۔ اس کی کوئی تفریح نہیں تھی کیونکہ تفریح کے لیے بھی رقم درکار ہوتی ہے۔ اس کے پاس ایک کھٹارا سی کار تھی جو اکثر خراب رہتی اور اسے بس میں دفتر جانا پڑتا۔ اس کی واحد تفریح دفتر سے واپسی پر اپنی گلی کے کونے پر واقع ڈیرک کے بار میں چند جام تھے۔ اس دوران میں وہ محلے کی خبریں بھی سن لیتا تھا۔ ایک دن بار میں اسے پتا چلا کہ مکان نمبر ایف ایک سو انیس میں ایک جوڑا آیا ہے۔

ڈیرک ایک محلے دار سے بات کر رہا تھا۔ محلے دار نے پوچھا۔ ''بیوی کیسی ہے؟''

''اے ون۔'' ڈیرک نے آنکھ میچی۔ ''کوئی سُپر ماڈل لگتی ہے۔ جب اپنے گھر کے سوئمنگ پول میں تیراکی کرتی ہے تو اسے دیکھنے کے لیے آس پاس والے بے تاب ہو جاتے ہیں۔''

پیٹر کو خیال آیا، ایف ایک سو انیس اس کی عمارت کے سامنے ہی تھا۔ دو مہینے پہلے یہاں ایک عالی شان مکان تیار ہوا تھا ایک سال پہلے یہ ایک بدصورت عمارت تھی۔ مکان کے پہلو میں سوئمنگ پول تھا جس کے آس پاس پام کے بڑے درخت لگائے گئے تھے۔ مکان دیکھنے کے لائق تھا۔ پیٹر نے کئی بار اسے دیکھا تھا لیکن یہ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہاں دیکھنے کے لائق کچھ اور بھی تھا جیسا کہ ڈیرک بتا رہا تھا۔ اس سے پہلے پیٹر نے کبھی اس حوالے سے اس مکان کی طرف توجہ نہیں دی تھی کہ اس میں کون رہ رہا ہے۔

اس رات پیٹر گھر آیا تو اپنا کھانا اوون میں گرم ہونے کے لیے رکھ کر کھڑکی سے سب سے پہلے اس مکان کا جائزہ لیا۔ اس کی روشنیاں بتا رہی تھیں کہ وہ آباد ہے۔ پیٹر کے پاس ایک دوربین تھی۔ اس نے الماری سے دوربین نکالی اور اس کی مدد سے مکان کا جائزہ لینے لگا۔ یہ خوب صورت دو منزلہ مکان تھا جس کے آگے اور بائیں جانب لان تھا جب کہ دائیں طرف ایک درمیانے سائز کا سوئمنگ پول تھا جس کے اردگرد پام کے درخت تھے۔ ان کا مقصد ایک تو پول کا پردہ کرنا تھا کیونکہ سڑک کے پار کئی عمارتیں تھیں جن سے پول صاف نظر آتا اور پھر ان درختوں کی وجہ سے مکان کی خوب صورتی میں بھی اضافہ ہوا تھا۔

پیٹر کے بیڈروم کی کھڑکی کچھ اس طرح تھی کہ اس سے سوئمنگ پول نصف صاف نظر آرہا تھا۔ ابھی وہ دوربین سے پول کا معائنہ کر ہی رہا تھا کہ کوئی پانی میں کودا اور ایک لکیر سی بن گئی۔ چند لمحے بعد ایک سنہری بالوں والی حسین عورت پانی کی سطح پر ابھری اور پول میں سست روی سے تیراکی کرنے لگی۔ دوربین کی وجہ سے پیٹر کو وہ صرف چند فٹ کے فاصلے پر دکھائی دے رہی تھی اور پول کے اندر کی تیز روشنیوں میں اس کا بدن سونے کی طرح جگمگا رہا تھا۔ پیٹر سحر زدہ سا رہ گیا۔ اس نے زندگی میں اتنی حسین عورت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ڈیرک ٹھیک کہہ رہا تھا، یہ عورت دیکھنے میں کوئی سُپر ماڈل لگ رہی تھی۔ پیٹر کو اس کے شوہر پر رشک آیا۔

وہ عورت کو دیکھنے میں اتنا مگن تھا کہ اسے خاصی دیر بعد اپنے کھانے کا خیال آیا اور وہ اوون کی طرف دوڑا۔ اس

kahopakistan.com

نے اوون کھولا تو کھانا جل کر کوئلہ ہو چکا تھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کھانا ڈسٹ بن میں ڈالا اور اپنے لیے سینڈوچز تیار کرنے لگا۔ سینڈوچز کھاتے ہوئے وہ اتنا ناخوش نہیں تھا، اس نے آج ایک حسین عورت کو بہت دلکش روپ میں دیکھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا شوہر کیسا ہوگا۔ کھانا کھا کر وہ دوبارہ کھڑکی میں آیا لیکن عورت جا چکی تھی اور پول کی روشنیاں بھی بجھ گئی تھیں۔ اس کے بعد سے پیٹر کا معمول بن گیا۔ وہ عورت جب تیراکی کرتی، پیٹر دوربین لے کر بیٹھ جاتا۔ وہ عام طور سے ہر دوسرے تیسرے دن تیراکی کرتی تھی اور غالباً فٹ رہنے کے لیے کرتی تھی۔

کوئی ایک مہینے بعد پیٹر حسبِ معمول ڈیرک کے بار میں تھا جہاں چند افراد کسی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ پہلے پیٹر نے توجہ نہیں دی لیکن جب ایف ایک سوانیس کا ذکر ہوا تو اس کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ توجہ سے ان لوگوں کی باتیں سننے لگا۔ وہ کسی پاؤلا جیک کی بات کر رہے تھے... جلد اسے معلوم ہو گیا کہ پاؤلا اسی حسین عورت کا نام ہے۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ اپنے شوہر سے بے وفائی کر رہی تھی اور آئے دن اس کے نت نئے عشاق اسے گھر چھوڑنے یا لینے آتے تھے اور ایسا ہمیشہ اس وقت ہوتا تھا جب اس کا شوہر فیڈر جیک گھر پر نہیں ہوتا تھا۔

”یہ عورت سوفی صد اپنے احمق شوہر کو دھوکا دے رہی ہے۔“ مل پیٹ نے کہا، وہ بھی پیٹر والی عمارت میں رہتا تھا۔

”یہ ممکن ہی نہیں ہے اس کے شوہر کو علم نہ ہو۔“ ایک اور نے تبصرہ کیا۔

پیٹر کا دل چاہا کہ اس بحث میں وہ بھی حصہ لے لیکن ہمیشہ کی طرح اپنی کم ہمتی کی وجہ سے وہ خاموش رہا اور صرف سنتا رہا۔ پیٹر نے ابھی تک فیڈر نامی شخص کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے کبھی مکان میں نظر نہیں آیا تھا۔ صرف عورت نظر آتی تھی اور وہ بھی اکیلی۔ اسی طرح پیٹر نے عورت کو کہیں آتے جاتے بھی نہیں دیکھا تھا اور نہ کوئی اس کے ہاں آتا تھا۔ شاید اس کا آنا جانا دن میں ہوتا تھا اور دن میں فیڈر کی طرح پیٹر بھی کام پر ہوتا تھا۔ ویسے پیٹر کو پاؤلا کے شوہر کو دیکھنے کی اتنی بھی خواہش نہیں تھی۔ اسے پاؤلا دیکھنے کو مل رہی تھی، اس کے لیے یہی بہت تھا۔

اس رات وہ گھر آیا تو اس نے سب سے پہلے ایف ایک سوانیس کے سوئمنگ پول کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر اس کی باچھیں کھل اٹھیں کہ پاؤلا پول میں موجود تھی۔ پیٹر نے جلدی سے دوربین نکالی اور کمرے کی روشنی بند کر کے کھڑکی کے سامنے پردہ کر کے بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی سیٹنگ اس طرح کر لی تھی ایک ڈیڑھ گھنٹا بیٹھنے سے بھی اسے تھکن نہیں ہوتی تھی۔ اس نے کھڑکی کے سامنے کرسی رکھ لی تھی اور آرام سے بیٹھ کر پاؤلا کا نظارہ کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ نہ ہونے کے برابر لباس میں تیراکی کر رہی تھی۔ اچانک پول کی روشنیاں کم ہو گئیں اور وہاں ہلکی سی تاریکی چھا گئی۔ اب وہاں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن دوربین کی مدد سے کسی قدر نظر آ رہا تھا۔ پھر پیٹر نے کسی کو سوئمنگ پول میں کودتے دیکھا اور وہ بھی پاؤلا کے ساتھ تیراکی کرنے لگا۔

مرد کے خدوخال صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن پیٹر نے اندازہ لگایا کہ وہ جوان عمر کا آدمی تھا اور پاؤلا کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ شاید وہی فیڈر تھا۔ کیونکہ کوئی باہر سے آ کر اس طرح پاؤلا کے ساتھ تیراکی نہیں کر سکتا تھا جبکہ اس کا شوہر کسی وقت بھی باہر سے آ سکتا تھا۔ وہ یقیناً فیڈر ہی تھا۔ تاریکی ہونے سے پیٹر کو پاؤلا صاف نظر نہیں آ رہی تھی اس لیے وہ بددل ہو کر اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اچانک اس نے سوئمنگ پول میں ہل چل محسوس کی اور اس نے دیکھا کہ مرد نے پاؤلا کا سر پکڑ کر پانی میں کر دیا تھا اور وہ سر نکالنے کے لیے مچل رہی تھی۔ پیٹر ایک لمحے کو ساکت رہ گیا۔ چند لمحے بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ مرد پاؤلا کو قتل کر رہا ہے۔ وہ پوری قوت سے اس کا سر پانی میں ڈبوئے ہوئے تھا۔ پاؤلا سانس لینے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی لیکن مرد اس کے مقابلے میں کہیں طاقت ور تھا۔

پیٹر کو خیال آیا کہ اسے پولیس کو کال کرنی چاہیے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ پولیس کو کال کرنے تک پاؤلا مر چکی ہوتی اور پولیس زیادہ سے زیادہ اس کے قاتل کو گرفتار کر سکتی تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ بعد میں پولیس نے اس سے پوچھ لیا کہ وہ دوربین لے کر کیا کر رہا تھا تو وہ کیا جواب دیتا اور یقیناً یہ ساری باتیں میڈیا پر بھی آتیں اور اس کا اچھا خاصا مذاق اڑتا اور وہ اپنے دفتری ساتھیوں کا سامنا کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ یہ سوچ کر وہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس نے پولیس کو فون کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جب تک وہ فون کرنے یا نہ کرنے پر غور کرتا رہا تھا، اس دوران میں مرد پاؤلا کو کھینچ کر پول کے دوسرے کنارے کی طرف لے گیا اور پھر وہ لاش سمیت پیٹر کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ پیٹر کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے ایک قتل کا پورا منظر دیکھ لیا تھا۔

لیکن ابھی اور بھی بہت کچھ باقی تھا۔ کچھ دیر بعد مکان کی باقی روشنیاں بھی بجھ گئیں اور پیٹر نے بائیں طرف والے لان میں ایک سائے کو حرکت کرتے دیکھا۔ سایا مرد کا تھا اور اس نے لباس اتار رکھا تھا اور تاریکی کے پردے میں زمین کھود رہا تھا۔ پیٹر کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی، وہ یقیناً پاؤلا کی قبر کھود رہا تھا۔ تاریکی میں ایک ہیولا تھا جو کدال چلا رہا تھا اور کوئی نصف گھنٹے تک وہ قبر کھودتا رہا۔ اس نے قبر اتنی گہری کھودی کہ وہ اس میں اتر کر پیٹر کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔۔۔ نصف گھنٹے بعد وہ قبر سے نکلا اور اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک تھیلا سا گھسیٹتا ہوا لایا اور اسے کھودے جانے والے گڑھے میں اتار دیا۔ اسے اچھی طرح اندر کی طرف دبایا اور پھر اوپر سے مٹی ڈالنے لگا۔ کھودنے کے مقابلے میں مٹی ڈال کر گڑھا بند کرنے میں نصف وقت بھی نہیں لگا تھا۔ مٹی ڈال کر اور اسے ہموار کر کے اس نے وہاں سے اکھاڑی جانے والی گھاس دوبارہ اسی جگہ لگا دی اور پھر اس پر پانی ڈال دیا تاکہ مٹی اچھی طرح بیٹھ جائے اور گھاس دوبارہ سے جڑ پکڑ لے۔ یہ کام مکمل کر کے وہ اندر چلا گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد مکان کی بجھی روشنیاں پھر سے جل اٹھیں۔ پیٹر نے دوربین سنبھال لی۔ وہ شخص پھر باہر آیا۔ اب اس نے گاؤن پہن رکھا تھا۔ اس نے زمین کا معائنہ کیا اور ایک اوزار کی مدد سے اس کے اوپر نیچے رہ جانے والے حصے ہموار کیے اور مطمئن ہو کر اندر چلا گیا۔ اس کا اطمینان بتا رہا تھا کہ وہ مکان کا مالک اور پاؤلا کا شوہر فیڈر ہی ہے۔

پیٹر نے دوربین رکھ دی اور صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ وہ ایک قتل کا چشم دید گواہ بن گیا تھا یہی نہیں بلکہ اس نے پاؤلا کی لاش کا مدفن بھی دیکھ لیا۔ اب اسے چاہیے تھا کہ وہ پولیس کو گمنام کال کر کے اس واقعے کے بارے میں بتائے اور اس کے بعد پولیس خود تفتیش کرتی رہتی۔ لاش مل جاتی تو فیڈر کو الیکٹرک چیئر یا ہمیشہ کے لیے جیل جانے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ لیکن وہ ایسا کوئی کام کرنے سے پہلے اس کے نتائج پر اچھی طرح غور کر لینا چاہتا تھا اور وہ اس وقت یہی سوچ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ اچھل پڑا۔ وہ اس پر غور کرنے لگا اور جیسے جیسے غور کر رہا تھا، یہ خیال اس کے دل کو بھا رہا تھا۔

اگلے دن دفتر سے آنے کے بعد پیٹر نے کچھ دیر تک مکان نمبر ایف ایک سوانیس کا معائنہ کیا اور پھر تیار ہو کر نیچے آیا۔ اس نے احتیاطاً گلی سے نکل کر سڑک کے ایک فون بوتھ کا رخ کیا اور اس میں گھس کر اس نے پہلے فون ڈائریکٹری اٹھائی۔ اس میں فیڈر جیک کے نام کی مدد سے مکان نمبر ایف ایک سوانیس کا فون نمبر نکالنے میں اسے چند منٹ لگے تھے۔ اس نے سلاٹ میں سکہ ڈالا اور نمبر ملایا۔ تیسری بیل پر کال ریسیو کی۔ ایک مردانہ آواز نے کہا۔

”فیڈر جیک۔“

پیٹر کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے آواز بنا کر کہا۔

”مجھے معلوم ہے کل رات تم نے کیا، کیا ہے؟“

فیڈر جیک خاموش ہو گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو اور بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ گزشتہ رات کے اپنے کارنامے کا کسی اور کے منہ سے ذکر سن کر اس کی حالت بری ہو گئی تھی۔ اس نے خاصی دیر بعد کہا۔ ”تم کون ہو؟“

”میں کوئی بھی ہوں لیکن ایک بات یاد رکھنا، میں تمہاری ایک ایک حرکت سے واقف ہوں اور جلد تم سے دوبارہ رابطہ کروں گا۔“ پیٹر نے کہا اور فون بند کر دیا۔ وہ فوراً گھر کی طرف بھاگا اور عجلت میں اپارٹمنٹ میں داخل ہو کر کھڑکی کا رخ کیا۔ دوربین وہیں رکھی تھی۔ جیسے ہی اس نے دوربین سے دیکھا۔ اسے فیڈر لان کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ اس جگہ آیا جہاں اس نے پاؤلا کو دفن کیا تھا۔ کچھ دیر وہ وہاں کھڑا معائنہ کرتا رہا پھر اس نے سر اٹھا کر اردگرد دیکھا۔ پیٹر ہڑبڑا کر پیچھے ہٹا کیونکہ فیڈر کی نظر اس کے اپارٹمنٹ کی کھڑکی کی طرف آئی تھی۔ پیٹر نے پردے کی اوٹ سے دیکھا۔ فیڈر کچھ دیر اس کی کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا پھر مڑ کر اندر چلا گیا۔ پیٹر کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

”کیا فیڈر جان گیا تھا کہ وہ اسے چھپ کر دیکھ رہا ہے؟“ اس نے سوچا۔ اگر فیڈر جان گیا تھا تو وہ شک کر سکتا تھا کہ اسے کال پیٹر نے کی ہے۔ کھڑکی کی مدد سے اس کا اپارٹمنٹ تلاش کر لینا کوئی مسئلہ نہیں تھا اور اس کے بعد... یہ سوچ کر ہی پیٹر کو پسینہ آنے لگا... فیڈر ایک قاتل تھا۔ اگر اسے پیٹر پر شک ہو جاتا تو وہ اسے بھی دنیا سے رخصت کر سکتا تھا۔ جو ایک بار کسی کو قتل کر دیتا ہے اس کے لیے دوبارہ قتل کرنا کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ پیٹر کے اندر ہول سے اٹھنے لگے۔ بنیادی طور پر وہ کم ہمت سے زیادہ بزدل آدمی تھا اور جہاں اسے کوئی خطرہ محسوس ہوتا اس کی حالت خراب ہو جاتی۔ وہ کمرے میں گھوم رہا تھا اور بار بار آ کر کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ فیڈر دوبارہ باہر نہیں آیا تھا لیکن پیٹر کی حالت خراب رہی

www.kahopakistan.com

اوراس نے فوری طور پر فیصلہ کرلیا کہ وہ اب اس معاملے سے دور رہے گا اور دوبارہ اس میں کوئی دخل نہیں دے گا۔

لیکن اگلی صبح جب وہ دفتر جارہا تھا تو اسے شدت سے اپنی بزدلی پر غصہ آیا تھا۔ اگر فیڈر کو اس پر شک بھی ہوگیا تب بھی وہ اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا اور پیٹر اگر پولیس کو فون کر دیتا تو وہ جیل جاتا۔ ڈرنا فیڈر کو چاہیے تھا اسے نہیں۔ لیکن وہ طبعی بزدلی کا کیا کرتا۔ وہ سارا دن دفتر میں یہی سوچ سوچ کر کڑھتا رہا۔ شام کو وہ دفتر سے نکلا تو اس کے اندر ایک جوش و ولولہ سا آگیا۔ اس نے پہلے ڈیرک کے بار کا رخ کیا۔ جہاں مقامی افراد کا گروپ موجود تھا اور حسب معمول ان کا موضوع پاؤلا اور فیڈر جیک تھے۔ بیل کہہ رہا تھا۔ ''حیرت کی بات ہے، دو دن سے پاؤلا نظر نہیں آرہی ہے۔''

پیٹر دل ہی دل میں مسکرایا۔ وہ کہاں سے نظر آتی جبکہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ یہ بے چارے سمجھ رہے تھے کہ پاؤلا زندہ ہے۔ ایک مقامی کہہ رہا تھا۔ ''فیڈر کو کم مت سمجھو وہ بہت خطرناک آدمی لگتا ہے شاید اسے ابھی اپنی بیوی کے کرتوتوں کا پتا نہیں ہے۔ جس روز اسے معلوم ہوگیا، وہ اسے قتل کردے گا۔''

''احمق آدمی... وہ دن آگیا ہے۔ فیڈر نے اپنی بیوی کو اس کے کرتوتوں کی وجہ سے قتل کر دیا ہے۔'' پیٹر نے دل میں کہا۔

وہ لوگ باتیں کرتے رہے اور پیٹر پیتا رہا۔ اس روز اس نے خلافِ معمول کئی جام چڑھا لیے۔ جب وہ بار سے نکلا تو اس کے ذہن پر خمار چھا رہا تھا۔ اس نے گھر کے بجائے فون بوتھ کا رخ کیا اور فیڈر کا نمبر ملایا۔

''تم؟'' دوسری طرف سے فیڈر نے فون اٹھایا۔

''ہاں، میں... میں نے سوچا تمہیں یاد دلا دوں... میں تمہیں بھولا نہیں ہوں۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟'' فیڈر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''میں کیا چاہ سکتا ہوں؟'' پیٹر کا لہجہ استہزائیہ ہوگیا۔

''تم مجھے بلیک میل کر کے رقم حاصل کرنا چاہتے ہو لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہے۔''

پیٹر نے فون بند کر دیا۔ اس نے یہ بات سوچی تھی مگر فیڈر سے کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا، جب فیڈر نے کہا تو اس نے بوکھلا کر فون بند کر دیا۔ بلیک میلنگ آسان کام نہیں اس کے لیے بہت ہمت درکار ہوتی ہے جو پیٹر اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔ لیکن گھر آتے ہوئے اس نے سوچا کہ جب فیڈر نے خود کہہ دیا ہے تو اسے بات تو کر کے دیکھنا چاہیے۔ ممکن ہے وہ اس سے کچھ رقم نکلوانے میں کامیاب ہوجائے۔ فیڈر دولت مند تھا تبھی تو کم سے کم ڈیڑھ ملین ڈالرز کے مکان کا مالک تھا۔ یقیناً وہ کروڑ پتی تھا۔ اگر اس سے ایک آدھ ملین مل جاتے تو اسے تو اتنا فرق نہیں پڑتا لیکن پیٹر کے وارے نیارے ہو جاتے۔

گھر آنے کے بعد اس نے بیڈ روم کی روشنی بند رہنے دی اور بہت احتیاط سے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دوربین سے فیڈر کے گھر کا معائنہ کیا اور فیڈر اسے لان میں ٹہلتا نظر آگیا۔ وہ پریشان لگ رہا تھا۔ یقیناً پیٹر کی فون کال نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ پیٹر اس کی حالت دیکھ کر دل میں محظوظ ہونے لگا۔ وہ پیٹر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا کیونکہ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کون ہے۔ جب فیڈر اپنے گھر کے اندر چلا گیا تو پیٹر بھی خوش خوش رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گیا۔ اگلے دو دن وہ فیڈر سے رقم حاصل کرنے کے بارے میں غور کرتا رہا۔ وہ اصل میں ایسے طریقے پر غور کر رہا تھا کہ رقم بھی مل جائے اور وہ پھنسے بھی نہیں۔ بلیک میلنگ قابلِ سزا جرم ہے اور وہ ایک قتل کو چھپانے میں شامل ہوگیا تھا۔ اگر معاملہ پولیس تک جا پہنچتا تو وہ لمبی مدت کے لیے جیل جا سکتا تھا۔

تیسرے دن وہ دفتر سے نکلا، پہلے ڈیرک کے بار پہنچا لیکن اس روز وہاں کوئی نہیں تھا جو پاؤلا اور فیڈر پر بات کر رہا ہو۔ ڈیرک بھی میز چمکانے میں مصروف تھا۔ پیٹر دو جام لے کر وہاں سے اٹھ آیا۔ وہ متذبذب تھا کہ کیا کرے؟ گھر جائے یا فون بوتھ کا رخ کرے؟ آخر اس نے کال کرنے کا فیصلہ کیا۔ فیڈر نے پہلی بیل بجنے سے پہلے ہی ریسیور اٹھا لیا، جیسے وہ اسی کا منتظر تھا۔

''تم؟'' اس نے کہا۔

''ہاں میں نے سوچا کہ تمہیں موقع دوں۔'' پیٹر ہنسا۔ آج وہ خود کو بہت پُراعتماد محسوس کر رہا تھا۔ ''تم نے اس دوران میں خوب غور کیا ہوگا؟''

''کس بات پر؟''

''یہی کہ اپنی جان اور آزادی بچانے کی تم کیا قیمت ادا کر سکتے ہو؟''

''اوہ۔'' فیڈر نے آہستہ سے کہا۔ ''تو میرا اندازہ درست تھا، تم مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''ہاں، تمہارا اندازہ درست نکلا۔'' پیٹر نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟'' فیڈر کا لہجہ سرد ہوگیا۔

''ہاں تم بہت خطرناک انسان ہو... قتل وغیرہ کر دیتے ہو اور لاشیں وغیرہ خود دفنا بھی دیتے ہو... لیکن مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''فرق تمہیں اس وقت پڑے گا جب تم میرے سامنے آؤ گے۔''

''میں تمہارے سامنے کیوں آؤں گا جبکہ تم مجھے جانتے ہی نہیں ہو۔'' پیٹر کا لہجہ مزید مذاق اڑانے والا ہوگیا۔

فیڈر کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ہاں میں تمہیں واقعی نہیں جانتا۔ بہرحال تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

پیٹر نے ہمت کی اور دل کڑا کر کے بولا۔ ''ایک ملین۔''

''ایک ملین کے بارے میں جانتے ہو کہ یہ کتنی بڑی رقم ہے۔''

''میں نے کبھی ایک ملین نہیں دیکھے لیکن تم نے دیکھے ہوں گے اور زندہ رہو گے تو مزید دیکھ لو گے۔ بشرطیکہ زندہ رہے۔''

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟''

''نہیں... لیکن میں نے پولیس کو ایک کال کر دی تو تم سوچ لو کہ پھر کیا ہوگا۔''

''اوکے... میں تمہارا مطالبہ پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

پیٹر خوش ہوگیا۔ ''کل میں تمہیں اسی وقت فون کر کے بتاؤں گا کہ رقم کب اور کہاں دینی ہے۔''

پیٹر فون رکھ کر بوتھ سے باہر آیا تو بہت خوش تھا۔ اگر اس کے پاس ایک ملین ڈالرز آجاتے تو اسے یہ معمولی سی نوکری کرنے کی ضرورت نہیں رہتی جس سے اسے مشکل سے پانچ سو ڈالرز ہفتہ ملتے تھے اور نہ اس معمولی سے فلیٹ رہنا پڑتا۔ وہ ایک ملین ڈالرز کہیں انویسٹ کر دیتا تو اسے آرام سے ماہانہ آٹھ نو ہزار ڈالرز ملتے رہتے اور اس رقم سے وہ قسطوں میں کوئی اچھا مکان خرید سکتا تھا اور قسطوں پر ہی گاڑی اور دوسری چیزیں لے سکتا تھا۔ سال میں دو بار تفریح کرنے کے لیے کہیں جا سکتا تھا۔ اسے صبح سے شام تک ملازمت میں سر کھپانا نہیں پڑتا۔ ایک ملین ڈالرز اس کا ہر مسئلہ حل کر سکتا تھا۔ وہ گھر آیا تب بھی بہت خوش تھا اور اسی خوشی میں اس نے پردہ اٹھا کر فیڈر کے مکان کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

اگلے روز پیٹر دفتر نہیں گیا۔ اسے ایک ملین ڈالرز کی رقم تو نہیں ملی تھی لیکن اسے ابھی سے دفتر سے نفرت ہوگئی تھی۔ اس نے فون کر کے کہہ دیا کہ اس کی طبیعت خراب ہے اور وہ آج دفتر نہیں آسکے گا۔ اس نے دل میں سوچ لیا کہ جب تک اسے رقم نہیں مل جاتی اُس کی طبیعت کی خرابی اسی طرح جاری رہے گی۔ وہ سارا دن گھر میں آرام کرتا رہا اور اپنی آنے والی زندگی کا سوچ کر لطف اندوز ہوتا رہا۔ شام کو وہ اٹھا اور اس نے تیار ہو کر بار کا رخ کیا اس کا ارادہ فیڈر سے بات کرنے سے پہلے وہسکی کے چند پیگ لینے کا تھا۔ اس کا تجربہ تھا کہ پینے کے بعد اس کے اندر ہمت آجاتی تھی۔ ڈیرک اور بیل رازدارانہ انداز میں بات کر رہے تھے۔ پیٹر نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اس نے جلدی جلدی تین پیگ حلق سے اتارے۔ رقم ادا کی اور باہر جانے لگا کہ اس نے بیل کی آواز سنی۔

''کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ فیڈر ایسا آدمی نکلے گا اب سب محلے والوں کو محتاط رہنا ہوگا۔''

پیٹر رک گیا اور بلاوجہ اپنی پتلون جھاڑنے لگا۔

ڈیرک بولا۔ ''ہاں ایسے لوگوں سے محتاط رہنا چاہیے۔''

''کیا پولیس کو اس کے خلاف درخواست دینی چاہیے؟'' بیل نے کہا۔

''نہیں یہ تو بیل کو دعوت دینے والی بات ہوگی۔'' ڈیرک نے انکار کیا۔ ''وہ دشمن بن جائے گا۔ جہاں تک ممکن ہو ایسے لوگوں سے زیادہ سے زیادہ دور رہا جائے۔''

پیٹر کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ فیڈر اتنا خطرناک شخص ہے کہ محلے والے اس سے محتاط رہنے کا سوچ رہے ہیں اور وہ اسے بلیک میل کرنے جا رہا تھا۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر نہیں رہی... باہر نکل کر اس نے چند گہرے سانس لیے تو خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ اس نے خود کو تسلی دی کہ فیڈر اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اس لیے وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ پیٹر فون بوتھ تک آیا۔ اس نے اندر داخل ہو کر ریسیور اٹھایا اور فیڈر کا نمبر ملایا۔ اس بار خاصی دیر بیل جاتی رہی پھر اس نے کال ریسیو کی۔

''فیڈر جیک۔''

''میں بات کر رہا ہوں۔ رقم تیار ہے؟''

''ہاں، کہاں پہنچانی ہے۔''

www.kahopakistan.com

درحقیقت پیٹر نے سوچا نہیں تھا کہ رقم اسے کیسے اور کہاں منگوانی ہے۔ اس نے بوکھلا کر کہا۔ ''یہ میں تمہیں کل بتاؤں گا۔''

وہ فون بند کر کے بوتھ سے باہر نکل آیا اور خود کو کوسنے لگا۔ اس نے کل سے اب تک اس بارے میں سوچنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔ اب اسے سوچنا تھا۔ وہ بے خیالی میں چل رہا تھا کہ عقب سے کسی نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اس نے بوکھلا کر دیکھا۔ وہ ایک گرانڈیل آدمی تھا اور سخت نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پیٹر کے پیٹ میں مارے خوف کے گرہیں سی پڑنے لگیں۔ اس نے تھوک نگل کر کہا۔ ''کک... کون ہو تم؟''

اس شخص نے جواب دینے کے بجائے پیٹر کو چھوٹی سی بغلی گلی میں دھکیلا اور... دیوار سے لگا دیا۔ ویسے وہ سڑک بھی ویران تھی جس پر اس شخص نے پیٹر کو گھیرا تھا۔ لیکن اس گلی میں تو دور دور تک کسی کا نام و نشان نہیں تھا۔ اگر وہ شخص پیٹر کو قتل کر دیتا تو اسے روکنے اور دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ پیٹر نے کانپنا شروع کر دیا۔ اس شخص نے پیٹر کی گردن دباتے ہوئے کہا۔

''ابھی بوتھ نمبر بارہ سے تم کال کر رہے تھے؟''

اس کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی خون خوار درندہ انسانی لہجے میں بولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پیٹر نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ ''ہاں... مم... میں ہی کر رہا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' گرانڈیل شخص نے کہا اور اچانک پیٹر کا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ پیٹر فوراً بے ہوش ہو گیا جب اسے ہوش آیا تو اسے لگا جیسے اس کے سر کے اندر کنکریٹ مکسر چل رہا ہو اور اس مکسر میں اس کا دماغ الٹ پلٹ ہو رہا ہو۔ کسی نے اسے امونیا سونگھائی تو وہ تیزی سے ہوش میں آ گیا لیکن اس سے اس کے سر کے درد میں کمی نہیں آئی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ ایک کھلی جگہ پڑا تھا۔ یہ کسی کوٹھی کا لان تھا اور اس کے سامنے وہی گرانڈیل شخص کھڑا تھا۔ امونیا اسی نے سونگھائی تھی۔ اسے دیکھ کر پیٹر سہم گیا۔

''تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟''

''تمہارا نام پیٹر جوزف ہے۔'' گرانڈیل آدمی کے بجائے کسی اور نے کہا۔ پیٹر اس طرف مڑا وہ زمین سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے درد میں تو کمی نہیں آئی تھی لیکن چکر کم ہو گئے تھے۔ اس طرف ایک کسی قدر موٹا اور قیمتی سوٹ پہنا شخص کھڑا تھا۔ وہ ہوانا سگار پی رہا تھا اور اس کے کوٹ سے سونے کی موٹی اور وزنی چین لٹک رہی تھی۔ اس نے تین انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ چہرے سے وہ کوئی خطرناک شخص لگ رہا تھا۔ پیٹر نے تھوک نگل کر کہا۔

''میرا نام ہی پیٹر جوزف ہے۔''

''تم نے فون بوتھ نمبر بارہ سے اس نمبر پر کال کی تھی۔'' موٹے آدمی نے کہا اور نمبر دہرایا۔

پیٹر کا گلا خشک ہو گیا لیکن وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ''جی جناب ملایا تھا۔''

''اور مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی؟'' آدمی کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ پیٹر نے چونک کر اسے دیکھا اور تردید کی۔

''نہیں جناب یہ غلط ہے میں نے آپ کو بلیک میل نہیں کیا ہے۔''

''بکواس مت کرو۔ تم نے کئی مرتبہ میرے نمبر پر کال کی اور مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ ویسے تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

اس بار پیٹر کا گلا ہی نہیں دم بھی خشک ہو گیا۔ یہ کوئی بڑا گھپلا ہو گیا تھا۔ اس نے بوکھلا کر کہا۔ ''ایک منٹ جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں تو فیڈرجیک کو کال کرتا تھا۔''

''میں ہی فیڈرجیک ہوں۔'' اس نے پیٹر کے منہ کے عین سامنے منہ لا کر کہا۔ ''غور سے دیکھو مجھے۔''

پیٹر پہلے ہی یہ کام کر رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ مرد جس نے سوئمنگ پول میں پاؤلا کو قتل کیا تھا، یہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ درمیانی جسامت کا اور کسی قدر خوبرو شخص تھا جبکہ اسے کسی طرح بھی خوبرو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ہوئی تھی۔ فیڈرجیک نے گرانڈیل شخص کی طرف دیکھا تو اس نے پستول نکال لیا اور اس کا میگزین چیک کرنے لگا۔ پیٹر کی حالت غیر ہونے لگی، اس نے جلدی سے کہا۔

''خدا کے لیے میری بات سنو، تم وہ شخص نہیں ہو جسے میں فون کرتا ہوں۔''

''بکواس مت کرو، تم نے مجھے رات والی بات کا حوالہ دیا تھا۔'' فیڈرجیک غرایا۔ ''اس سے تمہاری کیا مراد تھی؟''

''پاؤلا تمہاری بیوی کا نام ہے؟''

''ہاں اور اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''کچھ نہیں جناب... کچھ بھی نہیں... میں تو سمجھا تھا کہ تم نے اپنی بیوی پاؤلا کو قتل کر دیا ہے۔''

فیڈرجیک اچھل پڑا۔ ''تمہارا دماغ خراب ہے، میں اپنی بیوی کو کیوں قتل کرنے لگا؟''

پیٹر کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ مارے خوف کے اس کے منہ سے سب کچھ خود بہ خود نکلا جا رہا تھا۔ ''وہ ڈیرک کے بار میں سب لوگ بات کرتے ہیں کہ پاؤلا تم سے بے وفائی کر رہی ہے اور نت نئے مردوں کے ساتھ اس کا چکر چلتا ہے۔''

فیڈرجیک کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''اچھا علاقے والے یہ باتیں کر رہے ہیں اور مجھے خبر ہی نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے خون خوار نظروں سے گرانڈیل آدمی کو دیکھا تو اس نے جلدی سے کہا۔

''باس سچ کہہ رہا ہوں، مجھے اس معاملے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔''

''خیر اس مسئلے کو بعد میں دیکھیں گے۔'' فیڈرجیک نے ذرا معنی خیز انداز میں کہا اور پیٹر کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تمہیں یہ شبہ کیوں ہوا کہ میں نے پاؤلا کو قتل کر دیا ہے؟''

پیٹر نے بے چارگی سے اسے دیکھا۔ ''وہ اصل میں میں کسی اور کو فیڈرجیک سمجھ رہا تھا۔ ڈیرک کے بار میں جب تمہارا اور پاؤلا کا ذکر ہوا تو میں سمجھا کہ وہ دونوں فیڈر اور پاؤلا ہیں۔''

''سوال اب بھی وہی ہے تمہیں کیسے پتا چلا کہ کسی پاؤلا کو قتل کر دیا گیا ہے۔''

اس سے پہلے پیٹر کوئی جواب دیتا، ایک عورت لہراتی اور بل کھاتی ہوئی وہاں چلی آئی۔ اس نے فیڈرجیک سے کہا۔ ''ڈیئر کیا چلنا نہیں ہے، پارٹی شروع ہونے والی ہو گی۔''

''ابھی میں نہیں جا سکتا۔ تم چلی جاؤ میں کچھ دیر بعد آ جاؤں گا۔'' فیڈرجیک نے انکار کیا تو عورت نے برا سا منہ بنایا اور اسی طرح لہراتی اور بل کھاتی چلی گئی۔ وہ بھی اس عورت کی طرح دلکش اور حسین تھی لیکن اس جیسی بات نہیں تھی۔ فیڈرجیک نے اس کے جاتے ہی سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر ملا کر بولا۔ ''آج اور اسی وقت سے پاؤلا پر مکمل نظر رکھنی ہے۔ وہ کہاں جاتی ہے اور کس سے ملتی ہے۔'' اس نے یہ کہہ کر سیل فون واپس کوٹ میں رکھ لیا اور پیٹر کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے؟ تم نے پاؤلا کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔''

فیڈرجیک نے ایک بار پھر اس کی ناک سے ناک ملا کر کہا۔ ''احمق آدمی ابھی جو حرافہ یہاں سے گئی ہے وہی پاؤلا ہے اور وہ ابھی تک سو فی صد زندہ ہے۔''

پیٹر کی حالت اس حد تک غیر ہو چکی تھی کہ اس کا اپنے جسم پر قابو ختم ہو گیا۔ اور اس کی پتلون گیلی ہو گئی لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ فیڈرجیک اس سے دور ہو گیا۔ اس نے کوٹ سے رومال نکال کر منہ پر رکھ لیا۔

''یہ... ٹھیک ہے جناب... وہ عورت پاؤلا نہیں... تھی لیکن میں سمجھا تھا کہ وہ پاؤلا ہے۔''

''کیوں سمجھے تھے؟'' فیڈرجیک نے پاؤں پٹخ کر پوچھا۔

''وہ میں نے اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے اس عورت کو دیکھا تھا۔ اس کے شوہر نے اسے سوئمنگ پول میں ڈبو کر مار دیا تھا۔''

''پھر تم نے کیا کیا، پولیس کو اطلاع دی؟'' فیڈرجیک رفتہ رفتہ اس کی بات سمجھنے لگا۔

''نہیں جناب... میں نے تمہیں وہ سمجھ کر کال کر دی۔''

''تم نے میرا نمبر کہاں سے لیا؟''

''فون ڈائریکٹری سے جناب۔''

''یعنی تم سمجھے کہ اس عورت کو قتل کرنے والا شخص فیڈرجیک ہے اور عورت پاؤلا ہے؟''

''جی جناب۔''

''ٹھیک ہے لیکن تم نے اپنے اپارٹمنٹ سے کیسے دیکھ لیا؟''

''وہ میرا اپارٹمنٹ بالکل اس مکان کے سامنے ہے اور وہاں سے سوئمنگ پول صاف نظر آتا ہے۔'' پیٹر نے کہا اور اسی لمحے اس کی نظر سامنے گئی اور اسے دور اپنے اپارٹمنٹ والی عمارت نظر آئی اور مزے کی بات تھی کہ اس کے اپارٹمنٹ کی کھڑکی بھی نظر آ رہی تھی لیکن وہ یہاں سے بہت دور تھی۔ پیٹر ایک لمحے کو چکرا گیا کہ اس کے اپارٹمنٹ سے یہ جگہ یا اس جگہ سے اس کا اپارٹمنٹ کیسے نظر آ رہا ہے۔ پھر وہ سمجھ گیا۔ اصل میں یہ مکان سوئمنگ پول والے مکان کے ساتھ ملا ہوا تھا اور اس کی گلی دوسری طرف تھی۔ یعنی محلہ ایک ہی تھا۔

''کیا اس مکان کا نمبر ایف ایک سو انیس ہے؟''

''ہاں یہی میرے مکان کا نمبر ہے۔''

''تب سوئمنگ پول والا مکان تمہارے مکان کے

www.kahopakistan.com

بالکل پیچھے ہے۔'' پیٹر نے انکشاف کیا۔ ''وہ دیکھو یہاں سے میرا اپارٹمنٹ صاف نظر آرہا ہے۔''

فیڈر جیک ایک بار پھر اچھل پڑا۔ ''میرے پیچھے والا مکان... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

گرانڈیل آدمی بھی چونکا اور اس نے جھک کر آہستہ سے فیڈر جیک کے کان میں کہا۔ ''کہیں یہ جینٹ والے مکان کی بات تو نہیں کر رہا ہے؟''

فیڈر جیک کا چہرہ یک دم ہی سفید پڑ گیا۔ اس نے پیٹر کا گریبان پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ ''جو عورت سوئمنگ پول میں مرد کے ہاتھوں ماری گئی، اس کا حلیہ کیسا تھا؟''

پیٹر کو اس کا جغرافیہ از بر تھا۔ اس نے فر فر سب بتا دیا اور جیسے جیسے وہ بتا رہا تھا فیڈر جیک کا چہرہ سفید سے سرخ اور پھر سرخ تر ہوتا جا رہا تھا۔ آخر میں اس نے پیٹر کو گرانڈیل آدمی کی طرف دھکیلا۔ ''اگر یہ سب سچ نکلا تو میں تم دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دوں گا۔''

پیٹر نے دوسرے کے بارے میں نہیں پوچھا۔ وہ تو اپنے دفن کیے جانے کی اطلاع پر ہی ادھ مرا ہو گیا تھا اور عملاً گرانڈیل آدمی کے ہاتھوں میں جھول گیا۔ گرانڈیل آدمی نے اس سے پوچھا۔ ''اس کا کیا کرنا ہے باس؟''

فیڈر جیک اپنے انداز اور اپنے گرگے کی وجہ سے کوئی اونچے درجے کا جرائم پیشہ لگ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اسے لے کر میرے ساتھ آؤ پہلے تو میں اس حرامزادے سے نمٹوں گا۔''

پیٹر ان دونوں کے ساتھ گھسٹ رہا تھا۔ وہ مکان کی عقبی دیوار تک آئے۔ فیڈر جیک نے دیوار پر ہاتھ پھیرا اور نہ جانے اس کا کون سا حصہ دبایا کہ دیوار کا ایک حصہ کسی دروازے کی طرح کھل گیا۔ یہ منقش پتھروں سے بنی دیوار تھی اور اس میں ایسے کسی دروازے کا پتا چلانا ناممکن تھا۔ وہ دوسری طرف آگئے اور فیڈر جیک نے اسی طرح دروازہ بند کر دیا۔ اب بھی پیٹر نہیں دیکھ سکا کہ اس نے دیوار کا کون سا حصہ دبایا تھا۔ اتنا تو پیٹر سمجھ گیا تھا کہ یہ دوسرا اور وہی مکان تھا جس کے سوئمنگ پول میں وہ اس حسین عورت کو دیکھتا تھا لیکن فیڈر جیک کا اس مکان سے کیا تعلق تھا اور وہ کس حرامزادے سے نمٹنے جا رہا تھا؟ پیٹر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ فیڈر جیک سے اس بارے میں خود سے کوئی سوال کرتا۔

وہ عقبی سلائڈنگ گلاس ڈور کھسکا کر مکان کے اندر داخل ہوئے۔ کہیں سے ٹی وی چلنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ اسی طرف بڑھے۔ لاؤنج میں وہی خوبرو آدمی اس حال میں بیٹھا تھا کہ اس کے پاس رکھی وہسکی کی ایک پوری بوتل خالی ہو چکی تھی اور سامنے ٹی وی پر رگبی میچ آرہا تھا۔ وہ شخص خراٹے لے رہا تھا۔ فیڈر جیک نے پیٹر کی طرف دیکھا۔ ''یہ وہی شخص ہے جس پر تمہیں میرا شبہ ہوا تھا؟''

''جی جناب وہی ہے۔''

فیڈر جیک نے سوئے ہوئے شخص کو لات ماری تو وہ کرسی سے نیچے لڑھک گیا اور بدستور سوتا رہا۔ فیڈر جیک نے پاؤں نیچے اور گرانڈیل آدمی سے کہا۔ ''اسے ہوش میں لاؤ۔''

گرانڈیل آدمی نے جیب سے امونیا کی بوتل نکال کر اسے سونگھائی اور وہ ایک منٹ سے بھی پہلے ہوش میں آگیا۔ رہی سہی کسر ٹھنڈے پانی کے جگ نے پوری کر دی جو فیڈر جیک نے اس کے سر پر انڈیل دیا تھا۔ موسم سرد تھا اور وہ فوراً حواسوں میں آگیا۔ اس نے جھرجھری لی اور اٹھ بیٹھا۔ اس نے فیڈر جیک کو دیکھا تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ فیڈر جیک نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور خون خوار لہجے میں بولا۔

''جینٹ کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے منمنا کر کہا۔ ''وہ ایک رقعہ چھوڑ گئی تھی کہ تفریح کے لیے جنوب کی طرف جا رہی ہے۔ پھر اس نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔''

''بکواس مت کرو... وہ اس طرح نہیں جا سکتی۔''

آدمی اب پوری طرح ہوش میں آگیا تھا، اس نے لہجہ بدل کر کہا۔ ''تم اندر کیسے آئے؟''

''میں اندر کیسے آیا؟'' فیڈر جیک نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تم بھول رہے ہو یہ گھر میں نے تمہیں... بلکہ جینٹ کو لے کر دیا ہے۔''

''اس نے جینٹ کو قتل کر دیا ہے۔'' پیٹر بول اٹھا۔

آدمی بھونچکا رہ گیا۔ ''بکواس... یہ کون ہے؟''

''میں نے خود دیکھا تھا۔ اس نے سوئمنگ پول میں عورت کو پانی میں ڈبو کر مارا تھا۔'' پیٹر نے کہا

''یہ بکواس کر رہا ہے، ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔'' آدمی بولا لیکن اس کا لہجہ کمزور تھا۔

''اگر میں بکواس کر رہا ہوں تو تم نے اپنے لان میں کیا چیز دفن کی ہے۔'' پیٹر تیز لہجے میں بولا۔

فیڈر جیک دونوں کی باتیں سن رہا تھا، اس نے آدمی کی گردن دبوچ لی۔ ''راجر اگر یہ بات درست نکلی تو میں تمہیں اپنے ہاتھ سے مار کر اسی قبر میں دفن کر دوں گا۔''

راجر کا چہرہ سفید ہو گیا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ فیڈر جیک نے پیٹر کی طرف دیکھا۔ ''تم اس جگہ کی نشان دہی کر سکتے ہو جہاں اس نے کچھ دفن کیا تھا؟''

پیٹر نے سر ہلایا۔ ''کر سکتا ہوں لیکن کیا اس کے بعد تم مجھے جانے دو گے؟''

''ہاں میں تمہیں جانے دوں گا۔'' فیڈر جیک نے وعدہ کر لیا۔

وہ سب لان میں آئے۔ پیٹر نے اس جگہ کی نشان دہی کی جہاں راجر نے زمین میں ایک تھیلا دفن کیا تھا۔ فیڈر جیک کی ہدایت پر گرانڈیل آدمی اندر سے بیلچہ لے آیا اور وہ اس نے راجر کے حوالے کر دیا۔ ''زمین کھودو۔'' فیڈر جیک نے حکم دیا اور پستول بھی نکال لیا۔

راجر نے بادلِ ناخواستہ اس کے حکم کی تعمیل شروع کی اور آہستہ آہستہ زمین کھودنے لگا۔ پیٹر کے ساتھ اس کی حالت بھی بری ہو رہی تھی۔ پیٹر نے گھگیا کر فیڈر جیک سے کہا۔ ''تمہارا کام ہو گیا ہے اب مجھے جانے دو۔''

''اتنی جلدی بھی کیا ہے؟'' اس نے ایک خونی قسم کی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''ممکن ہے یہ قبر بھی کو بند کرنا پڑے۔''

اس کا مطلب سمجھ کر پیٹر کے جسم میں تھرتھری آگئی وہ اسے دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ راجر کی سست روی دیکھ کر فیڈر جیک نے اس کی کمر پر اچانک لات ماری اور وہ کھودے جانے والے گڑھے میں جا گرا۔ ''ہاتھ تیز چلاؤ ورنہ مجھے لاتیں چلانی پڑیں گی۔''

راجر خون کے گھونٹ پی کر اٹھا اور پھر سے بیلچہ سنبھال کر زمین کھودنے لگا۔ ساتھ ہی وہ کہنے لگا۔ ''تم جانتے ہو جینٹ صرف مجھ سے نہیں بلکہ تم سے بھی بے وفائی کر رہی تھی۔''

''بکواس، وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی کیونکہ وہ ایسا کرنے کا انجام جانتی ہے۔'' فیڈر جیک نے یقین سے کہا۔

راجر زمین کھودتے کھودتے رکا اور تلخ لہجے میں بولا۔ ''تم یہ بات اپنی بیوی کے بارے میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ جینٹ تو پھر بھی محبوبہ تھی۔ میں نے خود اسے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔''

''تم اپنے جرم کا جواز پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''اگر تم پاؤلا کو بے وفائی کرتے ہوئے پکڑ لو تو تم کیا کرو گے؟''

فیڈر جیک مسکرایا۔ ''تم پاؤلا اور جینٹ کو آپس میں ملا رہے ہو۔ پاؤلا میری بیوی ہے اور اسے دنیا بھر کی آسائشیں میں نے دی ہیں اس لیے اسے صرف میرا وفادار ہونا چاہیے۔ جبکہ جینٹ میری محبوبہ تھی اور تمہاری صرف دکھاوے کی بیوی تھی۔ یہ گھر اور اس کی تمام سہولتیں اسے میں نے دے رکھی ہیں اس لیے اس کی وفاداری مجھ سے ہونی چاہیے تم سے نہیں۔''

پیٹر دنگ رہ گیا۔ اس کے سامنے فیڈر جیک، راجر کی بیوی کو اپنی محبوبہ قرار دے رہا تھا۔ راجر اتنا بے غیرت ہو گیا اس نے سوچا بھی نہیں تھا لیکن اتنا بے غیرت آدمی قاتل کیسے بن گیا۔ اس نے یہ سوال راجر سے کر لیا۔ ''تم نے جینٹ کو کیوں قتل کیا؟''

''تمہارے اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔'' راجر نے کھدائی کرتے ہوئے کہا۔

گرانڈیل آدمی گڑھے کے پاس کھڑا تھا۔ فیڈر جیک اور پیٹر گڑھے سے کچھ فاصلے پر تھے۔ راج نے اچھا خاصا گڑھا کھود لیا تھا اور اب وہ کمر تک اس میں تھا۔ اتنی دیر تک اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی اس لیے فیڈر جیک اور گرانڈیل آدمی اس کی طرف سے مطمئن تھے۔ اس لیے جب اچانک ہی اس نے بیلچہ گھما کر گرانڈیل آدمی کے پاؤں پر مارا تو وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکا اور چیخ مار کر نیچے گرا۔ بیلچے کی دھار نے اس کا پاؤں تقریباً کاٹ دیا تھا۔ راجر نے دوسرا وار اس کے سر پر کیا اور اس کی چیخ و پکار یک دم رک گئی۔ یہ کھڑا وار تھا اور بیلچہ اس کے سر میں اتر گیا۔

فیڈر جیک پہلے تو دنگ رہ گیا پھر اس نے چونک کر عجلت میں راجر پر فائر کیا اور ایک زوردار دھماکا ہوا گولی راجر کے شانے پر لگی، وہ گڑھے سے نکل رہا تھا گولی کھا کر گرانڈیل آدمی کے اوپر گرا... فیڈر جیک آگے آیا اور دانت پیس کر لرزتے راجر کو گالی دی اور دو گولیاں مزید اس کی پشت میں اتار دیں۔ راجر کا جسم جھٹکا لے کر ساکت ہو گیا۔ پیٹر یہ سب دیکھتے ہوئے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کے سامنے دو افراد مر چکے تھے اور اب اس کی باری تھی۔ فیڈر جیک نے اس کی طرف دیکھا اور پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ ''مجھے افسوس ہے تم لالچ میں آکر اس چکر میں شامل ہوئے اور اب اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

''پلیز...'' پیٹر نے کہا لیکن فیڈر جیک کو پستول سیدھا کرتے دیکھ کر اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک دھماکا ہوا اور اس کے بعد لگاتار کئی دھماکے ہوئے۔ ہر

www.kahopakistan.com

دھما کے پر پیٹر کے جسم کو جھٹکا لگتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے تکلیف کیوں نہیں ہو رہی ہے۔ پھر کسی کے دھپ سے گرنے کی آواز آئی تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ فیڈر جیک اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا اور پشت سے اس کا کوٹ خون میں تر ہو رہا تھا۔ راجر کا ہاتھ اٹھا ہوا تھا اور اس میں گرانڈیل آدمی کا پستول تھا۔ پھر راجر کا ہاتھ گر گیا اور وہ دوبارہ ساکت ہو گیا۔

وہ مرا نہیں تھا اور موقع ملا تو اس نے مرنے سے پہلے اپنے قاتل کو مار دیا۔ گرانڈیل آدمی بھی مر چکا تھا کیونکہ بیلچے کی دھار کوئی تین انچ اس کے سر میں اتر گئی تھی۔

فضا میں پولیس سائرن کی آواز گونجی تو پیٹر کو جیسے ہوش آیا اس نے جھرجھری لے کر چاروں طرف دیکھا اور پھر دروازے کی طرف بھاگا۔ پولیس کی آمد سے پہلے ہی وہ گیٹ سے نکل کر فٹ پاتھ پر اپنے اپارٹمنٹ کی طرف جانے لگا۔ وہ کوئی بیس قدم دور گیا ہوگا کہ پولیس کی گاڑیاں راجر کے مکان کے سامنے رکیں۔ پیٹر ڈر گیا.... اور اسے محسوس ہوا کہ ابھی اسے روک لیا جائے گا لیکن پولیس نے اسے عام راہگیر سمجھ کر توجہ نہیں دی اور وہ سڑک عبور کر کے عمارت میں داخل ہو گیا۔ پھر اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی وہ کھڑکی کی طرف لپکا اور پردہ ذرا سا سرکا کر دوربین سے جائزہ لینے لگا۔ پولیس والے لاشوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ یقیناً کسی نے فائرنگ کی آواز سن کر پولیس کو کال کی تھی۔ پولیس والوں کا اطمینان بتا رہا تھا کہ وہاں کوئی زندہ نہیں ہے اور انہیں ایمبولینس طلب کرنے کے بجائے صرف ضابطے کی کارروائی کرنا تھی۔ البتہ کچھ پولیس مین کھودے جانے والے گڑھے کی مزید کھدائی شروع کر چکے تھے اور دس منٹ کے اندر انہوں نے جینٹ کی لاش بھی تلاش کر لی۔

پولیس وہاں دو گھنٹے رہی اور پھر لاشیں سمیٹ کر رخصت ہو گئی۔ اس دوران میں پیٹر ایک عام آدمی ہونے پر خدا کا شکر ادا کرتا رہا کیونکہ اس نے خاص آدمیوں کا انجام دیکھ لیا تھا اور اس نے عہد کیا کہ وہ ایسی ہی عام زندگی گزارے گا اور اب کبھی لالچ نہیں کرے گا۔ وہ دنیا سے اور پھر جیل جانے سے بال بال بچا تھا اس لیے اسے اپنا عام سا فلیٹ بہت پیارا لگ رہا تھا۔ اسے اپنا دفتر اتنا اچھا لگنے لگا تھا کہ وہ ابھی سے دفتر جانے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

اگلے روز وہ دفتر پہنچا تو بیزار ہونے کے بجائے اتنا خوش تھا کہ اس کے ساتھی حیران رہ گئے۔ اگلے دو دن دفتر میں پیٹر میں آنے والی تبدیلی موضوعِ بحث رہی۔ تیسرے دن پیٹر دفتر سے آیا اور اپنے لیے کھانا گرم کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور پھر اپنے سامنے پاؤلا کو دیکھ کر اس کا دل رک سا گیا۔ وہ اسے تو بھول ہی گیا تھا اور ظاہر ہے پھر یہ بھی بھول گیا تھا کہ پاؤلا اسے دیکھ چکی ہے۔ وہ فیڈر جیک تو نہیں تھی لیکن اس کی بیوی تو تھی اور اس کے مرنے کے بعد اس کے تمام امور کی ذمے دار بھی وہی تھی۔ پیٹر خوف سے ساکت ہو گیا اس لیے وہ اسے آرام سے ایک طرف کر کے خود اندر آ گئی اور دروازہ بھی بند کر دیا۔

''تم... تم۔'' پیٹر ہکلایا۔

وہ دل کش انداز میں مسکرائی۔ ''ہاں میں... تم ڈر رہے ہو؟''

پیٹر نے بے چارگی سے کہا۔ ''تو اور کیا کروں... پرسوں سے خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ جان بچ گئی لیکن لگتا ہے...''

''میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانے نہیں آئی ہوں۔'' پاؤلا نے اس کی بات کاٹ کر اسے تسلی دی۔ ''میں تو تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں کہ تمہاری وجہ سے مجھے فیڈر سے نجات مل گئی۔''

''تم اس کی بیوی تھیں؟''

''ہاں، ایک مافیا باس کی بیوی کیسی ہوتی ہے میں ایسی ہی بیوی تھی۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''جب تک وہ نہیں مرتا مجھے آزادی نہیں ملتی اور تمہاری وجہ سے مجھے آزادی مل گئی ہے۔''

پاؤلا نے کہتے کہتے اچانک اپنا چہرہ اس کے چہرے سے لگا دیا۔ پیٹر سحر زدہ رہ گیا۔ جب پاؤلا الگ ہوئی تب بھی اس کے چہرے پر کچھ ایسے ہی تاثرات تھے۔ پاؤلا شرارت سے مسکرائی۔ ''بس اب ہوش میں آ جاؤ... یہ صرف شکریہ تھا۔''

پیٹر چونکا اور پھر جھینپ کر اپنا منہ صاف کرنے لگا۔ ''گویا تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے؟''

''بالکل بھی نہیں ہے۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھی اور پھر رک گئی، اس نے اپنے پرس سے ایک موٹا سا لفافہ نکالا۔ ''یہ میری طرف سے ہے۔ میری خواہش ہے تم کسی اچھے سے تفریحی مقام پر چند دن گزار کر آؤ۔'' اس نے لفافہ میز پر رکھ دیا اور باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد پیٹر نے لفافے میں جھانکا، یہ دس ہزار ڈالرز کی رقم تھی۔ اسے ایک ملین ڈالرز تو نہیں لیکن ان کا سواں حصہ مل گیا تھا اور سب سے بڑھ کر وہ زندہ بچ گیا تھا۔

پہلا رنگ

کڑی مسافتیں

سلیم فاروقی

موسم بدلتا ہے تو اس کے آثار نظر آنے لگتے ہیں کہ... اب کچھ ہونے کو ہے... مگر کچھ طوفانِ بادوباراں اس قدر خاموشی سے وارد ہوتے ہیں کہ اس کی زد میں آکر ہر شے خس و خاشاک کی طرح بہتی چلی جاتی ہے... جس کے تباہ ہونے کا کبھی گمان بھی نہیں ہوتا... ایک ایسے ہی نوجوان کی حیاتِ طلسم کدہ... جس کی زندگی مصائب کے لامتناہی سلسلے کی لپیٹ میں آتی چلی گئی... اور کوئی خوش تدبیری بھی اس کی زندگی پر چھائی تاریکی کا ازالہ نہ کر سکی...

زندگی کے منجدھار میں ڈوبتی ابھرتی ناؤ جس کے پتوار زمانہ شناس مہاریوں کے ہاتھ میں ہے

افضل کے ہوٹل میں اس وقت بہت رش تھا۔ صبح کا وقت تھا اس لیے کام پر جانے والے مزدور، فیکٹری ورکرز اور دفتروں کے بابو بھی یہ چاہ رہے تھے کہ انہیں پہلے فارغ کر دیا جائے۔

میں بھی وہاں کونے کی ایک میز پر موجود تھا۔ اس میز کا ٹاپ ماربل کا تھا اور وہ بھدے اور بے ڈھنگے پایوں پر کھڑی تھی۔ ہوٹل میں دیوار کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ فٹ چوڑی اور اس سے کچھ اونچی منڈیری بنا دی گئی تھی۔ یہ منڈیر بارڈر کی

www.kahopakistan.com

طرح ہوٹل کے تین طرف بنی ہوئی تھی۔ سامنے دروازہ تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی کاؤنٹر تھا جس پر افضل بیٹھتا تھا۔ دیوار کے ساتھ بنی ہوئی منڈیر دراصل کرسی کا کام دیتی تھی۔ اسی منڈیر کے سامنے بھدّے پایوں والی ماربل ٹاپ کی میزیں رکھی تھیں۔ دوسری طرف پلاسٹک کی کرسیاں تھیں۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ مجھے وہاں بیٹھے ہوئے دس منٹ سے زیادہ گزر گئے تھے لیکن ابھی تک ہوٹل کا واحد بیرا اکّو میری طرف نہیں آیا تھا۔ میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ ابھی شور شرابا کر دوں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میں ایسا کرتا تو افضل مجھے باہر کا راستہ دکھاتا۔

اس ہوٹل میں میرا کھاتا کھلا ہوا تھا اور میں افضل خان سے مہینے کے مہینے حساب کیا کرتا تھا۔ گزشتہ دو مہینے سے میں اس کی ادائیگی نہیں کر پایا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے ملازمت سے جواب مل گیا تھا اور آج کل میں ملازمت کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ یہ تو افضل کی مہربانی تھی کہ حساب بے باق نہ ہونے کے باوجود وہ مجھے اُدھار پر ناشتا اور رات کا کھانا دے رہا تھا۔ وہ کئی دفعہ اپنی رقم کا تقاضا بھی کر چکا تھا لیکن میں نے مختلف بہانے بنا کر اسے ٹال دیا تھا۔ میں نے البتہ اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں بے روزگار ہو گیا ہوں ورنہ وہ شاید مجھے اُدھار نہ دیتا۔

بالآخر اکّو میری طرف آ ہی گیا۔ میں نے اس سے ایک مسکہ بن اور چائے لانے کو کہا اور اخبار کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں جو ایک موٹے سے آدمی کے ہاتھ میں تھا۔ یوں بھی وہ اخبار مختلف ہاتھوں سے گزر کر بوسیدہ ہو چکا تھا۔ میں نے چائے سے بن کھانے کے بعد سگریٹ کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن جیب میں سگریٹ نہیں تھی۔ لائٹر البتہ موجود تھا۔

میرے سامنے بیٹھے ہوئے ایک مزدور نما شخص نے دو پراٹھے اور آملیٹ پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد ایک لمبی ڈکار لی اور جیب سے ریڈ اینڈ وائٹ سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ ہونٹوں میں دبالی۔ پھر اس نے ماچس کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا۔

میں نے جھٹ جیب سے لائٹر نکال کر اس کی سگریٹ سلگا دی۔ اس نے ایک لمبا کش لے کر ناک سے دھواں خارج کیا اور یوں بے نیازی سے مجھے دیکھا جیسے اس کی سگریٹ سلگانا میرا فرض ہو۔

میں نے ڈھیٹ بن کر کہا۔ ”صاحب! اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں ایک سگریٹ لے لوں؟ میرے سگریٹ ختم ہو گئے ہیں۔ ابھی میں...“

”لے لیں صاحب۔“ وہ شخص بے نیازی سے بولا۔ ”لیکن ہم ٹھہرے مزدور آدمی۔ یہ برانڈ آپ کو پسند نہیں آئے گا۔“

”چلے گا جناب!“ میں نے مسکرا کر کہا اور ایک سگریٹ نکال لیا۔

مجھے کہیں جانے کی جلدی نہیں تھی اس لیے میں اطمینان سے سگریٹ پیتا رہا۔

ہوٹل کا رش آہستہ آہستہ چھٹ گیا تھا۔ لوگ جلدی جلدی ناشتا کر کے اپنے کاموں پر جا چکے تھے۔ اب وہاں چند ہی لوگ تھے۔ مجھے سگریٹ پیش کرنے والا بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

افضل خان کی نظر اچانک مجھ پر پڑی۔ وہ ہنس کر بولا۔ ”کیا بات ہے افتخار بابو! آج کیا چھٹی کا موڈ ہے؟“

”نہیں خان!“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”بس جا ہی رہا ہوں۔ آج کل بڑا صاحب اسلام آباد گیا ہوا ہے اس لیے...“ یہ کہتا ہوا میں کھڑا ہو گیا۔

”آپ کے حساب میں پانچ ہزار چار سو تریپن روپے ہو گئے افتخار صاحب!“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے بے نیازی سے کہا۔ ”پچھلے دو مہینے سے کچھ اضافی اخراجات ایسے اچانک ہو گئے کہ میرا سارا بجٹ گڑبڑ ہو گیا۔ اس مہینے تنخواہ ملتے ہی سب سے پہلے میں تمہارا حساب بے باق کروں گا خان۔“

میں افضل خان کا ردِعمل دیکھے بغیر باہر نکل آیا۔

باہر آ کر میں بہت دیر تک بس اسٹاپ پر بیٹھا رہا۔ آفس کے ایک پرانے ساتھی نے مجھے ایک دفتر میں جاب بتائی تھی، وہاں کے جی ایم کے نام ایک خط بھی لکھا تھا۔ وہ خود دو سال قبل وہاں ملازمت کر چکا تھا۔ مجھے امید تو کم تھی کہ وہاں مجھے جاب مل ہی جائے گی لیکن قسمت یاور ہوتی تو مل بھی سکتی تھی۔ اس وقت بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ میرے پاس وہاں تک جانے کا کرایہ نہیں تھا۔ وہ آفس آئی آئی چندریگر روڈ پر تھا۔ میں اس وقت نارتھ کراچی میں تھا۔ وہاں سے پیدل بھی جاتا تو کم از کم آج دفتری اوقات میں تو وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ بس یا کوچ والے سے کہہ دوں کہ میرے پاس کرایہ نہیں ہے اور وہاں جانا ضروری ہے۔ کوچ اور بس والے ایسے موقعوں پر انکار نہیں کرتے تھے لیکن میری خودداری نے یہ گوارا نہیں کیا۔ کسی سے ادھار کرنا ایک علیحدہ مسئلہ تھا اور کرایہ نہ ہونے کا عذر پیش کرنا علیحدہ مسئلہ۔

میرے ظاہری حلیے سے کوئی یقین ہی نہیں کر سکتا تھا کہ میری جیب اس وقت بالکل خالی ہو گی۔

میری زندگی بھی مصائب، پریشانیوں اور جدوجہد سے عبارت تھی۔ یہ حالات میرے لیے کوئی نئے نہیں تھے اس لیے میں زیادہ فکرمند بھی نہیں تھا۔

میرے والد ایک سرکاری دفتر میں چپراسی تھے۔ وہ خود کو بہت فخر سے نائب قاصد کہتے تھے۔ قناعت پسند آدمی تھے اس لیے چپراسی کی اس معمولی تنخواہ میں بھی خوش تھے۔ مجھ سے بڑی ایک بہن سعدیہ بھی تھی۔ وہ بھی ابّو ہی کی طرح قناعت پسند لڑکی تھی۔

سعدیہ باجی میں اور مجھ میں تقریباً دس بارہ سال کا فرق تھا۔ اماں کے انتقال کے بعد سعدیہ باجی ہی نے مجھے پالا تھا۔ انہوں نے کبھی مجھے ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ ابّو کی قلیل تنخواہ میں وہ نہ صرف گزارہ کر لیتی تھیں بلکہ کچھ نہ کچھ پس انداز بھی کر لیتی تھیں۔ پھر محلے کی ایک عورت سے انہوں نے سلائی بھی سیکھ لی اور وہ گھر پر سلائی بھی کرنے لگیں۔ ابّو خود تو برائے نام پڑھے تھے لیکن اپنی اولاد کو زیادہ سے زیادہ پڑھانا چاہتے تھے۔

اماں کا انتقال ہوا تو سعدیہ باجی آٹھویں کلاس میں تھیں۔ انہوں نے پڑھائی چھوڑ کر گھر سنبھال لیا۔ ابّو نے بہت چاہا کہ سعدیہ باجی تعلیم جاری رکھیں لیکن اب یہ ممکن نہ تھا۔

میری عمر ان دنوں مشکل سے دو برس ہو گی... اماں کی موت کا مجھ پر کوئی اثر نہ پڑا۔ مجھے تو اس وقت اتنا شعور ہی نہ تھا۔

سعدیہ باجی نے تعلیم کو خیرباد کہا تو ابّو کی ساری توجہ مجھ پر مبذول ہو گئی۔

میں اسکول جانے کے قابل ہوا تو وہ مجھے خود ہی اسکول چھوڑ کر آتے تھے۔ حتی الامکان میری ہر فرمائش پوری کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے لیکن ابّو اور سعدیہ باجی کے بے جا لاڈ پیار نے مجھے بگاڑا نہیں۔

میں ذرا سمجھ دار ہوا تو مجھے بھی یہ احساس ہو گیا کہ ابّو کو میری ذات سے بہت امیدیں وابستہ ہیں، مجھے ان امیدوں پر پورا اترنا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں دل و جان سے پڑھنے لگا اور ہر کلاس میں نمایاں پوزیشن سے کامیابی حاصل کرنے لگا۔

میں ان دنوں میٹرک میں تھا جب سعدیہ باجی کا رشتہ آیا۔ ابّو کے کوئی دور پرے کے رشتے دار لاڑکانہ کے ایک چھوٹے سے قصبے.... میں رہتے تھے۔ وہاں ان کی کچھ زمینیں تھیں۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا غلام محمد بھی تھا۔ وہ سعدیہ باجی کے لیے اسی کا رشتہ لائے تھے۔

میں نے تو ان لوگوں کو زندگی میں پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ ابّو ان کی تعریفیں کرتے نہیں تھک رہے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ غلام محمد مجھے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ شکل صورت تو خیر اللہ بناتا ہے لیکن نشست برخاست، گفتگو کا ڈھنگ، لباس وغیرہ تو انسان کے ہاتھ میں ہے۔

وہ چٹا اَن پڑھ تھا۔ کہاں میری خوب صورت اور نرم و نازک سعدیہ باجی اور کہاں وہ سانڈ! پھر سعدیہ باجی نے تو آٹھویں تک تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ وہ بہت ذہین تھیں اور اپنی گفتگو سے خاصی پڑھی لکھی لگتی تھیں۔

بہرحال دو مہینے کے اندر اندر سعدیہ باجی کی شادی ہو گئی اور وہ ہم سے سیکڑوں میل دور چلی گئیں۔

ہمارے صرف ایک چچا تھے، صابر۔ وہ ابّو کے حقیقی بھائی تھے۔ ان کے حالات بھی کچھ اچھے نہیں تھے لیکن ہم سے خاصے بہتر تھے۔ وہ ایک بینک میں چپراسی تھے۔ وہ مجھ سے اور سعدیہ باجی سے بہت محبت کرتے تھے۔ چاچی نسیمہ بھی ہم دونوں پر جان چھڑکتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چاچا صابر بے اولاد تھے۔

سعدیہ باجی کی شادی کا تمام انتظام انہوں نے ہی کیا تھا۔ ابّو کے لاکھ منع کرنے کے باوجود چاچا نے سعدیہ باجی کو زیورات کا ایک سیٹ، ضرورت کی کئی دوسری چیزیں اور ایک ٹی وی بھی دیا تھا۔

میں ان دنوں فرسٹ ایئر میں تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں انجینئرنگ کالج میں داخلہ لوں گا اس لیے میں بہت دل لگا کر اور محنت سے پڑھ رہا تھا۔ میں نے ان دنوں کھیل کود اور تفریح اپنے اوپر حرام کر لی تھی۔ دل میں بس ایک ہی لگن تھی کہ پڑھ لکھ کر مجھے ابّو کے خوابوں کو تعبیر دینا ہے۔

ایک دن ابو دفتر سے واپس آئے تو مجھے ان کی طبیعت کچھ خراب لگی۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر عجیب سی گھبراہٹ کے تاثرات تھے۔

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ”ابّو! آپ ٹھیک تو ہیں؟“

”ہاں بیٹا! میں ٹھیک ہوں۔ بس کچھ تھکن سی محسوس ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر آرام کر لوں... گا... تو...“ ان کا جملہ ادھورا رہ گیا اور وہ پلنگ پر بیٹھے بیٹھے ایک طرف لڑھک گئے۔

”ابّو!“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”کیا ہوا آپ کو؟“

میری بات کا جواب دینے کے بجائے ابّو گہرے

www.kahopakistan.com

گہرے سانس لیتے رہے۔ ان کے چہرے پر شدید کرب و اذیت کے آثار تھے اور پسینا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں؟ میں نے سوچا کہ ڈاکٹر کو یہیں گھر پر بلالوں لیکن میرے لوٹنے تک ابّو اکیلے رہتے۔ میں انہیں اکیلا چھوڑنا نہیں چاہ رہا تھا۔

ان دنوں سیل فون تو آگئے تھے لیکن ابھی غریب اور متوسط طبقے کی پہنچ سے باہر تھے۔

میں نے محلے کے ایک بچے کو بلایا اور اس سے کہا کہ تم ابّو کا خیال رکھنا، میں ڈاکٹر صاحب کو لے کر آتا ہوں۔

ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر ڈاکٹر کا کلینک تھا۔ وہاں اچھے خاصے مریض تھے اور وہ سب اپنی اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

کمپاؤنڈر کے روکنے کے باوجود میں اسے دھکیل کر ڈاکٹر کے کمرے میں گھس گیا۔ وہ اس وقت ایک مریض کا چیک اپ کر رہا تھا۔ مجھے یوں کمرے میں گھستا دیکھ کر وہ بھڑک اٹھا اور درشت لہجے میں بولا۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے۔ جایئے، اپنی باری پر آیئے گا۔''

''ڈاکٹر صاحب!'' میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میرے ابّو کی حالت بہت خراب ہے۔ آپ پلیز انہیں دیکھ لیں۔''

''اچھا، آپ باہر بیٹھیں... میں ان صاحب کے بعد آپ کو بلواتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے نرم لہجے میں کہا۔

''ایک ایک لمحہ قیمتی ہے ڈاکٹر صاحب۔'' میں نے کہا۔

''بس دو منٹ۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب!'' وہ مریض بولا جس کا معائنہ ڈاکٹر کر رہا تھا۔ ''میرے خیال میں آپ ان صاحب کو پہلے دیکھ لیں، مجھے کوئی شدید تکلیف ہے نہ مجھے کہیں پہنچنے کی جلدی ہے۔''

میں کچھ فاصلے پر کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے نزدیک آنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''جناب! اب تو آپ خوش ہو جایئے... مریض کو اندر لے آئیں۔''

''ڈاکٹر صاحب!'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''ابّو کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ گھر پر ہیں۔''

''کیا...؟'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! وہ اس حالت میں نہیں ہیں کہ میں انہیں یہاں لاتا۔''

''آپ کا گھر کہاں ہے؟''

''بی ڈی اسحاق کے گھر کے سامنے۔''

''آپ باہر دیکھ رہے ہیں کہ کتنے مریض بیٹھے ہیں؟'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب پلیز!'' میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''ان مریضوں سے کسی کی حالت خدانخواستہ ایسی سنگین نہیں ہے۔ وہ انتظار کر سکتے ہیں۔ میرے ابّو کی زندگی کا سوال ہے۔''

ڈاکٹر نے چند لمحے غور کیا پھر بولا۔ ''چلیے، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔'' اس نے اپنا بیگ اٹھالیا۔

میں نے لپک کر بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور ہم کلینک سے باہر نکل آئے۔ وہاں بیٹھے ہوئے کئی مریضوں نے ہمیں ناگواری سے دیکھا۔ کمپاؤنڈر کے چہرے پر بھی ناگواری کے تاثرات تھے۔

میرا گھر وہاں سے دور نہیں تھا، اس کے باوجود ڈاکٹر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

دو منٹ سے بھی کم وقت میں ہم گھر پہنچ گئے۔

گڈو، ابّو کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر کمرے سے باہر نکل آیا اور مجھ سے بولا۔ ''افتخار بھائی! انکل تو سو گئے ہیں۔''

میں ڈاکٹر کو لے کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ ابّو پر نظر پڑتے ہی مجھے جھٹکا سا لگا۔ وہ خاصے غیر فطری انداز میں بستر پر پڑے ہوئے تھے۔ ان کی ادھ کھلی آنکھیں دروازے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

انہیں ایک نظر دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا کہ ابّو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اس کے باوجود مجھے ایک امید سی تھی کہ ممکن ہے ابّو تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو گئے ہوں۔ انسان بھی عجیب مخلوق ہے۔ آخری وقت تک امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔

ڈاکٹر صاحب نے آگے بڑھ کر ابّو کی نبض دیکھی، اسٹیتھواسکوپ کانوں سے لگا کر دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی، پھر دوبارہ نبض دیکھی۔ آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں اور مایوسی سے سر ہلا کر ابّو کا چہرہ چادر سے ڈھانپ دیا۔

میں نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''ڈاکٹر صاحب! کیا میرے ابّو...''

''سوری افتخار صاحب! ہی از نو مور۔''

''نہیں ڈاکٹر صاحب! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی تو ابّو بھلے چنگے آفس سے آئے تھے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ...''

''حوصلہ رکھیں افتخار صاحب! اور ان کے حق میں دعائے خیر کریں۔''

ڈاکٹر دروازے کی طرف بڑھا تو میں لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ کی فیس؟''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے بھلا کیا ہی کیا ہے؟''

''آپ یہاں تک آگئے، آپ کا یہی احسان کیا کم ہے؟ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے ڈاکٹر صاحب!''

''جی ہاں لیکن انسانی جان اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے، خدا حافظ۔'' اس نے میرے کندھا تھپتھپایا اور چلا گیا۔

ڈاکٹر کی یہ بات میرے دل پر نقش ہو گئی۔ وہ میرے لیے ان لوگوں میں سے تھا جن کا میں دل و جان سے احترام کرتا تھا۔

ابّو کے انتقال کے بعد میں بالکل اکیلا ہو گیا تھا۔ سعدیہ باجی اپنے بن مانس شوہر کے ساتھ آئی تھیں اور ابّو کا سوئم ہوتے ہی واپس چلی گئی تھیں۔ انہوں نے مجھے سمجھایا تھا۔ ''افتخار! اب تم شادی کر لو ورنہ اس تنہائی میں تم پاگل ہو جاؤ گے۔''

''شادی!'' میں نے تلخ ہنسی کے ساتھ کہا۔ ''کون دے گا مجھ نکمے اور کنگال کو اپنی بیٹی؟''

''ارے لڑکیاں بہت... تم ہامی تو بھرو۔''

''نہیں باجی! میں خود ابھی شادی کے حق میں نہیں ہوں۔ میں اپنے پیروں پر کھڑا تو ہو جاؤں پھر شادی کے بارے میں سوچوں گا۔''

ایک ایک کر کے دور، نزدیک کے تمام رشتے دار رخصت ہو گئے۔ بلکہ دور کے رشتے دار کہنا زیادہ مناسب ہو گا، قریب کے رشتے دار تو بس چاچا صابر تھے۔

ابّو کے انتقال کے بعد سے میں نے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ باہر نکلنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہ احساس تو مجھے ابّو کی موت کے بعد ہوا تھا کہ میں ان سے کتنا پیار کرتا تھا۔

کبھی کوئی محلے والا کھانا دے جاتا تو میں کھا لیتا ورنہ یونہی بھوکا پڑا رہتا۔ صابر چاچا اپنے کسی کام سے ان دنوں لاہور گئے ہوئے تھے۔

ایک دن خالہ کلثوم میرے پاس آئیں اور بولیں۔ ''افتخار بیٹا! یہ تو نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟ مرنے والوں کے ساتھ کوئی مرتا نہیں ہے بیٹا! میں نے سنا ہے کہ تو ایک ہفتے سے کالج بھی نہیں گیا۔ تیرے اس رویّے سے نثار بھائی کی روح کو خوشی کے بجائے صدمہ پہنچے گا۔ وہ چاہتے تھے کہ تو پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے۔ چل اٹھ... نہا دھو کر کپڑے بدل، شیو کر۔ ذرا آئینہ دیکھ... شکل ہی سے تو برسوں کا بیمار لگ رہا ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولیں۔ ''تیرے چاچا کو بھی تیری فکر نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ تو تجھ پر جان چھڑکتے ہیں؟''

''خالہ! وہ کسی ضروری کام سے لاہور گئے ہوئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا تو جلدی سے اپنا حلیہ درست کر، میں کھانا بھجواتی ہوں۔''

''آپ تکلف مت کریں خالہ۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔''

''اے لو، اس میں تکلف کی کیا بات ہے؟'' خالہ نے کہا۔ ''بس تو جلدی سے نہا دھو لے۔ ہاں، حمید بھی آج کل آیا ہوا ہے۔''

ان کے جانے کے بعد میں بادلِ ناخواستہ شیو کرنے کے لیے اٹھا۔ آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو خود ہی بوکھلا کر پیچھے دیکھنے لگا۔ میں یہ سمجھا تھا کہ میرے پیچھے کوئی اور کھڑا ہے جس کا عکس مجھے آئینے میں دکھائی دے رہا ہے۔

میرے چہرے کی سرخ و سفید رنگت اس وقت زرد ہو رہی تھی۔ شیو بڑھنے کے بعد اب داڑھی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

شیو کرنے کے بعد میں دیر تک نیم گرم پانی سے نہاتا رہا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میں گزشتہ ہفتے کے دوران میں ایک مرتبہ بھی نہیں نہایا تھا ورنہ مجھے تو رات کو نہائے بغیر نیند نہیں آتی تھی۔ نہ صبح نہائے بغیر میری آنکھیں کھل پاتی تھیں۔

نہانے سے جسم واقعی ہلکا پھلکا ہو گیا۔

نہانے دھونے سے فارغ ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ گڈو آگیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ خالہ کلثوم آپ کو بلا رہی ہیں۔

دسترخوان پر خالہ کلثوم، ان کی دونوں بیٹیاں ملیحہ، فریحہ اور بیٹا حمید موجود تھے۔

خالہ کے شوہر کا دو سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ گھر کی ساری ذمے داریاں حمید پر تھیں۔ حمید بہترین پلمبر تھا اور ان دنوں دبئی میں تھا۔ نہ جانے کیوں وہ مجھے شروع ہی سے اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ غصے کا بھی بہت تیز تھا اور لڑنے کے تو گویا بہانے ڈھونڈتا تھا۔

میں نے اسے سلام کیا تو وہ میرے سلام کا جواب دے کر بولا۔ ''افتخار! مجھے نثار چچا کے انتقال کا بہت افسوس ہوا۔ میں آج ہی بلکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی پہنچا ہوں۔ اللہ

www.kahopakistan.com

ان کی مغفرت کرے۔ لیکن تم نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟''

''حمید بھائی! میرے تو سر سے سائبان اٹھ گیا۔ میں...'' مجھ سے بولا نہ گیا اور میرے حلق میں گولہ سا اٹک گیا۔

حمید نے اٹھ کر بہت محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''تم خود کو اکیلا کیوں سمجھتے ہو؟ ہم تمہارے لیے غیر تو نہیں ہیں۔ چلو کھانا کھاؤ۔''

ان لوگوں کے اصرار پر میں نے تھوڑا بہت کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔

ملیحہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے بھی اسے برسوں بعد دیکھا تھا۔ یوں تو گلی میں آتی جاتی وہ مجھے اکثر نظر آتی تھی لیکن میں نے کبھی اسے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ میرے ذہن میں تو وہ بات بات پر لڑنے اور رونے والی ملیحہ تھی۔ اب تو اس نے خوب رنگ روپ نکالا تھا۔ اس کے بال جو ہمیشہ الجھے الجھے سے اس کے چہرے پر بکھرے رہتے تھے، اب وہ سیاہ چمک دار ہو گئے تھے اور ان کی چوٹی اس کی کمر پر لہرا رہی تھی۔ اس کی رنگت بھی خوب نکھر گئی تھی۔ خوب صورت آنکھوں میں چمک تھی جیسے ان میں دو دیے روشن ہوں۔ اس کی چہچہی چنگھاڑتی آواز مترنم ہو گئی تھی۔

ملیحہ کھانے کے برتن اٹھا کر کچن میں لے گئی تو مجھے اس کی دلکش چال اور بھرپور سراپا دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے جلدی سے نظریں ہٹالیں۔ مبادا یہ بات حمید یا خالہ کلثوم کو ناگوار گزرے۔

''اب تم کل سے کالج جانا شروع کر دو۔'' خالہ نے کہا۔ ''اعلیٰ تعلیم تو تمہارے ابو کا خواب تھا بیٹا!''

''جی خالہ۔'' میں نے کہا۔ ''میں کل سے ضرور کالج جاؤں گا۔''

''اور بیٹا! کھانے پینے کی فکر مت کرنا۔ یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔''

''نہیں خالہ! میں اپنے اخراجات تو پورے کر ہی سکتا ہوں۔''

''ارے یار! کیسے پورے کرو گے؟'' حمید نے کہا۔ ''تمہارے ابو ایک دفتر میں چپراسی تھے۔ ان کی پنشن ہی کتنی ہو گی۔ ان کی زندگی ہی میں تم لوگ مالی مسائل کا شکار تھے۔ اب تو...''

''حمید بھائی!'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میرے پاس چار پانچ ٹیوشنز ہیں۔'' میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ ''میں اپنے کھانے پینے اور تعلیم کے اخراجات تو پورے کر ہی سکتا ہوں۔''

حمید کے تحقیر آمیز اور اکھڑ لہجے پر مجھے غصہ آ گیا تھا۔ ''اگر تمہارے ہاتھ میں کوئی ہنر ہوتا تو میں تمہیں فوراً دبئی بلا لیتا لیکن تم ٹھہرے تعلیم یافتہ بابو!'' اس کا لہجہ حسبِ سابق تحقیر آمیز تھا۔

''حمید بھائی! وہاں انجینئر اور پلمبر کی آمدنی میں کچھ فرق تو ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ فرق؟'' حمید نے ہنس کر کہا۔ ''میاں انجینئر کم سے کم چار پانچ گنا زیادہ کماتے ہیں۔''

''اوّل تو اپنا ملک چھوڑ کر جانے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور اگر گیا بھی تو انجینئر بننے کے بعد ہی جاؤں گا۔''

حمید میرے اس جملے سے خاموش ہو گیا۔ شاید اس بات سے اسے اپنی ہتک محسوس ہوئی تھی۔

دوسرے دن سے میں کالج جانے لگا اور میں نے بھاگ دوڑ کر کے کچھ ٹیوشنز بھی حاصل کر لیں۔

میں علی الصباح گھر سے نکل جاتا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر واقع فضل کے ہوٹل میں ناشتا کرتا پھر کالج چلا جاتا۔ کالج کے بعد میں تین بجے سے شام سات بجے تک ٹیوشنز پڑھاتا اور وہاں سے واپسی میں کھانا کھا کے گھر لوٹ آتا۔ پھر رات کو بارہ ساڑھے بارہ بجے تک اپنی پڑھائی کرتا اور سو جاتا۔

میں شام کو اکثر چاچی کے گھر بھی چلا جاتا تھا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ چاچا صابر کسی کام سے لاہور نہیں گئے ہیں بلکہ وہاں ان کا ٹرانسفر ہو گیا ہے۔

ایک دن میں ان کے گھر پہنچا تو چاچی کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ میں نے انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہا تو انہوں نے کہا۔ ''میں آج صبح ہی ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ ڈاکٹر کی دی ہوئی دوائیں بھی کھا رہی ہوں۔ تم پریشان مت ہو۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر آہستہ سے بولیں۔ ''افتخار! میرا تو خیال ہے کہ تم بھی یہیں آ جاؤ۔ تمہارے چاچا کے نہ ہونے سے مجھے بھی پریشانی ہے اور تم بھی اکیلے پریشان ہوتے ہو گے۔''

''چاچی! میں تو اب اس تنہائی کا عادی ہو گیا ہوں۔''

''بیٹا! تم عادی ہو گئے ہو تو کچھ میرا ہی خیال کر لو۔ میں اگر مر گئی تو محلے والوں کو ایک آدھ دن بعد ہی معلوم ہو گا۔''

''ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں چاچی؟'' میں نے کہا۔ ''واقعی آپ کو اکیلا نہیں رہنا چاہیے، میں آج ہی یہاں آ جاتا ہوں۔''

میں نے اسی دن اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں سمیٹیں، چند جوڑے کپڑے لیے اور گھر کو تالا ڈال کر چاچا صابر کے گھر آ گیا۔

یہاں آ کر کم سے کم مجھے کھانے کا آرام ہو گیا۔ چاچی دھوبی سے کپڑے دھلواتی تھیں، اب میرے کپڑے بھی دھوبی سے دھلوانے لگیں۔ وہ گھر میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ میں بچپن سے وہاں جاتا رہا تھا اس لیے میرا دل وہاں لگ گیا۔ زیادہ دوستی کا میں شوقین نہیں تھا، بس گھر سے کالج اور کالج سے گھر... یا پھر ٹیوشن پڑھانے کے لیے چلا جاتا تھا۔

کچھ لوگوں کی قسمت میں سکون سرے سے مفقود ہوتا ہے۔ میں بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔ اطمینان اور سکون تو مجھے راس ہی نہیں آتا تھا۔

وہ بھی گرمیوں کی ایک جھلتی ہوئی دوپہر تھی۔ گھر سے کالج کا فاصلہ کافی تھا۔ میں بس کا کرایہ بچانے کے لیے پیدل ہی کالج آیا جایا کرتا تھا۔ گرمی کے موسم میں میرے لیے شدید آزمائش ہوتی تھی۔ میں علی الصباح.... گھر سے نکلتا تھا اس لیے جاتے وقت تو مجھے اتنی تکلیف نہیں ہوتی لیکن واپسی میں میرا حشر خراب ہو جاتا تھا۔ میں گرمی میں جھلستا ہوا ساڑھے تین میل کا سفر طے کر کے جب گھر پہنچتا تو میری حالت ایسی ہوتی کہ کپڑے پسینے میں تر ہوتے تھے۔ پیاس کے باعث حلق میں کانٹے سے پڑ رہے ہوتے.... اور سر بُری طرح چکرا رہا ہوتا تھا۔

ایسی ہی ایک دوپہر کو جب میں واپس آیا تو چاچی بہت بے چین اور مضطرب تھیں۔ میں ان کی پریشانی پہلی ہی نظر میں بھانپ گیا اور ان سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے چاچی! آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟ چاچا تو خیریت سے ہیں؟''

''بیٹا! تیرے چاچا تو ماشاءاللہ بالکل خیریت سے ہیں لیکن...''

''لیکن کیا چاچی؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے سعدیہ کے دیور کا ٹیلی فون آیا تھا۔'' چاچی نے بتایا۔ ''غلام محمد کی طبیعت بہت خراب ہے۔''

''کیا ہوا ہے انہیں؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''اس نے مجھے تفصیل تو نہیں بتائی۔'' چاچی نے کہا۔ ''صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ غلام بھائی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔''

ٹیلی فون محلے کے کئی گھروں میں تھا۔ ان دنوں ٹیلی فون کا حصول زیادہ مشکل نہیں تھا۔ چاچا چاہتے تو وہ بھی ٹیلی فون لگوا سکتے تھے لیکن ابّو کی طرح وہ بھی قناعت پسند آدمی تھے۔ یوں بھی اب سیلی فون بہت تیزی سے مقبول ہو رہا تھا اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والوں کے ہاتھوں میں موبائل فون نظر آنے لگے تھے۔

چاچی کی بات سن کر میں اسی حالت میں اڈے کی طرف بھاگا کیونکہ اس وقت کوئی رکشا یا ٹرین تو لاڑکانہ جاتی نہیں تھی۔

میں وہاں پہنچا تو میرے دل میں ہزار وسوسے تھے اور میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ وہاں سب خیریت ہو۔

غلام محمد کے گھر کے سامنے شامیانہ لگا دیکھ کر میرا دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں کسی سے بغیر کچھ پوچھے ہی سب کچھ سمجھ گیا۔

وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں نے مجھے اجنبیت سے دیکھا، ظاہر ہے میں اتنے عرصے میں دو چار مرتبہ ہی وہاں گیا تھا۔

فوراً ہی مجھے غلام محمد کا بھائی انور نظر آ گیا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور وہ تیر کی طرح میری طرف آیا اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگا۔ میں اسے کیا تسلی دیتا۔ میرا دل تو خود خون کے آنسو رو رہا تھا۔ بہنوئی کی موت سے زیادہ مجھے بہن کی بیوگی کا صدمہ تھا۔

سعدیہ باجی تو مجھے دیکھ کر یوں بلک بلک کر روئیں کہ میرا کلیجا پھٹنے لگا۔

شادی کے آٹھ سال بعد تو انہیں اللہ نے ایک بیٹے کی شکل میں خوشیاں دی تھیں۔ غلام محمد تو ان خوشیوں کو پوری طرح سمیٹ بھی نہ پایا تھا کہ اجل نے اسے آ دبوچا۔

وہ اچھا بھلا صبح کھیتوں پر گیا تھا، پھر وہاں سے اس کی لاش ہی آئی۔ گاؤں والوں کا خیال تھا کہ یہ کسی آسیب کی کارستانی ہے ورنہ غلام محمد جیسا مضبوط آدمی جو بپھرے ہوئے بیل کو اپنی قوت سے قابو کر لیتا تھا، وہ یوں اچانک کیسے مر گیا؟

میں جانتا تھا کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کی حرکتِ قلب بند ہو گئی تھی۔

☆☆☆

غلام محمد کی موت کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس کی زمینداری محض دکھاوا تھی۔ کبھی وہ لوگ سیکڑوں ایکڑ زرعی اراضی کے مالک تھے اور رئیس کہلاتے تھے لیکن غلام محمد کا باپ نور محمد ساری زمینیں ٹھکانے لگا چکا تھا اور غلام محمد کے حصے میں صرف پندرہ ایکڑ زمین آئی تھی۔ اس پر بھی زرعی بینک اور وڈیرے کا قرضہ تھا۔

غلام محمد کا بھائی انور بہت ہی خود غرض اور لالچی تھا۔

www.kahopakistan.com

اس نے بینک اور وڈیرے کا قرض تو چکا دیا لیکن غلام محمد کے حصے کی زمین اپنے نام لکھوالی۔ اس نے سعدیہ باجی کو تسلی دی۔ ''بھاجائی! زمین تیرے پاس رہے یا میرے پاس، بات تو ایک ہی ہے۔ تیرا بیٹا سہیل تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ زمینداری کا سارا کام تو میں ہی کروں گا۔ تو فکر کیوں کرتی ہے۔ سہیل میرا خون ہے اور تو ہمارے خاندان کی عزت ہے۔ میں تجھے کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔''

سعدیہ باجی نے مجھ سے کہا۔ ''امی! تو مجھے بھی اپنے ساتھ کراچی لے چل۔ میں اب یہاں رہ کر کیا کروں گی؟''

''کیسی بات کر رہی ہے بہو؟'' سعدیہ باجی کی ساس نے کہا۔ ''تیرے جانے سے مرنے والے کو تکلیف ہوگی بیٹا! تو مجھ اندھی کو میرے پوتے سے دور کر دے گی؟'' سعدیہ باجی کی ساس گزشتہ چند برسوں سے اپنی بینائی کھو چکی تھیں۔

''لیکن اماں! اب میں یہاں رہ کر کروں گی ہی کیا؟'' سعدیہ باجی نے افسردگی سے کہا۔

''لے، تجھے کیا کرنا ہے؟'' اس کی ساس نے کہا۔ ''جو کچھ کرے گا انور کرے گا۔ بس تو یہاں سے جانے کی بات مت کرنا۔''

میں چند دن وہاں رکنے کے بعد واپس آگیا اور دوبارہ پڑھائی میں مصروف ہوگیا۔ صابر چاچا کے مشورے پر میں نے اپنا مکان کرائے پر دے دیا تھا۔

صابر چاچا دو چار مہینے میں لاہور سے کراچی کا چکر لگاتے تھے۔ اس مرتبہ وہ آئے تو بہت خوش تھے۔ ان کا پروموشن ہوگیا تھا۔ انہوں نے اسی خوشی میں مجھے ڈھیروں شاپنگ کرا ڈالی۔ وہ جانتے تھے کہ مجھے اچھے لباس، اعلیٰ جوتوں، بہترین پرفیومز کا جنون ہے۔

میں آپ کو شاید یہ بتانا بھول گیا کہ میں بچپن ہی سے خوش لباس تھا۔ دیکھنے والے کہتے تھے کہ میں جامہ زیب بھی ہوں اور ہینڈسم بھی۔ ابو بھی خاصے خوب رو تھے اور میں نے سنا تھا کہ امی بھی بہت خوب صورت تھیں۔

صابر چاچا کو اس مرتبہ ان کی بدنصیبی کراچی لائی تھی۔ اس دن ہم لوگ سی سائڈ پر گھوم کر واپس گھر آرہے تھے کہ لیاقت آباد کے قریب ہماری ٹیکسی پر ایک ٹرالر الٹ گیا۔ وہ تو شکر ہوا کہ ٹرالر اوور ہیڈ برج کے ایک پلر سے ٹکرا کر رک گیا اور ٹیکسی پوری طرح اس کی زد میں نہیں آئی۔ اس کے باوجود صابر چاچا بہت شدید زخمی ہوگئے، چاچی بھی زخمی تھیں۔ میں اس حادثے میں معجزانہ طور پر بچ گیا۔ اس کے باوجود میرا سر کسی چیز سے ٹکرایا اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

پھر مجھے اسپتال میں ہوش آیا۔ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا پھر اچانک مجھے سب یاد آگیا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

مجھے اٹھتا دیکھ کر ایک نرس میری طرف لپکی اور بولی۔ ''لیٹے رہیے، اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

''میرے سر میں درد ہے سسٹر لیکن میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

نرس نے ایک ڈاکٹر کو بلا لیا۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح میرا معائنہ کیا۔ میری ذہنی کیفیت جاننے کے لیے مختلف سوالات کیے اور حادثے کے بارے میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! ٹیکسی میں میرے ساتھ چاچا اور چاچی بھی تھے۔ وہ کہاں ہیں... ان کی طبیعت کیسی ہے؟''

''وہ بھی معمولی زخمی ہیں افتخار صاحب!'' ڈاکٹر نے جواب دیا لیکن اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

''مجھے ان کے پاس لے چلیں۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''آپ ابھی آرام کریں۔ ابھی آپ ان سے نہیں مل سکتے۔'' ڈاکٹر نے نرم لہجے میں کہا۔

''میں ان سے کیوں نہیں مل سکتا ڈاکٹر صاحب؟'' میں نے کہا۔ ''پلیز! مجھے بتائیے کہ دونوں ٹھیک تو ہیں؟''

میرے شور شرابے پر ایک سینئر ڈاکٹر وہاں آگیا اور بولا۔ ''افتخار صاحب! آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں گے۔ حادثے میں آپ کے چاچا کی دونوں ٹانگیں بری طرح کچل گئی ہیں۔ آپ کی چاچی کی حالت خطرے سے باہر ہے لیکن ان کی بیک بون (ریڑھ کی ہڈی) متاثر ہوئی ہے۔ وہ بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی ہیں۔''

ڈاکٹر کے الفاظ کیا تھے، پگھلا ہوا سیسہ تھا جو اس نے میرے کانوں میں انڈیل دیا تھا۔

صابر چاچا اور چاچی اس وقت انتہائی نگہداشت کے شعبے میں تھے۔ میرے بے حد اصرار پر ڈاکٹروں نے صرف اتنا کیا کہ...... انہیں دور سے دیکھنے کی اجازت دے دی۔

میں نے شیشے کے دروازے میں سے چاچا کو دیکھا تو میرا کلیجا منہ کو آگیا۔ چاچا کے جسم پر چادر تھی اور منہ پر آکسیجن ماسک چڑھا ہوا تھا جو ان کی ہر سانس کے ساتھ پھول اور پچکتا تھا۔ ان کے سرہانے مانیٹر لگا ہوا تھا جس پر آڑھا ترچھا گراف چل رہا تھا۔

چاچی کی حالت بھی بہت ابتر تھی۔ وہ نہ زندوں میں تھیں، نہ مُردوں میں۔ وہ بے حس و حرکت بیڈ پر پڑی تھیں اور حیران آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''چاچی! آپ فکر مت کریں۔ آپ انشاء اللہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔'' انہوں نے حسرت سے مجھے دیکھا، پھر ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر دائیں بائیں تکیے میں جذب ہونے لگے۔ ان دونوں کے علاج کے لیے میں نے اپنا مکان بیچ دیا۔ پیسا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ ان دونوں کے علاج میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔

میرا مکان پندرہ لاکھ میں بکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ رقم خرچ ہوگئی۔ اس سے اتنا فرق ضرور پڑا کہ چاچا کی حالت خطرے سے باہر ہوگئی اور چاچی بھی بولنے کے قابل ہوگئیں۔ لیکن ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ انہیں مزید تین مہینے اسپتال میں رہنا پڑے گا۔

چاچا کی ٹانگیں بُری طرح کچلی گئی تھیں۔ انہیں کاٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن ابھی ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اتنے بڑے آپریشن کے متحمل ہوسکتے۔

پیسا اب بھی پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ چاچا کے حادثے کی خبر سن کر سعدیہ باجی بھی لاڑکانہ سے آگئی تھیں لیکن وہ دو دن سے زیادہ نہیں رکیں۔ وہاں ان کی ساس اکیلی تھیں۔ وہ بھی اکثر بیمار رہتی تھیں۔ پھر میں انور کے رنگ ڈھنگ بھی دیکھ رہا تھا اس لیے میں نے سعدیہ باجی کو زیادہ دن وہاں روکنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ بے چاری روتی دھوتی واپس چلی گئیں۔

چاچی کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بس اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ بات چیت کر لیتی تھیں۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ انہیں اب گھر لے جائیں، ان کی ریکوری کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

یہ میرے لیے ایک نئی آزمائش کھڑی ہوگئی۔ چاچی کی دیکھ بھال کرنے کے لیے کسی خاتون کی ضرورت تھی۔ میری تو اتنی استطاعت تھی نہیں کہ میں ان کے لیے کسی کل وقتی ملازمہ یا نرس کا انتظام کرتا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر سعدیہ باجی کو بلانے کی کوشش کی لیکن ان کی ساس اور دیور نے صاف انکار کر دیا کہ ہم سعدیہ کو نہیں بھیج سکتے۔

میں اسی پریشانی میں تھا کہ ملیحہ ایک دن چاچی کو دیکھنے

ہو پاکستان کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

www.kahopakistan.com

آ گئی۔ جیسے ہی اسے میری پریشانی کا علم ہوا تو اس نے کہا کہ چاچی کی دیکھ بھال تو میں بھی کر سکتی ہوں۔

چاچی اتنی خوددار تھیں کہ انہوں نے یہ نوبت ہی نہ آنے دی۔ اسپتال سے آنے کے بعد دوسرے ہی دن وہ ہر قسم کی دیکھ بھال اور خدمت سے بے نیاز ہو گئیں۔ ان پے در پے ... صدمات میں میری جانے کون سی آزمائشیں تھیں۔ ابو کی موت کے بعد بھائی غلام محمد کی موت اور اب چاچی کی موت! ایسا لگ رہا تھا جیسے موت نے میرا گھر دیکھ لیا ہو۔

چاچا صابر ابھی تک اسپتال میں پڑے تھے لیکن ان کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اب ان کا آپریشن کیا جا سکتا ہے۔

انہوں نے آپریشن سے پہلے مجھ سے ایک فارم پُر کروایا اور اخراجات کی مد میں پانچ لاکھ روپے جمع کرنے کو کہا۔

وہ خاصا مہنگا اسپتال تھا۔ فوری طور پر میرے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔ میں اسپتال کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کے پاس چلا گیا اور اس سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! میں ابھی خود طالب علم ہوں۔ ٹیوشنز پڑھا کر اپنے گھریلو اور تعلیمی اخراجات پورے کر رہا ہوں۔ فوری طور پر اتنی بڑی رقم کا حصول میرے لیے ممکن نہیں ہے۔''

''دیکھیے مسٹر افتخار! اس سلسلے میں آپ اسپتال کے ایڈمنسٹریٹر سے بات کریں۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' اس نے مجھے ٹکا سا جواب دے دیا پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''ہاں، اگر دو دن کے اندر اندر آپریشن نہ کیا گیا تو مریض کے جسم میں زہر پھیل سکتا ہے۔ انہیں سیپٹک کا خطرہ ہے۔''

یہ سن کر میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ میں وہاں سے سیدھا اسپتال کے ایڈمنسٹریٹر کے پاس پہنچا۔ ان کے پیون نے یہ کہہ کر مجھے روک دیا کہ صاحب ابھی مصروف ہیں۔

''مجھے ان سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہاں تو ہر شخص کو ضروری بات کرنی ہوتی ہے صاحب۔'' چپراسی نے منہ بنا کر کہا۔

''تو پھر قباحت کیا ہے؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''ایڈمنسٹریٹر صاحب اسی لیے تو یہاں بیٹھے ہیں۔''

''آپ انتظار کریں۔'' چپراسی نے کہا۔ ''نہ جانے کہاں کہاں سے منہ اٹھا کر چلے آتے ہیں۔''

اس کی بات سن کر میری کھوپڑی گھوم گئی۔ میں نے اس کا گریبان پکڑ کر ایک طرف دھکیلا اور ایڈمنسٹریٹر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

وہ ٹیلی فون پر کسی سے گفتگو فرما رہے تھے۔ ''ہاں یار! آج ہی شام کو رکھ لو۔ کل تو مرزا صاحب کے یہاں پارٹی ہے۔ بس میں اٹھنے ہی والا ہوں۔''

اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا، اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ظاہر ہوئے۔

اس نے میری طرف توجہ دیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ ''یار! اگر پارٹی کے بعد ورائٹی پروگرام بھی ہو جائے تو مزہ آ جائے۔''

میں کھڑا ہوا دل ہی دل میں کھولتا رہا۔ اگر میرے جسم پر قیمتی لباس اور ہاتھ میں بیش قیمت گھڑی اور سیل فون نہ ہوتا تو شاید وہ اب تک مجھے چپراسی کے ذریعے باہر نکلوا چکا ہوتا۔ میری نظریں مسلسل گھڑی پر تھیں۔

جب اسے بات کرتے ہوئے پندرہ منٹ سے بھی زیادہ کا وقت ہو گیا تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ''یار! اس دفعہ نرگس کو نہیں بلکہ عذرا کو بلاتے ہیں۔ وہ ظالم...''

''ایک منٹ سر!'' میں نے بھنّا کر کہا۔ ''آپ یہ ''ضروری'' گفتگو تو بعد میں بھی کر سکتے ہیں۔ مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

اس نے ناگواری سے مجھے دیکھا، پھر ماؤتھ پیس میں بولا۔ ''یار جاوید! میں تمہیں بعد میں کال کرتا ہوں۔'' پھر مجھ سے بولا۔ ''جی فرمایئے، کیا پرابلم ہے آپ کو؟ اور آپ اندر کیسے آئے؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

فوراً ہی اس کا چپراسی اندر آ گیا۔ ''یس سر!'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''تم کیا نشہ کرنے لگے ہو، بھنگ پینے لگے ہو یا پھر دروازے پر موجود نہیں تھے؟'' وہ چپراسی پر برس پڑا۔ ''یہ صاحب اندر کیسے آئے؟''

''اس بے چارے پر غصہ مت کریں۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔''

''اس کے باوجود آپ اندر آ گئے؟'' اس نے ناگواری سے پوچھا۔

اس کے رویّے سے میں یہ بھی بھول گیا کہ میں وہاں رقم کے سلسلے میں مہلت لینے آیا ہوں۔

''آپ کے پیون نے کہا تھا کہ آپ کسی ضروری کام میں مصروف ہیں۔ یہ ہے آپ کا ضروری کام؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''آپ اپنا پرابلم بتائیں۔'' وہ چیخ کر بولا۔

مجھے وفعتاً احساس ہوا کہ میں نے معاملے کو بگاڑ دیا ہے۔ مجھے ایڈمنسٹریٹر سے نرم لہجے میں بات کرنی چاہیے تھی۔

''سر! وہ... میرے انکل یہاں ایڈمٹ ہیں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''اچھا... پھر؟'' اس کا لہجہ بدستور تلخ تھا۔

''سر! ان کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور ڈاکٹر نے...''

''مسٹر! آپ میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔'' وہ بھنّا کر بولا۔ ''کم ٹو دا پوائنٹ! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''سر! میں وہی بتا رہا ہوں۔ ڈاکٹرز نے ان کا میجر آپریشن تجویز کیا ہے اور اس کے لیے مجھے فوری طور پر پانچ لاکھ روپے ڈپازٹ کرنا ہوں گے۔''

''مسٹر! آپ کا نام کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا نام افتخار ہے۔ میں...''

''افتخار صاحب! رقم میں ڈپازٹ نہیں کرتا بلکہ کیش کاؤنٹر پر ڈپازٹ ہوتی ہے۔ اسپتال میں بے مٹ کی سہولت کے لیے رقم ڈپازٹ کرنے، انکوائری اور فارمیسی کے کاؤنٹرز چوبیس گھنٹے کھلے رہتے ہیں۔''

''سر! پرابلم یہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اصل میں فوری طور پر میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتا۔''

''تو پھر اس اسپتال میں آنے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟ شہر میں کئی خیراتی اور فلاحی ادارے ہیں۔ آپ...''

''پلیز!'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''میں اب تک یہاں سولہ، سترہ لاکھ روپے خرچ کر چکا ہوں اور آپ مجھے خیراتی اسپتال جانے کا مشورہ دے رہے ہیں؟'' میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کمینے آدمی کو مار مار کے آدھ موا کر دوں۔

''پیسے نہیں ہیں تو آپ اپنے مریض کو لے جائیں۔'' اس نے بے حسی سے کہا۔

''یہ ایک انسانی زندگی کا سوال ہے سر۔'' میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''آپ پلیز میرا وقت برباد مت کریں۔ اب آپ جائیں اور پیسوں کا بندوبست کریں۔''

اس کی طرف سے مایوس ہو کر میں کمرے سے باہر آ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست کہاں سے کروں؟

پھر مجھے چاچا صابر کے مکان کا خیال آیا۔ چاچا کی زندگی بچانے کے لیے میں وہ مکان بیچ سکتا تھا لیکن فوری طور پر تو اس کا بکنا بھی محال تھا۔ ڈاکٹروں نے مجھے صرف بارہ گھنٹے کا وقت دیا تھا۔ اتنے کم وقت میں وہ مکان کیسے بک سکتا تھا؟ اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں کسی اسٹیٹ ایجنٹ کو اونے پونے دام میں وہ مکان دے دوں۔ وہ دو منزلہ مکان تھا اور اس کی مالیت اس وقت بھی کم سے کم بیس بائیس لاکھ سے کم نہیں تھی۔

میں نے گھڑی دیکھی، اس وقت دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ میں نے ڈاکٹرز سے وعدہ کیا کہ میں دو گھنٹے کے اندر اندر رقم لے آؤں گا۔ میں وہاں سے سیدھا ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس پہنچا۔

اس نے مکان دیکھنے کے بعد کہا۔ ''افتخار صاحب! اس مکان میں بہت زیادہ کام کرانا ہوگا۔ میں آپ کو اس کے دس لاکھ دے سکتا ہوں۔'' اس نے عیاری سے کہا۔ ''بے شک آپ دوسرے ایجنٹس کو بھی دکھا لیں۔''

''مجھے پیسوں کی فوری طور پر ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ورنہ یہ مکان میں ہرگز نہ بیچتا۔ چلیں ٹھیک ہے..... دس لاکھ ہی سہی لیکن رقم مجھے کیش میں چاہیے اور وہ بھی فوری طور پر۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں؟'' اس نے کہا۔ ''مکانوں کے سودے اتنی جلدی کب ہوتے ہیں۔ تمام ضروری کاغذی کارروائیاں تو پوری کرنا ہوں گی۔ اخبار میں اشتہار دینا ہوگا، کورٹ سے سیل ڈیڈ بنانا ہوگی پھر کہیں جا کر مکان کا سودا ہوگا۔''

''آپ مکان کے کاغذ رکھ لیں اور قانونی کارروائی پوری کرتے رہیں، مجھے فوری طور پر پانچ لاکھ روپے دے دیں۔ میرے چاچا زندگی اور موت کی کشمکش میں ہیں۔'' میں نے کہا۔

''چلیے، آپ کی خاطر کوشش کرتا ہوں۔'' اس نے عیاری سے کہا۔ ''مکان کے کاغذات مجھے دے دیں۔ میں قانونی کارروائی کر لوں گا۔ کوشش کروں گا کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر آپ کو پانچ لاکھ روپے مل جائیں۔'' میں نے بلاسوچے سمجھے مکان کے کاغذات اس کے حوالے کر دیے۔ اس نے ایک گھنٹے میں رقم کی ادائیگی کا وعدہ کیا۔ وہ ایک گھنٹا میں نے گویا سولی پر گزارا۔ مجھے چاچا صابر کی بھی فکر تھی۔ میں نے اسٹیٹ ایجنٹ کو ٹیلی فون کیا کہ وہ رقم لے کر اسپتال آ جائے۔ میں خود بھی اسپتال روانہ ہو گیا۔

ڈاکٹروں نے بتایا کہ آپ کے مریض کی حالت لمحہ بہ

www.kahopakistan.com

لمحہ بگڑتی جارہی ہے۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ آپریشن شروع کریں۔ میرا آدمی رقم لے کر آنے ہی والا ہے۔''

لیکن وہ سب ڈاکٹر سے زیادہ لٹیرے اورڈاکو تھے۔ وہ مجھے جھوٹی تسلیاں دیتے رہے اوروقت تیزی سے گزرتا رہا۔

دو گھنٹے گزرنے کے بعد میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ میں نے اسٹیٹ ایجنٹ کو ٹیلی فون کیا تو اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ میں وقفے وقفے سے ٹیلی فون کرتا رہا لیکن ہر دفعہ مجھے جواب نہیں ملا۔

یونہی ساڑھے چار گھنٹے گزر گئے۔ میں اسپتال کے برآمدے، لان اور مین گیٹ تک دیوانہ وار چکراتا رہا۔

میں اسپتال کے مین گیٹ کا چکر لگا کر آیا تو ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔ ''مسٹر افتخار! آپ نے بہت دیر کردی۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کے چاچا اب اس دنیا میں نہیں رہے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ چاچا کی میت کب گھر آئی اور ان کی تدفین ہوگئی، مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔

صابر چاچا کے سوئم والے دن میں سوچ رہا تھا کہ اب اس ایجنٹ سے کاغذات واپس لے لوں مگر وہ خود ہی آگیا۔

''آپ تو اس دن کے بعد سے ایسے غائب ہوئے کہ آج شکل دکھا رہے ہیں۔'' میں پھٹ پڑا۔ ''اب آپ مجھے مکان کے کاغذات واپس کردیں۔''

''مکان کے کاغذات؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''افتخار صاحب! وہ مکان تو آپ بیچ چکے ہیں۔ میں آپ کو تین دن کی مہلت دے رہا ہوں۔ آپ اس دوران میں اپنا انتظام کرلیں۔''

''کیا بکواس کررہے ہیں آپ؟'' میں نے بپھر کر کہا۔ ''میں نے یہ مکان کب بیچا ہے؟ کس نے خریدا ہے اور مجھے ادائیگی کب ہوئی ہے؟''

''تمیز سے بات کریں۔'' وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ''اگر آپ نے زیادہ مسئلہ کیا تو میں ابھی سامان اٹھا کر پھینک دوں گا۔''

میں نے اچانک اس کا گریبان پکڑ لیا اور اس کے منہ پر اتنے زور سے تھپڑ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر سامنے والی دیوار سے ٹکرا گیا۔ ''دفع ہوجا یہاں سے... ورنہ چلنے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔ چور، دھوکے باز، چارسوبیس...''

اس کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ وہ ہتھیلی کی پشت سے خون صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''تیرے اس تھپڑ کا جواب تو پولیس دے گی۔''

میں نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑا اور اسے باہر کی طرف دھکیل کر بولا۔ ''گیٹ لاسٹ، یو بلڈی چیٹ۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی پشت پر ایک لات بھی جما دی۔

محلے والے اگر مجھے پکڑ نہ لیتے تو شاید میں اسے مزید مارتا۔ ایک تو میں پہلے ہی غم سے نڈھال تھا پھر اس نے مجھے مزید غصہ دلایا تھا۔

وہ مجھے پولیس اور عدالت کی دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد اکرام صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ ''افتخار میاں! یہ قصہ کیا ہے؟ میں اس آدمی کو جانتا ہوں، انتہائی دھوکے باز اور فراڈ شخص ہے۔ تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟'' اکرام صاحب ... سینئر وکیل تھے اور آج کل ہائی کورٹ کے مقدمات لیتے تھے۔

میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اس سے مکان بیچنے کی بات کی تھی۔ مجھے چاچا کے علاج کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے مکان کے کاغذات بھی دے دیے تھے لیکن اس سے پہلے کہ اس سلسلے میں کوئی کارروائی ہوتی، چاچا کا انتقال ہوگیا۔

اکرام صاحب کچھ دیر گہری سوچ میں گم رہے، پھر بولے۔ ''افتخار میاں! سیل ڈیڈ فائنل ہونے سے پہلے تمہیں مکان کے اصل کاغذات اسے نہیں دینا چاہیے تھے۔''

''انکل! میں اس وقت بہت پریشان تھا۔ میری تو کچھ سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے بھی ابھی اس سلسلے میں کوئی قانونی کارروائی تو ہوئی نہیں ہے۔''

''تم ایک کام کرو۔'' اکرام صاحب کچھ سوچ کر بولے۔ ''تم پولیس اسٹیشن جا کر ان کاغذات کی گم شدگی کی رپورٹ درج کرادو بلکہ میں خود تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔''

وہ مجھے اپنی گاڑی میں ملیر کے ایک تھانے میں لے گئے۔ وہاں کا ایس ایچ او اکرام صاحب کا شناسا تھا۔ وہ بہت ادب و احترام سے پیش آیا اور اکرام صاحب سے پوچھا۔ ''جی وکیل صاحب! فرمائیے کیسے زحمت کی؟''

اکرام صاحب نے اسے اپنی آمد کی غرض وغایت بتائی تو اس نے ایک دو رسمی سوالات کرنے کے بعد ایف آئی آر درج کرلی۔ میں نے اپنی رپورٹ میں لکھوایا تھا کہ اب سے چار دن پہلے میں اپنے ایک ضروری کام سے ملیر آیا تھا۔ مکان کے کاغذات کی فائل اسی علاقے میں کہیں گرگئی۔

انکل اکرام نے مجھے اچھی طرح سکھا پڑھا دیا تھا کہ مجھے کیا کہنا ہے اور کس جگہ کی نشان دہی کرنا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ کس پولیس اسٹیشن کی حدود کہاں تک ہیں ورنہ پولیس

والے رپورٹ درج کرانے والوں کو ایک تھانے سے دوسرے تھانے میں اتنے چکر لگواتے ہیں کہ لوگ شکایت درج کرانے ہی سے توبہ کرلیتے ہیں۔

دوسرے دن میں سو کر اٹھا ہی تھا کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ اب تک خالہ کلثوم اور ان کی بیٹیاں موجود تھیں۔ اس لیے مجھے اتنی تنہائی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو اسٹیٹ ایجنٹ رمضان علی دو پولیس والوں کے ساتھ دندناتا ہوا اندر آگیا۔ پولیس والوں میں ایک اے ایس آئی تھا اور دوسرا کانسٹیبل۔

میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''آپ لوگ کون ہیں اور یوں منہ اٹھائے میرے گھر میں کیسے چلے آرہے ہیں؟''

پولیس کی موبائل وین دیکھ کر محلے کے کچھ بچے اور کچھ بڑے بھی اکٹھے ہوگئے تھے۔ انہی میں سے کوئی اکرام انکل کو بھی بلا لایا تھا۔

''بہت خوب! تجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم لوگ کون ہیں؟'' اے ایس آئی نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ ''ابھی تھانے جا کر سب معلوم ہوجائے گا کہ ہم کون ہیں اور کیوں آئے ہیں؟''

''آپ کس جرم میں انہیں تھانے لے جارہے ہیں؟'' اکرام صاحب نے پوچھا۔

اے ایس آئی اکرام صاحب کو دیکھ کر ٹھٹکا پھر قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ''وکیل صاحب! یہ بندہ کسی دوسرے کی پراپرٹی پر ناجائز قبضہ کرکے بیٹھا ہے۔ پراپرٹی کا مالک آیا تو اس نے اس پر تشدد کیا... کیا یہ جرم کم ہے؟''

''پراپرٹی کا مالک کون ہے، اس کا فیصلہ تو عدالت کرے گی۔'' اکرام صاحب نے کہا۔ ''یہ دیوانی کیس ہے۔ اس میں پولیس کی دخل اندازی خلافِ قانون ہے۔''

''لیکن اس نے ایک شریف شہری پر تشدد کیا ہے۔ یہ تو دیوانی کیس نہیں ہے؟'' اے ایس آئی اب کچھ پریشان سا ہوگیا تھا۔

''یہ شریف شہری بغیر کسی اجازت کے میرے مؤکل کے گھر میں گھسا تھا۔ کیا زبردستی گھر میں گھسنے والے کو گھر سے نکالنا قانوناً جرم ہے؟'' اکرام صاحب نے ترش لہجے میں کہا۔ ''اس کا گواہ صرف میں ہی نہیں بلکہ پورا محلّہ ہے۔'' پھر وہ تلخ لہجے میں بولے۔ ''آفیسر! آپ بھی یہاں کس قانون کے تحت داخل ہوئے ہیں؟ کیا آپ کے پاس گھر کی تلاشی لینے کا وارنٹ ہے؟''

اس پر اے ایس آئی بغلیں جھانکنے لگا۔ ''وہ... وکیل صاحب... ان صاحب نے... کہا تھا کہ...''

''ان صاحب نے کیا کہا تھا، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ آپ مجھے خانہ تلاشی کا وارنٹ دکھائیے۔''

''وارنٹ تو نہیں ہے لیکن...''

''افتخار! ابھی ایک درخواست آئی جی صاحب کے نام لکھو اور ان صاحب کے خلاف...'' انہوں نے اے ایس آئی کی جیب پر لگی ہوئی نام کی پٹی دیکھی۔ ''ہاں، راجا نصیر کے خلاف ہائی کورٹ میں ایک پٹیشن داخل کرو۔''

''وکیل صاحب! بات کو نہ بڑھائیں تو اچھا ہے، ورنہ...'' اے ایس آئی نے سرد لہجے میں کہا۔

''ورنہ کیا؟'' اکرام صاحب ڈپٹ کر بولے۔ ''تم اتنے لوگوں کی موجودگی میں مجھے دھمکی دے رہے ہو؟''

اے ایس آئی ذلیل وخوار ہوکر اسٹیٹ ایجنٹ رمضان سمیت وہاں سے رخصت ہوگیا۔

دوسرے دن مجھے کورٹ سے سمن مل گیا۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہوں گا۔ رمضان نے نہ جانے کیسے جعلسازی سے نہ صرف اس مکان کی سیل ڈیڈ بنوالی تھی بلکہ دوسری تمام قانونی کارروائیاں بھی پوری کرلی تھیں۔

ان ناقابلِ تردید ثبوتوں کی روشنی میں اکرام صاحب کی ان تھک کوششوں کے باوجود میں مقدمہ ہار گیا اور مجھے مکان خالی کرنا پڑا۔

اب سب سے بڑا مسئلہ سر چھپانے کا تھا۔ میرے پاس تو نہ اب میرا مکان تھا، نہ چاچا کا۔ میں مقدمے کے سلسلے میں مقروض بھی ہوگیا تھا۔

محلے کے ایک صاحب نے ترس کھا کر مجھے اپنے مکان کی بیٹھک کا ایک کمرا عارضی طور پر دے دیا۔

میں پڑھائی چھوڑ کر ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہوگیا۔

اس مرتبہ تقدیر کو مجھ پر رحم آیا اور مجھے ایک آئل کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ اس کمپنی میں استعمال شدہ اور خام لبریکیشن آئل کو دوبارہ صاف کرنے کے بعد پیک کیا جاتا تھا۔

وہاں میری ڈیوٹی ایسی جگہ لگی جہاں ٹینکر آئل لے کر آیا کرتے تھے۔ اس سے پہلے مجھے ایک مخصوص گیج کے ذریعے آئل کی مقدار ناپنا ہوتی تھی۔

مجھے ملازمت کرتے ہوئے تیسرا دن تھا کہ ہمارا سپروائزر میرے پاس آیا اور بولا۔ ''افتخار صاحب! کام تو

www.kahopakistan.com

آپ کی سمجھ میں آگیا ہے نا؟"

"جی ہاں سر!" میں نے کہا۔ "یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

"ہاں، وہ ٹینکرز ہماری فیکٹری میں آتے ہیں۔ ان کا ذرا خیال رکھیے گا۔" اس نے کہا۔

"وہ ٹینکرز؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "سر! یہاں تو چار پانچ ٹینکرز روز آتے ہیں۔"

"ارے یار! شیر خان اور فضل داد کی بات کر رہا ہوں۔ پچھلے ہفتے بھی وہ آئے تھے تو آپ نے ان کا کوئی دھیان نہیں رکھا تھا۔"

"میں سمجھا نہیں سر!" میں نے الجھ کر پوچھا۔

"بھئی وہ لوگ ہمارے بہت پرانے سپلائر ہیں۔ آپ گیج لے کر ان کے ساتھ بھی ناپ تول شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے ان کا وقت بھی برباد ہوتا ہے اور آپ کا بھی۔ وہ آئل کی جتنی مقدار لکھوا دیں، آپ لکھ لیں۔"

"جی سر!" میں نے کہا۔ "آئندہ ان کا وقت برباد نہیں ہوگا۔"

تھوڑی دیر بعد شیر خان ٹینکر لے کر آگیا۔ میں نے گیج اٹھایا تو وہ بولا۔ "گیج کا کیا کرنا ہے صاحب! میں ویسے ہی آپ کو بتا دیتا ہوں کہ کتنا آئل ہے؟"

پھر اس نے جتنے لیٹر بتائے، وہ میرے اندازے کے مطابق بہت زیادہ تھے لیکن ٹینکر میں آئل کی مقدار اتنی نہیں تھی۔ میں نے دل پر جبر کر کے اس کی تصدیق تو کر دی لیکن سوچ لیا کہ میں آئندہ اس سلسلے میں سپروائزر سے بات کروں گا۔

لنچ کے بعد آفس کا پیون میرے پاس ایک لفافہ لے کر آیا اور بولا۔ "یہ سپروائزر صاحب نے آپ کو بھجوایا ہے۔"

میں نے حیرت سے اس خاکی لفافے کو دیکھا، اس میں شاید کسی قسم کے کاغذات تھے۔ میں نے لفافہ کھولا تو اس میں پانچ پانچ سو کے چار نوٹ تھے۔ اس کے ساتھ ایک پرچی بھی تھی۔ اس میں لکھا تھا۔ "اسی طرح کام کرتے رہو۔" پرچی پر کسی کا نام نہیں تھا۔ وہ ٹائپ شدہ کاغذ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ دو ہزار روپے رشوت کے ہیں۔ شیر خان نے درج شدہ آئل کی مقدار کا بل وصول کیا تھا جبکہ اس نے آئل بہت کم دیا تھا۔

میں نے وہ لفافہ سپروائزر صاحب کو واپس بھجوا دیا اور پیون سے کہا۔ "صاحب سے کہنا بہت بہت شکریہ... مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

پھر میں نے یکے بعد دیگرے شیر خان اور اس جیسے دوسرے ٹینکر والوں کی بات سنے بغیر گیج سے آئل کی پیمائش کر کے تصدیق نامہ جاری کیا تو سپروائزر بپھرا ہوا میرے پاس آیا اور بولا۔ "تم آخر خود کو سمجھتے کیا ہو؟ لگتا ہے اس جاب سے تمہارا دل بھر گیا ہے۔"

"مجھے حرام کھانے کا کوئی شوق نہیں ہے سر!" میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

"تمہیں ابھی جاب کرتے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے ہیں۔ تمہارے آگے پوری زندگی پڑی ہے۔ یہی حال رہا تو بھوکے مرو گے۔" اس نے بھنا کر کہا۔

"رزق دینے والا تو اللہ ہے سر! آپ نہیں ہیں۔"

"جب دھکے کھاؤ گے تو سارا فلسفہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ تمہاری ملازمت ابھی مستقل بھی نہیں ہوئی ہے۔ میرے ایک دستخط سے تم فیکٹری کے باہر ہو جاؤ گے۔ میں تمہیں آخری بار سمجھا رہا ہوں کہ میرے ساتھ تعاون کرو۔"

"میں بھی آخری بار کہہ رہا ہوں کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔" میں نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"او کے۔" وہ بپھر کر بولا۔ "تم ابھی اور اسی وقت اکاؤنٹ آفس جا کر اپنا حساب کر لو۔ مجھے ایسے سرکش آدمی کی ضرورت نہیں ہے۔"

"مجھے بھی ایسے رشوت خور افسران کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اپنے پیٹ کو جہنم کی آگ سے بھرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"شٹ اَپ۔" وہ دہاڑا۔ "گیٹ لاسٹ! تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

میرا دل تو چاہا کہ میں اس کے چہرے پر بھرپور تھپڑ رسید کر دوں لیکن میں ضبط کر گیا۔ میں نے اپنا حساب کیا اور فیکٹری سے باہر آگیا۔

فیکٹری سے کچھ فاصلے پر درمیانے درجے کا ایک ہوٹل تھا۔ میں وہاں چائے پینے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ آخر میں نے ایسا کون سا غلط کام کیا ہے کہ مجھ پر پے در پے پریشانیوں اور مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں؟ پہلے میرے ابّو کا انتقال ہوا، پھر میری بہن بیوہ ہوئی، محبت کرنے والے چاچا اور چاچی مجھ سے جدا ہوئے۔ میرے دونوں مکان میرے ہاتھ سے چلے گئے۔ اب یہ ملازمت بھی گئی۔

میں گھر پہنچا تو بہت پریشان تھا۔ میں نے اپنے پڑوسی کی بیٹھک چھوڑ کر ایک کمرا کرائے پر لے لیا تھا۔ اب مجھے یہ فکر تھی کہ آئندہ مہینے کرایہ کہاں سے دوں گا... کھاؤں گا کیا؟

خالہ کلثوم کئی بار کہہ چکی تھیں کہ میں ان کے گھر میں رہ جاؤں لیکن میری خودداری نے گوارا نہ کیا۔ یوں بھی ان کی دو جوان بیٹیاں تھیں۔ میں وہاں کس حیثیت سے رہتا؟ محلے والوں کو تو باتیں بنانے کا موقع مل جاتا۔

بس اب اُدھار پر گزارہ تھا۔ افضل خان کو اب تک علم نہیں ہوا تھا کہ میں ملازمت چھوڑ چکا ہوں، ورنہ شاید وہ اتنی فراخ دلی سے اُدھار نہ دیتا۔

اس دن بھی اخبار دیکھنے کے بعد میں نے ایک دو دفتروں کا پتا نوٹ کیا اور قسمت آزمائی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

باہر آنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میرے پاس تو کرائے کے پیسے بھی نہیں ہیں۔ میں وہاں تک پہنچوں گا کیسے؟

اچانک مجھے اپنے پرانے محلے کے چاچا اختر نظر آئے۔ وہ مجھے دیکھ کر سیدھے میری طرف آئے اور بولے۔ "کیسے ہو افتخار میاں؟ تم نے تو اب ہماری طرف کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا۔"

"میں آج کل بہت مصروف ہوں چاچا!" میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ پھر سرسری انداز میں کہا۔ "چاچا! میں صبح گھر سے اپنا پرس لینا بھول گیا۔ اب گھر جانے کا وقت بھی نہیں ہے اور مجھے ایک جگہ ضروری کام سے جانا ہے۔ اگر..."

"ہاں ہاں۔" چاچا نے ہنس کر کہا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکال لیے۔ "میرے پاس بارہ سو روپے ہیں۔ یہ تم رکھ لو کم سے کم پیسے لوٹانے کے بہانے ہی گھر آ جاؤ گے۔"

"مجھے صرف دو سو روپے کی ضرورت ہے چاچا۔" میں نے کہا۔

"ارے بیٹا رکھ لو۔ دو سو روپے سے کیا ہوگا؟" انہوں نے زبردستی نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیے۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر جلد ہی جاب کا بندوبست نہیں ہوا تو میں اپنی قیمتی گھڑی بیچ دوں گا۔ پندرہ ہزار کی گھڑی کم سے کم چھ سات ہزار میں تو بک ہی جائے گی۔ یوں مہینے مزید گزر جائیں گے پھر میرے پاس سیل فون بھی بہت قیمتی تھا۔

میں آئی آئی چندریگر روڈ پہنچا ہی تھا کہ مجھے رمضان نظر آیا۔ وہ وہاں گاڑی پارک کر رہا تھا۔

اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ گاڑی سے اترتا میں جھپٹ کر اس کے سر پر جا پہنچا۔

مجھے دیکھ کر وہ بوکھلا گیا، سنبھل کر بولا۔ "تم... تم اب کیا چاہتے ہو؟"

"اپنے مکان کی قیمت۔" میں نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

"کون سا مکان... کیسی قیمت؟" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

میں نے کھڑکی ہی میں سے اس کے چہرے پر گھونسا مارا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور شاید ایک دانت بھی ہل گیا۔

اس نے ڈیش بورڈ کھول کر اچانک اس میں سے ریوالور نکال لیا۔ "میں ابھی دیتا ہوں تمہیں قیمت... چور، اُچکّے! تم مجھے لوٹنا چاہتے ہو۔" اس نے ریوالور کا رخ میری طرف کیا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

وہ جونہی نیچے اترا، میں نے اچانک اس کے ریوالور والے ہاتھ پر ہاتھ ڈال دیا۔ چھینا جھپٹی میں اس کا ریوالور میرے ہاتھ میں آگیا۔

وہ آئی آئی چندریگر روڈ کا مصروف علاقہ تھا۔ لمحوں میں وہاں لوگ جمع ہو گئے۔ کسی نے یہ نہ دیکھا کہ ریوالور رمضان نے نکالا تھا کیونکہ جب لوگ جمع ہوئے تو ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔

وہ ریوالور چھیننے کو جھپٹا، اسی وقت گولی چل گئی۔

دھماکا ہوا۔ لمحے بھر کو تو میں سناٹے میں رہ گیا۔ رمضان خود بھی بری طرح نروس ہو گیا۔ وہ تو شکر ہے کہ گولی سے کسی کا نقصان نہیں ہوا تھا۔ وہ گاڑی کی چھت پھاڑتی ہوئی اوپر نکل گئی تھی۔

فوراً ہی وہاں پولیس آگئی اور مجھے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ ریوالور رمضان کا ضرور تھا لیکن اس کا لائسنس نہیں تھا۔

اس نے پولیس کو بیان دیا کہ یہ اُچکّا مجھے لوٹنا چاہتا تھا۔ میں نے مزاحمت کی تو اس نے فائر کر دیا۔

پولیس والے مجھے گرفتار کر کے پولیس اسٹیشن لے گئے اور حوالات میں بند کر دیا۔ پولیس نے مجھ پر دفعہ تین سو سات کے تحت مقدمہ بنا دیا۔

دوسرے دن پولیس نے میرا چودہ دن کا ریمانڈ لے لیا۔

خالہ کلثوم نے اس موقع پر میری بہت مدد کی۔ وہ بے چاری تو خود نہ جانے کیسے زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہی تھیں۔ وہ گھر پر سلائی وغیرہ کا کام کرتی تھیں اور ملیحہ کسی اسکول میں

www.kahopakistan.com

پڑھانے لگی تھی۔

ان لوگوں نے میرے لیے اپنی بساط سے بڑھ کر کیا۔ خالہ کلثوم ہی نے اپنے کسی جاننے والے کے ذریعے وکیل کا بندوبست کیا۔ وکیل کی کوششوں سے اتنا ضرور ہوا کہ دفعہ تین سو سات کا کیس دفعہ تین سو چوبیس میں تبدیل ہوگیا۔ فرق یہ ہے کہ تین سو سات اقدامِ قتل کا کیس ہے اور تین سو چوبیس ارادۂ قتل کا۔ یوں عدالت سے مجھے تین سال کی سزا ہوگئی۔

جیل میں ایک دفعہ خالہ کلثوم مجھ سے ملنے آئیں تو ان کے ساتھ ملیحہ بھی تھی۔

مجھے اسے وہاں دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ میں نے خالہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ آپ کا یہاں آنا مناسب نہیں ہے، آئندہ یہاں مت آئیے گا۔ یہ کوئی اچھی جگہ نہیں ہے۔

خالہ کلثوم نے اس کے بعد کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔

جیل میں بھانت بھانت کے قیدیوں سے میرا واسطہ پڑا۔ وہاں عادی مجرم بھی تھے اور ایسے قیدی بھی تھے جو بلا کسی قصور کے سزا بھگت رہے تھے۔

پہلے پہل تو مجھے وہاں پر قیدیوں نے دبا کر رکھا لیکن میں نے جب یہ دیکھا کہ جو قیدی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہیں، وہ فائدے میں رہتے ہیں۔ میں نے بھی وہی روش اپنانے کا فیصلہ کرلیا۔

اس دن حسبِ معمول نادر نے مجھ سے کہا۔ ''چل ذرا میری مالش کردے۔''

''میں کوئی مالشیا نہیں ہوں۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''مالش کرانے کا اتنا ہی شوق ہے تو یہاں اپنے ساتھ ایک مالش کرنے والا بھی لے کر آتے۔''

نادر ایک طرح سے اس بیرک کا لیڈر تھا اور سوائے اس کے چمچوں کے، کوئی اس کے آگے دم نہیں مارتا تھا۔

اس وقت اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ اس نے اچانک وہ گلاس مجھ پر کھینچ مارا۔ بچتے بچتے بھی تانبے کا گلاس اچھلتا ہوا میرے شانے پر لگا۔ گلاس پانی سے بھرا ہوا تھا اس لیے کچھ پانی میرے کپڑوں پر گرا اور کچھ پانی میرے بستر پر گرا جو صرف میلی اور بوسیدہ سی ایک دری پر مشتمل تھا۔

نادر قد کاٹھ اور صحت میں تو مجھ سے زیادہ نہیں تھا لیکن وہ عادی بدمعاش تھا اور لڑائی جھگڑا، دنگا فساد اس کا روز کا معمول تھا۔

اس نے قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا، پھر اپنی جگہ بیٹھے ہی بیٹھے دہاڑا۔ ''کیا کہا تُو نے؟''

''میں اپنی بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔ تم نے اگر نہیں سنا ہے تو اپنے کسی چمچے سے پوچھ لو۔ وہ تمہاری طرح بہرے نہیں ہوں گے۔''

اس کے دو چمچے اچانک میری طرف جھپٹے۔ نادر چیخ کر بولا۔ ''چھوڑ دو اسے۔ میں خود اس سے نمٹوں گا۔''

وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور فلمی بدمعاشوں کی طرح چلتا ہوا میرے نزدیک آگیا۔ ''کیوں بھئی، آج تو نے بھنگ پی رکھی ہے کیا؟''

''تم جیل میں رہ کر ولایتی شراب پی سکتے ہو تو کیا میں بھنگ بھی نہیں پی سکتا؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میں قیدیوں کی روز روز کی چک چک سے تنگ آچکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ایک دفعہ قادر کو للکار دیا تو پھر کوئی میرے سامنے ٹکنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس کوشش میں میری جان بھی جاسکتی ہے لیکن پے در پے اتنے صدمے سہنے کے بعد میں زندہ ہی کب رہنا چاہتا تھا۔ میں بھی نادر کے سامنے تن کر کھڑا ہوگیا۔

اس نے اچانک ہاتھ گھما دیا۔ میں ذہنی طور پر اس کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا۔ میں نے نیچے جھک کر اس کا وار بچایا اور بیٹھے بیٹھے ہی ایک گھونسا پوری قوت سے اس کی ٹانگوں کے بیچ میں دے مارا۔

نادر تکلیف کی شدت سے دُہرا ہوگیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ وار خاصا کاری ہے۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر ضرب شدید ہوئی تو اس کی موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔

وہ کراہتا ہوا گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کی پیشانی پر خاصی قوت سے ٹکر ماری۔ وہ الٹ کر گرا اور بری طرح تڑپنے لگا۔

''اٹھ...'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''اب تُو میری مالش کر۔'' میں نے اپنا پیر اس کی گردن پر رکھ دیا۔ ''اٹھ... تو تو بہت بڑا بدمعاش ہے۔'' میں نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

اگر میں چوک جاتا تو وہ میرا اس سے بھی بدتر حشر کرتا۔

وہ بے بسی سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے اس کی گردن سے پاؤں ہٹالیا اور خود اپنی جگہ جا بیٹھا۔

نادر تھوڑی دیر فرش پر پڑا رہا، پھر آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر اب بھی کرب کے آثار تھے۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور نادر کے ایک چمچے سے کہا۔ ''مجھے سگریٹ سلگا کردے۔''

اس نے سہمے ہوئے انداز میں مجھے دیکھا، پھر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اپنی جگہ سے اٹھا اور پیکٹ میری طرف بڑھا دیا۔

''میں نے کہا ہے کہ مجھے سگریٹ سلگا کردے۔'' میں نے ڈپٹ کر کہا۔

اس نے مشینی انداز میں ایک سگریٹ نکالی اور سلگا کر میری طرف بڑھا دی۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر سگریٹ کے گہرے گہرے کش لیتا رہا۔

اس بیرک میں تقریباً اسّی قیدی تھے۔ وہ سبھی نادر سے خوف زدہ تھے۔ وہ سبھی مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں کسی اور دنیا کی مخلوق ہوں۔

''کرمو!'' نادر نے تڑپتے ہوئے کہا۔ ''سنتری سے کہہ کہ میری طبیعت خراب ہے۔ مجھے اسپتال پہنچا دے۔'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

کرمو شاید اس کا خاص چمچہ تھا۔ اس نے فوراً سلاخوں والے دروازے کے پاس جاکر سنتری کو آواز دی۔

فوراً ہی نادر کو اسپتال منتقل کردیا گیا۔ اس کے جاتے ہی بیرک کا ایک اور قیدی کریم خان میرے پاس آگیا۔ وہ بھی نادر کا ڈسا ہوا تھا۔ نادر نے میرے سامنے ہی اسے بہت بری طرح مارا تھا۔

وہ آہستہ سے بولا۔ ''افتخار بابو! اس نادر سے ہوشیار رہنا، یہ سانپ کی سی خصلت رکھتا ہے۔ یہ موقع دیکھ کر بے خبری میں تمہیں ڈس لے گا۔''

''تم اس کی فکر مت کرو کریم خان۔'' میں نے کہا۔ ''یہ لوگ صرف اپنے چمچوں کے بل پر بدمعاشی کرتے ہیں۔ میں اس سے نمٹ لوں گا۔''

نادر کے اسپتال سے آنے سے پہلے بیرک میں ایک نیا قیدی آیا۔ وہ کسی کو منہ نہیں لگاتا تھا اور لیے دیے رہتا تھا۔ اپنے حلیے، چال ڈھال اور بات چیت سے پڑھا لکھا بھی لگتا تھا۔ میں نے بھی اسے چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔

نادر چار پانچ دن آرام کرکے اسپتال سے لوٹا تو وہ پھر پہلے کی طرح چاق و چوبند تھا۔

اس نے مجھے کینہ توز نظروں سے گھورا۔ پھر اس کی نظر نئے آنے والے قیدی پر پڑی۔

اس نے حقارت سے کہا۔ ''اے، اِدھر آ۔''

نو وارد نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔

''اوئے باؤ!'' اس نے پھر تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ ''میں تجھ سے کہہ رہا ہوں نمبر پانچ سو گیارہ۔''

اپنا نمبر سن کر اس نے نادر کو چونک کر دیکھا۔

''ابے کیا بہرا ہے؟ اِدھر آ۔''

''دیکھو اگر تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے تو تم یہاں آؤ... اور یہ بات کرنے کا کون سا طریقہ ہے؟''

''تو ہمیں بات کرنے کا طریقہ سکھائے گا؟'' نادر نے کہا پھر مضحکہ خیز لہجے میں بولا۔ ''جناب نمبر پانچ سو گیارہ صاحب! قبلہ ذرا یہاں تشریف لانا پسند فرمائیں گے؟''

اس کے اس انداز پر نادر کے تمام چمچے ہنسنے لگے۔

''اگر زحمت نہ ہو تو آپ ہی آجائیں۔'' پانچ سو گیارہ نے کہا۔

''او باؤ، تجھے عزت راس نہیں آتی؟'' نادر اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''اِدھر آکر میرا سر دبا۔''

''آرام سے سو جاؤ، سر کا درد خود ہی ٹھیک ہوجائے گا اور اب مجھے آواز مت دینا۔''

اس کی بات سن کر نادر بھنا کر اٹھا۔ حالانکہ ابھی وہ مجھ سے مار کھانے کے بعد اسپتال سے لوٹا تھا۔

میرا بستر پانچ سو گیارہ کے برابر ہی میں تھا۔ نادر ادھر بڑھا تو میں بھی محتاط ہوگیا۔ اس دن تو وہ بے خبری میں مار کھا گیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ ہر بار مار کھا جاتا۔

پانچ سو گیارہ کے اطمینان میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ نادر اس کے سر پر پہنچ گیا، وہ تب بھی بیٹھا رہا۔ میں البتہ محتاط تھا۔

نادر اس کے نزدیک پہنچ کر رکا اور اچانک اس کے سینے پر گھونسا مارنے کی کوشش کی لیکن میں نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نہ صرف ہاتھ پکڑا بلکہ دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے پر ایک گھونسا بھی رسید کرنے کی کوشش کی لیکن اب وہ محتاط تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے پانچ سو گیارہ پر اچھال دیا لیکن میں فرش پر گرا کیونکہ وہ تو وہاں سے ہٹ چکا تھا۔ پھر اس نے جھپٹ کر نادر کی کلائی پکڑی تو مجھے کلائی کے چٹخنے کی آواز آئی۔ دوسرے ہی لمحے نادر کا ہاتھ بے جان ہوکر پہلو میں جھولنے لگا۔

''اب ساری عمر ٹنڈا بن کر گھومنا۔ اگر تُو کہے تو تیرا دوسرا ہاتھ بھی ناکارہ کردوں۔'' پانچ سو گیارہ نے کہا۔ ''پھر تو دوسروں سے سر بھی دبوانا اور پیر بھی۔ معذور ہونے کے بعد تو تو اپنا کام خود نہیں کرسکے گا۔''

''دیکھ پانچ سو گیارہ... میں...''

www.kahopakistan.com

''میرا نام اکبر ہے۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''اب اگر تو نے بدمعاشی کی کوشش کی تو میں تیرے چاروں ہاتھ پاؤں توڑ کر پھینک دوں گا، پھر تیری بقیہ زندگی کسی ہاتھ گاڑی پر بھیک مانگتے گزرے گی۔''

''آ... آ... آپ اکبر خان ہیں؟'' نادر نے گھبرا کر پوچھا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں۔ میں... آپ کو... پہچان نہ سکا۔'' نادر نے اپنے دوسرے ہاتھ سے اپنا مفلوج ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔

''تو اب تو مجھے پہچان گیا نا؟'' اکبر خان نے کہا۔

''اکبر بھائی! کیا میرا ہاتھ اب ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہوجائے گا؟'' اس نے رو دینے والے انداز میں پوچھا۔

''ادھر آ۔'' اکبر نے کہا۔ ''میں تیرا ہاتھ اچھی ٹھیک کر دیتا ہوں لیکن تجھے تھوڑی سی تکلیف ہوگی۔''

اکبر نے اس کا ہاتھ پوری قوت سے کھینچا اور اس کی کلائی کا جوڑ بٹھا دیا۔

نادر دل خراش انداز میں چیخا، پھر آہستہ آہستہ پرسکون ہوگیا۔

اکبر میری طرف متوجہ ہوا۔ ''تمہارا شکریہ تو میں نے ادا کیا ہی نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''تم مجھے کچھ پڑھے لکھے لگتے ہو۔ شکل سے بھی کسی اچھے خاندان کے معلوم ہوتے ہو۔''

میں نے مختصراً اسے بتایا کہ میں کس الزام میں سزا کاٹ رہا ہوں۔

''دیکھو افتخار!'' اکبر خان نے کہا۔ ''یہ سچائی، ایمان داری، فرض شناسی، اصول پسندی سب کتابوں میں ہوتی ہیں۔ تم نے اب تک اپنی زندگی سچائی اور ایمان داری سے گزاری ہے نا، تمہیں اس کا کیا فائدہ ہوا ہے؟''

''میں نے خود بھی بہت پہلے یہ فیصلہ کرلیا ہے اکبر بھائی کہ ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ یہاں تو جس کی لاٹھی، اس کی بھینس کا قانون چلتا ہے۔ پھر میں بھی لاٹھی ہی کیوں نہ اٹھالوں؟''

''گڈ!'' اکبر خان خوش ہوکر بولا۔ ''سچائی اور ایمان داری کمزوروں اور بزدلوں کی اصلاحات ہیں۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''اب سو جاؤ، صبح بات کریں گے۔''

اکبر خان کے آنے اور نادر کی پٹائی کرنے سے مجھے کئی فائدے ہوئے۔ بیرک کا ہر قیدی اب مجھ سے خوف زدہ رہنے لگا۔ باہر سے نادر کے ساتھی جو کچھ اس کے لیے بھیجتے تھے، وہ اس میں سے مجھے اور اکبر خان کو بھی حصہ دیتا تھا۔

جیل میں مجھے ہر طرح کی سہولت میسر تھی۔ اچھے سے اچھا کھانا، بہترین سگریٹ، پرفیوم، حتیٰ کہ سیل فون بھی موجود تھا۔ حالانکہ میں نے دیکھا تھا کہ جو لوگ مخصوص قیدیوں سے ملاقات کرنے آتے تھے، جیل کا عملہ ان کے سیل فون باہر ہی جمع کرلیتا تھا۔ وہاں تو موبائل فون کی سم تک لے جانا بھی جرم تھا۔ اس کے باوجود اکبر خان، نادر اور اس کے ساتھی دھڑلے سے سیل فون استعمال کرتے تھے۔

ایک دن میں ایک قیدی کے ہاتھ کی بنی ہوئی شان دار کافی پی رہا تھا، ہاتھ میں بینسن کا سلگتا ہوا سگریٹ تھا۔ اکبر خان بھی میرے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ وہ اچانک بولا۔ ''افتخار! تم ہمارے ساتھ کام کرو گے؟''

''آپ کے ساتھ؟'' میں نے پوچھا۔ ''آپ تو یہاں خود کوئی کام نہیں کرتے۔''

''بے وقوف! میں جیل سے نکلنے کے بعد کی بات کررہا ہوں۔ تین چار مہینے بعد تمہاری سزا پوری ہورہی ہے۔ ممکن ہے تیئس مارچ کے موقع پر صدر یا وزیراعظم قیدیوں کی سزا میں تخفیف کردیں؟ جیل سے نکلنے کے بعد تم کیا کرو گے؟''

''میں کیا کروں گا؟'' میں نے مُردہ خیال انداز میں کہا۔ ''یہ تو میں نے ابھی سوچا ہی نہیں ہے۔ کوئی چھوٹی موٹی نوکری کرلوں گا اور اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کی کوشش کروں گا۔''

اکبر خان تحقیر آمیز انداز میں مسکرایا۔ ''تین سال جیل میں رہ کر بھی تمہیں یقین ہے کہ تمہیں کوئی ملازمت مل جائے گی اور تم اپنی تعلیم مکمل کرلو گے؟ فرض کرو تم نے تعلیم مکمل کر بھی لی تو کیا کرو گے؟ جیل میں رہ کر بھی تم نے جینے کا قرینہ نہیں سیکھا؟ بے وقوفی کی باتیں مت کرو افتخار! یہاں سے رہا ہونے کے بعد تم غلام رسول سے مل لینا۔ وہ تمہیں بڑے صاحب سے ملوادے گا۔''

پھر وہی ہوا۔ یومِ جمہوریہ پاکستان کے موقع پر وزیراعظم نے ان تمام قیدیوں کی سزا معاف کردی جن کی سزا تین ماہ یا اس سے کم رہ گئی تھی۔ یوں تین ماہ پہلے میں بھی جیل سے باہر آگیا۔

باہر آنے سے پہلے جیل سپرنٹنڈنٹ نے مجھے میرے کپڑے، پیسے، گھڑی وغیرہ واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر افتخار! مجھے امید ہے کہ اب تم ایک معزز شہری کی حیثیت سے زندگی گزارو گے اور ان حالات میں ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔ وش یو بیسٹ آف لک۔''

جیل سے باہر آنے کے بعد میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں فوری طور پر کہاں جاؤں؟ پھر مجھے خالہ کلثوم کا خیال

آیا۔ ان بے چاری نے میرا بہت ساتھ دیا تھا۔

میں سب سے پہلے انہی کے گھر پہنچا۔ دستک کے جواب میں خوب روسی، بھرے بھرے بدن کی ایک لڑکی دروازے پر آئی۔

میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ خالہ کلثوم کی چھوٹی بیٹی فریحہ تھی۔ اس نے بھی خوب رنگ روپ نکالا تھا۔

وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی، پھر مجھے خاموش پاکر بولی۔ ''جی فرمایئے، آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''مجھے اندر آنے کا راستہ تو دے چھپکلی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ارے افتخار بھائی! آپ... امی... باجی... دیکھیے کون آیا ہے؟'' وہ وہیں سے کھڑی کھڑی چیخی۔

خالہ کلثوم اور ملیحہ گھبرا کر وہاں پہنچیں۔ خالہ مجھے دیکھ کر خوشی سے بولیں۔ ''افتخار بیٹا! تم کب آئے؟ فریحہ! افتخار کو راستہ تو دے۔ تو تو دروازے میں اڑی کھڑی ہے۔''

فریحہ جلدی سے ایک طرف ہٹ گئی۔

خالہ نے کہا۔ ''آؤ بیٹا! اندر آجاؤ۔ تم تو مہمانوں کی طرح وہیں کھڑے ہوگئے۔''

''آداب، افتخار صاحب!'' ملیحہ نے اپنی مترنم آواز میں کہا۔ وہ ان تین برسوں میں گویا شعلہ جوالا بن چکی تھی۔ اس کے چہرے کی سفیدی میں اب ہلکی ہلکی سرخی کی بھی آمیزش ہوگئی تھی۔ اس کے لمبے گھنے براؤن بال کمر سے نیچے تک جھول رہے تھے۔ اس نے جدید فیشن کے انتہائی بہترین کپڑے پہن رکھے تھے۔

میں نے ملیحہ کے سلام کا جواب دیا اور اندر چلا گیا۔

''آج کل کس اسکول میں پڑھا رہی ہو ملیحہ؟'' میں نے پوچھا۔

''باجی اب اسکول میں نہیں پڑھاتیں بلکہ آفس میں جاب کرتی ہیں۔'' فریحہ نے کہا۔

''ارے واہ! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''کس آفس میں جاب کررہی ہو ملیحہ؟''

''ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے، ایڈجیم۔'' ملیحہ نے کہا۔ ''میں اسی میں جاب کررہی ہوں۔ میں وہاں کلائنٹ سروسز میں ہوں۔''

''ویری گڈ!'' میں نے خوش دلی سے کہا۔ ''ویسے مجھے پوچھنا تو نہیں چاہیے کیونکہ یہ بداخلاقی ہے لیکن میں خود کو غیر نہیں سمجھتا اس لیے پوچھ رہا ہوں۔''

''اوہو افتخار بھائی!'' فریحہ نے کہا۔ ''جتنی بھی آپ

ماہنامہ پاکیزہ کراچی
جون 2011ء کے خاص نمبر کی ایک جھلک
آپ کی پُرزور فرمائش پر **فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ** میں **محترمہ عذرا رسول** کی سچی اور کھری باتیں
آخری قسط ملاحظہ کریں
ذکیہ بلگرامی کا ناول **اگر ملنا نہیں ہمدم** سوچ کی نئی راہوں پر گامزن
شیریں حیدر کا نیا ناول **شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں**
عالیہ بخاری کا ناول **خوشبو کا سفر** ایک نئی مہک کے ساتھ
راحت وفا کا نیا ناول **ایک تھی نینا** نفسیاتی احساسات و خیالات سے مزین
میمونہ خورشید اور **رضوانہ پرنس** کے سچے جذبوں سے مزین پُرتاثر ناولٹ
عطیہ عمر، عظمیٰ آفاق سعید، عندلیب سلمیٰ، تسنیم منیر علوی، بلقیس جہاں، اورحرا فاطمہ
کے زندگی سے قریب ترین تلخ و شیریں افسانے
آپ کی آراء و گزارشات کے منتظر سلسلے
کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

www.kahopakistan.com

نے تمہید باندھی ہے، اتنی دیر میں تو آپ باجی سے تین چار سوال پوچھ سکتے تھے۔ اب پوچھ بھی چکیں۔''

''تم بولنے کا موقع دو گی چھپکلی تو میں کچھ بولوں گا۔''

''باجی دیکھیے، افتخار بھائی مجھے ابھی تک چھپکلی کہتے ہیں۔ اب میں کہاں سے چھپکلی لگتی ہوں۔'' وہ بُرا مان کر بولی۔

''تم ہر طرف سے چھپکلی لگتی ہو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''جائیے میں آپ سے نہیں بولتی۔'' وہ منہ پھلا کر بولی۔

''ارے چھپ... سوری فریحہ! ایسا غضب مت کرنا، اس وقت تو میری جیب میں چاکلیٹ بھی نہیں ہے۔ میں تمہیں مناؤں گا کیسے؟''

''میں اب چاکلیٹ نہیں پیزا، زنگر برگر اور کے ایف سی...''

''بس بس۔'' ملیحہ نے اسے ٹوک دیا۔ ''تم نے تو ابھی سے فرمائشیں شروع کر دیں۔''

خالہ کلثوم کمرے میں داخل ہوئیں تو ان کے ہاتھ میں ٹرے تھی جو سموسوں، پکوڑوں، نمکو اور مٹھائی سے بھری ہوئی تھی۔

''ارے خالہ! اتنا تکلف، میں کوئی مہمان ہوں۔''

''ارے بیٹا! شام کی چائے پر ان دونوں کو چٹورپن سوجھتا ہے۔ یہ میں نے خاص طور پر تمہارے لیے نہیں بنایا ہے۔ ہاں، مٹھائی خاص طور پر تمہارے لیے منگوائی ہے۔ یہ دونوں مٹھائی نہیں کھاتی ہیں، کہتی ہیں موٹی ہو جائیں گی۔''

''اور یہ سموسے، پکوڑے اور نمکو تو شاید وزن کم کرنے کے کام آتے ہیں؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

میں نے خالہ کلثوم کے گھر کی حالت کا جائزہ لیا۔ گھر کی ہر چیز سے خوش حالی ٹپک رہی تھی۔ ڈرائنگ روم میں بہت قیمتی فرنیچر اور بیش قیمت پردے تھے۔ فرش پر دبیز قالین تھا۔ ایک ایک کمرے میں انتہائی قیمتی اور امپورٹڈ ڈیکوریشن پیس سجے ہوئے تھے۔ ان سب کے چہروں سے بھی خوش حالی ٹپک رہی تھی۔

''ہاں، افتخار بھائی! آپ باجی سے کچھ پوچھنے والے تھے؟'' فریحہ نے چائے کا کپ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں یہ پوچھنے والا تھا کہ ملیحہ کو سیلری کتنی ملتی ہے؟''

''ارے بیٹا! بس خدا کو ہمارے دن پھیرنا مقصود تھے۔ ورنہ ایک بی اے پاس لڑکی کو اتنی بہترین جاب کب ملتی ہے؟ اوور ٹائم ملا کر اسے تقریباً چالیس ہزار روپے مل جاتے ہیں۔ اب تم سے کیا چھپانا ورنہ میں لوگوں کو اس کی تنخواہ بتاتی نہیں ہوں۔ حاسدوں کی نظر بھی تو کھا جاتی ہے۔ تم تو اپنے ہو اس لیے بتا دیا۔''

''اور افتخار بھائی! آپ کو پتا ہے، باجی کو ایک دو مہینے میں آفس سے گاڑی بھی ملنے والی ہے۔''

''یہ تو واقعی خوشی کی بات ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اسی بہانے ہمیں بھی سیر کا موقع مل جائے گا۔''

''افتخار بیٹا!'' خالہ نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔ ''اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

''میں آج ہی تو آیا ہوں۔ پہلے تو کہیں ملازمت تلاش کروں گا، پھر اپنی تعلیم مکمل کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''میں تمہارے گھر سے تمام سامان اٹھا لائی تھی۔ وہ سامان تمہاری امانت ہے۔ میں نے اوپر کے ایک کمرے میں بند کر دیا ہے۔ میری مانو تو اب تم یہیں آجاؤ۔''

''نہیں خالہ۔'' میں نے کہا۔ ''اب تو میں مزید بدنام ہو چکا ہوں۔ محلے والے میرے ساتھ ساتھ آپ کا جینا بھی دوبھر کر دیں گے۔ میرے پاس اتنی رقم تو ہے کہ میں کہیں بھی ایک کمرے کا مکان لے سکوں۔''

''جیسے تمہاری مرضی بیٹا!'' خالہ نے کہا۔ ''ویسے یہ تمہارا گھر ہے، جب چاہو یہاں آسکتے ہو۔''

''ہاں خالہ! مجھے فوری طور پر کچھ کپڑوں کی ضرورت پڑے گی۔ آپ میرے کپڑے تو وہاں سے لے آئی ہوں گی؟''

''وہ کپڑے اب آؤٹ آف فیشن ہو چکے ہیں افتخار بھائی!'' فریحہ نے کہا۔ ''آپ جیسا ہینڈسم آدمی وہ پرانے فیشن کے کپڑے پہنے گا؟''

''اس وقت تو مجبوری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بعد میں دیکھا جائے گا۔''

خالہ نے میرے سامان کا کمرا کھول دیا۔ اس میں میری ہر چیز جوں کی توں موجود تھی۔ کپڑے، جوتے، سوٹ، ٹائیاں، گھڑیاں، کف لنکس، لائٹر، پرفیوم، غرض یہ کہ ہر وہ چیز موجود تھی جس کا مجھے شوق تھا۔ میرے کپڑے ایسے بھی آؤٹ آف فیشن نہیں ہوئے تھے۔ جوتے بھی بہترین حالت میں تھے۔

میں نے فوری طور پر ایک سوٹ کیس لیا اپنے کپڑے وغیرہ رکھے، جوتے لیے اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

پھر وہی سوال تھا کہ اب میں کہاں جاؤں؟ پہلے میں نے سوچا کہ سعدیہ باجی کے پاس لاڑکانہ چلا جاؤں لیکن میں وہاں خالی ہاتھ نہیں جانا چاہتا تھا۔

میرے پاس اکبر خان کا دیا ہوا غلام رسول کا پتا موجود تھا۔ وہ نارتھ کراچی میں کہیں رہتا تھا۔

جیل سے رہائی کے وقت مجھے اتنے پیسے مل گئے تھے کہ میں ایک آدھ مہینا آرام سے گزار سکتا تھا۔

میں نے ٹیکسی پکڑی اور نارتھ کراچی روانہ ہو گیا۔

غلام رسول کا مکان ڈھونڈنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ مکان کیا، وہ چھوٹا سا بنگلا تھا۔ ڈور بیل کے جواب میں ملازم نما ایک شخص باہر آیا۔ میں نے اس سے غلام رسول کے بارے میں پوچھا۔

''صاحب کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔'' ملازم نے جواب دیا۔ ''آپ کا نام؟''

''صاحب سے کہنا کہ مجھے اکبر خان صاحب نے بھیجا ہے۔ یہ رقعہ بھی انہیں دے دینا۔'' میں نے اکبر خان کا دیا ہوا خط ملازم کو دے دیا۔

''آپ اندر آجائیں صاحب۔'' ملازم نے کہا اور میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا۔

اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔

فوراً ہی چالیس، بیالیس سال کا ایک باوقار آدمی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ وہ شاید اس وقت ٹائی باندھ رہا تھا۔ اکبر خان کا نام سن کر وہ اسی حالت میں وہاں آگیا تھا۔

وہ آگے بڑھ کر والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گیا اور بولا۔ ''افتخار صاحب! خان صاحب تو آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ میں کل ہی ان سے مل کر آیا ہوں۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ افتخار صاحب اب تک وہاں کیوں نہیں پہنچے؟''

''ویسے میں نے کبھی آپ کو اکبر خان صاحب سے ملتے نہیں دیکھا؟'' میں نے کہا۔

''میں اصل میں پاکستان سے باہر تھا۔'' غلام رسول نے کہا۔ ''کل ہی پاکستان پہنچا ہوں اس لیے ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا۔''

اس نے ملازم کو طلب کر کے کافی لانے کو کہا۔

''غلام رسول صاحب! یہ تکلف نہ کریں۔ ویسے بھی آپ کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔''

''کوئی ایسی خاص میٹنگ نہیں تھی۔'' اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر ملانے کے بعد بولا۔ ''ہاں غفور! میں آج نہیں آپاؤں گا۔ میٹنگ کینسل کر دو۔'' اس نے سیل فون آف کر کے میز پر رکھ دیا۔

''آپ نے میری وجہ سے فضول میں اپنا پروگرام کینسل کر دیا۔'' میں نے کہا۔

''آپ اکبر صاحب کے خاص آدمی ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''اور اکبر صاحب اس وقت حاجی صاحب کے بعد دوسرے نمبر پر ہیں۔ میں بھلا آپ کو چھوڑ کر جا سکتا ہوں۔''

اس دوران میں ملازم کافی اور دوسرے لوازمات لے آیا۔ میرا پیٹ تو خالہ کے گھر ہی بھر چکا تھا۔ میں نے صرف کافی پینے پر اکتفا کیا۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' میں نے کہا۔ ''اکبر خان جیسا آدمی جیل میں کیوں ہے؟''

میری بات سن کر غلام رسول مسکرایا۔ ''افتخار صاحب! آپ تو اب اپنے آدمی ہیں۔ اکبر صاحب نے خط میں لکھا ہے کہ افتخار انتہائی جی دار اور قابلِ اعتبار آدمی ہے۔ اب آپ سے کیا چھپانا۔ اکبر صاحب اصل میں اپنے ایک مخالف کو راہ سے ہٹانا چاہتے تھے۔''

''لیکن ان پر قتل کا الزام تو نہیں لگا؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ پہلے میری پوری بات سن لیں۔ اکبر صاحب اس شخص کو اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کرنا چاہتے تھے ورنہ یہ کام تو ان کا کوئی آدمی بھی کر سکتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر جیل گئے تھے۔''

''جان بوجھ کر جیل گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، جیل میں رہ کر انہوں نے اس آدمی کا پتا بھی صاف کر دیا اور ان پر کوئی الزام بھی نہ آیا۔ وہ رات کو جیل سے نکلے، اپنا کام کیا اور دوبارہ جیل میں چلے گئے۔ اب کون شک کر سکتا ہے کہ جیل میں موجود ایک آدمی کسی کا قتل کر سکتا ہے؟ ویسے ان کا جرم اتنا سنگین نہیں ہے۔ معمولی دنگے فساد کا کیس ہے، انہیں صرف ایک سال کی سزا ہوئی ہے۔ اب ہفتہ دس دن میں وہ جیل سے آنے ہی والے ہیں۔''

میں حیرت سے غلام رسول کی باتیں سن رہا تھا۔

وہ چونک کر بولا۔ ''ہاں، اکبر صاحب نے کہا تھا کہ میں آپ کو حاجی صاحب سے ملوا دوں۔ اس بہانے ان سے میری بھی ملاقات ہو جائے گی۔'' اس نے سیل فون اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگا، پھر لائن ملنے پر بولا۔ ''ہیلو، میں غلام رسول بول رہا ہوں۔ ذرا حاجی صاحب سے میری بات کرائیں... اچھا، ان سے کہیے گا کہ اکبر صاحب نے جن صاحب کو بھیجا تھا، وہ میرے پاس بیٹھے ہیں۔''

وہ چند لمحے تک خاموشی سے سیل فون کان سے لگائے

www.kahopakistan.com

رہا۔

پھر بولا... ''السلام علیکم سر!... میں ٹھیک ہوں...سر! وہ اکبر صاحب نے...اچھا...میں ابھی آرہا ہوں۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''چلیے افتخار صاحب! حاجی صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''یہ حاجی صاحب کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''حاجی صاحب اس شہر کے بہت بڑے آدمی ہیں۔ اکبر صاحب کی وجہ سے وہ آپ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہیں۔'' اس نے تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لیا، پھر بولا۔ ''آپ کے کپڑے کچھ مناسب نہیں ہیں۔ حاجی صاحب...''

''غلام رسول صاحب!'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''آپ شاید بھول گئے کہ میں جیل سے آرہا ہوں، امریکا سے نہیں۔''

''میرے خیال میں آپ کے اور میرے سائز میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اگر آپ میرا کوئی سوٹ...''

''سوری غلام رسول صاحب!'' میں نے تلخ لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں اپنے کپڑے دوسروں کو دے تو دیتا ہوں لیکن مانگے تانگے کے کپڑے پہنتا نہیں ہوں۔''

اس طرزِ تخاطب پر غلام رسول کے چہرے پر لمحے بھر کو ناگواری کے تاثرات ظاہر ہوئے، پھر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پالیا اور بولا۔ ''چلیے پھر چلیں۔''

اس کے پاس نئے ماڈل کی ہنڈا سوک تھی جسے وہ خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ ویسے اس کا نام اس کی شخصیت کی مناسبت سے بالکل بھی مناسب نہیں تھا۔ اس کا نام سن کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ گاؤں کا کوئی زمیندار ہوگا۔ اس نے بوسکی کا کرتا اور کلف دار شلوار پہن رکھی ہوگی، پیروں میں کھسّے ہوں گے لیکن وہ تو اس کے برعکس بالکل ماڈرن تھا اور اپنے حلیے سے پلے بوائے لگتا تھا۔

حاجی صاحب کا بنگلا ڈیفنس میں تھا اور کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ گیٹ پر دو باوردی اور مسلح گارڈز موجود تھے۔ انہوں نے غلام رسول کی گاڑی دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔

غلام رسول نے پورچ میں گاڑی روکی تو برآمدے میں کھڑے ہوئے ایک گارڈ نے دروازہ کھولا اور غلام رسول کی تلاشی لی۔ میں حیران رہ گیا پھر وہ گارڈ میری طرف بڑھا۔

میں نے اشارے سے اسے روک دیا اور کہا۔ ''یہ کیا طریقہ ہے؟ میں تلاشی نہیں دوں گا۔''

''یہ حاجی صاحب کا حکم ہے سر!'' گارڈ نے مہذب لہجے میں کہا۔

''اگر اس کے بغیر حاجی صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکتی تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔ حاجی صاحب کو اپنے مہمانوں پر اتنا بھی اعتماد نہیں ہے تو پھر ان سے ملاقات کا کیا فائدہ؟''

''یہ فارملٹی ہے افتخار صاحب۔'' غلام رسول نے جلدی سے کہا۔ ''میں گزشتہ پندرہ سال سے حاجی صاحب کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ میں نے بھی تو آخر تلاشی دی ہے۔''

''آپ ضرور دیں۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں تلاشی نہیں دوں گا۔ یہ تو ایک طرح سے گھر آئے مہمان کی توہین ہے۔ میں واپس جارہا ہوں۔'' میں واپسی کے لیے دروازے کی طرف گھوم گیا۔

''سوری سر!'' گارڈ نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''اب آپ حاجی صاحب سے ملے بغیر واپس نہیں جا سکتے۔''

''کون روکے گا مجھے؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''افتخار صاحب! پلیز بات سمجھنے کی کوشش کریں۔'' غلام رسول نے کہا۔ ''حاجی صاحب اگر ناراض ہو گئے تو...''

''میں کسی حاجی صاحب کو نہیں جانتا۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''مجھے اکبر صاحب نے یہاں بھیجا تھا۔ حاجی صاحب کو اگر ملنا ہے تو ملیں، میں تلاشی ہرگز نہیں دوں گا۔'' پھر میں نے گارڈ سے کہا۔ ''میرا راستہ چھوڑو۔ میں واپس جارہا ہوں۔''

''سر، پلیز!'' گارڈ نے کہا۔ ''آپ مجھے مجبور مت کریں کہ میں...'' میں نے اسے ایک طرف دھکیلا اور گیٹ کی طرف بڑھا۔

''رک جائیے سر!'' گارڈ نے تیز لہجے میں کہا۔ ''ورنہ...''

میں نے گھوم کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور اس کا رخ میری طرف تھا۔

''بہت خوب!'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ میں حاجی صاحب کا مہمان ہوں۔'' میں نے غلام رسول سے کہا۔ میں گارڈ سے مخاطب ہوا۔ ''ٹھیک ہے، لے لو میری تلاشی... لیکن میں تمہاری شکایت حاجی صاحب سے ضرور کروں گا۔''

گارڈ کے چہرے کا تناؤ کم ہوگیا۔ اس کا ریوالور والا ہاتھ جھک گیا۔ وہ میری طرف بڑھا اور جھک کر میرے کوٹ کی جیب پر ہاتھ مارنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کا ریوالور چھین لیا۔ وہ بے چارہ بے خبری میں مار کھا گیا۔ اس نے سوچا بھی نہ

ہوگا کہ میں حاجی صاحب کے گھر میں کھڑے ہو کر، مسلح گارڈز کی فوج کی موجودگی میں یہ حرکت کروں گا۔

میں نے اس کا ریوالور اسی کی کنپٹی پر رکھ دیا اور درشت لہجے میں بولا۔ ''تو لے گا میری تلاشی۔ میں تو حاجی صاحب سے ملنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ تو نے مجھ پر ہتھیار اٹھایا۔ دل تو چاہ رہا ہے کہ اس ریوالور کی ساری گولیاں تیرے اس کدو جیسے سر میں اتار دوں لیکن تو تو حکم کا غلام ہے۔'' میں نے اس کا ریوالور پھینک دیا۔ ''اب مجھے روکنے کی کوشش مت کرنا ورنہ میں بار بار رعایت نہیں کرتا۔''

غلام رسول یوں کانپ رہا تھا جیسے اسے ابھی تھوڑی دیر میں پھانسی گھاٹ لے جایا جائے گا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اچانک ایک بھاری اور درشت آواز گونجی۔

وہ آواز سن کر نہ صرف غلام رسول بلکہ گارڈ کے چہرے پر بھی مردنی چھا گئی۔

میں نے گھوم کر بولنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ شخص خاصا باوقار تھا۔ عمر پچاس اور پچپن کے درمیان رہی ہوگی لیکن اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ اس نے سفید براق کلف دار قمیص پر سیاہ واسکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر سیاہ رنگ کی داڑھی تھی جو اس کے سرخ و سفید رنگ پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔

''سس... سر... یہ... اف... افتخار صاحب... ہیں اور...''

''افتخار صاحب ہیں تو انہیں یہاں کیوں کھڑا کر رکھا ہے؟'' اس شخص نے غلام رسول کی بات کاٹ دی۔ وہی شخص یقیناً حاجی صاحب تھا لیکن اپنے حلیے سے وہ حاجی سے زیادہ کوئی بیوروکریٹ یا صنعت کار لگ رہا تھا۔

''سر! گارڈ نے ان کی تلاشی لینا چاہی تو انہوں نے تلاشی دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر...گارڈ نے...ریوالور نکال لیا اور...''

''کیا---؟'' حاجی صاحب گرج کر بولے۔ ''تم نے میرے مہمان پر ہتھیار اٹھایا۔ لگتا ہے زندگی سے تمہارا دل بھر گیا ہے۔'' انہوں نے جیب سے ریوالور نکالا اور گارڈ کا نشانہ لے کر فائر کرنے ہی والے تھے کہ میں نے چیخ کر کہا۔ ''نہیں سر! اس میں قصور میرا ہی تھا۔ پلیز فائر مت کیجیے گا۔ پھر یہ بے چارہ تو آپ ہی کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔''

گارڈ کے چہرے کا رنگ ایسا ہو رہا تھا جیسے اس کے چہرے پر کسی نے زردی مل دی ہو۔ وہ سردی کھائے ہوئے پتّے کی طرح کانپ رہا تھا اور گارڈ ہی کیا، غلام رسول کے ہاتھ پاؤں بھی لرز رہے تھے۔

حاجی صاحب نے ریوالور جیب میں رکھ لیا اور مجھ سے بولے۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

میں ان کے پیچھے پیچھے ایک آراستہ کمرے میں داخل ہوا۔ یہ غالباً ان کا سٹنگ روم تھا۔ کمرے کی بیش قیمت آرائشی اشیا اور فرنیچر دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں لیکن میں نے حاجی صاحب پر اپنی حیرت ظاہر نہ کی۔ اس طرح کے آراستہ پیراستہ کمرے میں نے فلموں ہی میں دیکھے تھے۔

''بیٹھو افتخار!'' حاجی صاحب نے کہا۔ ''اکبر نے تمہاری اتنی تعریف کی ہے کہ میں تو تم سے ملنے کے لیے بے تاب ہو گیا تھا۔ اچھا یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ پہلے ہم کھانا کھالیں۔''

''حاجی صاحب! میں نے جیل سے نکلتے ہی خوب سیر ہو کر کھانا کھایا ہے۔ اب تو میرے پیٹ میں بالکل گنجائش نہیں ہے۔ آپ کھانا کھائیے، میں صرف ایک کپ کافی پی لوں گا۔''

''تم بہت جی دار اور ضدّی نوجوان ہو افتخار! مجھے تمہاری یہ بات پسند آئی۔ میں خفیہ ...... کیمرے کے ذریعے سب کچھ دیکھ بھی رہا تھا اور سن بھی رہا تھا۔ اکبر نے تمہارا انتخاب غلط نہیں کیا ہے۔ مجھے ایسے ہی نڈر اور مضبوط نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ ویسے ایک بات بتاؤ، میں نے سنا ہے کہ تم خاصے شریف اور لڑائی جھگڑے سے دور رہنے والے آدمی ہو لیکن تم نے یوں اچانک گارڈ کی گردن دبوچ لی جیسے سانپ نیولے کو پکڑتا ہے؟''

''یہ سب اکبر صاحب کی مہربانی ہے سر!'' میں نے کہا۔ ''ان کی وجہ سے جیل میں مجھے کوئی کام تو تھا نہیں، وہ خود بھی فارغ رہتے تھے۔ انہوں نے اس دوران میں مجھے لڑنے بھڑنے کا فن سکھایا ہے۔''

''تمہارا نشانہ کیسا ہے؟'' حاجی صاحب نے پوچھا۔

''میرا نشانہ کوئی خاص نہیں حاجی صاحب! بس جیل میں رہ کر مجھے نشانے بازی کا موقع نہیں ملا لیکن میں سیکھ لوں گا۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم نشانے بازی بھی بہت کم وقت میں سیکھ لو گے۔'' پھر وہ چونک کر بولے۔ ''رات بہت ہو گئی ہے۔ یوں بھی تمہیں جیل میں گھر کا سا آرام تو نہیں ملا ہوگا۔ اب تم آرام کرو۔'' انہوں نے نہ جانے کہاں سے کوئی بٹن دبایا۔ مجھے کافی فاصلے سے گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ پھر دستک

www.kahopakistan.com

دے کر ایک ملازم اندر آ گیا۔

''شکور! یہ افتخار صاحب ہمارے خاص مہمان ہیں۔ ان کے رہنے کا بندوبست مہمانوں کے خصوصی کمرے میں کر دو۔'' پھر وہ مجھ سے بولے۔ ''افتخار! تمہارے لیے ایک خوش خبری بھی ہے۔ دو دن بعد اکبر بھی واپس آ رہا ہے۔ تم آرام سے یہاں رہو۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو کمرے میں موجود گھنٹی کا بٹن دبا دینا۔ شکور فوراً ہی آ جائے گا۔ ہاں، کل تم غلام رسول کے ساتھ جا کر شاپنگ کر لینا۔ تمہیں کپڑوں کی بھی تو ضرورت ہوگی۔ آج تو تم میرے سلیپنگ سوٹ سے کام چلا لو۔''

شکور مجھے اوپری منزل کی ایک عالی شان خواب گاہ میں لے گیا اور بولا۔ ''حضور! میں نے آپ کے لیے کپڑے باتھ روم میں لٹکا دیے ہیں۔ آپ غسل کرنا چاہیں تو کر لیں۔''

میں دیر تک نیم گرم پانی سے غسل کرتا رہا۔ میں جیل میں بھی نہاتا تھا لیکن وہاں یہ سب لوازمات کہاں موجود تھے۔ امپورٹڈ شیمپو، بہترین صابن اور نیم گرم پانی۔

میں نہا کر نکلا تو ہشاش بشاش تھا۔

بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر بینسن کے دو پیکٹ، ایک بیش قیمت لائٹر اور انتہائی نفیس چمڑے کا پرس موجود تھا۔

میں نے وہ پرس اٹھا کر دیکھا۔ اسے ہاتھ میں لیتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ خالی نہیں ہے۔ پرس میں تیس ہزار روپے کے کرنسی نوٹ تھے۔

اکبر کے ساتھ رہ کر مجھے کافی پینے کی عادت پڑ گئی تھی۔ مجھے اس وقت بھی کافی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ حاجی صاحب نے کہا تھا کہ شکور کو بلانے کے لیے وہاں گھنٹی کا کوئی بٹن لگا ہوا ہے۔

میں نے سوئچ بورڈ پر نظر ڈالی لیکن گھنٹی کا بٹن مجھے بیڈ کی دائیں جانب دیوار پر نظر آیا۔

میں نے گھنٹی بجائی تو شکور فوراً چراغ کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔ میں نے اس سے کافی لانے کو کہا اور خود نرم و ملائم بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

وہ جاتی ہوئی اپریل کے ابتدائی دن تھے، اس کے باوجود اچھی خاصی گرمی ہو رہی تھی۔ شکور کافی لے کر آیا تو بولا۔ ''سوری سر! میں آپ کے کمرے کا اے سی چلانا بھول گیا تھا۔'' اس نے ریموٹ سے اسپلٹ آن کر دیا اور چلا گیا۔

میں کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے غور کرتا رہا کہ آخر یہ حاجی اور اکبر مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟ کیا یہ مجھ سے کسی بڑے آدمی کا قتل کرانا چاہتے ہیں؟ حاجی مجھ سے نشانے کے بارے میں بھی پوچھ رہا تھا۔ اس بات سے اس کا مطلب کیا تھا؟

یہ قول اس کے وہ میری جی داری اور سرکشی سے متاثر تھا۔ میں کہاں کا سپر مین تھا؟ مجھ سے زیادہ جی دار اور لڑائی بھڑائی میں ماہر نوجوان اسے صرف چند ہزار روپے خرچ کر کے مل سکتے تھے۔ کسی کو قتل بھی کرانا ہوتا تو وہ کرائے کے کسی قاتل کی خدمات حاصل کر سکتا تھا۔ پھر میں ہی کیوں؟

سوچ سوچ کر میرا دماغ تھک گیا تو میں نے سارے خیالات ذہن سے جھٹکے اور یہ سوچ کر سو گیا کہ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟

میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ بستر پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔ جیل میں مجھے لاکھ آرام سہی لیکن حاجی صاحب کی اس عالی شان خواب گاہ کی بات ہی اور تھی۔ برسوں بعد بلکہ زندگی میں پہلی دفعہ میں اتنے شان دار اور نرم و ملائم بیڈ پر لیٹا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو گھڑی ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی۔ جیل میں رہ کر مجھے علی الصباح اٹھنے کی عادت پڑ گئی تھی لیکن رات میں ایسا سویا تھا کہ صبح میری آنکھ نہ کھل سکی۔

ابھی میں بستر پر لیٹا انگڑائیاں ہی لے رہا تھا کہ شکور نے کمرے میں جھانکا۔ مجھے بیدار دیکھ کر وہ کمرے میں آ گیا اور بولا۔ ''حضور! کیا آپ بیڈ ٹی پینا پسند فرمائیں گے؟''

''نہیں شکور! مجھے بیڈ ٹی کی عادت نہیں ہے۔ میں نہا دھو کر فارغ ہو جاؤں تو تم میرا ناشتا یہیں لے آنا۔'' پھر میں نے پوچھا۔ ''حاجی صاحب نے تو ناشتا کر لیا ہوگا؟''

''حاجی صاحب تو رات ہی میں کسی وقت کہیں چلے گئے تھے۔''

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''حضور وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ ان سے بھلا کوئی کیسے پوچھ سکتا ہے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ ہاں، وہ مجھے اتنا ضرور بتا گئے تھے کہ وہ کاروباری دورے پر دبئی جا رہے ہیں، دو چار دن میں واپسی ہوگی۔''

میں باتھ روم سے نکلا تو شکور فوراً ہی میرے لیے ناشتے کی ٹرالی لے آیا اور بولا۔ ''حضور! وہ...''

''شکور! مجھے حضور، سرکار وغیرہ کے الفاظ سے مت پکارا کرو۔'' میں نے اسے جھڑک دیا۔

''جی بہتر ہے حضو... سر!'' وہ حضور کہتے کہتے رک گیا، پھر بولا۔ ''سر! وہ غلام رسول کافی دیر سے آئے بیٹھے ہیں۔''

''تو انہیں یہیں لے آؤ۔'' میں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد غلام رسول کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے اسے ناشتے میں شریک کرنا چاہا لیکن وہ ناشتا کر کے ہی نکلا تھا۔ اس لیے اس نے معذرت کر لی اور مجھ سے بولا۔ ''جلدی سے تیار ہو جائیں افتخار صاحب! ابھی آپ کو شاپنگ کے لیے جانا ہے۔''

''شاپنگ کے لیے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بھئی، یہ حاجی صاحب کا حکم ہے۔ میں ان کے حکم سے سرتابی کیسے کر سکتا ہوں؟''

غلام رسول نے مجھے طارق روڈ اور کلفٹن کی مہنگی ترین دکانوں سے دل بھر کے شاپنگ کرائی۔

میں نے باتوں باتوں میں اس سے بھی حاجی صاحب کی اس عنایتِ خصوصی کا سبب جاننا چاہا لیکن وہ بھی کچھ نہ بتا سکا۔

وہ تو حاجی صاحب کی شپنگ کمپنی کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ حاجی صاحب کی شپنگ کمپنی میں پانچ کارگو شپ ہیں جو دنیا بھر میں پاکستان کا مال لاتے اور لے جاتے ہیں۔

حاجی صاحب دبئی سے تین دن بعد واپس آئے اور بولے۔ ''یار افتخار! میں تمہیں وہاں سے ٹیل فون کرتا رہا لیکن تم کبھی مجھے گھر میں موجود نہیں ملے۔'' پھر وہ چونک کر بولے۔ ''تمہارا سیل نمبر... لیکن تمہارے پاس سیل فون کب ہو گا۔''

انہوں نے اپنا انتہائی قیمتی سیل فون نکالا۔ اس کا کور کھول کر سم نکالی اور وہ سیٹ میرے حوالے کر دیا اور بولے۔ ''میں اس میں ابھی پوسٹ پیڈ کنکشن کرا دیتا ہوں۔''

انہوں نے اپنے بریف کیس سے دوسرا سیل فون نکالا اور اس میں اپنی سم ڈالنے کے بعد بولے۔ ''مجھے ایک پوسٹ پیڈ کنکشن چاہیے، لیس انٹرنیشنل رومنگ کے ساتھ!... تمہیں، میں ابھی آفس جاتے ہوئے آپ کی کسی فرنچائز سے لے لوں گا۔''

☆☆☆

اس دن شام کو اکبر خان جیل سے رہا ہو کر آ گیا۔ اب تو اس کی سج دھج ہی نرالی تھی۔ وہ انتہائی نفیس تراش کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ کلائی میں رولیکس کی بیش قیمت گھڑی اور قمیص ..... میں سونے کے کف لنکس تھے۔ اس کی ٹائی پن بھی شاید سونے ہی کی تھی۔

اس کے ساتھ درمیانے قد اور اکہرے بدن کا ایک شخص اور موجود تھا۔ یہ بھی سفید بے داغ قمیص اور جدید تراش کے سوٹ میں ملبوس تھا۔

''یہ جمشید نظامی صاحب ہیں۔'' حاجی صاحب نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''ملک کے معروف ارب پتی جناب ایس ایچ درانی کے جنرل منیجر۔'' پھر وہ نظامی سے بولے۔ ''یہ افتخار ہے، بہت ذہین اور جی دار آدمی ہے۔''

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' نظامی نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ اس کا ہاتھ ملجلا اور کمزور تھا لیکن اس کی شخصیت بارعب تھی۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں ایسی تھیں کہ مجھے اپنے جسم کے اندر گھستی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کا سر اوپر سے بالکل شفاف تھا لیکن کناروں پر بالوں کی ایک جھالر سی تھی۔

اس نے بہ غور میرا جائزہ لیا اور وہ کافی دیر تک مجھے اتنے غور سے دیکھتا رہا کہ مجھے الجھن پیدا ہونے لگی۔

پھر اس نے اپنا بریف کیس کھول کر کوئی تصویر نکالی اور دیر تک اس تصویر کا مجھ سے موازنہ کرتا رہا۔ تصویر کا رخ میری طرف نہیں تھا اس لیے میں وہ تصویر نہ دیکھ سکا۔ پھر وہ تصویر کو دوبارہ بریف کیس میں رکھ کر بولا۔ ''آپ کا انتخاب سو فیصد درست ہے۔''

''ویری گڈ!'' حاجی صاحب خوش ہو کر بولے۔ ''یہ سب اکبر کا کمال ہے۔''

''میرا اس میں کوئی کمال نہیں ہے۔'' اکبر نے کہا۔ ''میں نے وہ تصویر اتنی دفعہ دیکھی تھی کہ اس کا ایک ایک نقش میرے ذہن پر چسپاں ہو گیا تھا۔''

میں ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے ان کی بات چیت سن رہا تھا۔

حاجی صاحب پُرجوش میں بولے۔ ''اب تو گویا ہم نے میدان مار لیا۔''

''ابھی نہیں۔'' نظامی نے اپنا گنجا سر ہلا کر کہا۔ ''پہلے آپ اس کہانی کے مرکزی کردار سے بات تو کریں۔ پھر اسے کچھ ٹریننگ دینا پڑے گی، اس کے بعد بڈھے کا اعتماد حاصل کرنا پڑے گا۔ تب کہیں جا کر ہمیں کامیابی نصیب ہو گی۔''

''اس کی تو آپ فکر ہی مت کریں۔ میں آج ہی اپنے ہیرو سے بات کر لوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مجھے مایوس نہیں کرے گا۔''

نظامی نے اپنا بریف کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''او کے جنٹل مین! اب مجھے اجازت دیجیے۔''

''کھانا تیار ہے نظامی صاحب!'' حاجی صاحب نے کہا۔

www.kahopakistan.com

''کھانا پھر کسی وقت سہی۔'' نظامی نے کہا۔ ''میرے بغیر بڈھا بے چین ہو جاتا ہے۔ اب تو اکٹھا جشن ہی منائیں گے۔'' نظامی یہ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

''مجھے بھی ایک ضروری کام سے جانا ہے۔'' حاجی صاحب نے کہا۔ ''میں کھانا کھا کر ہی لوٹوں گا۔ تم لوگ کھانا کھا لینا۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے اکبر سے پوچھا۔ ''آپ کم سے کم اپنی آمد کی اطلاع ہی دے دیتے۔''

''جو مزہ سرپرائز میں ہے، وہ اطلاع دے کر آنے میں کہاں ہے؟'' اکبر نے کہا۔

''یہ نظامی کون ہے اکبر بھائی؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور آپ لوگ معتوں میں کیا باتیں کر رہے تھے؟''

''حاجی صاحب نے بتایا تو ہے کہ نظامی ملک کے ایک ارب پتی سرمایہ دار کا جنرل منیجر ہے۔ اس سرمایہ دار کا بزنس دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ اسے خود بھی اندازہ نہیں ہے کہ اس کے اکاؤنٹ میں کتنا پیسا ہے اور وہ کس کس ملک میں ہے۔ بڈھا ڈالرز میں ارب پتی ہے۔''

''لیکن اس تمام معاملے کا مجھ سے کیا تعلق اور وہ تصویر کس کی تھی جس کا موازنہ وہ مجھ سے کر رہا تھا؟''

''ابے یار، کیا سب کچھ ابھی پوچھ لو گے؟'' اکبر نے ہنس کر کہا۔ ''میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا لیکن ذرا صبر سے کام لو۔''

کھانے کے بعد بھی میں نے اکبر کو بہت کریدنے کی کوشش کی لیکن اس نے کچھ بتا کر نہ دیا۔

دوسرے دن وہ مجھے شہر سے باہر ایک ویران مقام پر لے گیا اور ریوالور دے کر بولا۔ ''اب ذرا تم نشانے بازی کی مشق بھی کر لو۔''

''مجھے نشانے بازی کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے کُرتا کر کہا۔

''احمق ہو تم، یہ تو آج کی ضرورت ہے۔ ملک کے حالات تم سے بھی پوشیدہ نہیں ہیں۔ ہتھیار کی ضرورت تو کبھی بھی پڑ سکتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم سوئمنگ بھی سیکھ لو۔''

اکبر خان نے مجھے قائل کر کے نشانے بازی سیکھنے پر راضی کر ہی لیا۔

میں نے بچپن میں غلیل اور ایئر گن سے بہت نشانے لگائے تھے، اب وہی مشق میرے کام آ رہی تھی۔ میں ایک ہفتے میں اس قابل ہو گیا کہ کسی بڑے ہدف پر نشانہ لگا سکوں۔ دو ہفتے بعد میرا نشانہ بالکل پرفیکٹ ہو گیا۔ اب تو میں متحرک ہدف پر بھی صحیح صحیح نشانہ لگا سکتا تھا۔

اکبر نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ مجھے نشانے بازی کی مشق کیوں کرا رہا ہے اور اس بوڑھے ارب پتی سے اس معاملے کا کیا تعلق ہے؟

ایک دن رات کے کھانے پر حاجی صاحب بھی موجود تھے۔ وہ عموماً کم ہی ہمارے ساتھ شامل ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے کھانے کے دوران میں کہا۔ ''اکبر! میرے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ تم افتخار کو حقیقت سے آگاہ کر دو۔''

''جی حاجی صاحب! میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔'' اس کے بعد حاجی صاحب ہمارے ساتھ کچھ دیر بیٹھ کر سونے چلے گئے۔

اکبر نے ملازم سے کافی منگوائی اور میرے کمرے میں آ گیا۔

وہ کافی پیتے ہوئے بولا۔ ''افتخار! میں اب تمہیں بہت اہم بات بتانے والا ہوں۔ اس میں انکار کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم انکار کرو گے بھی نہیں۔''

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اکبر مجھ سے کیا کہنے والا تھا؟ کیا وہ مجھ سے کسی اہم سیاسی لیڈر کو قتل کرانا چاہتا تھا؟

''تم نے اس ارب پتی بوڑھے درانی کا نام تو سنا ہی ہے؟''

''جی ہاں، میں نے اس کے بارے میں اخبارات میں بھی پڑھا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں شاید یہ علم نہیں ہے کہ وہ بوڑھا ارب پتی بینائی سے معذور ہے۔''

''بینائی سے معذور ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''اور اس کے یہ اربوں ڈالرز کے اثاثے؟''

''اس نے کافی دولت جوانی ہی میں کمالی تھی۔'' اکبر نے کہا۔ ''اس وقت وہ اندھا نہیں تھا۔ پھر ایک حادثے میں اس کا بیٹا اور بہو مارے گئے۔ وہ خود اپنی آنکھوں کی بینائی کھو بیٹھا۔ ان کے ساتھ گاڑی میں بوڑھے کا اکلوتا پوتا بھی تھا۔ اس کی عمر شاید سات یا آٹھ سال تھی۔

''وہ حادثہ گاڑی کا... گیس سلنڈر پھٹنے سے ہوا تھا۔ اس میں کئی لوگ مارے گئے تھے۔ مرنے والوں میں کچھ بچے بھی تھے۔ بوڑھا ارب پتی اس حادثے میں بچ تو گیا لیکن اس کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ اسے نہ جانے کیوں یقین ہے کہ اس کا پوتا زندہ ہے اور ایک دن اس سے ضرور ملے گا۔ وہ اپنے پوتے سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اس نے پوتے کے نام سے فیصل آباد میں دو ٹیکسٹائل ملز لگائیں، امریکا کے مختلف

شہروں میں اس کے نام سے ڈپارٹمنٹل اسٹورز قائم کیے۔''

''لیکن یہ سب باتیں آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ تمہارے چہرے میں اس کے پوتے کی بہت شباہت ہے۔ اگر وہ اس وقت زندہ ہوتا تو بالکل تمہاری طرح ہوتا۔ کم سے کم تم سے مشابہ ضرور ہوتا۔''

''پھر... آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' میں اب معاملے کو کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا۔

''تمہیں اس بوڑھے کے پوتے خرم درانی کا کردار ادا کرنا ہے۔''

''مجھے؟'' میں اچھل پڑا۔ ''میں...''

''دیکھو افتخار! انکار مت کرنا ورنہ تمہارے ساتھ ساتھ میری زندگی بھی جائے گی۔'' اکبر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''حاجی بہت ظالم آدمی ہے۔ وہ انسانوں کو مکھیوں کی طرح مار دیتا ہے۔''

''لیکن میں یہ سب کیسے کروں گا؟''

''سب کچھ ممکن ہے۔'' اکبر نے کہا۔ ''حاجی صاحب نے بوڑھے درانی کے ایک دیرینہ ملازم کو خرید لیا ہے۔ اس نے خرم کو اپنی گود میں کھلایا ہے پھر بڑا ہونے کے بعد بھی وہ اس کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ وہ خرم کی پسند ناپسند اور تمام عادتوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ اسے وہ تمام واقعات بھی یاد ہیں جو خرم کے ساتھ پیش آئے۔ مثلاً ایک دفعہ خرم جھولے سے گر پڑا تھا تو کس ڈاکٹر نے اس کا علاج کیا تھا۔ خرم کس اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس کی ٹیچر کا نام کیا تھا اور اس وقت گھر میں جو ڈرائیور تھا وہ کون تھا... خرم کا کرکٹ کون سا تھا اور اسے اپنے کھلونوں میں سب سے زیادہ کون سا کھلونا پسند تھا۔ یہ تمام باتیں خرم کا نوکر اللہ بخش تمہیں تفصیل سے بتا دے گا۔''

''لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' میں نے کہا۔ ''جب درانی دیکھ نہیں سکتا تو پھر اس کے پوتے کی شباہت کا ہونا کیا ضروری ہے؟''

''یہی بات تو ہے کہ درانی بالکل ہی اندھا نہیں ہے۔ اسے... دُھندلا دُھندلا نظر آتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس کے بے شمار ملازمین ایسے ہیں جنہوں نے خرم کو دیکھا تھا۔ وہ تو تم میں خرم کی شباہت تلاش کریں گے۔ اسی لیے تمہیں خرم کی زندگی کے تمام واقعات ازبر کرائے جائیں گے۔ یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ بوڑھے درانی نے ایک دفعہ یقین کر لیا کہ تم ہی خرم ہو تو وہ اپنی تمام دولت، جائداد تمہارے حوالے کر دے گا۔''

''نظامی کا اس ڈرامے میں کیا رول ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نظامی ہی سب سے پہلے تمہیں خرم کی حیثیت سے شناخت کرے گا۔ درانی اس پر اندھا اعتماد کرتا ہے۔ اس کی پوری بزنس ایمپائر نظامی ہی چلا رہا ہے۔ بس وہاں ایک شخص ہے مراد کامل! درانی اس پر بھی بہت اعتبار کرتا ہے۔ تمہیں اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ درانی تو شاید برسوں پہلے نظامی کو سیاہ و سفید کا مالک بنا دیتا لیکن مراد نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر خرم بابا لوٹ آئے تو آپ اپنی ساری دولت ان کے حوالے کر دیجیے گا۔ ورنہ درانی کی موت کے بعد وہ ساری دولت ایک رفاہی ادارے کو منتقل ہو جائے گی۔''

''مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دیں اکبر بھائی۔'' میں نے کہا۔

''تم اس سلسلے میں اچھی طرح غور کر لو۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے لیکن فیصلہ حاجی صاحب کی مرضی کے خلاف مت کرنا۔''

''پھر سوچنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ تم اس معاملے کے ہر پہلو پر غور کر لو۔ کہیں کوئی کمی محسوس ہو تو ہم سے مشورہ کر لو۔''

اس دن میں ساری رات اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ کام انتہائی خطرناک تھا لیکن کامیابی کی صورت میں کروڑوں ڈالرز ملنے کا موقع بھی تھا۔ صبح تک میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میں یہ کام کروں گا۔ ایمان داری اور سچائی نے مجھے دیا ہی کیا ہے؟ در در کی ٹھوکریں، فاقے، جیل کی مشقت۔

مجھے اسپتال کے ڈاکٹروں کا رویہ یاد آیا تو میرا ارادہ مزید پختہ ہو گیا۔ محض پانچ لاکھ کی خاطر انہوں نے صابر چاچا کا علاج کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے وہ وقت یاد آیا تو ڈاکٹروں کے ساتھ ساتھ رمضان بھی یاد آیا۔ مجھے تو ابھی ڈاکٹروں کے علاوہ اس فراڈیے اسٹیٹ ایجنٹ سے بھی

www.kahopakistan.com

حساب بے باق کرنا تھا۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر میں نے اکبر کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ اکبر اتنا خوش ہوا کہ یہ خبر دینے کے لیے اسی وقت حاجی صاحب کے کمرے کی طرف دوڑ گیا۔

پھر اکبر، اللہ بخش کو لے آیا۔ اللہ بخش اب گاؤں میں رہتا تھا اور ریٹائرڈ زندگی گزار رہا تھا لیکن درانی ہر ماہ اسے ایک معقول رقم اب بھی بھجوایا کرتا تھا۔

اس بے چارے کی چار بیٹیاں تھیں، چاروں جوان تھیں اور ان میں سے ایک کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ حاجی صاحب نے اسے پچاس لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔

غریب آدمی کے لیے وہ پچاس لاکھ بھی بہت تھے۔

حاجی صاحب نے پیشگی کے طور پر اسے پانچ لاکھ روپے دے دیے تھے۔

وہ صبح سے شام تک مجھے خرم کے بارے میں بتاتا۔ دو مہینے میں اس نے مجھے خرم بابا کے بارے میں اتنا کچھ بتا دیا کہ میں خود بھی اپنے آپ کو خرم سمجھنے لگا۔

خرم کے پیٹ کے دائیں حصے میں سرخ رنگ کا ایک قدرتی نشان تھا۔ حاجی صاحب نے پلاسٹک سرجری کے ذریعے وہ نشان بھی میرے پیٹ پر بنوا دیا۔

جب میں ہر طرح سے تیار ہو گیا تو نظامی نے میرا ٹیسٹ لیا اور مجھے پاس کر دیا۔ اصل مسئلہ تھا مجھے درانی تک پہنچانے کا۔

اس سلسلے میں بھی نظامی کے شاطر ذہن نے ایک کہانی گھڑی۔ میری پیشانی پر زخم کا گہرا نشان تھا۔ نظامی نے اس نشان کو بنیاد بنایا اور مجھ سے کہا۔ ''جب حادثہ ہوا تو تم اچھل کر دور جا گرے۔ پھر تمہیں کچھ ہوش نہیں رہا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا۔ زخمی حالت میں تمہیں ایک فقیر نے وہاں سے اٹھا لیا۔ اس نے تمہارا علاج کرایا۔ پھر اس نے تمہیں بھاری رقم لے کر ایک بے اولاد جوڑے کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس وقت تک تمہاری یادداشت کام نہیں کر رہی تھی۔

''وہ بے اولاد جوڑا تمہیں لے کر ملک سے باہر چلا گیا۔ تم نے امریکا کے شہر کیلیفورنیا میں تعلیم حاصل کی۔ اس اسکول کا ریکارڈ میں منگوا چکا ہوں۔ وہاں کا ایک تعلیمی سرٹیفکیٹ بھی ہے۔ پھر تمہارے ان والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ اس حادثے کا تراشا بھی میرے پاس موجود ہے۔ اس وقت تک تمہیں یاد آ چکا تھا کہ تم درانی کے پوتے ہو۔ اپنے والدین کے انتقال کے بعد تم پاکستان آ گئے اور مجھ سے ملے۔ میں تمہیں تمہارے دادا کے پاس لے گیا۔''

''اس سلسلے میں سب سے زیادہ جرح مراد کرے گا۔'' نظامی نے کہا۔ ''لیکن تمہیں بہت اطمینان اور اعتماد سے اس کے ہر سوال کا جواب دینا ہے۔ میں کیلیفورنیا، نیویارک، اٹلی اور لندن کے نقشے بھی لایا ہوں۔ تم ان شہروں کی ایک ایک اسٹریٹ ازبر کر لو کیونکہ تم ان شہروں میں گھوم چکے ہو۔''

''آپ شاید بھول رہے ہیں کہ مجھے ایک پاسپورٹ کی ضرورت بھی پڑے گی۔''

نظامی مسکرایا اور اپنے بریف کیس سے ایک پاسپورٹ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ ایک مہینا پہلے اکبر نے میری کچھ تصاویر بنائی تھیں۔ پاسپورٹ پر میری تصویر لگی تھی لیکن اس پر نام خرم درانی ولد اکرم درانی کا تھا۔ پاسپورٹ پر امریکا، برطانیہ، اٹلی اور جرمنی کے ویزے بھی لگے ہوئے تھے۔

میں ہر طرح سے تیار ہو کر ایک دن نظامی کے پاس پہنچ گیا۔ میرے جسم پر بہترین سوٹ تھا، بالوں کا اسٹائل بھی مختلف تھا اور یہ بھی اتفاق تھا کہ خرم کے بال بھی میری طرح براؤن تھے اور اس کا رنگ بھی میری طرح سرخ و سفید تھا۔

نظامی نے پہلے تو مجھے دیکھ کر حیرانی کا مظاہرہ کیا، پھر چیخ کر بولا۔ ''خرم بابا! آپ... آپ کہاں تھے؟''

اس کی آواز سن کر ایک دو سینئر لوگ بھی وہاں آ گئے۔ ان میں مراد بھی تھا۔ اسے دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہی شخص میرے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔

نظامی نے مجھ سے چند عمومی سوالات کیے، میرا پاسپورٹ دیکھا پھر مجھے درانی کی محل نما کوٹھی میں لے گیا۔

درانی کی صحت قابلِ رشک تھی۔ اس نے مجھے ٹٹول کر دیکھا، پھر مجھ سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگا اور بولا۔ ''تُو کہاں چلا گیا تھا خرم! تُو مجھے چھوڑ کر کہاں چلا گیا تھا؟''

میں نے اسے بھی وہی داستان سنا دی جو نظامی نے

مجھے رٹائی تھی۔ نظامی نے اپنا اعتماد قائم کرنے کے لیے درانی سے کہا۔ ''سر! ممکن ہے یہ لڑکا جھوٹ بول رہا ہو۔ اللہ بخش آج بھی زندہ ہے۔ وہ اس کے بچپن کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ آپ کہیں تو میں اسے یہاں بلوا لوں؟ اس سے مزید تصدیق ہو جائے گی کہ یہ لڑکا جھوٹا ہے یا سچا۔''

''نظامی! تم چاہو تو اللہ بخش کو بلوا لو۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ یہ لڑکا سچا ہے۔ ہاں، دوسرے لوگوں کو یقین دلانے کے لیے اللہ بخش کی گواہی بہت ضروری ہے۔''

دوسرے ہی دن اللہ بخش کو بلوا لیا گیا۔ درانی نے اس دن خاص طور پر اپنی کمپنی کے پرانے ملازمین کو کھانے پر بلایا اور ان کی موجودگی میں اللہ بخش نے مجھ سے وہ سوالات کیے جو وہ مجھے پہلے ہی رٹا چکا تھا۔

''سر!'' مراد نے کہا۔ ''خرم بابا کے پیٹ پر سرخ رنگ کا ایک پیدائشی نشان تھا۔ کیا ان صاحب کے پیٹ پر بھی ویسا ہی نشان ہے؟''

''خرم صاحب!'' نظامی نے سخت لہجے کا مظاہرہ کیا۔ ''آپ اپنا وہ نشان دکھا دیں۔''

''آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' میں نے تند لہجے میں کہا۔ ''آپ سب کے سامنے میرے کپڑے اتارنا چاہتے ہیں؟''

''یہ بہت ضروری ہے خرم صاحب۔'' مراد نے سرد لہجے میں کہا۔

''جی نہیں۔'' میں نے صاف انکار کر دیا۔ اصل میں یہ بھی ہمارے ڈرامے کا ایک حصہ تھا۔ ''میں اپنے کپڑے ہرگز نہیں اتاروں گا۔''

''خرم بیٹا!'' درانی نے کہا۔ ''وہ نشان ان لوگوں کو دکھا دے۔''

''داجی! آپ بھی مجھ پر شبہ کر رہے ہیں؟'' میں نے اللہ بخش کے بتائے ہوئے خرم کے اسٹائل میں کہا اور اپنے داہنے کان کی لو کو مسلنے لگا۔

خرم جب غصے میں ہوتا تھا تو اپنے داہنے کان کی لو کو مسلتا تھا۔

''مجھے تو یقین ہے بیٹا۔'' درانی نے کہا۔ ''لیکن میں

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟
کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک
المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

www.kahopakistan.com

نہیں چاہتا کہ یہ لوگ تجھ پر شبہ کریں۔ اپنا وہ نشان دکھا دے۔''

''او کے۔'' میں غصے میں اٹھا۔ خرم کے انداز میں اپنی کرسی کو ٹھوکر ماری اور اپنا کوٹ اتار کر پھینک دیا۔ پھر ٹائی کھولی اور شرٹ اتار کر نظامی کے منہ پر اچھال دی۔ اب میرے جسم پر صرف بنیان تھی۔ میں نے وہ بنیان بھی ایک جھٹکے سے اتار دی۔ میرے پیٹ کے دائیں حصے پر وہ پیدائشی نشان موجود تھا جو ایک ماہر ڈاکٹر کی سرجری کے مرہونِ منت تھا۔

''سوری خرم صاحب!'' نظامی نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ...''

''شٹ اَپ!'' میں نے اسے بُری طرح ڈانٹ دیا۔ ''تم لوگ مجھے فراڈ سمجھ رہے ہو؟ میں کوئی بھک منگا نہیں ہوں۔ میرے داجی کی محبت مجھے یہاں کھینچ لائی ہے ورنہ مجھے وہاں بھی پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔'' پھر میں درانی سے بولا۔ ''داجی! میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔ میں کل ہی واپس اسٹیٹس چلا جاؤں گا۔''

''خرم بیٹا!'' درانی کی بے نور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''کیا تو پھر مجھے چھوڑ جائے گا؟''

''داجی! میں یہاں اپنی توہین کرانے نہیں آیا ہوں۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''کون ہے جو درانی کے پوتے کی توہین کرے گا۔'' درانی غضب ناک انداز میں بولا۔ ''یہ نظامی... آج کے بعد اگر تم نے خرم پر کسی بھی قسم کا شبہ کیا تو میں تمہیں ایسی عبرت ناک سزا دوں گا کہ تم نے تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ میں آنکھوں سے معذور ضرور ہوں لیکن اب بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔'' پھر وہ مراد سے بولا۔ ''مراد! تم بھی کان کھول کر سن لو اور سب لوگوں کو بتا دو کہ آئندہ جس کسی نے بھی خرم پر شبہ کیا، وہ خود کو ملازمت سے فارغ سمجھے۔''

''سر! میں تو پہلے ہی خرم بابا سے معافی مانگ چکا ہوں۔'' نظامی نے کہا۔

''دھاٹ ڈو یو مین.... خرم بابا؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تمہیں کس نے حق دیا ہے کہ مجھے خرم بابا کہو؟''

میں نے ڈپٹ کر کہا۔ ''مراد صاحب! آپ کے چہرے پر کیوں بارہ بج رہے ہیں؟ آپ بھی مجھ سے معافی مانگیں۔''

مراد کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ توہین کے احساس سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ درانی کے بعد نظامی کی طرح ادارے کا سینئر ایگزیکٹو تھا۔ اس سے اس لہجے میں شاید ابھی تک درانی نے بھی بات نہیں کی تھی۔ وہ نظامی کے مقابلے میں زیادہ سوبر اور کھرا آدمی تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''خرم بابا! میں...''

''پھر خرم بابا!'' میں چیخ کر بولا۔ ''مجھے خرم بابا کہنے کا حق صرف داجی یا چاچا اللہ بخش کو ہے۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ میں نے اس سے پہلے کیا کہا تھا؟''

''سوری مسٹر خرم درانی!'' مراد نے کہا۔ ''میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔''

''نظامی، مراد!'' درانی نے ان دونوں کو مخاطب کیا۔ ''ہر جگہ یہ نوٹیفکیشن بھیج دو کہ آج کے بعد میرا پوتا خرم درانی میرے تمام کاروباری معاملات کا ذمے دار ہوگا۔'' پھر وہ مراد سے بولا۔ ''مراد! کل تمام بینکوں کے نام لیٹر جاری کر دو کہ اب میرے تمام اکاؤنٹ خرم ڈیل کرے گا۔ اِز اٹ کلیئر؟''

''یس سر! لیکن...''

''لیکن کیا؟'' درانی غرایا۔

''سر! آپ کو یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''سر! میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مسٹر خرم ابھی کاروباری لحاظ سے بالکل نئے ہیں۔ انہیں کام سمجھنے کے لیے کچھ عرصہ تو درکار ہوگا۔''

''میں کام کی نہیں، اپنے اکاؤنٹس کی بات کر رہا ہوں۔'' درانی نے کہا۔ ''کام کرنے کے لیے اسٹاف کی جو فوج ہے۔ تم ہو، نظامی ہو... کیا وہ سب ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں گے؟ اور کام بھی خرم کو تم لوگ ہی سکھاؤ گے۔ ویسے تو میں بھی اس کے ساتھ رہوں گا اور میرے مشورے ہر قدم پر اس کے ساتھ ہوں گے۔''

''او کے سر!'' نظامی نے کہا۔ ''کل تمام بینکوں کو لیٹر جاری کر دیے جائیں گے۔''

اس رات کے بعد میں بہت سکون کی نیند سویا۔

دوسرے دن نظامی میرے پاس آیا اور بولا۔ ''افتخار صاحب! ہماری ایک کمپنی میں کچھ گھپلا ہو رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ وہاں کا سرپرائز وزٹ کریں۔''

''ایک بات کان کھول کر سن لیں نظامی صاحب!'' میں نے کہا۔ ''آپ مجھے تنہائی میں بھی اب خرم ہی کے نام سے مخاطب کریں گے۔ ابھی کمپنی کا نظم و نسق میرے ہاتھ میں نہیں آیا ہے۔''

''سوری سر!'' نظامی نے کہا۔ ''آج تمام بینکوں کو لیٹر ایشو کر دیے جائیں گے۔ ایک دو دن کاغذی کارروائی میں لگیں گے پھر سب کچھ ہمارا ہوگا۔''

''ہاں، آپ کسی کمپنی کی بات کر رہے تھے؟'' میں نے کہا۔

''سر! ہم نے اپنی مصنوعات کی تشہیر کے لیے اپنی ہی ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی قائم کی تھی۔ وہاں جو شخص منیجر ہے، وہ دل پھینک قسم کا آدمی ہے۔ وہ ماڈل لڑکیوں پر بے دریغ دولت خرچ کر رہا ہے۔''

''چلو پھر آج اسی کمپنی کا وزٹ کر لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

اب میرے پاس جدید ماڈل کی بی ایم ڈبلیو تھی۔ مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی لیکن میں نے اس زمانے میں ڈرائیونگ بھی سیکھ لی تھی جب اکبر مجھے نشانے بازی کی مشق کرا رہا تھا۔

میں نے نظامی سے اس کمپنی کا ایڈریس پوچھا اور روانہ ہو گیا۔ نظامی میرے ساتھ ہی آنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ میں اس کمپنی کا اچانک وزٹ کر کے اس کے ایم ڈی کو حیران کرنا چاہتا ہوں۔

میں ایک سگنل پر رکا تو ساتھ کھڑی ہوئی گاڑی میں مجھے رمضان نظر آیا۔ اس کے سر کے بال خاصے اڑ گئے تھے اور وہ کچھ فربہ ہو گیا تھا لیکن اس کی گاڑی اور لباس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لوگوں کے ناجائز پلاٹ بیچ کر دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہا ہے۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ سگنل کھلا تو میں نے اپنی گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔ اس کا رخ ڈیفنس کی طرف تھا۔ وہ فیز فائیو کے اس علاقے میں پہنچا جہاں آبادی برائے نام تھی۔ کچھ مکان زیرِ تعمیر تھے، کچھ کے ڈھانچے کھڑے ہوئے تھے۔

اس نے اپنی گاڑی ایک زیرِ تعمیر مکان کے سامنے روکی۔ وہاں اس وقت کوئی تعمیر نہیں ہو رہی تھی۔ مالک نے مکان کا اسٹرکچر بنا کر چھوڑ دیا تھا۔ رمضان شاید اس ادھورے تعمیر شدہ مکان کو خریدنے کے لیے یا پھر اسے کسی پارٹی کے ہاتھ بیچنے کے لیے اس کا جائزہ لینے آیا تھا۔

میں نے اپنی گاڑی کچھ فاصلے پر روکی اور دبے قدموں اس کے پیچھے اس مکان میں داخل ہو گیا جس کا گیٹ بھی بس برائے نام تھا۔

میں مکان کے اندر پہنچا تو میرے قدموں کی آہٹ سن کر چونک اٹھا اور بولا۔ ''جی فرمائیے؟''

''کیا اس مکان کے مالک آپ ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، فرمائیے۔'' اس نے کہا۔

''مجھے یہ مکان خریدنا ہے۔ اصل میں یہ پُرسکون جگہ مجھے پسند آ گئی ہے۔ آپ یہ مکان بیچنا پسند کریں گے؟''

''ہمارا تو کام ہی یہ ہے صاحب۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''کیا ڈیمانڈ ہے آپ کی؟'' میں نے پوچھا۔

''دو کروڑ روپے۔'' اس نے کہا۔

''اس ادھورے مکان کے دو کروڑ روپے؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں اس کے پچاس لاکھ دے سکتا ہوں۔''

''آپ کوئی اور مکان دیکھیں۔'' اس نے بے رخی سے کہا۔

میں نے اچانک ریوالور نکال لیا۔ ''کوئی اور مکان کیسے دیکھ لوں رمضان!'' میں نے کہا۔ ''برسوں پہلے تُو میرا مکان ہضم کر چکا ہے۔''

''کک... کون ہو تم؟''

''میں تیری موت ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے بھول گیا حرامزادے! میں افتخار ہوں۔''

www.kahopakistan.com

''تم... مجھ سے... اس مکان کی قیمت لے لو... میں...''

''اب وقت گزر چکا ہے۔'' میں نے کہا اور اچانک فائر کر دیا۔ گولی اس کے دل کے مقام پر لگی۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گر گیا۔

وہاں دور دور تک کوئی آبادی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود کوئی بھی گولی کی آواز سن سکتا تھا۔ میں نے ریوالور جیب میں رکھا اور اس مکان سے باہر آ گیا۔ رمضان کو مار کر میرے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔

وہاں سے میں سیدھا ایڈورٹائزنگ کمپنی میں پہنچا۔ سائن بورڈ پر لکھا ہوا نام مجھے کچھ جانا پہچانا محسوس ہوا۔ پھر مجھے یاد آ گیا کہ ملیحہ اسی کمپنی میں جاب کرتی ہے۔ سائن بورڈ پر جلی حروف میں ایڈجیم ایڈورٹائزنگ لکھا ہوا تھا۔

میں نے وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ملیحہ مجھے پہچان کر بھانڈا پھوڑ سکتی تھی۔ میں وہاں سے واپس آفس آ گیا۔

نظامی نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا رہا خرم صاحب؟ آپ اس ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں گئے تھے؟''

''یہ معاملہ آپ ہی ڈیل کریں۔'' میں نے کہا۔ ''وہاں میری ایک پرانی شناسا جاب کرتی ہے۔ وہ مجھے بچپن سے جانتی ہے۔ اس نے مجھے افتخار کی حیثیت سے پہچان لیا تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔''

''اوہ!'' نظامی نے تشویش سے کہا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا... ''یہ تو واقعی گڑبڑ والی بات ہے۔ کیا نام ہے اس لڑکی کا؟''

''ملیحہ۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں اکبر سے کہوں گا' وہ اس معاملے کو ڈیل کرے گا۔''

''نظامی صاحب! مجھے ایک بات بتائیں۔ درانی صاحب کے ملک بھر میں بلکہ دنیا بھر میں اتنے کاروبار پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ کو صرف چھوٹی سی وہ ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہی نظر آئی ہے؟''

''بات اصل میں یہ ہے خرم صاحب!'' نظامی مکاری سے مسکرایا۔ ''وہاں شہر کی خوب صورت ترین لڑکیاں ہوتی ہیں۔ وہاں کا جنرل منیجر مسعود بہت خبیث آدمی ہے۔ وہ خود تو ان لڑکیوں پر ہاتھ صاف کرتا ہے لیکن دوسروں کو پھٹک بھی نہیں لگنے دیتا۔''

''اچھا تو یہ معاملہ ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''کمپنی کی بھلائی سے زیادہ آپ کو اپنی فکر ہے۔''

''ایسی بات نہیں خرم صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''اب یہ بیسا ہمارا ہی تو ہے۔ ہم اسے برباد کیوں ہونے دیں؟''

''یہ بتائیے، اس سب ڈرامے میں آپ کا شیئر کتنا ہے؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''تھرٹی پرسنٹ۔'' اس نے جواب دیا۔

''مجھے صحیح رقم بتائیں۔ پرسنٹیج کا حساب میری سمجھ میں نہیں آتا۔'' میں مسکرایا۔

''یہ سمجھ لیں کہ ہماری کمپنی کے اثاثے کئی بلین ڈالرز ہیں۔ اس میں سے میرا حصہ تقریباً ایک بلین ڈالرز بنتا ہے۔''

''اور حاجی صاحب کا کتنا حصہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈیڑھ بلین ڈالرز ان کا ہے۔ باقی آدھے بلین میں سے آدھا آپ کا اور آدھا اکبر کا ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے کہا۔ ''یعنی ہم تو بیٹھے بٹھائے لکھ پتی ہو گئے۔''

''لکھ پتی نہیں سر... کروڑ پتی۔'' نظامی مکاری سے مسکرایا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا۔ سب سے زیادہ خطرناک کام میرا ہے اور یہ لوگ مجھے اتنے کم پیسوں پر ٹرخا رہے ہیں۔ یعنی دکھ کہیں بی فاختہ اور کوّے انڈے کھائیں۔

میں اس دن گھر جانے کے بجائے حاجی صاحب کے گھر کی طرف نکل گیا۔ پورچ میں نظامی کی گاڑی موجود تھی۔ میں نے اپنی گاڑی باہر ہی پارک کر دی اور خود پیدل ہی اندر کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں موجود گارڈز اب مجھے بلا روک ٹوک اندر جانے دیتے تھے۔

میں ڈرائنگ روم کے نزدیک پہنچا تو اندر سے نظامی کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''اکبر صاحب! ایڈجیم میں کام کرنے والی ایک لڑکی افتخار کو بچپن سے جانتی ہے۔ وہ کسی بھی وقت بھانڈا پھوڑ سکتی ہے۔''

''اس کے پورے خاندان کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دو ورنہ ہمارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا اور جیل کی ہوا مفت میں کھانا پڑے گی۔''

''کیا افتخار نے کبھی آپ کو اس لڑکی کے بارے میں نہیں بتایا تھا؟''

''اگر بتا دیتا تو میں اب تک اس لڑکی کے پورے خاندان کا پتا صاف کر دیتا۔ اس نے تو کہا تھا کہ اسے کوئی نہیں جانتا۔ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ہاں، اگر کوئی شناسا مل جائے تو اسے جھٹلایا جا سکتا ہے کہ اسے غلط فہمی ہوئی ہے لیکن جو لوگ افتخار کو بچپن سے جانتے ہیں، انہیں جھٹلانا آسان نہیں ہوگا۔ تم کل آفس سے اس لڑکی کا ایڈریس معلوم کرو اور اس کے گھر میں جتنے بھی افراد ہیں، ان سب کا صفایا کر دو۔''

میرے جسم میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ میں تیزی سے باہر آ گیا۔

میں وہاں سے سیدھا خالہ کلثوم کے گھر پہنچا۔ ملیحہ اسی وقت آفس سے آئی تھی۔ خالہ مجھے دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ میں نے ان سے کہا۔ ''خالہ! آپ اپنا ضروری سامان لے لیں اور ابھی میرے ساتھ چلیں۔''

''تمہارے ساتھ چلوں... لیکن کہاں؟''

''جلدی کریں خالہ... زیادہ سوال جواب مت کریں۔ آپ لوگوں کی جان خطرے میں ہے۔ میں نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔ سب کچھ بتا دوں گا۔ آپ یہاں سے تو چلیں۔''

میری آواز سن کر ملیحہ بھی دوسرے کمرے سے آ گئی۔ اسے اب تک صورتِ حال کا علم نہیں تھا اس لیے وہ مجھے دیکھ کر بہت دل آویز انداز میں مسکرائی۔

''لیکن بیٹا! ایسی کیا آفت آ گئی؟'' خالہ نے پوچھا۔

''آپ کو مجھ پر اعتبار ہے نا؟'' میں نے کہا۔

''ہاں بیٹا! لیکن...''

''خالہ پلیز، میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔'' میں نے کہا۔ ''بس ضروری چیزیں لے لیں، گھر کو تالا لگائیں اور میرے ساتھ چلیں۔''

''کچھ بتائیں تو افتخار! آخر ہوا کیا ہے؟'' ملیحہ بھی پریشان ہو گئی۔

''سب کچھ بتا دوں گا۔ تم لوگ یہاں سے تو چلو۔''

میں نے انہیں بہ مشکل تمام اپنے ساتھ چلنے پر راضی کیا۔ خالہ نے جلدی جلدی تمام زیورات، نقدی اور کپڑے سمیٹے اور چلنے کو تیار ہو گئیں۔

گاڑی میں بیٹھ کر میں سوچنے لگا کہ ان لوگوں کو کہاں لے جاؤں جہاں یہ محفوظ رہیں۔

اچانک مجھے نادر کا خیال آیا۔ جیل میں رہ کر اس سے بھی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ فی الحال تو ان لوگوں کو نادر کے گھر ہی لے جاتا ہوں۔ بعد میں کوئی اور بندوبست کروں گا۔

نادر لی مارکیٹ میں رہتا تھا۔ مجھے اس کا ایڈریس بھی معلوم تھا۔ ویسے بھی لی مارکیٹ کا ایک ہوٹل اس کا اڈا تھا جس کی اوپری منزل پر وہ جوا کھلاتا تھا۔ گزشتہ مہینے مجھے معلوم ہوا تھا کہ نادر جیل سے رہا ہو چکا ہے۔ یہ اطلاع بھی مجھے جیل ہی کے ایک ساتھی نے دی تھی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ جیل میں تو سیکڑوں لوگ مجھے پہچانتے تھے۔ وہاں تو باقاعدہ میرا ریکارڈ موجود تھا۔ یہ لوگ کس کس کو ختم کریں گے؟ مجھے تو اپنی زندگی بھی خطرے میں لگ رہی تھی۔

میں نادر کے ٹھکانے پر پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔ اس نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اڑے واجا! تم آج کیدر بھول پڑا؟''

''میں بہت مصیبت میں ہوں نادر۔'' میں نے کہا۔ ''میرے ساتھ میری خالہ اور ان کی بیٹیاں بھی ہیں۔ ان کی جان بھی خطرے میں ہے۔''

''اس کی تو تم پھکر ہی نہیں کرو واجا!'' نادر نے کہا۔ ''تمہارا خالہ ہمارا خالہ ہے۔ وہ لوگ ام لوگ کے گھر والوں کے ساتھ رہے گا۔ نادر مر جائے گا مگر تم لوگ کی خالہ اور ان کی

www.kahopakistan.com

بیٹیوں پر آنچ نہیں آنے دے گا۔''

وہ ہم لوگوں کو اپنے گھر لے گیا۔ اس کا مکان پختہ اور دو منزلہ بنا ہوا تھا۔ اس نے اوپر کے دو کمرے ہمارے لیے خالی کر دیے۔

خالہ کلثوم ابھی تک پریشان تھیں کہ میں ایسی افراتفری میں وہاں سے کیوں بھاگا ہوں۔ پھر میں نے ہمت کر کے خالہ کلثوم کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

مارے حیرت کے ان تینوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد خالہ بولیں۔ ''افتخار بیٹا! ایسے لوگوں کا کوئی دین ایمان نہیں ہوتا۔ اپنا کام نکالنے کے بعد وہ تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ابھی وقت ہے بیٹا! اس خطرناک کھیل سے باز آجا۔''

''اب وقت نہیں ہے خالہ!'' میں نے افسردگی سے کہا۔ ''میں دلدل میں دھنس چکا ہوں۔ اب اگر میں نے ان سے اختلاف کیا تو وہ مجھے مار دیں گے۔'' پھر میں نے کہا۔ ''لیکن آپ فکر مت کریں۔ میں آپ پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ آپ جلد ہی اپنے گھر جاسکیں گی۔''

انہیں تسلی دلاسے دینے کے بعد میں نے کہا۔ ''یہ بات آپ کسی کو بھی نہیں بتائیے گا۔ نادر یا اس کے گھر کی کسی عورت کو بھی نہیں۔''

میں نادر سے رخصت ہو کر سیدھا درانی صاحب کے بنگلے پر پہنچا۔

وہ میرے ہی انتظار میں بیٹھے تھے۔ میری آہٹ سن کر وہ بولے۔ ''خرم بیٹا! کہاں چلا گیا تھا تو۔ تیرا سیل فون بھی آف تھا؟''

''میرے سیل فون کی بیٹری کام نہیں کر رہی ہے داجی۔'' میں نے کہا۔ ''میں اپنے ایک لندن کے دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔''

''اچھا چل کھانا کھالے۔ تیرے انتظار میں، میں بھی بھوکا بیٹھا ہوں۔''

کھانے کے بعد میں کچھ دیر اس بدنصیب بوڑھے کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ مجھ سے اپنے بیٹے یعنی میرے پاپا اور مما کی باتیں کرتا رہا۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو تھوڑی دیر بعد اللہ بخش بھی آگیا۔

''ہاں چاچا! کوئی خاص کام ہے؟''

''خرم بابا!'' اس نے کہا۔ ''اب میں اپنے گاؤں جانا چاہتا ہوں۔ میری گھر والی بہت بیمار ہے۔ اکبر صاحب سے کہو کہ میرا حساب صاف کر دیں۔ یوں بھی اب میرا کام ختم ہو چکا ہے۔''

''اچھا، میں کل اکبر صاحب سے بات کروں گا یا پھر نظامی صاحب سے بات کروں گا۔ پیسے تو تمہیں وہی دیں گے۔''

''نظامی صاحب تو ابھی بڑے صاحب کے پاس بیٹھے ہیں۔ وہ کسی ضروری کام سے آئے ہیں۔''

''اچھا۔'' میں نے کہا۔ ''وہ کب آئے؟ میں ان سے ابھی بات کر لیتا ہوں۔''

میں وہاں سے اٹھ کر درانی صاحب کے سٹنگ روم میں چلا گیا۔ دفتر کے تمام ملازمین سے وہ سٹنگ روم ہی میں ملاقات کرتے تھے۔

نظامی ان سے کہہ رہا تھا۔ ''سر! بینکوں کو لیٹر جا چکے ہیں۔ اب خرم صاحب تمام اکاؤنٹس آپریٹ کر سکیں گے۔ میں نے احتیاطاً جوائنٹ اکاؤنٹ رکھا ہے۔ کبھی خرم صاحب ملک سے باہر ہوں تو آپ بھی بینک سے کیش نکلوا سکیں۔''

''اس پر خرم کیسے سائن کرے گا؟'' درانی صاحب نے کہا۔

''سر! وہ جوائنٹ اکاؤنٹ ایسا نہیں ہے کہ اس پر آپ دونوں کے سائن ضروری ہوں۔ آپ دونوں میں سے کوئی بھی ان اکاؤنٹس سے کیش نکال سکتا ہے۔''

''گڈ!'' درانی صاحب نے کہا۔ میں اچانک کمرے میں داخل ہو گیا۔ نظامی مجھے دیکھ کر چونک اٹھا اور بولا۔ ''آئیے خرم صاحب! میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ گھر میں موجود ہی نہیں ہیں۔''

''میری گاڑی پورچ میں موجود ہے، اس کے باوجود آپ یہ سمجھ رہے تھے؟'' میں نے کہا۔ پھر اس سے بولا۔ ''نظامی صاحب! داجی سے فارغ ہونے کے بعد آپ ذرا میرے کمرے میں آئیے گا۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری بات

کرنی ہے۔''

''واہ بھئی!'' داجی نے کہا۔ ''خرم تو اب پوری طرح کاروبار میں دلچسپی لے رہا ہے۔ جائیں بھئی، پہلے اس کی بات سن لیں۔''

''داجی! پہلے آپ ان سے بات کر لیں۔ میں تو امریکا کے ڈپارٹمنٹل اسٹورز کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

میں دوبارہ کمرے میں آگیا۔

فوراً ہی نظامی میرے کمرے میں آگیا۔ میں نے اللہ بخش سے کافی بنوانے کو کہا اور نظامی سے بولا۔ ''نظامی صاحب! اللہ بخش غریب آدمی ہے۔ اس کی بیوی بیمار ہے، یوں بھی اس سے اب کام نہیں ہوتا۔ آپ اس بے چارے کا حساب تو صاف کر دیں۔''

''اسے پانچ لاکھ دے تو چکے ہیں۔''

''لیکن آپ نے اس سے بات تو پچاس لاکھ کی کی تھی۔ وہ اپنی بقیہ رقم مانگ رہا ہے۔''

''اچھا۔'' نظامی نے کہا۔ ''اس سے کہیں کہ کل وہ شام کو چھ بجے تک حاجی صاحب کے بنگلے پر آجائے۔''

''میں اس سے کہہ دوں گا بلکہ میں خود اسے لے آؤں گا۔ مجھے بھی حاجی صاحب سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔''

کافی پینے کے بعد نظامی رخصت ہو گیا۔

میں نے اللہ بخش سے کہا۔ ''چاچا! کل تم میرے ساتھ حاجی صاحب کے بنگلے پر چلنا۔ تمہاری بقیہ رقم بھی مل جائے گی۔''

''خرم بابا! اللہ آپ کو خوش رکھے۔'' وہ بے چارہ مجھے خرم بابا ہی کہتا تھا۔

دوسرے دن میں نے اللہ بخش کو گاڑی میں بٹھایا اور حاجی صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ وہاں نظامی، اکبر اور حاجی صاحب پہلے سے موجود تھے۔

حاجی صاحب نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ''آئیے خرم درانی صاحب! اب تو آپ کے درشن ہی نہیں ہوتے۔''

''میں تو پہلے بھی ایک دو دفعہ آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''آپ ہی آج کل کچھ زیادہ مصروف ہیں۔''

''اس وقت کیسے زحمت کی؟'' حاجی کے لہجے میں طنز تھا۔

''یہ چاچا اللہ بخش اپنے گاؤں جانا چاہتا ہے۔ اس کی گھر والی بیمار ہے۔ اس بے چارے کا حساب بے باق کر دیں۔''

''اچھا!'' حاجی صاحب نے کہا۔ ''ہم ذرا ضروری حساب کتاب لگالیں۔ آپ کا حساب ابھی کرتے ہیں۔''

حاجی صاحب نے اللہ بخش سے کہا۔ ''آپ ذرا باہر لان میں جا کر ہوا کھائیں۔''

''افتخار صاحب!'' حاجی صاحب نے کہا۔ ''نظامی نے بڈھے کے وکیلوں سے بات کی تھی۔ اس کے کل اثاثے ساڑھے پانچ بلین ڈالرز ہیں۔ اس میں ہم چار آدمی حصے دار ہیں۔'' حاجی صاحب نے کہا۔

''چار آدمی؟'' میں نے کہا۔ ''یہ چوتھا کون ہے؟''

''آپ غلام رسول کو بھول گئے؟'' حاجی صاحب نے

السلام علیکم

ایک دوسرے کو سلام کرنا اسلامی معاشرت کا ایک بنیادی ستون ہے یہ روایت آج بھی برقرار ہے مگر دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر ان دعائیہ کلمات کے تلفظ میں احتیاط نہیں برتی جاتی جس کے سبب مفہوم بددعا میں بدل جاتا ہے۔ مروج الفاظ و معانی کچھ یوں ہیں:

السلام علیکم: تم پر اللہ کی سلامتی ہو۔
اسام علیکم: تم کو موت آئے۔
سلائے علیکم: تم پر لعنت ہو۔
سام علیکم: تم برباد ہو جاؤ۔
علیکم السلام: مردوں پر سلام ہے۔

سلام کے آداب یہ ہیں: چلنے والا بیٹھے ہوئے کو، سوار پیدل کو، چھوٹا بڑے کو، کم افراد کی جمعیت زیادہ تعداد کو، آنے والا پہلے سے موجود لوگوں کو، گھر میں آنے یا وہاں سے جانے والا بقیہ اہلِ خانہ کو سلام کرے۔ اس کے باوجود سلام میں پہل کرنے کا زیادہ ثواب ہے۔ غیر مسلموں کے سلام کے جواب میں صرف وعلیکم کہنا کافی ہے۔ سلام کے بعد مصافحہ کرنے سے گناہ جھڑتے ہیں۔ کسی کو سلام پہنچانے کی ذمے داری قبول کرے تو اسے پورا کرے ورنہ گناہ گار ہوگا۔ فلاں کو میرا سلام کہنا۔ یہ ایک رسمی سا فقرہ بن گیا ہے۔ ایسی ذمے داری قبول کریں تو اسے پورا کریں ورنہ گناہ گار ہوں گے۔

کراچی سے سیر ینا راضی کی عنایت

www.kahopakistan.com

کہا۔

''اچھا، وہ جو آپ کی شپنگ کمپنی کی دیکھ بھال کرتا ہے؟'' میں نے کہا۔

''میری شپنگ کمپنی؟'' حاجی نے حیرت سے کہا۔ ''وہ شپنگ کمپنی بھی درانی ہی کی ہے۔ میں نے اس کے ساتھ مل کر وہ کمپنی خریدی تھی لیکن وقتِ مقررہ پر میں پارٹی کو کمیشن کی ادائیگی نہ کر سکا اور مالک نے وہ کمپنی درانی کے نام کر دی۔ خیر تو میں بتا رہا تھا کہ درانی کے اثاثے ساڑھے پانچ بلین ڈالرز ہیں۔ اب آپ آہستہ آہستہ اس کے تمام اکاؤنٹس میں سے رقم نکالو گے۔ یہ کام دو مہینے میں ہو جانا چاہیے۔ یہ میں صرف کیش کی بات کر رہا ہوں۔ اس کی دوسری جائداد اس کے علاوہ ہے۔ دو مہینے اسے بھی نمٹانے میں لگیں گے۔''

''اور اس میں ہمارا کمیشن کس حساب سے ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''دیکھو بھئی، اس پلان کا ماسٹر مائنڈ میں ہوں۔'' حاجی نے کہا۔ ''نقد رقم میں سے تین بلین ڈالرز میں لوں گا۔ اس سلسلے میں دوسرا اہم کام کیا ہے نظامی نے۔ ایک بلین ڈالرز اس کے ہیں۔ یہ ہو گئے چار بلین ڈالرز! اب باقی بچے ڈیڑھ بلین۔ وہ آپ، اکبر اور غلام رسول آپس میں برابر برابر بانٹ لیں۔''

''حاجی صاحب!'' میں نے کہا۔ ''یہ تو زیادتی ہے۔ اس میں بنیادی کام تو میرا ہے۔ نشانے کی زد پر تو میں ہوں۔ مجھے کم سے کم دو بلین ڈالرز تو دیں۔''

''چلو، وہ بھی مل جائیں گے۔'' حاجی نے کہا۔ ''لیکن وہ رقم تمہیں اس کی جائداد کی فروخت سے ملے گی۔''

''یہ حساب کتاب تو بعد میں طے کرتے رہیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''نظامی صاحب! چاچا اللہ بخش کو تو فارغ کریں۔ اس کی بیوی بیمار ہے اور اسے فوری طور پر رقم کی ضرورت ہے۔''

''اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' حاجی نے کہا۔ ''اسے پانچ لاکھ دیے جا چکے ہیں، پانچ لاکھ اور دے کر چلتا کرو۔ پچاس لاکھ تو اس کی اوقات سے کہیں زیادہ ہیں۔''

اکبر نے ایک ملازم کو بلا کر کہا۔ ''باہر جو بوڑھا بیٹھا ہے، اسے اندر بھیج دو۔''

چاچا اللہ بخش اندر آیا تو حاجی نے اپنا بریف کیس کھولا اور اس میں سے پانچ گڈیاں نکال کر چاچا اللہ بخش کو دے دیں اور بولا۔ ''اللہ بخش! تمہیں پانچ لاکھ پہلے دیے جا چکے ہیں۔ پانچ لاکھ یہ ہیں۔ اب تمہارا اور ہمارا حساب بے باق ہو گیا۔''

''صرف دس لاکھ؟'' چاچا اللہ بخش نے ناگواری سے کہا۔ ''آپ نے تو پچاس لاکھ کی بات کی تھی۔''

''اللہ بخش! میں نے دس لاکھ ہی کی بات کی تھی۔'' حاجی نے کہا۔

''آپ حاجی ہو کر ایسی بات کر رہے ہیں؟'' اللہ بخش نے کہا۔ ''آپ نے پچاس لاکھ ہی کی بات کی تھی۔''

''اچھا!'' حاجی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت شاید میں نشے میں تھا۔''

''میں نہیں جانتا حاجی صاحب! آپ اس وقت نشے میں تھے یا اب نشے میں ہیں۔'' اللہ بخش نے درشت لہجے میں کہا۔ ''مجھے پوری رقم چاہیے۔''

''اچھا ایسا کرو، یہ دو لاکھ اور رکھ لو۔'' حاجی نے دو گڈیاں اس کی طرف مزید اچھال دیں۔

اللہ بخش نے پوری رقم اس کی طرف پھینک دی اور بولا۔ ''مجھے کچھ نہیں چاہیے لیکن پھر ملے گا آپ کو بھی کچھ نہیں۔''

''اچھا چلو، پندرہ لاکھ لے لو۔'' حاجی نے کہا۔ ''بس اب زیادہ بات مت کرنا۔''

''نہیں سرکار! آپ نے مجھے زبان دی تھی۔ میں نے آپ کی خاطر اتنا بڑا جھوٹ بولا۔ مجھے پوری رقم چاہیے۔''

''ورنہ تم کیا کرو گے؟'' حاجی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔

''ورنہ میں کیا کروں گا؟'' اللہ بخش نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی سب کچھ جا کر درانی صاحب کو بتا دوں گا۔ پھر آپ سب جیل کی ہوا کھائیں گے۔ مجھے خرم بابا کو جیل بھیجتے ہوئے افسوس ہوگا لیکن لپیٹ میں تو یہ بھی آئیں گے۔''

''اچھا، میں تمہیں پورے پیسے دے دیتا ہوں۔''

حاجی نے کہا اور اپنی جیب سے اچانک ریوالور نکال لیا۔ ''تُو مجھے دھمکی دے رہا ہے۔ مجھے... جو دوسروں کو جیل بھجواتا ہے۔ میں تجھے بولنے کے قابل چھوڑوں گا ہی نہیں۔''

''حاجی صاحب!'' میں نے کہا۔ ''آپ چاچا کو میرے حصے میں سے دے دیں۔ یہ کسی سے کچھ نہیں کہے گا۔''

''یہ سب کچھ جا کر درانی سے بک دے گا۔'' حاجی نے کہا اور اچانک فائر کر دیا۔

اللہ بخش گولی لگنے سے لڑکھڑایا، حاجی نے دوسرا فائر کیا تو وہ گر گیا۔ اس نے ڈوبتی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔ ''حاجی... تو... بھی... کتے کی... موت... مرے گا... اور... تیرے... یہ ساتھی بھی... لا الٰہ الا اللہ... محمد...'' اس کی آواز خاموش ہو گئی اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔ اس کا سرخ... خون حاجی کے سفید ٹائلوں پر بہہ رہا تھا۔

فائر کی آواز سن کر حاجی کے گارڈ دوڑتے ہوئے آئے۔ اس نے نخوت سے کہا۔ ''اس کتے کی لاش کو ٹھکانے لگا دو اور فرش کی اچھی طرح صفائی کر دو۔''

چاچا اللہ بخش کی موت کا میرے دل پر بہت گہرا اثر ہوا تھا۔ میں کافی دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔

''افتخار صاحب! اب ادھر سٹنگ روم میں چل کر بیٹھیں۔'' حاجی نے کہا۔

میں نے آخری نظر چاچا اللہ بخش کی لاش پر ڈالی، اس کی بے نور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ مجھ سے کہہ رہا ہو۔ ''خرم بابا! آپ نے خوب صلہ دیا ہے مجھے میری محنت کا۔ آپ تو مجھے یہاں رقم دلانے لائے تھے۔ آپ نے تو میری جان ہی لے لی۔ اب میری بیٹیوں کا کیا بنے گا، میری بیوی تو پہلے ہی مر رہی ہے۔ میری موت کی خبر سن کر تو وہ کل کی مرتی آج ہی مر جائے گی۔''

مجھے ان دو مہینوں میں ایسا لگنے لگا تھا جیسے چاچا اللہ بخش نے واقعی مجھے گودوں میں کھلایا ہے اور میں افتخار نہیں بلکہ خرم ہوں۔

میں بوجھل قدموں اور دل کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر سٹنگ روم میں آ گیا۔

''تم کل بینک سے ایک کروڑ روپے نکالو گے۔''

حاجی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''ہاں، میں ایک ضروری بات تو بھول ہی گیا۔'' نظامی نے کہا۔ ''میں نے آج ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے اس لڑکی ملیحہ کا ایڈریس لیا تھا۔ میں اس کے گھر پہنچا تو وہاں تالا تھا۔ محلے والوں کو بھی معلوم نہیں کہ وہ اچانک کہاں چلے گئے۔''

''اس گھر میں کتنے افراد تھے؟'' اکبر نے پوچھا۔

''وہاں ملیحہ کے علاوہ اس کی بہن اور ماں تھی۔ وہ تینوں کل رات سے غائب ہیں۔''

''اس لڑکی کو تلاش کروا اکبر!'' حاجی نے کہا۔ ''وہ لڑکی ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ وہ خرم کو بچپن سے جانتی ہے۔ محلے کے دوسرے لوگ تو شاید افتخار کو نہ پہچانیں لیکن وہ تو اکثر ان کے گھر جاتا رہتا تھا۔''

''میرے خیال میں اب میں بھی چلوں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، کل بینک سے رقم نکالنا مت بھولنا۔'' حاجی نے کہا۔ ''بینک منیجر پوچھے تو کہہ دینا کہ ایک نئے پروجیکٹ کے سلسلے میں رقم کی ضرورت ہے۔''

میں وہاں سے آیا تو میرا دل بہت اداس تھا۔

درانی آنکھوں سے اندھا تھا لیکن اس نے میری خاموشی کو محسوس کر لیا۔ ''کیا بات ہے خرم! آج تُو بہت خاموش ہے؟''

''کچھ نہیں داجی!'' میں نے کہا۔ ''میرے سر میں درد ہے۔''

''سر میں درد ہے تو ڈاکٹر کو ٹیلی فون کر۔'' درانی نے تشویش سے کہا۔

''میں نے ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا تھا۔ اس سے دوا پوچھ لی ہے۔ ابھی کھانے کے بعد کھا لوں گا۔''

''بیٹا! ابھی تجھے اتنی محنت کی عادت نہیں ہے۔ اتنی محنت مت کیا کر۔ یہ اتنا بڑا اسٹاف کس لیے ہے۔ تُو تو بس ان کی نگرانی کر۔''

''میں اتنی محنت کہاں کرتا ہوں داجی! میں تو آفس میں

www.kahopakistan.com

بھی سارا وقت بیٹھا ہی رہتا ہوں۔ میں مراد صاحب سے کام سیکھ رہا ہوں۔"

درانی سے اِدھر اُدھر کی گفتگو کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرا دل غم سے بوجھل ہو رہا تھا۔ رہ رہ کے مجھے چاچا اللہ بخش کا خیال آ رہا تھا۔ یہ لوگ تو انتہائی گھٹیا اور کمینے تھے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ایک دن میری لاش بھی اسی طرح پڑی ہوگی اور حاجی اپنے گارڈ سے کہے گا کہ اس کتے کی لاش کو بھی ٹھکانے لگا دو۔

مجھے اس رات صحیح طرح نیند بھی نہیں آئی۔ بار بار آنکھ کھل جاتی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ چاچا اللہ بخش کمرے میں آیا ہے اور وہ میرے سرہانے بیٹھا میرا سر دبا رہا ہے۔

دوسری صبح میری طبیعت خاصی بوجھل تھی۔ میں نے الٹا سیدھا ناشتا کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ درانی نے کہا۔ "خرم بیٹا! ناشتا تو اچھی طرح کر لے... تو اس گروپ آف کمپنیز کا ملازم نہیں بلکہ مالک ہے۔"

"دا جی! اگر مالک ہی وقت پر نہ پہنچے تو اسٹاف بھی وقت پر نہیں آتا۔ پھر آج دو تین کلائنٹس سے میری میٹنگ بھی ہے۔" میں نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

میں بینک پہنچا تو منیجر نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس نے فوراً میرے لیے کولڈ ڈرنک منگوالی۔

میں نے چیک لکھ کر اس کی طرف بڑھایا تو وہ بولا۔ "خرم صاحب! اتنی رقم؟"

"ہاں منیجر صاحب! ہم ایک نیا پروجیکٹ شروع کر رہے ہیں۔ پارٹی کو پے منٹ کرنا ہے۔"

"اتنا کیش ابھی برانچ میں تو نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "آپ کو آدھا گھنٹا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"میں ایک دو کام نمٹا کر ایک گھنٹے بعد آ جاؤں گا۔" میں نے کہا اور بینک سے باہر نکل آیا۔

میں نے سوچا کہ خالہ کلثوم کی کوئی خیر خبر لے لوں۔ میں نے گاڑی کا رخ لی مارکیٹ کی طرف موڑ دیا۔

خالہ کلثوم بہت زیادہ پریشان تھیں۔ اب انہیں میری فکر بھی تھی۔ ملیحہ اور فریحہ دونوں بہت بیزار تھیں۔ وہ بے چاری گھر میں قید ہو کر رہ گئی تھیں۔ خالہ نے بتایا۔ "نادر ہمارا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے۔ اس نے مکان کے گرد اپنے آدمی خاص طور پر لگا دیے ہیں۔ کوئی اجنبی یہاں قدم نہیں رکھ سکتا لیکن بیٹا! ایسا کب تک چلے گا؟"

"خالہ! بس کچھ دن اور صبر کر لیں۔ میں ان سب لوگوں کو پولیس کے حوالے کر کے ہی آؤں گا۔"

"اور آپ کا کیا ہوگا؟" ملیحہ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"میں وعدہ معاف گواہ بن جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"اللہ کرے، سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔" خالہ نے کہا۔

نادر نے میرے لیے چائے کے ساتھ کھانے پینے کے بہت سے لوازمات بھجوا دیے تھے۔

چائے پینے کے بعد میں نے انہیں ایک مرتبہ پھر تسلی دی۔

وہاں سے میں بینک پہنچا۔ منیجر نے کیش تیار کر رکھا تھا۔ میں اس کے لیے خاص طور پر دو بریف کیس لے کر گیا تھا۔

میں نے رقم دونوں بریف کیسوں میں رکھی اور آفس روانہ ہو گیا۔ کچھ دور جا کر مجھے خیال آیا کہ رقم تو حاجی صاحب کو دینا ہے۔ میں آفس دو دو بریف کیس لے کر آؤں گا تو آفس والے حیرت کریں گے۔ میں نے گاڑی کا رخ ڈیفنس کی طرف موڑ دیا۔

پورچ میں دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک تو حاجی کی تھی دوسری اکبر کی۔

میں گاڑی سے اتر کر برآمدے میں پہنچا تو بنگلے میں سناٹا تھا۔ حاجی کا سٹنگ روم برآمدے سے خاصے فاصلے پر تھا۔ میں سمجھ گیا کہ حاجی اور اکبر سٹنگ روم میں ہوں گے۔

میں سٹنگ روم کی طرف بڑھا تو وہاں سے آتی ہوئی آوازوں کو سن کر دروازے کے پاس ہی رک گیا۔

"اب اس افتخار کا کیا کرنا ہے؟" اکبر کی آواز آئی۔

"اسے ابھی دو چار مہینے تک مت چھیڑو۔ ابھی تو اس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔ ہاں، اب اس اندھے کو ٹھکانے لگا دو۔ اس نے سب کچھ افتخار کو دے کر خود ہی اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیے ہیں۔ یہ کام کل ہی کر لو۔ ایسے وقت میں کرنا جب افتخار آفس میں ہو۔ اس قتل کو ڈکیتی کا رنگ دے دینا۔ پولیس نے افتخار پر شبہ کر لیا تو ہمارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"افتخار تو ہمارے لیے مستقل خطرہ ہی بنا رہے گا حاجی صاحب!" اکبر کی آواز آئی۔

"تین چار مہینے کی تو بات ہے۔ جیسے ہی بڈھے کا بینک بیلنس اور جائداد ہمارے قبضے میں آئی، افتخار کو بھی ٹھکانے لگا دیں گے اور اس حرامزادے نظامی کو بھی۔ غلام رسول کو تو کچھ معلوم ہی نہیں ہے کہ بڈھے کے پاس کتنا مال ہے۔"

میں خود بھی ابھی مصلحت سے کام لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں وہاں سے دبے قدموں کچھ فاصلے پر گیا اور وہاں جا کر بلند آواز میں کہا۔ "حاجی صاحب خود کہاں ہیں، ان کی گاڑی تو باہر موجود ہے۔"

فوراً ہی سٹنگ روم کا دروازہ کھلا اور حاجی باہر آ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بولا۔ "آیئے خرم درانی صاحب! آج بے وقت کیسے آ گئے؟"

"میں نے بینک سے کیش نکلوایا تھا۔ دو دو بریف کیس لے کر آفس جاتا تو لوگ خوامخواہ شک کرتے کہ ان دو بریف کیسوں کی کیا ضرورت ہے۔"

"اچھا... کیش لے آئے؟" حاجی خوش ہو کر بولا۔

میں نے دونوں بریف کیس اس کی طرف بڑھا دیے اور بولا۔ "گن لیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے خرم صاحب۔" حاجی مضحکہ خیز لہجے میں بولا۔ "ہمیں آپ پر اعتبار ہے۔" پھر اس نے ایک بریف کیس میں سے دو گڈیاں نکال کر میری طرف بڑھا دیں۔ "یہ آپ کا انعام ہے۔ اس کا آپ کے اس کمیشن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

میں اسے کسی بھی قسم کا شک نہیں ہونے دینا چاہتا تھا اس لیے نوٹ لے لیے۔

"میں اب چلوں گا۔" اکبر نے کہا۔

"ہاں، تم وہ کام آج ہی کر دینا۔ اب اس بندے کا کام ختم ہو گیا ہے۔"

میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

اکبر نے مجھ سے پوچھا۔ "آپ کس طرف جائیں گے؟"

"میں تو اب آفس جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "آج تو کئی میٹنگز بھی ہیں، پھر مجھے دفتر کے اسٹاف پر اپنا اعتبار بھی تو قائم کرنا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اب آپ سے رات ہی کو ملاقات ہوگی؟" اکبر نے کہا۔ وہ شاید تصدیق کرنا چاہ رہا تھا کہ میں گھر کس وقت پہنچوں گا؟

"رات کو بھی مشکل ہے۔ میں نے ایک پارٹی کو ڈنر دیا ہے۔ وہاں شہر کے دوسرے بزنس مین بھی موجود ہوں گے۔ میں یہاں کے کاروباری حلقے میں بھی تو اپنی شناخت بنانا چاہ رہا ہوں۔"

"بھئی بہت اچھے۔" حاجی صاحب نے کہا۔ "آپ تو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہوشیار اور ذہین ہیں خرم صاحب۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "میں آپ کو خرم صاحب بار بار اس لیے کہتا ہوں کہ کسی کے سامنے بے خیالی میں بھی آپ کا نام میرے منہ سے نہ نکل جائے۔ اکبر! تم بھی انہیں اب خرم صاحب ہی کہا کرو۔"

اکبر کے رخصت ہونے کے بعد میں بھی رخصت ہو گیا اور آندھی طوفان کی طرح درانی کے گھر پہنچا۔ وہاں اکبر کی گاڑی پہلے ہی سے کھڑی تھی لیکن وہ درانی کے بنگلے سے خاصی دور تھی۔ وہ شاید اس وقت جائزہ لینے آیا تھا کہ بنگلے میں کہاں سے داخل ہوا جا سکتا ہے؟ دروازے پر تو گارڈ ہوتے ہیں۔ بنگلے میں بھی کم از کم چار ملازم تھے۔

میں نے باہر سے درانی کو ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ خود بھی اس وقت گھر میں موجود نہیں ہے بلکہ اپنے ڈینٹسٹ کے پاس ہے۔

میں اس کی طرف سے مطمئن ہو کر آفس چلا گیا۔

آفس پہنچا تو نظامی میرے پاس آ گیا اور بولا۔ "خرم صاحب! آپ کیش لے آئے؟"

"میں وہ کیش حاجی صاحب کے حوالے کر کے ہی آ رہا ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

اچانک نظامی کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور اسکرین پر نام دیکھ کر بولا۔ "ہاں اکبر! ہاں یہیں آفس میں ہے... میٹنگ... نہیں بھئی آج کوئی میٹنگ نہیں ہے... کیسا ڈنر... نہیں کوئی ایسا پروگرام نہیں ہے... اچھا میں بعد میں بات کرتا ہوں۔" اس نے سیل فون بند کر کے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "خرم صاحب! آج کون سی میٹنگز ہیں؟"

"ارے یار! وہ تو میں نے اکبر صاحب سے یوں ہی کہہ دیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ وقت آفس میں گزاروں۔"

نظامی چند لمحے تک مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

اس کا مطلب تھا کہ اکبر نے معلوم کر لیا تھا کہ میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔ اب وہ اپنے پروگرام میں کوئی تبدیلی کر سکتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں درانی صاحب کو خطرے سے کیسے آگاہ کروں؟

میرے پاس بنگلے کے ایک گارڈ کا سیل نمبر تھا۔

میں نے اس کا نمبر ملایا اور اس سے کہا۔ "ہیلو شبیر! میں

www.kahopakistan.com

خرم بول رہا ہوں۔''

''جی سر!'' شبیر نے کہا۔

''داجی کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ سٹنگ روم میں ہیں اور ٹیپ ریکارڈر پر کوئی پروگرام سن رہے ہیں۔''

''تم ایسا کرو، کسی سیکیورٹی ایجنسی سے کچھ گارڈز اور بلالو۔''

''کیوں سر؟'' شبیر نے پوچھا۔

''داجی کی جان کو خطرہ ہے۔''

''آپ فکر مت کریں صاحب!'' شبیر نے کہا۔ بنگلے میں اس وقت بھی چار گارڈز موجود ہیں۔ ایک وقت میں دو گارڈز ڈیوٹی دیتے ہیں، دو آرام کرتے ہیں۔ میں ان دونوں کو بھی ڈیوٹی پر لگادوں گا۔''

میرے دل میں ہول سے اٹھ رہے تھے کہ کچھ ہونے والا ہے۔

میں شام کو پانچ بجے ہی آفس سے نکل گیا۔

میں نے پارکنگ لاٹ میں جا کر اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا اور گاڑی کو پارکنگ لاٹ سے باہر نکالا ہی تھا کہ کوئی سخت سی چیز میری گردن سے آلگی۔ میں اچھل پڑا۔ پھر پیچھے سے آواز آئی۔ ''گاڑی کو دائیں طرف لے لو۔''

''میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا لیکن مجھے اس ریوالور بردار کی شکل نظر نہیں آئی کیونکہ وہ آئینے کی رینج میں نہیں تھا۔

''کون ہو تم... اور کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرو۔'' اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''ورنہ میں گردن میں سوراخ کردوں گا۔''

پھر میں اس کے بتائے ہوئے راستوں پر دائیں بائیں مڑتا رہا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ مجھے ملیر کی طرف لے جارہا ہے۔ قومی شاہراہ پر آنے کے بعد اس نے مجھے بائیں طرف مڑنے کا اشارہ کیا۔ آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ملیر کے فارم شروع ہوگئے۔ اس نے ایک فارم کے سامنے گاڑی روکنے کو کہا اور ہارن بجانے کا حکم دیا۔

ہارن بجانے پر ایک مسلح چوکیدار باہر نکلا پھر اس نے گاڑی دیکھ کر مین گیٹ کھول دیا۔

میرے ساتھ آنے والے شخص نے مجھے گن پوائنٹ پر نیچے اترنے کا حکم دیا پھر وہ مجھے اس فارم ہاؤس کے ایک کمرے میں لے گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے میری تلاشی لی اور میری جیب سے ریوالور اور نقد رقم برآمد کر کے اپنی جیب میں ڈال لی۔

پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''تم یہاں چیخ چیخ کر مر بھی جاؤ گے تو کوئی تمہاری آواز نہیں سنے گا، اس لیے چیخنے کی کوشش مت کرنا۔'' اس نے چوکیدار کو آواز دی اور کہا۔ ''حاکم خان! یہ ہمارا مہمان ہے، اس کا خیال رکھنا۔ ہاں، اگر یہ بھاگنے کی کوشش کرے تو گولی ماردینا۔ میں اب صبح آؤں گا۔ اس کو روٹی شوٹی کھلا دینا۔'' اس نے مجھے کمرے میں بند کیا اور چلا گیا۔

اس کا مطلب تھا کہ وہاں صرف وہی ایک چوکیدار تھا۔ اگر میں کسی طرح اسے قابو کر لیتا تو یہاں سے نکل سکتا تھا۔ جو شخص مجھے یہاں لایا تھا، وہ کم بخت جاتے ہوئے میرا سیل فون اور نقد رقم سب کچھ لے گیا تھا۔

میں آدھے گھنٹے تک تو وہاں خاموشی سے بیٹھا رہا۔ اس نے اتنی عنایت کی تھی کہ میری کلائی کی گھڑی چھوڑ گیا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے دروازہ پیٹا تو باہر سے چوکیدار کی آواز آئی۔ ''کیا ہے؟''

''مجھے پیشاب کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کمرے میں باتھ روم نہیں ہے۔

''صبر کرو بابا۔'' اس نے کہا، پھر باہر سے تالے میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ چوکیدار کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی اور اس کا رخ میری طرف تھا۔ ''بابا شرافت سے رہو گے تو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''چلو سامنے، وہ سامنے پیشاب کرنے کی جگہ ہے۔''

میں آہستہ آہستہ اس طرف بڑھا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

میں چلتے چلتے لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ اس وقت تک چوکیدار میرے نزدیک آچکا تھا۔

میں نے لیٹے ہی لیٹے لات چلائی اور اس کی کلاشنکوف والی کلائی کو نشانہ بنایا۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

میں جھپٹ کر اٹھا اور اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ بری طرح مچلا۔ مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ یہاں کوئی اور نہ آجائے۔ میں نے اس کی گردن کو زوردار جھٹکا دیا تو چٹاخ کی آواز آئی اور وہ لہراتا ہوا زمین پر گر گیا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے اور اب یہ کبھی نہیں اٹھے گا۔

میں نے بہت عجلت میں اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب میں تیس پینتیس روپے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ میں نے اسے چھوڑا اور دوڑ کر اس کی کلاشنکوف اٹھالی۔

پھر میں آندھی طوفان کی طرح وہاں سے نکلا اور راستے میں جو پہلا پی سی او نظر آیا، وہاں سے ملیحہ کو ٹیلی فون کر کے کہا کہ نادر سے فوراً میری بات کراؤ۔ میرے پاس اس کا سیل نمبر نہیں ہے۔

فوراً ہی نادر لائن پر آگیا۔

''نادر! تمہارے پاس جتنے بھی آدمی ہیں ان سب کو لے کر درانی صاحب کے بنگلے پر چلے جاؤ۔ ان کی زندگی خطرے میں ہے۔'' میں نے اسے درانی صاحب کے بنگلے کا پتا بھی سمجھا دیا۔

پھر میں خود بھی برق رفتاری سے درانی صاحب کے بنگلے کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس دن میں نے تیز رفتاری کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ بی ایم ڈبلیو یوں بھی بہت طاقتور اور تیز رفتار گاڑی ہے۔

میں بنگلے کے نزدیک پہنچا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ گیٹ کے نزدیک شبیر زخمی حالت میں پڑا تھا لیکن وہ ابھی زندہ تھا۔

''کیا ہوا شبیر؟'' میرے لہجے میں وحشت تھی۔

''وہ پانچ آدمی تھے صاحب!'' شبیر نے اٹکتے ہوئے کہا... ان لوگوں نے... آتے ہی... فائرنگ شروع کر... دی۔ ان کے ریوالور پر سائیلنسر لگے ہوئے تھے۔ میں نے حسن اور احمد علی کو... اندر... بڑے صاحب کی... طرف بھیج دیا تھا... وہ... وہ...'' شبیر آگے نہ بول پایا اور اس کا جسم ساکت ہوگیا۔

میں نے کلاشنکوف کے ساتھ ساتھ شبیر کی ریپیٹر گن بھی اٹھائی اور اندر کی طرف بھاگا۔

اندر چار آدمی تھے جو حسن اور احمد علی کو مارنے کی کوشش کررہے تھے لیکن وہ ان کی زد سے باہر تھے۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پورا برسٹ کھول دیا۔ وہ چاروں وہیں لوٹ پوٹ ہوگئے۔

میں حسن کی طرف بڑھا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی شدید زخمی ہے۔

ابھی میں اس کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ پیچھے سے اکبر کی آواز آئی۔ ''اپنی گن پھینک دو افتخار!''

میں نے بے چون و چرا اپنی گن پھینک دی۔

میں گن پھینک کر اس کی طرف مڑا ہی تھا کہ اکبر کے عقب سے فائر ہوا اور گولی اکبر کی گردن میں پیوست ہوگئی۔

حسن اور احمد علی دونوں بری طرح زخمی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم نے بڑے صاحب کو کچن میں چھپا دیا تھا۔

میں نے ٹیلی فون کر کے ایمبولینس بلائی اور دونوں زخمی گارڈز کو اسپتال بھجوایا، پھر میں نے پولیس کو ٹیلی فون کردیا اور نادر سے کہا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ابھی یہاں پولیس آنے والی ہے۔ نادر جانے پر راضی نہیں تھا لیکن میں نے اسے بہت مشکل سے راضی کیا۔

پھر میں نے درانی صاحب کو سب کچھ سچ بتا دیا۔

ان کی بے نور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

پولیس نے مجھے گرفتار کرلیا۔ میری نشان دہی پر حاجی اور غلام رسول بھی پکڑے گئے۔

درانی صاحب حوالات میں مجھ سے ملنے آئے تو بولے۔ ''خرم بیٹا! تو خرم نہ سہی لیکن اب تو تو ہی میرے لیے سب کچھ ہے۔ تو میری جان بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل گیا۔ میں تجھے سزا نہیں ہونے دوں گا۔''

''درانی صاحب! میں...''

''داجی کہہ بیٹا۔'' ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''میں کس منہ سے آپ کو داجی کہوں سر!'' میں نے کہا۔ ''میں نے تو آپ کو...''

''بس آگے کچھ مت بولنا خرم بیٹا!'' انہوں نے کہا۔

پھر انہوں نے میرے لیے شہر کے بہترین وکیلوں کی فوج کھڑی کردی۔ وکیلوں نے مجھے وعدہ معاف گواہ بننے کا مشورہ دیا۔

کیس دو سال تک چلتا رہا، حاجی اور غلام رسول کو عمر قید کی سزائیں ہوگئی تھیں کیونکہ تحقیقات کرنے پر ان کے خلاف مزید جرائم بھی ثابت ہوگئے تھے۔

میں ضمانت پر پہلے ہی باہر آگیا تھا۔ دو سال بعد کورٹ نے مجھے بری کردیا۔

خالہ کلثوم اب بھی اپنے گھر میں نہیں رہتیں۔ وہ داجی کے محل نما گھر میں رہتی ہیں۔ میں نے فریحہ کی شادی کردی ہے اور وہ شادی کے بعد کینیڈا چلی گئی ہے۔ لیکن میں نے ملیحہ کی شادی نہیں کی ہے۔ اس کی شادی خالہ کلثوم نے کی ہے لیکن وہ بھی داجی کے بنگلے میں ہی رہتی ہے اور داجی اسے بہت عزیز رکھتے ہیں۔ وہ بھی دن رات ان کی خدمت کرتی ہے، آخر کو وہ ان کی بہو ہے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ سچائی اور ایمان داری کتابوں میں نہیں ہوتی بلکہ انسانوں میں ہوتی ہے۔ اگر ضمیر زندہ ہو تو سچائی بھی زندہ ہوتی ہے اور دیانت داری بھی۔ میں نے بھی بہت کڑی مسافتیں جھیلی ہیں لیکن ان مسافتوں کا صلہ بھی ملا ہے۔

www.kahopakistan.com

دوگز زمین

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

زندگی اور موت کی کشمکش سے کوئی شخص آزاد نہیں... ہر شخص کو دنیا میں آنے کے بعد زیست کی کرب والام سے گزرنا ہے... اور پھر موت سے ہمکنار ہونا ہے... مگر موت کی حقیقت کو ہر کوئی یاد نہیں رکھتا... کچھ ایسے بھی ذی نفس ہیں... جو اپنی طاقت... قوت اور دولت و آسائشات کو اوّل تا آخر صرف اور صرف اپنے لیے مخصوص سمجھتے ہیں... ایک ایسے ہی سفاک شخص کی زندگی کے دریدہ اوراق... جو ہر انسان کو کمتر... و حقیر سمجھتا تھا... یہاں تک کہ اس کے دل میں اپنی اولاد تک کے لیے محبت کا کوئی خانہ نہیں تھا...

[illegible]

وہ ڈوب رہی تھی... ابھر رہی تھی، یوں وہ غوطہ کھانے کے عمل سے گزر رہی تھی۔ اس کا ساتھی بھی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو بڑی آسانی سے تیر کر اپنی ساتھی کو لے کر کنارے پر پہنچ جاتا اور خود کو بھی ڈوبنے سے بچا لیتا لیکن اس نوجوان کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ ایک مضبوط رسّی سے اس کے دونوں ہاتھ پشت کی جانب موڑ کے باندھے گئے تھے، اسی طرح دونوں پیروں کو بھی آپس میں جکڑ دیا گیا تھا، پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا یہ ایک چوڑے پاٹ والی نہر تھی جو سندھو دریا (دریائے سندھ) سے نکلتی تھی اور گوٹھ کرم پور کے کھیتوں کھلیانوں کو سیراب کرتی گزرتی تھی۔ دونوں بدقسمت نوجوان لڑکا اور لڑکی، اذیت ناک موت سے نبرد آزما تھے، کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ ڈوبنے ہی والے تھے مگر شاید قدرت کو ابھی ان کی زندگی مقصود تھی۔ لڑکی باحوصلہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنے ساتھ نوجوان کو بھی اپنی سی کوشش کرتے ہوئے ڈوبنے سے بچائے ہوئے تھی، وہاں ان دونوں کی بدقسمتی یا متوقع اذیت ناک موت کا تماشا دیکھنے والے بھی موجود تھے اور ان کی بے بسی پر ہنس رہے تھے۔ دو جیتے جاگتے زندہ وجود کو بے رحم اور یقینی موت سے لڑتے ہوئے دیکھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا اور وہ سب اس وقت اپنے اس مشغلے سے خوب محظوظ ہو رہے تھے۔ ان کی تعداد آٹھ تھی، چار اس کنارے پر اور چار دوسرے کنارے پر۔ ان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے، ان کے ہاتھوں میں رائفلیں اور ڈبل بیرل بندوقیں تھیں۔ خوفناک جبڑوں اور شکاری دانتوں والے خوں خوار کتے بھی ان کے ہمراہ تھے، جن کی زبانیں ان کے نکیلے دانتوں سے باہر لپلپا رہی تھیں اور ان کے حلق سے خوفناک غراہٹیں برآمد ہو رہی تھیں جیسے شکار کو دبوچنے، اسے بھنبھوڑنے کے لیے بے چین ہوں۔ ان کی گردنوں میں خوب صورت بیلٹ بندھے ہوئے تھے اور زنجیریں انہی لوگوں کے ہاتھوں میں تھمی ہوئی تھیں۔

ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ پانی میں غوطے کھاتی اور رسیوں میں جکڑے ساتھی کو ڈوبنے سے بچانے والی وہ بدنصیب لڑکی، ساتھی سمیت خود کو کنارے تک لانے میں کامیاب بھی ہوئی لیکن موت کا تماشا دیکھنے والے ان بے حس درندوں نے اپنے خوں خوار کتوں کو آگے کر دیا۔ لڑکی خوف سے چیخ مار کے اپنے ساتھی سمیت کنارے سے دور ہونے پر مجبور ہوگئی اور پھر غوطے کھانے لگی۔

ظالم و مظلوم کے درمیان زندگی اور موت کا یہ کھیل نصف گھنٹے سے جاری تھا لڑکی اب بے حال ہونے لگی، وہ ہمت ہار گئی، اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اس کے ساتھی نے چلّا چلّا کے اسے جگانے کی کوشش بھی کی لیکن بے سود، پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے لڑکی گہرے پانیوں میں گم ہوگئی، لڑکے نے چیخ مارنا چاہی مگر پانی اس کے حلق میں چلا گیا اور وہ صرف گڑگڑا کر رہ گیا اور تہِ آب ہوگیا۔ بے حس لوگوں کا یہ شیطانی ٹولہ اب بھی مطمئن نہ ہوا۔ وہ بڑے غور سے اپنی گھنی بھوؤں سے ڈھکی ہوئی آنکھوں کو سکیڑے سطحِ آب پر نظریں جمائے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ پھر ذرا دیر بعد ان دونوں بدنصیب نوجوان لڑکا لڑکی کی لاشیں دوبارہ سطحِ آب پر آکے تیرنے لگیں تو وہ لوگ قہقہے بلند کرتے ہوئے واپس مڑ گئے۔

وڈیرا رئیس خان اپنی بلند چھت والی اوطاق میں موجود تھا۔ اس نے بیش قیمت کھڑکھڑاتا ہوا شلوار کرتہ زیب تن کیا ہوا تھا۔ پیروں میں پشاوری چھابے تھے، کاندھوں پر اصلی ریشمی اجرک تھی اور سر پر شیشے کے کام والی سرخ سندھی ٹوپی... اس پر خالص کاٹن کا قیمتی کپڑے کا اونچے شملے والا بڑا سا پگڑ باندھ رکھا تھا۔

اس کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی۔ صحت قابلِ رشک تھی، رنگت سرخ و سفید تھی' بھویں گھنی تھیں۔ موچھوں

www.kahopakistan.com

نے پورے ہونٹ ڈھانپ رکھے تھے جس کے دونوں سروں کو انگلیوں سے تاؤ دینے کے انداز میں بل دے کے اوپر اٹھا دیا گیا تھا جس کے باعث اس کی آنکھوں اور چہرے پر کھنڈی ازلی رعونت میں اضافہ ہوگیا تھا، ہاتھوں کی انگلیوں میں سونے اور قیمتی پتھروں کی انگشتریاں نظر آرہی تھیں۔ اس کے سامنے میز پر ایک ٹرے رکھی تھی جس میں سات آٹھ کالے بھٹ تیتروں کے بھنے ہوئے سالم پتھور رکھے ہوئے تھے۔ اصلی ولایتی شراب کی بوتل اور ایک گلاس بھی رکھا ہوا تھا جس میں نصف شراب نظر آرہی تھی، ساتھ ہی ایک پلیٹ میں سیاہ رنگ کی لعوق بھی رکھی تھی، وڈیرا دو تیتر چبانے اور ایک گلاس شراب چڑھانے کے بعد ذرا جھکا اور انگلی کی مدد سے پلیٹ پر پھیلی ہوئی کالے رنگ کی لعوق سمیٹی اور زبان پر رکھ کے چاٹنے لگا۔ لعوق حلق سے اترتے ہی اس کا نشہ دوچند ہوگیا۔ اس کا چہرہ یک دم سرخ ہوگیا۔ آنکھیں ابلنے لگیں اور پھر چند لمحوں بعد اس کی یہ کیفیت معمول پر آگئی۔

اوطاق میں اس وقت اس کے علاوہ دو افراد موجود تھے، ایک منشی جاڑو خان... جبکہ دوسرا چاکر خاص صوبو خان تھا۔ منشی جاڑو خان منحنی سے وجود کا پکی عمر کا شخص تھا جبکہ چاکر خاص صوبو خان قدآور، چوڑے شانوں والا پہلوان نما شخص تھا۔

"ابھی تک یہ مُردار نہیں لوٹے؟" معاً اوطاق میں وڈیرے رئیس خان کی گونج دار آواز ابھری۔

"بس! ابھی آتے ہوں گے سائیں وڈا!" منشی جاڑو خان نے فوراً ہاتھ جوڑ کے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ابھی اس نے الفاظ ادا ہی کیے تھے اوطاق کے باہر گاڑیاں رکنے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ابھریں۔ سب اندر داخل ہوئے اور ایک طرف دست بستہ کھڑے ہوگئے۔ لگتا تھا کتے بھی خوب سدھائے ہوئے ہیں اور "آدابِ اوطاق" کو محسوس کرتے تھے، کیونکہ وہ بھی غرانا بند کر کے خاموش کھڑے تھے۔

"ہاں بابا... بولو؟" وڈیرے نے اتنا کہنے پر اکتفا کیا۔

"سائیں...! جس طرح آپ کا حکم تھا اسی طرح ان دونوں کے ساتھ سلوک کیا گیا ہے۔" شیطانی ٹولے میں سے ایک نے دست بستہ مؤدبانہ کہا۔ "جب تک ان دونوں کی لاشیں پھول کر اوپر نہیں آگئیں، ہم وہاں سے ہلے نہیں تھے۔"

"ہوں۔" اس کی بات سن کر وڈیرے نے ایک طویل سانس لی۔ اس کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک گہری ہوگئی۔ پھر اس نے کہا۔ "آج رات والا کام یاد ہے؟"

"ہاں سائیں وڈا! یاد ہے، اچھی طرح یاد ہے۔" کارپرداز قدرے خم ہو کے بولا۔ پھر کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔ "سائیں میرا تو خیال ہے ان بڈھوں کو اتنی اہمیت دینے کی ضرورت تو نہیں، بھلا ان کی کیا جرأت کے ہمارے خلاف کچھ بول سکیں۔"

"یارو! اولاد کا معاملہ دوسرا ہوتا ہے، چھوکری کے ماں باپ دب سکتے ہیں مگر چھوکرے کا باپ احمد بخش اپنے جوان اکلوتے بیٹے کی موت پر پاگل ہو کے بک سکتا ہے۔" وڈیرے نے اپنی گھنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے گھاگ لہجے میں کہا۔

"برابر سائیں برابر... آپ کی بات سولہ آنے ٹھیک... اگر ایسا ہوا تو اسے ٹھکانے لگانا کون سا مشکل ہوگا۔" یار محمد عرف یارو نے بے رحمی سے کہا۔ یہ وڈیرے کے شیطانی ٹولے کا سرغنہ تھا۔ چھ فٹ سے زائد قد، رنگ سانولا اور کندھے چوڑے تھے۔ جسم کسرتی تھا۔ وڈیرے رئیس خان نے اس کی بات پر اطمینان کا اظہار کیا۔

☆☆☆

گوٹھ کرم پور پر رات اتر چکی تھی، پورا گوٹھ محوِخواب تھا۔ دور کھیتوں میں محافظ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان میں کبھی کبھی کسی گیدڑ کے رونے کی آواز بھی شامل ہوجاتی۔ آبادی سے الگ تھلگ، تھوڑے فاصلے پر وڈیرے رئیس خان کی بلند و بالا حویلی "گورکھ ہاؤس" پر گہرا سکوت طاری تھا۔ خوب صورت محرابی چھجوں والے دریچے بھی بند تھے۔ ایک دریچے سے روشنی پھوٹتی نظر آتی تھی۔

یہ بالائی منزل کا دریچہ تھا، چاند کی روشنی میں اس دریچے کا ایک پٹ اندر کی طرف تھوڑا سا کھلتا نظر آیا اور ایک چہرہ چمکتی ہوئی چاندنی میں طلوع ہوا۔ یہ چہرہ ایسا ہی تھا جس کے لیے کہا جا سکتا کہ اس چہرے کے سامنے چاند بھی شرما جائے... مگر دریچے کا یہ چاند بہت اداس تھا اور اداسی شاید چاند کا کوئی وصف تھا کہ آج اس کے ملکوتی حسن کو گہنانے کے بجائے دوچند کر رہا تھا۔ اس چاند چہرے کا نام مورزادی تھا۔ یہ وڈیرے رئیس خان کی بڑی بیٹی تھی اور اس کی پہلی بیوی حاکم خاتون کے بطن سے تھی اس نے اپنی عمر کی بیس بہاریں چہکتے، دمکتے اور مہکتے گل پاش نظاروں میں گزاری تھیں، مگر باقی دس بہاریں اس نے اس طرح راتوں کو دریچے وا کر کے اداسی کی خزاں رسیدہ راتوں میں گزاری تھیں اور اب شاید مقدر کی یہ کالی سیاہ راتیں عمر بھر کے لیے اس کی درماندہ زندگی کے ساتھ نتھی کر دی گئی تھیں۔ اب شاید غمناک راتیں اور غمگسار اداسیاں اس کا اوڑھنا بچھونا تھیں اور اپنے نصیب کا لکھا سمجھتے ہوئے مورزادی نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے، بس آنکھیں تھیں اور دل تھا۔ آنکھوں کی گہری جھیلوں میں گم گشتہ مناظر جھلملاتے تھے۔ دل کے کشکول میں اب فقط ماضی سے مستعار لی ہوئیں یادوں کے چند سکے تھے... اب یہی اس کی باقی درماندہ زندگی کی کل متاع بھی تھی اور زادِراہ بھی۔ وہ اس وقت بھی دریچے کے پاس کھڑی، تاریک آسمان میں اپنے مقدر کا تارا تلاش کرتی ہوئی بیتے ہوئے وقت کے مناظر اور گزری یادوں کے سکوں کی کھنک سن رہی تھی۔

"مورو جیئے!" معاً ایک ممتا بھری آواز عقب سے ابھری۔ مورزادی چونکی، مڑ کے دیکھا اس کی ماں حاکماں کھڑی تھی۔ غموں کا پہاڑ لیے، جس کے بوجھ تلے اس کا وجود پِسا ہوا ہی نظر آرہا تھا، مورزادی اس کی ایک ہی بیٹی تھی، جو خود ساختہ رسموں اور ذاتی مفادات کی بھینٹ میں گویا زندہ پرودی گئی تھی اور اب اسے ہلکی آنچ میں پکنے دیا جارہا تھا، کندن بننے کے لیے نہیں جل کے خاکستر ہونے کے لیے۔ حاکماں کے سر کے بالوں میں قبل از وقت چاندی اتر آئی تھی اور پورا سر ہی سفید پڑ گیا تھا۔ آنکھیں جو کبھی بڑی دلنشیں ہوتی تھیں، جو بیٹی کی وراثت میں چلی گئی تھیں، اب نیم مردہ سی ہو کے اندر کو دھنس چکی تھیں۔ رنگت پیلی زرد تھی، جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے شوہر وڈیرے رئیس خان سے پورے بیس سال چھوٹی تھی اور اس سے زیادہ ضعیف نظر آتی تھی۔ بیٹی کا غم ماں کو چاٹ گیا تھا اور وہی دیمک بیٹی کو بھی اندر سے کھوکھلا رہی تھی۔

"سو جا میری دھی رانی۔" وہ اس کے قریب آ کے محبت سے بولی۔ "اب ان خالی اور دور تک خاموش آسمانوں میں دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں... انسان ان میں ایک دن ہمیشہ کے لیے گم ہو کے رہ جاتا ہے۔"

"کاش! ایسا ہو جائے۔" مورزادی نے مرتعش لہجے میں کہا اور دھیرے سے اپنے عقب میں دریچے کا پٹ بند کر دیا۔ وہ اب ماں کے بالمقابل آن کھڑی ہوئی۔ سروقد، گندمی رنگت، بڑی بڑی جھیل سی گہری آنکھیں، جن میں ڈوبنے کو من چاہے اور ایسا چاہے کہ دوبارہ کبھی نہ ابھرے سیاہ گھنے بال، حسن و رعنائی کا دلکش نمونہ تھی وہ۔ دونوں ماں بیٹی گویا ایک دوسرے کی رازداں تھیں اور ہمدم بھی... حاکماں نے آگے بڑھ کر اپنی بیٹی کی پیشانی کو چوما اور اپنے ساتھ لگایا تو دونوں بری طرح سسک پڑیں۔

"اماں! مجھے اب یہاں اتنی بڑی حویلی میں بہت گھٹن ہونے لگی ہے، کیا ہم تھوڑی دیر کے لیے باہر نہیں جا سکتے؟" مورزادی کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

"نہیں میری بچی... ہم اس حویلی سے باہر قدم نہیں نکال سکتے۔ تو یہ دریچہ بھی کھولتی ہے مجھے لاتعداد اندیشے گھیر لیتے ہیں کہ سائیں کو نہ معلوم ہو جائے پھر نہ جانے تیرا کیا حشر ہو۔" حاکماں کے لہجے میں خوف کا عنصر غالب تھا۔

"اماں! میرے بابا ایسے کیوں ہیں؟ کیا سب بیٹیوں کے بابا ایسے ہی انا پرست، ظالمانہ حکم مسلط کرنے والے ہوتے ہیں؟ وہ تو ایسا اپنے ہاریوں کے ساتھ کرتے ہیں... مگر ہم تو بابا جان کے اپنے ہیں، وہ آخر مجھے اپنے وجود کا ٹکڑا کیوں نہیں سمجھتے؟ لفظ بیٹی پر تو لوگ مٹھاس محسوس کرتے ہیں، خوشی ہوتی ہے، مگر بابا جان اتنے کٹھور اور بے حس کیوں ہیں؟ میرے دل میں تو اب بھی یہ تمنا ہے کہ بابا جان ایک بار پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیر دیں، محبت سے مجھے گلے لگا لیں، مجھے وہ پدرانہ محبت دیں جس کے لیے میں ترسی ہوئی ہوں۔ اماں! اللہ سائیں کی قسم! میں یہ دکھ بھی بھلا دوں گی، جو انہوں نے مجھے دے رکھا ہے۔"

"بس کر... میری بچی! بس کر..." بیٹی کی حسرت و یاس زدہ باتیں سن کر ماں کا جگر چھلنی ہونے لگا۔

"تو سو جا... بچی... تو سو جا... آرام کر..." ماں نے افسردگی سے کہا۔

"ہاں اماں! تو صحیح کہتی ہے... مجھے سو جانا چاہیے... اپنے نصیب کی طرح مجھے سو جانا چاہیے۔" وہ گوگو سے انداز میں بولنے لگی اور دوبارہ دریچے کی طرف بڑھی، اس بار اس نے دونوں پٹ وا کر دیے، ماں کچھ نہ سمجھ پائی اور جب تک وہ سمجھتی، مورزادی دریچے سے باہر بلندی سے نیچے اتھاہ تاریکی میں چھلانگ لگا چکی تھی۔ حاکماں کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں، ان میں غیر یقینی اتر آئی، بے اختیار اپنا ایک ہاتھ اس نے اپنے کھلے منہ پر رکھ دیا جیسے یہاں چیخنے کی بھی اجازت نہ ہو، پھر جیسے اس کا سکتہ ٹوٹا اور وہ "میری دھی، میری مور رانی" کہتی ہوئی دریچے کی طرف بڑھی، نیچے جھانکا، تاریکی میں کچھ نظر نہ آیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بے رحم تاریکی نے اس کی بیٹی مورزادی کو نگل لیا ہو۔

حاکماں خاتون دریچے سے نصف باہر جھکی ہوئی بیٹی کو تلاش کر رہی تھی، آنکھوں سے آنسو بھی گر رہے تھے، منہ پر ہنوز ہاتھ تھا، گھٹی گھٹی آواز میں وہ زار و قطار روئے جارہی

www.kahopakistan.com

تھی۔

’’میری بچی۔۔۔ میری مور رانی! میری مورزادی۔۔۔! یہ تو نے کیا کیا۔۔۔؟‘‘ وہ سسکتے ہوئے گھٹے گھٹے انداز میں بولی۔ پھر نڈھال سی دریچے سے پیچھے ہٹی، مسہری کے پائنتی تک کر یوں رک رک کے رونے لگی جیسے اس عظیم الشان حویلی ’’گورکھ ہاؤس‘‘ میں رو کے غبار نکالنے کی بھی اجازت نہ ہو۔۔۔

پھر اس سے نہ رہا گیا۔ آخر وہ اس کی لختِ جگر تھی۔ وہ بھی نصیبوں کی ماری، اس کی پھول سی بیٹی مورزادی، جسے حاکماں پیار سے مور رانی کہتی تھی۔ ایک ہی بیٹی، ماں کی سہیلی بھی ہوتی ہے، دکھ درد کی ساتھی بھی۔ ماں، بیٹوں سے زیادہ بیٹی کو محسوس کرتی ہے۔ وہ اٹھی اور روتی چلاتی ہوئی کمرے سے باہر بھاگی۔

’’میری مورنی نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ میری نورِ نظر۔۔۔ حویلی سے نیچے کود گئی ہے۔‘‘ اس کی چیخ و پکار سے پوری حویلی کے در و دیوار وا ہو گئے، حاکماں غم سے نڈھال تھی، سب سے پہلے اس کے جوان بیٹے شہزادہ خان نے اسے سنبھالا، پھر شہزادہ خان کی نو بیاہتا بیوی سوہنی بھی نکل آئی دوسرا دروازہ کھلا، اس کی چھوٹی سوتن مائی مراداں برآمد ہوئی پھر اس کی جوان بیٹی ماروی، بڑا بیٹا جمال خان نکلا۔۔۔ خادموں، ملازموں کی قطار بھی ادھر ادھر سے برآمد ہو گئی، تب تک اپنے کمرائے خاص سے وڈیرا رئیس خان برآمد ہوا، اسے بھی تک حقیقت معلوم ہو چکی تھی، حاکماں غم سے نڈھال اس کی طرف لپکی اور روتے ہوئے بولی۔ ’’میڈا سائیں! اپڑیں دکھی مورزادی نے۔۔۔‘‘

اس کی آواز حلق میں ہی اٹک گئی۔ وڈیرے سائیں رئیس خان نے اپنے بھاری ہاتھ کا ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے چہرے پر جڑ دیا۔ زوردار تھپڑ نے حاکماں کو فرش پر گرا دیا اور وہ اکھڑی اکھڑی سانسیں لینے لگی۔ وہ صدمے سے بے حال تھی جبکہ وڈیرے کا بھاری بھرکم نیم غنودہ چہرہ غیظ و غضب سے سرخ ہو رہا تھا، بڑا بیٹا شہزادہ خان فوراً آگے بڑھا اور ماں کو سنبھالتے ہوئے باپ سے ناگوار انداز میں بولا۔

’’بابا سائیں! یہ کیا؟ ہم پر ظلم ہو گیا۔۔۔ میری ماں پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ گیا اور آپ۔۔۔‘‘

’’بکواس بند کرایں۔۔۔‘‘ وڈیرے نے بیٹے کو پُرتپش نظروں سے گھور کر کہا۔

’’اپڑیں ماں کو کمرے میں لے جا اور خبردار، سب کان کھول کر سن لو یہ بات حویلی سے باہر نکلی تو اس حویلی کے تہ خانے میں زندہ گاڑ دوں گا، اب تم سب جاؤ اور بھول جاؤ کہ آج کی منحوس رات میں کچھ ہوا تھا۔‘‘ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں واپس سر جھکائے خاموشی سے لوٹنے لگے۔ وڈیرے نے اپنے ہم قدم بیٹے، جمال خان اور دو خدمت گاروں کو روک لیا۔ باقی سب جا چکے تھے۔

’’آؤ، باہر جا کر یہ قضیہ نمٹاتے ہیں۔‘‘ وڈیرے نے دانت پیس کر کہا۔

’’بابا سائیں! میں ٹارچ لے کر آتا ہوں۔‘‘ جمال خان نے کہا اور اجازت ملتے ہی اپنے کمرے کی طرف دوڑا۔

تھوڑی دیر بعد یہ چاروں حویلی گورکھ ہاؤس سے باہر تاریکی میں آ گئے، ہر سو گھپ اندھیرا تھا۔۔۔ دور کہیں گیدڑ کے رونے کی آواز ابھری۔ رات اپنے پچھلے پہر میں داخل ہونے والی تھی۔

’’کدھر مری ہے وہ؟‘‘ وڈیرے نے بے رحمانہ لہجے میں پوچھا۔

’’اس طرف بابا سائیں!‘‘ بیٹے جمال خان نے ٹارچ کی روشنی حویلی کی جنوبی دیوار کی طرف ڈالی۔ جہاں کسی کا بے سدھ وجود پختہ سیمنٹ کے آٹھ فٹ چوڑے فرش پر خون میں لت پت پڑا تھا۔ یہ لوگ وہاں پہنچے، وہ بڑا عبرت ناک منظر تھا۔ نازک اندام، حسن و شباب کا مرقع، معصومیت کا پیکر وجود اس وقت بے بسی کے عالم کے ساتھ چکنے فرش پر ہاتھ پاؤں کی ہڈیاں ٹوٹنے کے باعث مڑی تڑی حالت میں پڑا تھا۔ پتھر سے پتھر دل انسان کے لیے بھی یہ منظر رلا دینے کے لیے کافی تھا مگر بدنصیب مورزادی تو وڈیرے رئیس خان کی سگی بیٹی تھی اور وہ اس کا باپ تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ تو درکنار، چہرے پر دکھ یا غم کی ایک رمق تک نہ تھی۔ اس کے برعکس وہ پتھر دل اور بے حس باپ غصے اور طیش کے باعث بپھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یہی حال اس کے بیٹے بدنصیب مورزادی کے سوتیلے بھائی کا تھا۔ اسے جیسے اپنی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

’’جاتے جاتے بھی ہماری عزت پر داغ لگا ہی دیا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں بابا سائیں! اس نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہوگا۔‘‘

’’ادا جمال خان! کیا تم جان بوجھ کر خود کو ایک ذرا سی سوئی چبھو کے دکھا سکتے ہو مجھے؟‘‘ اچانک ان کے عقب سے شہزادہ خان کی زہریلی آواز ابھری اور جمال خان جز بز ہو کر رہ گیا۔ شہزادہ خان جانے کب حویلی سے ان کے پیچھے چلا آیا تھا اور اب غمگین نظروں سے اپنی بدنصیب بہن کی لاش۔۔ دیکھ رہا تھا۔

’’شاید اچھا ہی ہوا جو اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ بے چاری زندہ بھی تھی تو موت سے بہرحال بدتر ہی تھی۔ اپنی زندگی میں ہی میری بدنصیب بہن کو زندہ درگور کر دیا گیا تھا۔‘‘

’’شہزادہ خان!‘‘ وڈیرا خشمگیں نظروں سے بیٹے کو گھورتا ہوا درشت لہجے میں بولا۔ ’’تم اپنی بکواس بند کرو اور اندر جاؤ۔‘‘ پھر وہ اپنے دو خدمت گاروں اور چھوٹے بیٹے جمال خان سے مخاطب ہو کے بولا۔

’’اب تم جلدی سے اپنا کام نمٹاؤ۔ لاش کو اٹھا کے حویلی کے تہ خانے میں گاڑ دو۔‘‘

’’ایسا نہیں ہو سکتا۔‘‘ معاً بڑے بیٹے شہزادہ خان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ’’یہ کسی جانور کی لاش نہیں ہے بابا سائیں! ایک انسان کی لاش ہے اور وہ بھی میری بہن کی۔ میں خود اسے قبرستان۔۔۔۔ لے جا کے دفناؤں گا۔‘‘

’’شہزادہ خان! تم حد سے بڑھتے جا رہے ہو، ہماری نرمی کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔ کیا تم ہماری بدنامی چاہتے ہو؟ اپنے باپ کی۔۔۔ اس شان دار حویلی کی؟‘‘ باپ نے اسے گھورا۔

’’بدنامی، شان دار حویلی۔۔۔‘‘ شہزادہ خان طنزیہ کاٹ سے بولا۔ ’’بابا سائیں! آپ کی نیک نامی اور آپ کی اس شان دار حویلی کی عزت میں تو اس روز اضافہ ہو گیا تھا جب آپ نے اپنی جائداد بچانے کے لیے میری بدنصیب بہن کو ’’ونی‘‘ کر دیا تھا، قرآن شریف سے اس کا نکاح پڑھوا کے اس بے چاری کا حق بخشوا دیا تھا۔‘‘ بیٹے کے لہجے کا زہریلا پن اور طنزیہ باتوں نے وڈیرے کو آپے سے باہر کر دیا۔ مگر یہ وقت ایسا تھا کہ وہ بیٹے کے ساتھ گرماگرمی نہیں کر سکتا تھا۔

یہ کوئی معمولی بات نہ تھی کہ وڈیرے رئیس خان کی بڑی بیٹی نے اپنی ہی حویلی ’’گورکھ ہاؤس‘‘ کی اوپری منزل سے چھلانگ لگا کے خودکشی کر لی تھی۔ وڈیرے کے لیے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا لیکن جہاں جائداد اور ملکیت کی بات آتی تھی، تب اسے کسی بدنامی کی پروا نہیں ہوتی تھی۔ وہ اسے روایت کا خودساختہ لبادہ پہنا دیا کرتا تھا۔ اس وقت یہ سوچ اس کے ذہن میں نہیں ابھرتی تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے بے انتہا نوازا تھا، جائداد، دولت، اولاد، بھرا پُرا گھر بار مگر یہ اس کی عاقبت نااندیشی نہیں تو اور کیا تھا کہ وہ بیٹیوں کی شادی کرنے کے حق میں نہیں تھا کہ اس طرح جائداد تقسیم ہونے لگتی جبکہ وڈیرے کی اگر دس بیٹیاں بھی ہوتیں تو وہ انہیں شایانِ شان طریقے سے بیاہتا تو بھی اس کی شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی دولت و جائداد میں کوئی کمی نہ آتی، مگر یہاں مسئلہ جھوٹی انا کا بھی تھا، ایک بے تم اور خودساختہ روایت کا بھی دخل تھا جو جانے کب سے اس حویلی گورکھ ہاؤس کا مقدر بنی چلی آ رہی تھی۔

گزرے زمانوں میں بیٹیوں کی پیدائش پر انہیں زندہ زمین میں دفن کر دیا جاتا تھا۔ آج کے زمانے کا انسان باشعور اور متمدن تو ہو گیا لیکن ایک ذرا سے فرق کے ساتھ، وہ آج اپنی بیٹیوں کو زندہ تو زمین میں نہیں گاڑ سکتا تھا البتہ جیتے جی زندہ درگور ضرور کر دیتا تھا اور شاید یہ ان بدنصیب بچیوں کے لیے زندہ گاڑ دینے سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔

اب یہ تذلیلِ انسانیت کی انتہا نہیں تھی کہ وڈیرا اپنی بیٹی کی لاش کو۔۔۔۔۔ احترام سے دفنانے کے بجائے اسے دنیا والوں سے چھپا کے اپنی حویلی کے تہ خانے میں گاڑ دینا چاہتا تھا۔

باپ، بیٹے کے درمیان ضد فضول اور اصول کی بحث جاری تھی مگر وڈیرا پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا۔ نہ ہی اس نے آج تک کسی کی سنی تھی، اس نے وہی کیا جو وہ چاہتا تھا۔ بیٹی کی لاش کو اٹھوا کے حویلی کے تہ خانے میں گاڑ دیا۔

غم سے نڈھال حاکماں خاتون کو اس کی چھوٹی سوتن مراداں اور اس کی بیٹی ماروی نے سنبھالا ہوا تھا، وہ دونوں ماں بیٹیاں اسے تسلی دے رہی تھیں۔ اس کی دل جوئی کر رہی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ دونوں سوتنیں روایت سے ہٹ کر آپس میں بالکل بہنوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ رہتی تھیں، انہیں آپس میں کوئی بغض یا حسد نہ تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ گورکھ ہاؤس میں صرف ایک مطلق العنان آدمی کی حکومت تھی جسے اپنی جگہ سے کوئی ایک انچ بھی نہیں سرکا سکتا تھا۔ حکم اس کا چلتا تھا، مائی مراداں کا بیٹا جمال خان البتہ گورکھ ہاؤس کا وہ واحد شخص تھا جس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ وڈیرا رئیس اپنے بعد اسے چاہتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ جمال خان کے پاس باپ کی ایسی کون سی دکھتی رگ تھی لیکن بسا اوقات اسے بھی باپ سے سخت جھڑکیاں کھاتے بھی دیکھا گیا تھا۔ تاہم یہ حقیقت تھی کہ وہ بڑے بیٹے کی بہ نسبت اپنے باپ کے زیادہ قریب تھا، شاید اس لیے کہ جمال خان باپ کی ہر جائز و ناجائز بات پر ہاں میں ہاں ملانے کا قائل تھا۔

www.kahopakistan.com

شہزادہ خان نے جب اپنی ماں حاکماں خاتون کو یہ جاں سوز حقیقت بتائی کہ بدنصیب مورزادی کو بے گوروکفن گورکھ ہاؤس کے تہ خانے میں گاڑ دیا گیا ہے تو وہ یک دم ایک مظلوم عورت سے بپھری ہوئی شیرنی بن گئی پھر سب اسے روکتے ہی رہ گئے مگر اس کے اندر اچانک ہی کون سی طاقت عود کر آئی تھی کہ وہ دندناتی ہوئی سیدھی شوہر کے کمرۂ خاص میں بغیر دستک دیے داخل ہو گئی۔ وڈیرا اس وقت ''شغل'' میں مصروف تھا اور تنہا تھا۔

''میری معصوم اور بے گناہ بچی کا قصور کیا تھا جو اسے مرنے کے بعد بھی بے حسی کی سولی پر چڑھا دیا گیا؟'' وہ شوہر کی طرف دیکھ کر بولی۔ اس کی آواز میں لرزش تھی اور برہمی کی تپش بھی۔ وڈیرے نے غضبناک نظروں سے بیوی کو گھورا اور اکھڑ لہجے میں بولا۔

''ہم جو کرتے ہیں وہ اپنے پرکھوں کی عزت، اپنی آن اور گورکھ ہاؤس کی شان کو نظر میں رکھ کے کرتے ہیں، تم جیسی کم عقل عورتیں جن کی عقل مغرب کا سورج غروب ہونے کے بعد گھٹنوں تک محدود ہو جاتی ہے، یہ باتیں نہیں سمجھ سکتیں۔ اب تم دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ...'' وڈیرا رئیس غصے سے دہاڑا اور دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا، مگر لگتا تھا حاکماں خاتون بھی آج اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے ارادے سے ہی آئی ہے۔

''ارے ظالم! کیسا باپ ہے تُو، بیٹی کو مرنے کے بعد بھی اپنی بے حسی کا نشانہ بنا کے چھوڑا، اللہ سے ڈر، اس کی لاٹھی بے آواز ہے۔'' یہ کہہ کر وہ زیرلب کچھ پڑھنے لگی اور اپنی آنکھیں وڈیرے پر جماتے ہوئے بولی۔

''تُو میرے سر کا سائیں ہے پر تُو نے میری بیٹی کے ساتھ مرنے کے بعد بھی جو سلوک کیا ہے، وہ میں تجھے کبھی معاف نہیں کر سکتی، میرا آخری آسرا میرا رب سائیں ہے! میں نے اس کے آگے فریاد ڈال دی ہے اور سن وڈیرا رئیس خان...! میں نے تجھے آج بہت مجبور ہو کے بددعا دی ہے۔'' یہ کہہ کر حاکماں خاتون روتی سسکتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

اپنی سوتیلی اور بڑی بہن مورزادی کا یہ عبرت ناک انجام دیکھ کر ماروی کے اندر چھپا ہوا جنون جاگنے لگا۔ ماروی اٹھارہ سال کی ایک نازک اندام اور خوب صورت لڑکی تھی جب اس کی بڑی بہن مورزادی کو ''ستی جتی'' کیا گیا تھا تو اس وقت اس کی عمر دس گیارہ سال تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ کیسا بھیانک اور خدائی عذاب کو پکارنے والا قبیح عمل گورکھ ہاؤس میں کھیلا جا رہا ہے...... اس دن کے بعد سے اس نے مورزادی کو زرق برق لباس کے بجائے، ہر وقت سفید کپڑوں میں ملفوف دیکھا اور عمر کی اٹھارویں بہار میں قدم رکھا تو اسے جہاں اس ساری حقیقت کا علم ہوا بلکہ ایک انجانا سا خوف بھی اس کے دل و دماغ میں جاگزیں ہونے لگا کہ گورکھ ہاؤس میں آٹھ دس سال پہلے اس کی بہن کو قبیح روایت کی جس سولی پر لٹکایا گیا تھا، وہ اس کا بھی نصیب بن سکتی ہے...

''تو کیا میرا انجام بھی آدی مورزادی جیسا ہو گا؟ میرے بھی ارمانوں کو اس طرح اس رسم کی آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا جائے گا اور پھر ایک دن میں بھی ادی مورزادی کی طرح اپنے خوابوں اور ارمانوں کی زندہ لاش سمیت کسی اونچے دریچے سے نیچے چھلانگ لگانے پر مجبور ہو جاؤں گی؟ اور پھر گورکھ ہاؤس کی شان کی خاطر بدنامی کے خوف سے ڈر کے میری بکھری ہوئی لاش کو گورکھ ہاؤس کے منحوس تہ خانے میں بے گوروکفن گاڑ دیا جائے گا۔''

ماروی اپنے... خیالات کے بھنور میں ڈوب کر ابھر رہی تھی جو اسے اس خوفناک گرداب کے جنگل سے نبرد آزما ہونے پر اکسا رہے تھے۔

''نہیں... ہرگز نہیں... میں ماروی ہوں، مورزادی نہیں۔'' فقط یہی الفاظ اس کے اندر ابھرے تھے اور پھر اسے اپنی سماعتوں میں اس آہنی زنجیروں کے کھنکنے کی آوازیں آتی محسوس ہوئیں۔

''میں توڑ ڈالوں گی ان زنجیروں کو...'' وہ سرکشی سے بولی۔

پھر اسے گولیوں کی گھن گرج اور خونخوار کتوں کے غرانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''مجھے اس کی بھی پروا نہیں، بے بسی کی موت سے بہتر ہے انسان کچھ کر کے مر جائے مگر... کیا کیا جائے؟ اور کس کے ساتھ کیا جائے؟ اس جی داری میں کسی جی دار کا ساتھ ضروری ہے۔ کون ہے وہ میرا ''جی دار'' کہاں ہے وہ؟''

☆☆☆

اس نے بے اختیار جانے کس جذبے سے اپنی آنکھیں موند لیں۔ ایک کھٹکا ہوا، اس نے آنکھیں کھولیں اور وہ ''جی دار'' اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ قد درمیانہ تھا مگر مضبوط جسامت، چہرہ چوڑا اور بھرا بھرا تھا۔ بال گھنگریالے... بڑی بڑی آنکھوں میں روشن چمک اور طوفانوں سے ٹکرا جانے کی سرکشی کی جھلک نمایاں تر تھی۔

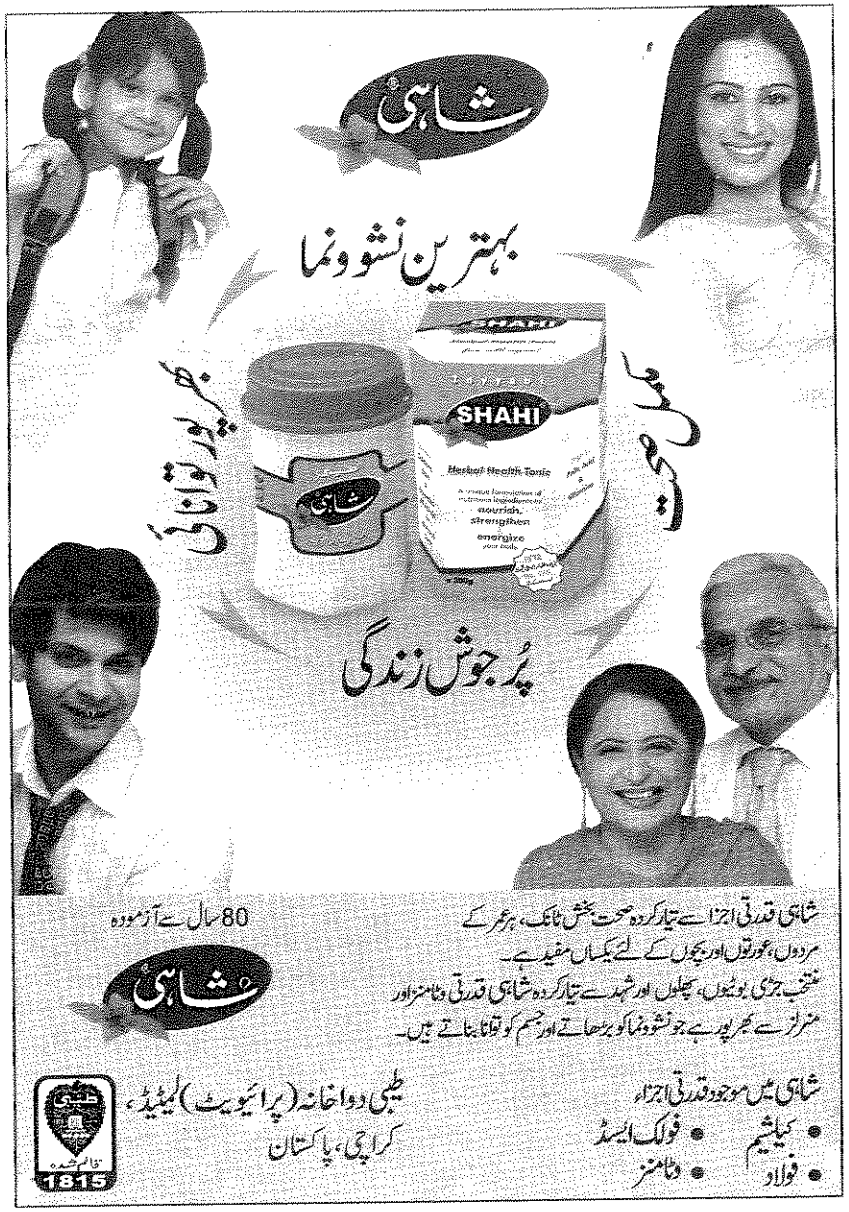

www.kahopakistan.com

''چھوٹی بی بی جی! کھانا آپ اپنے کمرے میں ہی کھائیں گی یا...؟''

''ادھر ہی لے آؤ۔'' ماروی نے یک ٹک اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ الٹے پیروں لوٹ گیا اور جیسے ماروی کا دل ٹوٹ گیا۔

'یہ تو قادر بخش ہے، وہی کادو جو ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہتا تھا مگر پہلے کیوں نہیں نظر آیا؟ وہ کون سی نظر تھی آخر کہ اسے سامنے رہتے ہوئے بھی نہ ڈھونڈ سکی؟ کیا یہی وہ جی دار ہے، جو مجھے گورکھ ہاؤس کی نادیدہ زنجیروں کی قید سے نجات دلائے گا؟' ماروی نے سوچا۔

وہ، ماروی کا جواب سن کر واپس جا چکا تھا اور ماروی کو سوچتا ہوا چھوڑ گیا۔ کسی نے اسے اندر سے کچھ کا لگایا۔

'یاروی! تو کون اور میں کون۔ تو شہزادی اور یہ غلام۔ تو مالکن، یہ نوکر... تو آسمان یہ زمین۔ تو اونچی حویلی میں رہنے والی، یہ سرکنڈوں کی جھونپڑی میں رہنے والا۔ ہوش میں آ... ماروی! اور اپنی حیثیت اور اپنا مرتبہ پہچان۔'

وہ نہ جانے کب تک کھوئی رہی پھر اس وقت چونکی جب وہ کھانے کے برتن لے کر اندر آیا۔

''مہرالنسا کدھر مر گئی آج جو تم ادھر زنان خانے میں دندناتے پھر رہے ہو؟'' ماروی نے اس کی طرف گھور کے غصے سے کہا۔ وہ اپنی اس پل کے پل بدلتی کایا کلپ پر خود حیران تھی۔ بے چارے کادو کا چہرہ ست کر رہ گیا۔ اس نے کھانے کی ٹرے کو جلدی سے قریبی تپائی پر رکھا اور سر جھکائے ہاتھ جوڑ کے مؤدبانہ انداز میں بولا۔

''چھوٹی بی بی جی! مہرالنسا بیمار تھی، اور... اور... اور... میں خود سے زنان خانے میں نہیں آیا، بڑی بی بی کی اجازت سے آیا ہوں۔ اب چلا جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ واپس جانے کے لیے لوٹنے لگا۔

''ٹھہرو۔'' ماروی نے بارعب لہجے میں کہا۔ ''اسی طرح ادھر کھڑے رہو، ہاتھ جوڑے، سر جھکائے۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور ایک طرف کونے میں سر جھکائے ہاتھ جوڑے خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔

ماروی اسی طرح اپنی مسہری پر ٹکی اسے بہ غور دیکھنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ 'یہ خوابوں کا شہزادہ بننے کے تو لائق نہیں، نہ ہی اجڈ جاہل کے ساتھ ساری زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ ہاں اتنا تو ضرور کر سکتا ہے کہ یہ مجھے اس جہنم سے اس منحوس حویلی گورکھ ہاؤس سے نکال لے... اس کے مضبوط بازوؤں میں بڑا دم نظر آتا ہے۔'

''تم بہادر ہو یا بزدل؟'' معاً ماروی نے اس سے پوچھا۔ وہ سر اٹھا کے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس عجیب سوال پر وہ گڑبڑایا ہوا نظر آنے لگا۔ جیسے اس سے کوئی جواب نہ بن پا رہا ہو۔ ماروی نے کڑک دار لہجے میں پھر پوچھا۔

''جواب دو میری بات کا تم بہادر ہو یا بزدل؟''

''جج... چھوٹی بی بی... مم... میں بھلا اس کا کیا جواب دوں؟'' بالآخر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''میں نے فارسی نہیں بولی۔'' ماروی کے لہجے میں برہمی تھی۔

وہ بولا۔ ''میں اپنے منہ سے کیا بتاؤں کہ میں کتنا بہادر ہوں؟''

''اچھا! کوئی ایسا واقعہ بتاؤ... جب تم نے کوئی بڑی بہادری کا کام کیا ہو، کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو؟'' ماروی بولی۔

وہ کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ''میں نے کاسو دودھ والے کی بوڑھی ماں کو ڈوبنے سے بچایا تھا، وہ بے چاری ایک نہر میں جا گری تھی۔''

''یہ کوئی اتنا بڑا بہادری کا کام نہیں... کوئی اور بتاؤ؟'' ماروی منہ بسور کے بولی۔ کادو پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد پھر بولا۔

''میں نے ایک موٹے تازے بیل سے مقابلہ کیا تھا، وہ بدمست ہو کے ایک کھلے دروازے والے کچے گھر میں جا گھسا تھا۔ اندر ایک عورت تھی، اس کے دو چھوٹے بچے صحن میں کھیل رہے تھے، عورت کے چیخنے چلانے پر میں اس کی مدد کے لیے اندر گھس گیا تھا اور اس موٹے بیل کو سینگوں سے پکڑ کر زمین پر گرا کے بے بس کر دیا۔''

''یہ بھی کوئی خاص کارنامہ نہیں۔'' ماروی نے منہ بنایا۔ ''کسی انسان کے ساتھ مقابلہ کیا ہے؟''

''انسان؟'' وہ زیرلب بڑبڑایا پھر اسے یاد آیا اور اس نے ماروی سے نظریں چراتے ہوئے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

ماروی یک دم خوش ہو کے بولی۔ ''اچھا! بتاؤ مجھے بتاؤ۔'' وہ بے تاب ہو گئی۔ کادو بتانے لگا۔

''وزیر محمد ہے نا! اینوں کے بھٹے کا مالک، اس کے ایک بیٹے دینو کے ساتھ لڑا تھا۔ اس کا ایک دوست بھی ساتھ تھا۔ کسی بات پر میرا ان سے جھگڑا ہو گیا۔ دونوں نے کلہاڑی اور چاقو نکال لیے مجھ پر... اور...

''... اور تم... نہتے تھے...؟'' ماروی نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے پوچھا۔ وہ اب اس کے اس ''کارنامے'' میں دلچسپی لے رہی تھی۔

''ہاں، چھوٹی بی بی! میں اس وقت بالکل نہتا تھا مگر اس کے باوجود میں نے دونوں کی خوب کٹ لگائی تھی، چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا تھا دونوں کو۔''

''واہ... یہ ہوئی نا بات۔'' ماروی چہک کر بولی پھر چند ثانیے کسی پُرسوچ خاموشی میں غلطاں رہنے کے بعد بولی۔

''اگر میں تمہارا کوئی امتحان لینا چاہوں تو...؟''

''کیسا امتحان؟''

''بہادری کا امتحان۔''

''جی۔''

''یار محمد کو جانتے ہو؟''

''یار محمد؟'' وہ یاد کرنے کے انداز میں ہولے سے زیرلب بڑبڑایا پھر یک دم بولا۔ ''ہاں، کک... کہیں آپ... یاروکی بات تو نہیں کر رہی ہو، چھوٹی بی بی...؟''

''ہاں، اسی کی بات کر رہی ہوں۔'' ماروی متانت سے بولی۔ ''تمہیں اس سے لڑنا ہے اور یہ مقابلہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''مم... مم... ی... ی... یارو سے لڑوں؟ مم... مگر کیوں؟ چھ... چھوٹی بی بی!'' کادو پریشان ہو گیا۔

''میری خاطر... یہ میرا حکم ہے تمہیں۔'' ماروی اس کے پریشان سے چہرے پر اپنی بڑی بڑی آنکھیں جما کے بولی۔

کادو بے چارہ مخمصے میں پڑ گیا۔ اسے متذبذب پا کر ماروی نے اسے اکسایا۔ ''کیا تم یارو سے ڈرتے ہو؟''

''میں ڈرتا کسی سے نہیں ہوں چھوٹی بی بی۔'' کادو جوش میں آ گیا اور ماروی کے عنابی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تیر گئی جس پر فوراً قابو پاتے ہوئے بولی۔

''تو پھر...؟''

''یارو، وڈے بھوتار کا آدمی ہے اور وہ آپ کے بابا جان ہیں۔''

''اس لیے تو میں تمہیں یارو سے لڑانا چاہتی ہوں، اصل بہادری کا کام تو یہ ہے نا۔'' ماروی نے پھر اس کے جوش کو ابھارا۔

کادو نے پہلی بار اپنی روشن چمک دار آنکھوں سے ماروی کی طرف دیکھا۔ ماروی نے بھی اپنی آنکھوں کی دلکش کمندیں اس پر ڈال دیں۔ کادو نے پھر نظریں جھکا دیں اور ایک لمبی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے، اگر آپ کا حکم ہے تو میں یارو سے لڑ جاؤں گا، پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔''

ماروی اس کا جواب سن کر مسرت آمیز حیرت میں پڑ گئی۔

''پر چھوٹی بی بی! آپ یہ لڑائی کس طرح دیکھیں گی؟'' معاً اس نے استفسار کیا۔

''اوپر در یچے سے دیکھوں گی جو بابا جانی کی اوطاق کی طرف کھلتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، جیسے ہی آپ شور کی آواز سنیں، در یچے میں آ جانا۔'' وہ بولا۔

''لیکن ایک بات یاد رکھنا۔'' ماروی بولی۔ ''میرا نام نہ آئے اور یارو کو تم نے خوب مار لگانی ہے، یہ نہ ہو اس سے مار کھا بیٹھو۔''

''جیسا آپ چاہتی ہیں، ویسا ہی ہو گا۔'' اس نے کہا۔

''اب تم جاؤ۔'' ماروی بولی اور وہ سر جھکا کے چلا گیا۔

بعد میں ماروی کو افسوس سا ہونے لگا، وہ جانتی تھی، یار محمد عرف یارو اس کے باپ وڈیرے رئیس کا مقرب خاص ہے دوسرے وہ لمبا چوڑا اور خاصا مضبوط جسم کا آدمی ہے جبکہ کادو بھی اگرچہ صحت اور جسم میں کم نہ تھا پر قد میں مار کھاتا تھا اور یارو کے مقابلے میں کم حیثیت کا نوکر تھا۔ یارو کی شکایت پر کادو اس کے باپ کے زیر عتاب آ سکتا تھا۔

'جانے دو، سب ٹھیک ہے' میں جو کام کرنے والی ہوں، اس کے لیے ایسا ہی آدمی مجھے چاہیے جو درانہ وار آگ کے دریا میں کود پڑے میری خاطر...' ماروی نے سوچا۔

☆☆☆

نور محمد ریگولیٹر کے دروازے پر دو پھولی ہوئی لاشیں آن پھنسیں تو متعلقہ تھانے کے انچارج انسپکٹر مہر ولی کو اس کی اطلاع ملی۔ وہ فوراً ایک جیپ میں اپنے چند ساتھیوں سمیت نورواہ کے ریگولیٹر پر پہنچا اور دونوں لاشوں کو نکالنے کا حکم جاری کیا۔ لاشیں نکالی گئیں، جو پانی سے پھول چکی تھیں اور ان کی شناخت مشکل ہو رہی تھی، تاہم کسی نہ کسی طرح انہیں قابلِ شناخت بنایا گیا۔ مقامی لوگوں سے پوچھ تاچھ کی گئی، سب کا ایک ہی جواب تھا۔ ''یہ دونوں بدنصیب مرد و عورت ان کے گوٹھ سے تعلق نہیں رکھتے... اور جہاں سے بہتے ہوئے آئے تھے اس طرف قریبی گوٹھ کرم پور پڑتا تھا۔ چنانچہ انسپکٹر مہر ولی نے گوٹھ کرم پور سے چند مقامی آدمیوں کو اپنے پولیس والوں کو بھیج کر تھانے طلب کر لیا۔ انہوں نے دونوں لاشوں کو، مول اور ارباب علی کے نام سے شناخت کر لیا تھا جس کے مطابق مول چاچار مضان کی بیٹی تھی جبکہ ارباب نالی

www.kahopakistan.com

لڑکا احمد بخش کا بیٹا تھا۔ انسپکٹر مہرولی نے انہیں جیپ میں بٹھایا اور چند سپاہیوں کے ساتھ گوٹھ کرم پور کی طرف روانہ ہو گیا۔

گوٹھ پہنچتے ہی وہ افراد جن کی نشان دہی پر یہ یہاں تک آئے تھے، وہ ادھر ادھر خاموشی سے کھسک گئے۔ انسپکٹر مہرولی نے البتہ ان سے مقتولین کے ورثا کے ٹھکانوں کا پتا کر لیا تھا۔ چنانچہ انسپکٹر مہرولی اپنے سپاہیوں کے ساتھ مومل نامی مقتول لڑکی کے گھر پہنچا۔ گھر کیا تھا، جھونپڑ نما سا سر چھپانے کا ٹھکانا تھا۔ دن نکلا ہوا تھا، تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ انسپکٹر مہرولی جیپ سے اترا چھپر سا شکستہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک کمزور سا بڈھا برآمد ہوا۔ اس نے صرف تہبند باندھ رکھی تھی۔ پولیس والوں کو اپنے دروازے پر دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

''محمد رمضان تمہارا نام ہے؟'' انسپکٹر مہرولی نے پوچھا۔

''جج... جج... جی صاحب! میں ہی محمد رمضان ہوں، کھیریت ہے؟'' اس نے لرزیدہ سی آواز میں کہا۔

''مومل نام کی چھوکری تمہاری بیٹی ہے؟'' انسپکٹر ولی کی بات پر رمضان کے چہرے پر خوف کے سائے امڈ آئے اور ساتھ ہی اس کے چشم تصور میں وڈیرے رئیس خان اور اس کے بے رحم کارپرداز یار محمد عرف یارو کے چہرے گھوم گئے۔

''نن... نن... نہیں... مم... میری کوئی بیٹی نہیں... میں تو برسوں سے اکیلا ہوں، میری کوئی اولاد نہیں ہے۔'' وہ لرزتے لہجے میں بولا۔ انسپکٹر ولی نے بہ غور اس کی کیفیات کا جائزہ لیا۔ وہ اسے کسی انجانے خوف میں جکڑا ہوا محسوس ہوا۔ چنانچہ وہ ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔

''دیکھو بابا! مومل نام کی ایک جوان لڑکی کی ہمیں لاش ملی ہے، نور واہ کینال میں، تمہارے گوٹھ کے لوگوں سے ہم نے لاش کی شناخت کروالی ہے۔ انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ مومل تمہاری بیٹی ہے ہم اب جاننا چاہتے ہیں کہ کیا یہ کوئی حادثہ تھا یا کسی نے تمہاری بیٹی کو قتل کرنے کی نیت سے کینال میں دھکا دیا تھا جبکہ اس کے ساتھ ایک اور لڑکے کی بھی لاش ملی ہے اس کا نام ارباب ہے اور وہ احمد بخش نامی ہاری کا بیٹا ہے۔''

یہ سن کر بوڑھے محمد رمضان کی حالت مزید غیر ہو گئی۔ اس کے کھریوں بھرے چہرے پر خوف کے سائے گہرے ہو گئے جبکہ بوڑھی آنکھوں میں نمی جھلکنے لگی۔ وہ بے چارہ اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر رو پڑا۔ ''نہیں سائیں! میری کوئی بیٹی نہیں۔ آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے میری کوئی بیٹی نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ روتے ہوئے اندر چلا گیا اور چارپائی پر بیٹھ کر چہرہ ہاتھوں میں چھپائے زار و قطار رونے لگا... ساتھ ہی پُرسوز آواز میں کہتا بھی جاتا۔ ''میری کوئی بیٹی نہیں، میری کوئی بیٹی... میری بچی مومل! مم... مجھے معاف کر دینا... مجھے معاف کر دینا...''

ایک تنگ و تاریک کوٹری سے عمر رسیدہ عورت برآمد ہوئی۔ رنگ سانولا تھا۔ صحت کمزور تھی، اور... چہرہ بھی غمگین تھا۔ وہ رمضان کی بیوی تھی۔ وہ اسے سنبھالنے لگی۔

انسپکٹر ولی ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ وہاں سے سیدھا وہ ہاری احمد بخش کے گھر پہنچا۔ احمد بخش بھی ایک ضعیف سا شخص تھا۔ اس کی بیوی تھی اور ایک جوان بیٹی تھی۔ جس کا نام سمانہ تھا۔ جب انسپکٹر ولی نے اسے اس کے بیٹے ارباب علی کے بارے میں بتایا تو اس کی بھی وہی کیفیت ہو گئی جو محمد رمضان کی ہوئی تھی۔ اس نے بھی اس بات سے انکار کر دیا کہ ارباب نامی لڑکا اس کا بیٹا تھا۔

''صاحب! میری تو بس ایک یہی بیٹی ہے، سمانہ۔'' احمد بخش نے ماں کے ساتھ کھڑی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ انسپکٹر ولی نے دونوں ماں بیٹی کی طرف دیکھا۔ ماں کا چہرہ غمناک ہو رہا تھا جبکہ بیٹی سمانہ کے چہرے پر دکھ کے علاوہ تند تاثرات کی آمیزش بھی تھی، یوں لگتا جیسے وہ اندر سے ایک پُرجوش کیفیت سے دوچار ہو۔ سمانہ کی عمر کا اندازہ انسپکٹر ولی نے بیس بائیس ... کے درمیان لگایا تھا وہ ایک دبلی پتلی اور خوش شکل لڑکی تھی، سرو قد تھی اور رنگ گورا تھا۔

انسپکٹر ولی ایک ذہین پولیس آفیسر تھا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا، یہ لوگ کسی انجانے خوف کی لپیٹ میں ہیں، ایک ایسا انجانا خوف جو انہیں منہ کھولنے سے روکے ہوئے تھا، حتیٰ کہ اپنے لختِ جگر کی اذیت ناک موت کا سن کر بھی یہ لوگ ماسوائے گھٹی گھٹی سسکیاں لینے کے اس بات سے انکاری تھے کہ ارباب ان کی اولاد تھا۔ وہ سوچنے لگا آخر ایسا کون سا ''ہوا'' تھا جس نے انہیں منہ کھولنے سے قاصر کر رکھا تھا۔

''تم لوگ بے حس ماں باپ ہو جو اپنے ہی بچوں کی غیرت ناک موت کا سن کر بھی پتھر دل بن گئے ہو۔'' بالآخر انسپکٹر ولی نے ان پر برہم ہو کے کہا۔ ''صاف لگتا ہے کہ مومل اور ارباب کو کسی نے قتل کرنے کے ارادے سے نہر میں ڈبویا ہے اور تم سب لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ قاتل کون ہے؟ لیکن... تم...''

''انسپکٹر صاحب!'' معاً قریب کھڑی سمانہ نے اس کی بات کاٹ کر اسے سپاٹ لہجے میں مخاطب کیا۔ انسپکٹر ولی قدرے چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا..... وہ جوش میں چند قدم چل کے اس کے قریب آ کے بولی۔

''اگر آپ کو قاتلوں کے بارے میں معلوم ہو جائے تو کیا آپ ان کو گرفتار کر لیں گے؟ انہیں قانون کی زنجیروں میں جکڑ سکیں گے؟ اگر آپ مجھ سے وعدہ کریں تو میں آپ کو ساری حقیقت سے آگاہ کر دوں گی۔''

انسپکٹر ولی کو گوٹھ کی اس بظاہر سیدھی سادی لڑکی سے اس طرح بولنے کی جرأت کی توقع نہ تھی لیکن اس کے لہجے کے جوش اور آواز کے تموج سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت کچھ جانتی ہے۔

انسپکٹر ولی ایک تیس سالہ خوبرو اور صحت مند شخص تھا۔ وہ عام روایتی پولیس افسروں کی طرح نہ سہل پسند تھا اور نہ ہی ''راتب خوار'' وہ ایک دیانت دار، فرض شناس اور دلیر شخص تھا۔ اس نے سنجیدہ نظروں سے سمانہ کے چہرے کی طرف دیکھا اور اٹل لہجے میں بولا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''سمانہ۔'' لڑکی نے بتایا۔

''دیکھو سمانہ! میں صرف اللہ پر یقین رکھتا ہوں اور اس سے ڈرتا ہوں، جب میں نے یہ وردی پہنی تھی تو مجھے احساس ہو گیا تھا کہ اب میں ایک ایسی راہ پر چل نکلا ہوں جن میں کانٹے بھی ہیں اور کھٹنائیاں بھی... اگر میں اس راہ پُرخار کا احساس کرنے کے بعد چاہتا تو وردی اتار کے پھینک سکتا تھا یا پھر سمجھوتا کر کے غلط راہ چن لیتا جہاں سے بن بھی برستا ہے اور سہل پسندی بھی ملتی لیکن میں نے عزم کر لیا تھا قانون کے سر کو کسی کے آگے جھکنے نہیں دوں گا۔ میرا خیال ہے اب تمہیں اطمینان ہو گیا ہو گا کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اب تم مجھے بلا خوف و خطر حقیقت بتا سکتی ہو۔'' انسپکٹر ولی سمانہ سے اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

سمانہ نے ایک عجیب سی نگاہ اس بھرپور نوجوان پر ڈالی اور اسے احساس ہونے لگا کہ واقعی وہ کسی روایتی پولیس افسر کے سامنے نہیں بلکہ ایک باعزم سپاہی کے سامنے کھڑی ہے جس نے پولیس کی وردی محض تنخواہ یا رشوت بٹورنے کے لیے نہیں، مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے پہنی ہے۔ اتنی وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اس کا بوڑھا باپ احمد بخش بیٹی کی طرف لپکا اور برہمی سے بولا۔

''چ... چھوکری! تیرا دماغ تو ٹھیک ہے، کیا تو نہیں جانتی تیرے منہ کھولنے سے ہم سب کتنی بڑی مصیبت کا شکار ہو جائیں گے؟ کیا تو چاہتی ہے کہ ہمارا بھی حشر مومل اور ارباب جیسا ہو؟'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ انسپکٹر ولی کی طرف بڑھا اور اس کے آگے ہاتھ جوڑ کے بے چارگی سے بولا۔ ''سائیں انسپکٹر صاحب! ہمیں کسی سے کوئی شکایت نہیں، ہم جیسے ہیں اپنی زندگی میں، اپنی دنیا میں بہت خوش ہیں۔ آپ جاؤ۔''

''بابا! میں اپنے بھائی ارباب کا بے گناہ خون رائگاں نہیں جانے دوں گی۔ تم جیسے لوگوں نے ہی ظالموں اور جابروں کے حوصلے بڑھا رکھے ہیں۔ میں انسپکٹر صاحب کو آج کل کے ساری حقیقت بتا دوں گی۔'' سمانہ نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ پھر انسپکٹر ولی کو صراحت سے تمام واقعات بیان کرنے لگی۔

''انسپکٹر صاحب! ہمارے گوٹھ میں ایک مطلق العنان انسان کی حکومت ہے جو خود کو زمینی خدا سمجھتا ہے۔ اپنی مرضی کے حکم لوگوں پر مسلط کرتا ہے اور جو ذرا بھی اس کے حکم یا اس کے خود ساختہ فیصلوں سے روگردانی کرتا ہے، وہ اپنے کالے قانون سے انہیں عبرت ناک موت کی سزا سناتا ہے، پھر اس کا شیطانی ٹولہ حرکت میں آ جاتا ہے۔

''میرا بھائی ارباب علی ایک سیدھا سادہ مگر باغیرت انسان تھا۔ اس کی مومل نامی ایک لڑکی سے شادی ہوئی تھی جو وڈیرے رئیس خان کی حویلی ''گورکھ ہاؤس'' میں ملازمہ تھی۔ شادی کے بعد میرے بھائی یعنی اس کے شوہر ارباب نے وہ نوکری چھڑوا دی، کسی نے وڈیرے کے کان بھر دیے۔ وڈیرے نے مومل کو حکم دیا کہ وہ پہلے ہماری گورکھ ہاؤس کی ملازمہ ہے بعد میں ارباب علی کی بیوی مگر میرے بھائی ارباب کو یہ گوارا نہ تھا، بالآخر ہمارے سمجھانے بجھانے پر کہ یہ ایسی کوئی بڑی بات نہیں جس پر وڈیرے کی ناراضی مول لی جائے، تاچار ہماری خاطر بھائی ارباب علی مان گیا لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوئی۔ یار محمد عرف یارو نامی جو وڈیرے رئیس کا خاص آدمی ہے اور اس کے شیطانی ٹولے کا سرغنہ بھی وہ مومل کے ساتھ بدتمیزیاں کرنے لگا، یہ بات کوئی بھی غیرت مند انسان برداشت نہیں کر سکتا اور پھر میرا بھائی باغیرت ہونے کے ساتھ جوشیلی طبیعت بھی رکھتا تھا اس نے مومل کو حویلی جانے سے ہمیشہ کے لیے روک دیا اور وڈیرے سے یارو کی شکایت کر ڈالی مگر وڈیرا رئیس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی، الٹا ارباب علی کو ہی اپنی اوطاق سے بے عزت کر کے نکال دیا، پھر ارباب نے مومل کو دوبارہ حویلی نہیں بھیجا۔ تب وڈیرے کا حکم جاری ہو گیا۔ ارباب اور مومل کو سزا دینے کا، یوں ظالم و مظلوم کی کہانی کا آغاز ہوا۔ یہ خون رنگ تماشا خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ گوٹھ کے کسی فرد میں

www.kahopakistan.com

اتنی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ وڈیرے کے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا۔ اس کے خونخوار کتوں جیسے حواری کو روکتا۔ میں اپنے بھائی اور بھابی موتل کا نہر پر تماشا دیکھنے نہیں گئی تھی بلکہ میری کوشش تھی کہ مجھے کوئی ایسا موقع مل جائے کہ میں ان دونوں بدنصیبوں کی مدد کرسکوں اور اس کے ساتھ مجھے اس بات کا بھی ڈر تھا کہ کہیں ان خونی بھیڑیا نما انسانوں کی مجھ پر نظر نہ پڑ جائے لیکن مجھے افسوس ہوا کہ میں اپنے بھائی ارباب اور بھابی موتل کی مدد نہ کرسکی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ہم کم مایہ لوگوں کی زندگی کتنی بے بس اور مجبور ہے، ہم ظلم کی چکی میں پیس دیے جاتے ہیں اور کوئی ہمارا پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ یقین کریں انسپکٹر صاحب! مجھے اس قدر مایوسیوں نے گھیر لیا کہ جی چاہتا ہے میں بھی اسی نہر میں چھلانگ لگا کے جان دے دوں۔''

سامنہ اتنا بتا کر خاموش ہوگئی، اس کا لہجہ رندھ گیا تھا، آنکھیں اشکبار تھیں، نازک سا وجود شدتِ غم سے مرتعش تھا۔ انسپکٹر ولی نے یہ دردناک داستان بڑے غور سے سنی تھی۔ وہ سامنہ کی جرأت سے بھی متاثر ہوا تھا۔

''اب مجھے بتایئے انسپکٹر صاحب!'' سامنہ نے اپنے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنے کے بعد کہا۔

''کیا اب آپ اس جابر شخص وڈیرے رئیس خان کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کی ہمت کرسکتے ہیں؟ اسے قانون کی گرفت میں لینے کا حوصلہ کرسکتے ہیں؟ شاید نہیں۔'' اس کا لہجہ آخر میں طنزیہ اور تلخ ہوگیا۔

''آپ تو شاید اس کے شیطانی ٹولے کے ایک حواری کو بھی گرفتار نہیں کرسکتے۔ وڈیرا تو دور کی بات ہے۔'' انسپکٹر ولی کو پُرسوچ خاموشی میں پاکے سامنہ نے آخر میں کہا۔

انسپکٹر ولی نے سامنہ کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے اس سے وڈیرے کے شیطانی ٹولے کے بارے میں مزید تفصیل پوچھی اور پھر رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

شام کی جھلملاہٹ گورکھ ہاؤس کے در و بام پر اترنے لگی تھی۔ دور مغرب میں سورج ابھی پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا۔ ماروی اپنے کمرے میں موجود تھی اور منتظر تھی کہ کب باہر شور کی آواز ابھرتی ہے تاہم وہ خود بھی بار بار دریچے... سے نیچے دیکھ لیتی تھی مگر وہاں کوئی ذی نفس نظر نہیں آرہا تھا۔ ماروی کو گمان ہو رہا تھا کہ کادو شاید وقتی جوش سے اپنی بہادری کے جوہر دکھانے کا وعدہ اس سے کر گیا ہے مگر بعد میں اس نے ٹھنڈے دل و دماغ سے یہ بات سوچی ہوگی کہ وہ دیدہ و دانستہ خود کو موت کے منہ میں دھکیل کر زندگی کی بہت بڑی بے وقوفی کرے گا۔

دوسرے کمرے میں جمال خان بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ جب اس کا نشہ سر چڑھنے لگتا تو اس کی سماعتوں میں کسی کے ہاتھوں کی خوب صورت کلائیوں میں پڑی چوڑیوں کی چھن... چھن سنائی دیتی تھی۔ کسی نوخیز دلہن کے چنبیلی گجروں کی خوشبو میں، اس کے پُرشباب بدن کی مدہوش کر دینے والی مہک بھی شامل ہوتی، پھر اس کی چشمِ خیال میں سوہنی کا خوب صورت گلابی چہرہ رقص کرنے لگتا، یوں تو یہ شیطانی خیال ہر وقت اس کی نیت میں فتور کی طرح جاگزیں رہتا تھا مگر نشے کی حالت میں وہ سوہنی کے تصور سے پاگل ہو جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سوہنی اس کے سوتیلے بھائی شہزادہ خان کی نو بیاہتا بیوی ہے اور اس ناتے وہ اپنی بھابی پر گندی نظر رکھے ہوئے تھا لیکن وہ شہزادہ خان کو اپنا بھائی تو درکنار سوتیلا بھائی بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اسے جانے کس بات کا اس سے حسد رہتا تھا اور پھر جب شہزادہ خان کی شادی سوہنی جیسی حسین و جمیل لڑکی سے ہوئی تو یہ حسد ایک ہر لمحے سلگتی رہنے والی آگ بن گیا۔

وہ اپنی بھابی سوہنی پر گندی نگاہ کیوں رکھے ہوئے تھا؟ اس کی وجہ تھی۔ پہلی وجہ تو وہ احساسِ کمتری تھا جب بدطینت اور صفتِ ابلیس، جمال خان، شہزادہ خان کی بیوی سوہنی کا اپنی بیوی کے ساتھ موازنہ کرتا تو بھائی کے خلاف اس کے دل میں حسد کی آگ مزید بھڑک اٹھتی اس لیے کہ سوہنی کے مقابلے میں اس کی اپنی بیوی بالکل الٹ تھی۔ اس کا نام ریشماں تھا۔ اس سے اس کی شادی کو پانچ برس ہو چکے تھے اس سے تین بچے ہوئے تھے، ایک پیدا ہوتے ہی فوت ہو گیا جبکہ دو بچوں میں سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ ریشماں قبول صورت تھی مگر صحت مند تو شروع سے ہی تھی اب وہ موٹی اور بھدی ہوگئی تھی آرام طلبی نے اسے مزید چربیلا بنا دیا تھا، رنگ بھی سانولا تھا پھر عمر میں بھی وہ سوہنی سے بڑی تھی مگر ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔

دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ سوہنی ایک عام ہاری کی اکلوتی بیٹی تھی۔ حسین و جمیل اور کم عمر تو وہ تھی ہی مگر بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ شہزادہ خان نے اس سے محبت کی شادی کی تھی۔ ذات اور قوم ایک ہی تھی اس لیے کسی کو اس شادی پر اعتراض نہ تھا پھر اس میں شہزادہ خان کی ضد کا بھی دخل تھا جبکہ جمال خان یہ سوچ سوچ کر خود کو کوستا تھا کہ آخر سوہنی جیسی حسین اور وہ بھی ایک غریب ہاری کی بیٹی اس کے

پُرہوس شکنجے سے کس طرح بچ گئی۔

چنانچہ اب وہ اس شیطانی خیال کی منصوبہ بندی میں مصروف رہتا تھا کہ کسی طرح وہ سوہنی کے تروتازہ، پُرشباب... بدن کو کھلونا بنائے۔

شکرخورے کو شکر مل ہی جاتی ہے کہ مصداق اسے اگلے دن یہ سنہری موقع ہاتھ لگتا محسوس ہوا۔ اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھل پڑا۔ باپ نے جمال خان کو شہر کا ایک کام کرنے کو دیا۔ دو ٹریکٹر ٹرالیوں سمیت خریدنے تھے، اس کے علاوہ وہ پچاس من کھاد بھی خریدنا تھی، جمال خان نے اپنی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنالیا اور رک گیا اور شہزادہ خان کو چند خدمت گاروں کے ساتھ شہر جانا پڑ گیا۔ گوٹھ کرم پور سے شہر بہت دور تھا اور جو کام شہزادہ خان کو سونپا گیا تھا، وہ ایک دن کا متقاضی ضرور تھا اور پھر وہاں وڈیرے کی ایک رائس مل اور دوسری فلور مل تھی۔ رہائش گاہ بھی اپنی تھی، جہاں ایک دو روز شہزادہ خان کو قیام کرنا ہی پڑتا۔ چنانچہ اس رات ایک بھیڑیے کو اپنا دانت گڑونے کا موقع ہاتھ آہی گیا۔ اس روز رات بھی بہت کالی تھی، آخری راتوں کا چاند بھی دور کہیں چھپا ہوا تھا، آسمان پر بھی بادل تھے اور ہلکے ہلکے گرج رہے تھے، موسم کے تیور دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ کسی پل بارش ہونے والی ہے۔

رات کے کسی پہر بدلیوں سے بھرا آسمان بادلوں سے گرجنے لگا۔

جمال خان نے شراب کا خالی گلاس تپائی پر رکھا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آج اس کا چہرہ بہت ہی مکروہ نظر آرہا تھا، اس کی نشے میں ڈوبی ہوئی آنکھوں اور پھٹکار برستے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس پر آج شیطان پوری طرح حاوی ہو چکا ہے۔ وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا اور اپنے بھائی شہزادہ خان کے کمرے کی طرف دھیرے دھیرے قدم بڑھانے لگا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال ابھرا تھا کہ اپنی بھابی سے منہ کالا کرنے کے بعد کیا ہوگا؟ سوہنی اپنی عزت لٹانے کے بعد شہزادہ خان سے اس کی شکایت کر سکتی ہے، مگر جمال خان کو پورا یقین تھا کہ باپ کے ہوتے ہوئے اس کا بھائی شہزادہ خان اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ باپ کی نظر میں سب سے زیادہ ''فرماں بردار'' اور ''منظورِ نظر'' بیٹا جمال خان ہی تھا۔ جمال خان نے سوچ رکھا تھا کہ یہ گھناؤنا کام کرنے کے بعد صاف مکر جائے گا۔ لہٰذا باپ بھی اسی کی حمایت کرے گا۔ انہی باتوں نے اس کی ہمت بڑھا دی تھی۔

وہ شہزادہ خان کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رکا۔ باہر طوفانِ باد و باراں کا شور جاری تھا۔ سارے کمروں کے دروازے بند تھے اور سب خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔

جمال خان نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ سوہنی اندر تنہا مسہری پر لیٹی ہوئی تھی۔ اسے اپنے شوہر شہزادہ خان سے بہت محبت تھی۔ اس کے بغیر اسے ایک پل کے لیے بھی چین نہیں آتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ نیند اب بھی اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جیسے ہی اس نے دروازے پر دستک کی آواز سنی، وہ یک دم کھل اٹھی، پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی ابھرا تھا کہ دروازے پر اس کا شوہر شہزادہ خان ہی ہو سکتا ہے۔ یوں بھی وہ سیدھے سادے ذہن کی معصوم سی لڑکی تھی۔ کالی دنیا کے شیطانی چلتر سے ناواقف تھی۔ اس نے جھٹ سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور سامنے اپنے شوہر کے بجائے جیٹھ جمال خان کو نشے میں دھت دیکھ کر ایک اندیشہ ناک خیال سے اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑک اٹھا۔

گورکھ ہاؤس کے آسمان پر بجلی کا زوردار کڑاکا ہوا۔ بادلوں کی خوفناک گڑگڑاہٹ ابھری۔۔۔ گورکھ ہاؤس کا بلند و بالا اور بارش سے بھیگا ہوا اسرار بھرا ہیولا روشنی میں نہا گیا۔

''کان کھول کے ایک بات میری سن لے، اگر تو نے کسی سے آج کی رات کا ذکر بھی کیا تو سب سے پہلے تیرے غریب بوڑھے ماں باپ کا گھر آگ کی نذر کر دیا جائے گا اور پھر یہی انجام تیرے شوہر شہزادہ خان کا بھی ہوگا، میرا ابا بھی بیگانہ ہوگا۔''

معصوم اور مجبور سوہنی کے ساتھ شیطانی کھیل کھیلنے کے بعد جمال خان اسے یہ دھمکی دے کر کمرے سے نکل گیا۔ سوہنی اپنے بکھرے وجود کے ساتھ مسہری پر پڑی سسکنے لگی۔

☆☆☆

سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسا کہ جمال خان نے سوچ رکھا تھا۔ سوہنی نے کسی سے بھی اس کی شکایت کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ جمال خان کا حوصلہ اور بلند ہوگیا۔ دو تین دن ہی گزرے تھے کہ اس کے شیطانی دماغ میں ایک بار پھر ہوس کا نشہ چڑھنا شروع ہوا۔ شکرے کے منہ کو شکار لگ چکا تھا، وہ اب پیچھے کہاں ہٹنے والا تھا... مگر اس بار جمال خان کو وہ موقع نہیں مل پارہا تھا جس کا وہ متمنی تھا۔ وہ سوہنی کے قرب کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ تب اچانک اس کے ذہن میں پہلی بار ایک سفاک خیال ابھرا۔ خیال کیا اس کے ذہن میں آیا

www.kahopakistan.com

کہ وہ ایک پورے منصوبے کی شکل اختیار کر گیا۔

جمال خان کے خیال کے مطابق یہ منصوبہ بہت سیدھا سادہ اور سود مند تھا۔ اس نے اپنے بھائی شہزادہ خان کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا تھا، شوہر کے مرنے کے بعد سوہنی بیوہ ہو جاتی، پھر یا تو دستور کے مطابق اسے جمال خان کی بیوی بنا دیا جاتا یا پھر وہ ساری عمر بیوگی کا لبادہ اوڑھے، گورکھ ہاؤس کی حویلی میں ہی گزار دیتی اس لیے کہ گورکھ ہاؤس کا دستور یہی تھا۔

یہ خیال آتے ہی مکار جمال خان نے گورکھ ہل کی پہاڑیوں میں شکار کا پروگرام بنایا اور اپنے بھائی شہزادہ خان کو دعوت دی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جمال خان نے اپنے سوتیلے بھائی شہزادہ خان کو بھی اپنے ساتھ شکار کھیلنے کی دعوت دی تھی ورنہ تو کہاں جمال خان، اپنے بھائی شہزادہ خان کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتا تھا اور اس بات پر یقیناً شہزادہ خان کو بھی اچنبھا ہوا، تاہم وہ راضی ہو گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا بدطینت بھائی جمال خان کس کا ''شکار'' کرنا چاہتا ہے۔

بغیر ہڈ والی جیپ میں دونوں بھائی سوار ہوئے اور گورکھ ہل کی پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے ہمراہ اور کوئی نہ تھا، چالاک اور بدطینت جمال خان نے کسی اور کو دانستہ ساتھ نہیں لیا تھا۔ وہ اپنے سفاک منصوبے میں کسی کو بھی حصے دار نہیں بنانا چاہتا تھا۔

اس نے یہ تک کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ شکار پر جا رہا ہے اور وہ بھی اپنے بھائی شہزادہ خان کے ساتھ۔ ہاں اتنا ضرور کیا تھا کہ اس نے چند ایک خدمت گاروں سے اپنے بارے میں تو یہ کہہ دیا تھا کہ وہ اکیلا ضروری کام سے شہر جا رہا ہے اور جلد لوٹ آئے گا جبکہ شہزادہ خان کے بارے میں یہ بتا دیا کہ وہ فارم کی طرف نکل گیا ہے۔

جیپ جمال خان ہی ڈرائیو کر رہا تھا اور شہزادہ خان اس کے برابر والی سیٹ پر خاموش بیٹھا تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں ڈبل بیرل شاٹ گنیں تھیں جبکہ جمال خان کے بغلی ہولسٹر میں بھرا ہوا ریوالور بھی موجود تھا۔

گوٹھ کرم پور سے گورکھ ہل کا فاصلہ محض چار پانچ کلو میٹر تھا اور یہاں سرخ چونچوں والی مرغابیاں بہ کثرت پائی جاتی تھیں جو قریب بہتے سندھ دریا سے ادھر کا رخ کرتیں۔ گورکھ ہل دادو، سہون کا معروف گنجان پہاڑی علاقہ تھا، جو پُرفضا ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین شکارگاہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

جیپ خاصی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ رہی تھی اور پھر ایک مقام پر جمال خان نے جیپ کو دائیں جانب کچے میں اتار لیا۔

جیپ اب ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ شہزادہ خان اردگرد نظریں دوڑانے میں مصروف تھا۔ شاید شکار تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ ''شکار'' تو وہ خود ہے اور شکاری اس کا اپنا بھائی جمال خان جو اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔

ایک ویران مقام پر جمال خان نے جیپ روک دی اور دونوں بھائی نیچے اتر آئے۔

''لگتا ہے ہمیں ذرا اور آگے جانا پڑے گا یہاں تو ایک چڑیا کا بچہ بھی نظر نہیں آ رہا۔'' شہزادہ خان نے اپنی بندوق ہاتھ میں پکڑے ہوئے..... قریب کی سرسبز پہاڑیوں پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ان کے بائیں جانب گہری گھاٹیاں اور اندھی کھائیاں ہیں جبکہ دائیں جانب کی زمین سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔

''ہمیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے شہزادہ خان! شکار تو میرے سامنے ہے۔'' جمال خان نے تمسخر خیز لہجے میں کہا اور اپنی بندوق کی نال کا رخ شہزادہ کے سینے کی طرف کر کے لبلبی دبا دی۔

فضا میں ہلکی ''ٹرچ'' کی آواز برآمد ہوئی۔ جمال خان بوکھلا سا گیا۔ اس نے نہایت پھرتی سے بندوق ایک طرف پھینک دی اور اپنے بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکال کے شہزادہ خان پر فائر کیا مگر وہ بھی چل کے نہ دیا۔

شہزادہ خان کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ ابھری اور اس نے اپنی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال کے دو بڑے کارتوس اور گولیوں سے بھری مٹھی حیران پریشان جمال خان کی آنکھوں کے سامنے کھول کر زمین پر گرا دیں اور پھر اپنی بندوق اس کے سینے پر تان لی۔

''تم خود کو بہت چالاک سمجھتے تھے، ہے نا...؟''

شہزادہ خان نے اس کی طرف دیکھ کر زہرناک لہجے میں کہا۔

''تم انتہائی خبیث، بے ضمیر اور کمینے انسان ہو۔ تمہاری شیطانیت پر تو شیطان بھی منہ چھپا لے، تم نے اپنی معصوم بھائی یعنی میری بیوی سوہنی کی عزت کو کھلونا بنایا اور یہ ناپاک کھیل کھیلنے سے پہلے تمہارے ذہن میں اتنا خیال بھی نہ آیا کہ وہ تمہارے اپنے بھائی کی عزت ہے... تم ضرور حیران ہو رہے ہو گے کہ مجھے یہ سب کیسے معلوم ہوا؟ مجھے سوہنی نے سب بتا دیا تھا، تم نے اپنا منہ کالا کرنے کے بعد اسے منہ بند رکھنے کی دھمکیاں دی تھیں، تم نے سمجھا تھا سوہنی سیدھی سادی لڑکی ہے، ایک عام باری کی بیٹی، تم سے ڈر جائے گی خوف زدہ ہو جائے گی مگر تم اس کی اندر کی عورت کو بھول گئے جو سب کچھ برداشت کر لیتی ہے مگر اپنی عصمت دری کبھی برداشت نہیں کرتی، کچھ میں نے بھی اس کے چہرے سے بھانپ لیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی عزت لوٹنے والے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

''میں موقع کی تلاش میں تھا، تم نے مجھے یہ موقع آج خود فراہم کر دیا جمال خان! تم مجھے قتل کرنے کی نیت سے یہاں لائے تھے، میں جان گیا تھا تم تو مجھ سے بات تک کرنا گوارا نہیں کرتے، آج شکار کی دعوت کیسے دے رہے ہو؟ یہ بھی جانتا تھا سوہنی کی خاموشی تمہیں اور حوصلہ دے گی اور تم دوبارہ شیطانی کھیل کھیلنے کے لیے بے چین ہو جاؤ گے، میں تمہارا اس روز سے ایک ایک لمحہ چہرہ پڑھ رہا تھا کہ تم اب کیا کرتے ہو؟ کون سی چال چلتے ہو؟ لیکن اس بار تو تم نے مجھے یعنی اپنے بھائی کو ہی راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ شکار پر آنے سے کچھ ہی دیر پہلے ایک خدمت گار سے معلوم ہوا کہ تم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ تم میرے ساتھ شکار پر جا رہے ہو بلکہ یہ بتایا کہ میں فارم پر جا رہا ہوں۔ اچھا کیا اب میرا راستہ صاف ہو گیا۔ گواہی کے لیے یہ سب کافی ہے، تم شہر گئے ہوئے ہو، میں فارم گیا ہوا ہوں... اب تم مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' یہ کہہ کر شہزادہ خان نے اس پر گن تان لی۔ جمال خان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ ہاتھ جوڑ کے معافی مانگنے لگا۔

''ادا سائیں...! مجھ سے غلطی ہو گئی... م... مجھے...''

''ڈز... ڈز...''

شہزادہ کی ڈبل بیرل بندوق نے یکے بعد دیگرے دو کارتوس اگلے اور وہ آواز نکلے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ شہزادہ خان نے ایک نفرت بھری نگاہ بھائی کی لاش پر ڈالی اور پھر اس کی لاش کو گھسیٹ کر ایک گہری کھائی میں پھینک دیا۔

☆☆☆

''تم واقعی بزدل نکلے... دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔'' ماروی نے نفرت سے خدمت گار کادو کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ سر جھکا کے بولا۔

''بی بی جی! مجھے اپنا وعدہ یاد ہے، میں آپ کو پہلے روز ہی اپنی بہادری کا نظارہ دکھا سکتا تھا لیکن مجھے اس سے پہلے کچھ کام نمٹانے تھے، اب میں وہ کام نمٹا چکا ہوں، اب آپ میری بہادری کا نظارہ دیکھنے کے لیے تیار ہو جائیں۔''

''کون سے کام نمٹانا تھے تمہیں؟'' ماروی نے الجھن آمیز تاثرات سے اس کی طرف دیکھ کر دریافت کیا۔

وہ بولا۔ ''میں جانتا ہوں یارو سے لڑائی کے بعد یہ بزدل لوگ میرے خلاف انتقامی کارروائی کے طور پر سب سے پہلے میرے بوڑھے ماں باپ کو نشانہ بنائیں گے کیونکہ ان گیدڑوں کا شروع ہی سے یہ شیوہ رہا ہے۔ میں اب اپنے بوڑھے ماں باپ اور چھوٹی بہن کو کسی بہانے دوسرے گوٹھ اپنے قریبی عزیزوں کے پاس منتقل کر چکا ہوں تاکہ یہ جنگڑا صرف اور صرف مجھ تک محدود رہے۔''

اس کی بات سن کے ماروی کی ساری کلفت دور ہو گئی، دلکش ہونٹوں پر بھیدوں بھری مسکراہٹ ابھری، کنارا آنکھوں میں فخر و غرور کی چمک نمودار ہوئی وہ سوچنے لگی۔ 'یہ پکا آدمی ہے اور سچا غلام بھی۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے پھر دریا میں چھلانگ لگاتا ہے۔ گویا جوشِ قوت کے ساتھ دماغ بھی چلاتا جاتا ہے۔'

یہ کہہ کر کادو چلا گیا۔ ماروی سوچتی رہ گئی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ماروی کو باہر شور کی آواز سنائی دی۔ وہ چوکی اور لپک کر دریچے کی طرف بڑھی، آہستگی سے ایک پٹ کھولا اور اپنی دلکش آنکھوں سے اپنے حکم کے غلام کی بہادری کا نظارہ کرنے لگی، وہ یارو سے بھڑ چکا تھا۔ دونوں گتھم گتھا تھے، سب سے زیادہ غصے اور طیش میں یارو بھرا ہوا تھا، حویلی کے ایک معمولی ملازم نے اس سے بھڑنے کی کوشش کی تھی جبکہ یارو کی حویلی کے خدمت گار تو کیا اوطاق میں موجود وڈیرے کے حواری بھی اس کی عزت کرتے تھے اور ایک طرح سے اس کے تابع بھی تھے۔ ماروی نے دیکھا۔ کادو نے ایک موقع پر یارو کو اٹھا کے زمین پر پٹخ دیا۔ یارو کے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ اور منہ سے مغلظات کا طوفان ابل پڑا... یارو نے گرتے ہی کادو کی ٹانگ کھینچ لی۔ کادو بھی زمین پر آ رہا۔ یارو کا غیظ و غضب سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے ایک گھونسا کادو کے چہرے پر رسید کر دیا، کادو نے بھی جواب میں اس کے پیٹ میں ناف کے نیچے گھٹنا رسید کر دیا۔ اس دوران میں دیگر خدمت گار بھی آ گئے، ان میں یارو کے شیطانی ٹولے کے ساتھی بھی تھے۔ وہ بھی بیک وقت کادو پر پل پڑے۔ ماروی نے دریچے سے دیکھا۔ کادو بے چارے میں جتنی سکت تھی، وہ بے جگری سے تھوڑی دیر تک ان سب سے نبرد آزما رہا... بالآخر ڈھے گیا۔ اس پر لاتوں، گھونسوں کی بارش ہو گئی۔ پہلی بار کادو کو پٹتے دیکھ کر ماروی کا دل بھی

www.kahopakistan.com

پہنچ گیا۔ کچھ بھی تھا، وہ اسی کی خاطر مار کھا رہا تھا۔ اس کے حکم کی غلامی کی مار سہہ رہا تھا۔ ماروی باہر نکل آئی۔

''بند کرو یہ لڑائی... کیا شور مچایا ہوا ہے... ایک آدمی پر سب پلے پڑے ہو، گیدڑوں کی اولاد۔'' چھوٹی بی بی کو دیکھ کر سارے خدمت گار، یارو سمیت الف ہو گئے۔

''تم لوگوں کو شرم نہیں آتی، ایک کو سب مل کے مار رہے ہو؟'' ماروی غصے سے سرخ ہو رہی تھی۔ یارو نے صفائی میں کچھ کہنا چاہا... مگر ماروی نے جھڑک کے اسے خاموش کرا دیا۔ پھر اپنی حویلی کے نوکروں سے تحکمانہ انداز میں بولی۔

''کادو کو اندر لے آؤ اور اس کی مرہم پٹی کرو۔'' یہ کہہ کر وہ غصے سے پاؤں پٹخ کر اندر آ گئی۔

کادو کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ اس کے چہرے اور ناک پر چوٹیں آئی تھیں۔ اس کے سانولے صحت مند جسم پر نیل پڑے ہوئے تھے۔ ماروی اس کے پاس نہیں گئی۔

اس روز حویلی میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ دو تین روز گزرنے کے باوجود جمال خان شہر سے نہیں لوٹا تھا۔ وڈیرا رئیس خان بیٹے کی گمشدگی پر بہت ...... پریشان ہو رہا تھا۔ کیونکہ وہ اسے اپنا بازو سمجھتا تھا وہ اس کا ''ہم قدم'' بھی تھا۔ ممکن تھا کہ اس کے بعد وہی اس کا جانشین بھی بنتا۔ ''چھوٹا رئیس'' تو وہ بن ہی چکا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ جمال خان کہاں سے ملتا؟ وہ تو سرے سے شہر گیا ہی نہیں تھا وہ تو گورکھ پہاڑی کے تاریک اور اندھے گڑھے میں لاش کی صورت پڑا تھا۔ جو گڑھا اس نے اپنے شیطانی مقصد کی خاطر کسی اور کے لیے کھودا تھا، اس میں وہ خود جا گرا تھا۔ شہزادہ خان جانتا تھا کہ اول تو اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں جائے گا، گیا بھی تو اب تک جمال خان کی لاش کو مردار خور گدھ اور جنگلی جانور چٹ کر چکے ہوں گے۔

بہرحال جو بھی تھا جمال خان کی کھوج پڑ چکی تھی۔

☆☆☆

انسپکٹر ولی تھانے پہنچا۔ دس سپاہیوں کی نفری ساتھ لی اور گوٹھ کرم پور کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے مقتول ارباب علی کی بہن اور ہاری احمد بخش کی بیٹی سانمہ کا بیان لے لیا تھا اور وہی چشم دید گواہ بھی تھی۔ اسے اور اس کے گھر والوں کو کسی ممکنہ خطرے سے بچانے کے لیے ان سب کو پولیس کسٹڈی میں لے لیا گیا تھا۔ وہ گوٹھ کرم پور سے ہجرت کر کے نوروواہ آ گئے تھے جو چند کلومیٹر ہی دور تھا۔ تھانے کے قریب انہیں ایک گھر دے دیا گیا تھا۔

اوطاق کے سامنے پولیس جیپ آ کے رکی۔ انسپکٹر ولی سمیت سارے سپاہی اتر آئے۔ انسپکٹر نے اپنے ہمراہ صرف اے ایس آئی صادق سومرو کو ساتھ لیا اور اوطاق میں داخل ہوا۔ اندر وڈیرا موجود تھا، چند مسلح حواری بھی تھے۔ وڈیرا سائیں بیٹے کی گمشدگی کی وجہ سے خاصا پریشان تھا۔ انسپکٹر ولی کو دیکھتے ہی بے تابانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''بھلی کرے آیو انسپکٹر صاحب! ہم آپ ہی کی طرف آنے والے تھے۔ ہمارا بیٹا جمال خان پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ آج اسے غائب ہوئے پانچواں روز ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے انسپکٹر ولی سے معانقہ اور مصافحہ کیا اور اسے ایک موڑھے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ انسپکٹر ولی نے وہاں موجود ایک نظر وڈیروں کے مسلح حواریوں پر ڈالی انہی میں یارو بھی موجود تھا۔ اس کے چہرے پر اب تک نیل پڑے ہوئے تھے، یہ کادو سے لڑائی کے نتیجے میں پڑے تھے۔

''تمہارے چہرے پر یہ نشان کیسے ہیں؟'' انسپکٹر ولی نے سر دست وڈیرے کی بات... نظر انداز کرتے ہوئے یارو سے پوچھا۔ ساتھ ہی وہ بڑے غور سے یارو کا سر سے پاؤں تک جائزہ بھی لے رہا تھا۔ سانمہ کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق یار محمد عرف یارو کے خدوخال بتا رہے تھے کہ یہی اس کا مطلوبہ مجرم ہے جسے وہ گرفتار کرنے آیا تھا۔

''وہ جی اپنے کسی آدمی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔'' یارو بولا۔

''یار محمد عرف یارو تمہارا ہی نام ہے؟'' انسپکٹر نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں جی، میرا ہی نام ہے... خیریت؟'' یارو نے انسپکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

''ابھی معلوم ہو جاتی ہے خیریت بھی۔'' انسپکٹر ولی نے اسے گھورتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔

''اڑے بابا، انسپکٹر صاحب! آپ یہ کون سے چکروں میں پڑ گئے ہو۔ ہمارا مسئلہ تو حل کرو۔'' وڈیرے نے چبھتے ہوئے لہجے میں انسپکٹر ولی سے کہا تو انسپکٹر ولی پہلی بار بغور وڈیرے رئیس خان کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔

''آپ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا، میں اس وقت آپ کے آدمی یار محمد عرف یارو کو گرفتار کرنے آیا ہوں۔''

انسپکٹر ولی کے اس انکشاف نے اوطاق میں گویا دھماکا کر دیا۔ وڈیرے سائیں کا چہرہ یک دم غیظ سے سرخ ہو گیا اور وہ غصیلی نظروں سے انسپکٹر ولی کو گھورتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم! یارو نے کون سا جرم کیا ہے؟''

''اس کے جرم کی فہرست تو بہت طویل ہے وڈیرا سائیں۔'' انسپکٹر ولی کا لہجہ ذومعنی ہو گیا۔

''لیکن اس وقت میں اسے موہل اور ارباب کو قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کرنا چاہتا ہوں... مجھے امید ہے آپ قانون سے پورا پورا تعاون کریں گے۔''

''انسپکٹر!'' وڈیرا رئیس غیظ کے مارے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہماری جاگیر میں صرف ہمارا قانون چلتا ہے۔''

انسپکٹر ولی بھی اٹھ کھڑا ہوا اور وڈیرے کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے اسسٹنٹ صادق سومرو کو اشارہ کیا۔ وہ ہتھکڑیاں سنبھالے اپنے ساتھیوں کے ساتھ یارو کی طرف بڑھا۔ یارو پریشان نظر آنے لگا۔ وہ بار بار وڈیرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''خبردار! میرے کسی آدمی کو بھی تم نے ہاتھ لگانے کی کوشش کی۔'' وڈیرا دہاڑا۔ اس کے مسلح حواریوں نے پولیس پر اپنی گنز تان لیں۔ انسپکٹر ولی کے چہرے پر جوش کے سے تاثرات تھے مگر وہ ہوش مندی سے کام لیتے ہوئے وڈیرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''وڈیرا سائیں! قانون کے ساتھ آپ کا یہ رویہ آپ کو مہنگا پڑ سکتا ہے۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا مگر مجھے یقین ہے کہ ان حالات میں اعلیٰ حکام مجھے اسپیشل اختیارات دینے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائیں گے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے رینجرز یا آرمی کی مدد لینی پڑ جائے، پھر میں آپ سے بھی کسی قسم کی رعایت نہیں برتوں گا کیونکہ میرے پاس یارو کے جرم کا نہ صرف ٹھوس ثبوت ہے بلکہ میں چشم دید گواہ بھی رکھتا ہوں۔'' انسپکٹر ولی نے کہا اور صادق سومرو کو ہتھکڑیاں واپس رکھنے کا اشارہ دے کر چلنے کا کہا۔

''ٹھہرو انسپکٹر!'' معاً وڈیرے رئیس کی گونج دار آواز اوطاق میں ابھری۔ انسپکٹر ولی دروازے کی طرف جاتے جاتے پلٹا۔ وڈیرے رئیس کا سارا دبدبہ اور غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔

''بیٹھو بابا... بیٹھو! دراصل ہم اس وقت اپنے بیٹے کی وجہ سے خود بھی پریشان ہیں۔''

''معافی چاہتا ہوں وڈیرا سائیں! میں اب بیٹھ نہیں سکتا، مجھے آپ کا یہ آدمی چاہیے۔'' انسپکٹر ولی نے وہیں کھڑے کھڑے سنجیدہ لہجے میں کہا تو وڈیرا رئیس خان فوراً اپنی کینچلی بدل کر بولا۔

''اڑے بابا... اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ آؤ بیٹھو۔ آرام سے معاملے پر بات کرتے ہیں۔ کوئی چائے پانی، لسی شغل میلہ کرتے ہیں، کالے بھٹ تیتر آپ کو کھلاتے ہیں، ہم تو یاروں کے یار ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے کسی خدمت گار کو آواز دی۔

''اڑے او... خیرل... کدھر مر گیا؟''

''حاضر سائیں وڈا! میں ادھر ہی ہوں۔'' ایک گٹھے ہوئے جسم کا نوکر ہاتھ جوڑے قریب آ گیا۔

''اس کی ضرورت نہیں وڈیرا سائیں! میرا معدہ کمزور ہے ایسی ثقیل چیزیں ہضم نہیں کرتا۔'' انسپکٹر ولی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''کیا اب میں اپنا فرض نبھا سکتا ہوں یا خالی ہاتھ لوٹ جاؤں... دوبارہ آنے کے لیے؟'' اس نے آخر میں پوچھا۔ اس کے لہجے میں چھپی تہدید کو محسوس کر کے وڈیرا سخت جزبز ہوا۔ ایک نظر قریب کھڑے یارو پر ڈالی پھر خاموشی سے اپنے موڑھے پر براجمان ہو گیا۔ یارو کی حالت پتلی ہو رہی تھی اور وہ بار بار امید بھری نظروں سے اپنے وڈیرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ انسپکٹر ولی کھڑا سرد نظروں سے وڈیرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اوطاق میں اچانک پُراسرار خاموشی طاری ہو گئی پھر وڈیرے کی کھرکھراتی آواز گونجی۔

''انسپکٹر! تم اپنا فرض پورا کر سکتے ہو۔''

یہ سن کر انسپکٹر ولی نے فوراً اے ایس آئی صادق سومرو کو اشارہ کیا اور اس نے جھٹ آگے بڑھ کر یار محمد عرف یارو کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

☆☆☆

اندیشوں بھری رات اپنے درمیانی پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ گورکھ ہاؤس پر گہرا سکوت طاری تھا۔ ماروی اپنے کمرے میں موجود تھی۔ وہ آج پُرجوش نظر آ رہی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی یہ موقع اس کے لیے بہترین ہے۔ وہ اوطاق سے حویلی تک ساری خبریں رکھتی تھی اور یہ کام کادو بہ حسن و خوبی انجام دیا کرتا تھا۔ یوں بھی یہ ایسی باتیں یا خبریں تھیں جو کم از کم ....گورکھ ہاؤس کے مکینوں سے چھپی نہیں رہ سکتی تھیں۔ پہلی اہم خبر تو ماروی کے لیے یہ تھی کہ اس کا بھائی جمال خان کئی روز سے پُراسرار طور پر لاپتا تھا اور وہ اپنے اس بھائی سے ڈرتی بھی تھی کیونکہ ایک تو وہ غصیلی طبیعت کا.... تھا دوسرا وہ باپ سے مختلف طبیعت کا نہ تھا۔ رہا سوتیلا بھائی شہزادہ خان تو اس کی اسے پروا نہ تھی کیوں اس کی فطرت بھی اسے معلوم تھی۔ وہ اپنے بھائی جمال خان اور باپ وڈیرا رئیس سے الگ اور مختلف فطرت کا آدمی تھا، کسی معاملے میں دخل نہیں

www.kahopakistan.com

دیتا تھا، اپنی دنیا میں مگن رہتا تھا۔

دوسری اہم خبر ماروی کے لیے یہ بھی تھی کہ اس نے سنا تھا آج اوطاق میں پولیس کی گاڑی آئی تھی اور اس کے باپ کے مقرب خاص یارو کو گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ اس پر موٹل اور ارباب علی دو میاں بیوی کو بے رحمی سے نہر میں ڈبو کے ہلاک کرنے کا سنگین جرم عائد کیا گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یارو کی گرفتاری کے بعد اس کا باپ وڈیرا رئیس بھی قانون کی پکڑ میں آجاتا.... یوں ماروی کی راہیں اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لیے آسان ہو چکی تھیں۔ ان تمام باتوں کو مدنگاہ میں رکھتے ہوئے ماروی نے آج سہ پہر ہی کادو کو بلا کے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا۔ ماروی کا منصوبہ جان کر کادو پریشان بھی ہوا اور حیران بھی۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ چھوٹی بی بی اس سے کہہ کیا رہی ہیں۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں... چھوٹی بی بی؟''

''میں وہی کہہ رہی ہوں جو تم سن چکے ہو'' ماروی نے سنجیدہ لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہ بہت خطرناک ہوگا آپ کے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔'' کادو نے اسے ڈرایا۔

''لیکن میں اگر اس منحوس حویلی میں زیادہ عرصہ رہی تو یہ میرے لیے زیادہ خطرناک بات ہوگی۔'' ماروی بولی۔

''وہ کس طرح... چھوٹی بی بی؟ آپ کو بھلا یہاں کیا تکلیف ہے؟ آپ تو اس حویلی میں بہت عیش سے زندگی بسر کر رہی ہیں۔'' کادو کے لہجے میں حیرت تھی۔

''عیش کی زندگی، ہونہہ...'' ماروی نے حقارت سے کہا۔ ''یہ عیش بھری زندگی کسی وقت میرے گلے کا عمر بھر کے لیے طوق بن سکتی ہے، کیا تم میری بڑی بہن مورزادی کا انجام بھول گئے؟''

کادو خوف زدہ سا ہو گیا اور ادھر ادھر دیکھ کر لرزیدہ لہجے میں بولا۔ ''چھ... چھوٹی بی بی! مور بی بی کا نام بھی نہ لیں اگر کسی نے سن لیا تو سائیں وڈیرا ہم پر قیامت برپا کردے گا۔''

''میں اس آنے والی قیامت سے پہلے دور چلی جانا چاہتی ہوں۔'' ماروی نے اٹل لہجے میں کہا۔

''لیکن چھوٹی بی بی! ہم بھاگ کر کہاں جائیں گے؟ کون ہمیں پناہ دے گا؟ کہاں جا کے ہم رہیں گے؟ آپ نہیں جانتیں، سائیں کے حواریوں کو، بھیڑیے سے زیادہ خوں خوار ہیں۔ ایک صرف یارو ہی نہیں ہے۔''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔'' ماروی بولی۔ ''بابا سائیں کو اس وقت اپنی پڑی ہوئی ہے۔''

''یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔'' کادو بولا۔ ''سائیں کو آپ اب تک نہیں جانتی ہیں۔ وہ اس سے پہلے بھی مسائل کا شکار ہوئے ہیں۔ اس مرتبہ بھی وہ یہ مسئلہ حل کرلیں گے۔ گوٹھ سے شہر تک ان کے بڑے تعلقات ہیں اور...''

''تم میرے ساتھ چل رہے ہو یا نہیں؟'' ماروی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ کادو نے ماروی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اٹل فیصلے کا جوش بھی تھا اور کہیں دور چھپی ہوئی التجا بھی۔ جیسے کہنا چاہ رہی ہو۔ ''تم کیسے حکم کے غلام ہو میرے؟ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے اور تم پہلو تہی کر رہے ہو۔''

''کیا تم میرا حکم نہیں مانو گے؟ اپنی چھوٹی بی بی جی کا؟ کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی بڑی بہن کی طرح اس منحوس حویلی میں رہتے ہوئے اپنے ہی ارمانوں کا کفن اوڑھ لوں؟ اور پھر ایک دن مورزادی کی طرح دریچے سے چھلانگ لگا کے خودکشی کرلوں؟'' ماروی کی آواز میں اب تحکم نہیں، سسکتی ہوئی التجا تھی۔

کادو بولا۔ ''چھوٹی بی بی! آپ کا حکم سر آنکھوں پر، میں بھلا آپ کی حکم عدولی کر سکتا ہوں؟ لیکن بی بی جی! جس راستے کا آپ انتخاب کر رہی ہیں وہ اس راہ سے زیادہ پُرخار ہے۔ یہاں ضروری تو نہیں کہ آپ کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو جو بڑی بی بی جی (مورزادی) کے ساتھ ہوا؟''

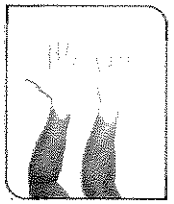

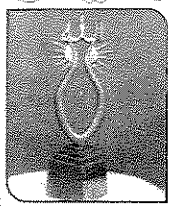

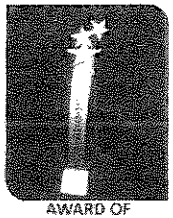

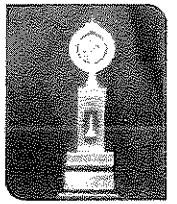

''میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا اس لیے کہ میں اس منحوس حویلی کی وہ مکین ہوں جس کے مرد جوان بیٹیوں سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ وہ ہمارے ہاتھوں میں لگنے والی مہندی سے ڈرتے ہیں۔ وہ ہمارے ہاتھوں میں رنگِ حنا نہیں ہمارے ہی ارمانوں اور آرزوؤں کا رنگِ لہو دیکھنا چاہتے ہیں۔'' ماروی کی آواز رندھنے لگی۔ کادو خاموش تھا۔ ماروی بدستور اس کی جانب دیکھ کر بولی۔ ''اگر تم میرے ساتھ نہیں چلتے تو میں تم سے ایک التجا کروں گی میرے بارے میں کسی کو نہ بتانا، میں خود اکیلی یہاں سے چلی جاتی ہوں، آگے جو میرا نصیب...'' اس کی بات پر کادو نے چونک کر ماروی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔

''ٹھیک ہے بی بی جی! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں، کسی کو نہیں بتاؤں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ ماروی کے اندر چھناکا ہوا۔ اسے کادو سے اس بات کی امید نہ تھی کہ وہ اسے بے یارو مددگار چھوڑ دے گا۔ پھر بھی اپنی تسلی

www.kahopakistan.com

کی خاطر بولی۔

''تو تم واقعی میرے ساتھ نہیں جارہے ہو؟''

''نہیں، بی بی جی! میں آپ کے ساتھ کہیں نہیں جارہا۔'' اس نے بالآخر حتمی جواب دیا۔

''تو تم میرا حکم ٹھکرا رہے ہو؟ اپنی چھوٹی بی بی جی کا؟''

ماروی کی آنکھوں میں کرب اتر آیا۔

''میں آپ کا یہ حکم نہیں مان سکتا۔'' کادو کا سر بدستور جھکا ہوا تھا۔ ماروی کو آخری وقت تک اس کے ساتھ چلنے کی امید رہی تھی۔ اس نے اپنے مختصر سامان کا ایک بڑا سا سوٹ کیس تیار کر رکھا تھا۔ وہ اس نے اٹھا لیا پھر اچانک اس کی آنکھوں میں نفرت وطیش کی چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں اور وہ اسی لہجے میں دانت پیس کر کادو سے بولی۔

''اب یہاں منہ لٹکائے کیوں کھڑے ہو... دفع ہو جاؤ میری نظروں سے۔''

کادو بغیر اس کی طرف دیکھے خاموشی سے مڑا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

''ٹھہرو۔'' ماروی نے عقب سے آواز دی۔ وہ رک کے دوبارہ اس کی طرف گھوما مگر سر نہیں اٹھایا۔ ماروی نے دانت پیس کر طنز سے کہا۔

'میرے جانے کے بعد تم ایک کام کرنا، اپنے ہاتھوں میں چوڑی پہن لینا اور میں اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ کے گورکھ ہاؤس کی حویلی کے مردوں کو مرد بن کے دکھاؤں گی جو عورتوں کو اپنی جائدادوں کی خاطر زندہ درگور کرتے آئے ہیں اب جاؤ یہاں سے۔''

کادو خاموشی سے یہ سب سن کر واپس لوٹ گیا۔ ماروی سوٹ کیس ہاتھ میں تھامے کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو چہرے کو اشکبار کر رہے تھے۔ اس کے اندر کوئی چیخا۔ 'ماروی! یہ تو کیا ہے وقوفی کر رہی ہے؟ بری گھڑی آنے سے پہلے بری گھڑی کو آواز دے رہی ہے؟ رات کے اس سے تو کہاں جائے گی؟ راہ میں آنے والے جنگلی جانوروں سے تو شاید تو بچ جائے مگر ان بھیڑیوں سے کس طرح خود کو بچائے گی جو انسان کے روپ میں تیرے حسین اور جوان وجود پر رال ٹپکاتے تجھے اپنے نرغے میں لینے کی کوشش کریں گے۔ قیامت سے پہلے قیامت کو آواز نہیں دے۔ اب بھی وقت ہے پھینک دے سوٹ کیس، رک جا، مت آگے بڑھا قدم... کوئی تیرے ساتھ بھی نہیں ہے اور جس کے ساتھ ہونے کی تجھے امید تھی، وہ بھی عین وقت پر تیرا ساتھ چھوڑ گیا۔' اس کے دل نے کہا۔ 'ماروی! اپنی تقدیر بدلنے والے ایسے سر پھرے ہی تو ہوتے ہیں اگر ان باتوں سے ڈر و گی تو ایک دن تم بھی گورھ ہاؤس کی زندہ درگور رسموں کی بھینٹ چڑھا دی جاؤ گی۔ یہی موقع ہے اپنی تقدیر بدلنے کا، تم خالی ہاتھ نہیں ہو، پندرہ سولہ لاکھ کا زیور تمہارے پاس ہے دو تین لاکھ کی نقدی ہے پھر شہر تمہارے لیے اجنبی کہاں ہے؟ تم تو آتی جاتی رہی ہو وہاں سے آگے کسی اور بڑے شہر نکل جانا، جہاں وومن ہوسٹلز کی کمی نہیں' اس کی شہر میں پڑھنے والی سہیلی نے تو یہ بھی بتایا تھا کہ بڑے شہروں میں عورتوں کو پناہ دینے کے لیے ادارے بھی ہوتے ہیں... جا نکل جا۔ ماروی اس منحوس حویلی سے بھاگ جا۔ یہاں گھٹن کے سوا کچھ نہیں۔'

ماروی اب پُرعزم نظر آنے لگی۔ اس نے سوٹ کیس پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کی اور کمرے کا دروازہ کھول کے پھر باہر نکل آئی۔ گورکھ ہاؤس خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ قدم بڑھا رہی تھی۔ باہر دور کہیں مرغ کے بانگ دینے کی آواز آرہی تھی شاید مشرق کی سمت سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ گورکھ ہاؤس سے باہر تھی۔ اس نے حویلی کے پچھلے چور دروازے کا انتخاب کیا تھا باہر نکلنے کے لیے۔

معاً اس کے سوٹ کیس والے ہاتھ پر کسی نے اپنا ہاتھ رکھ دیا اور ساتھ ہی ایک شناسا آواز ابھری۔ ''چھوٹی بی بی جی! سوٹ کیس میں اٹھا لیتا ہوں، میں بھلا آپ کو تنہا اتنا بڑا قدم کیسے اٹھانے دوں گا' میں آپ کے ساتھ ہوں۔'' ماروی نے چونک کر دیکھا۔ کادو سر جھکائے کھڑا تھا۔ سوٹ کیس اس نے سنبھال لیا۔ ماروی کے چہرے پر حیرت ابھری، پھر سنجیدہ لہجے میں شکایتاً بولی۔ ''تو پھر وہ سب ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا تم میری جرأت اور ہمت کا امتحان لے رہے تھے؟''

''نہیں چھوٹی بی بی جی۔'' وہ عجیب سے لہجے میں کہنے لگا۔

''میں جانتا ہوں آپ بہت ہمت والی ہیں لیکن میں اپنے ضمیر کا قیدی نہیں بننا چاہتا تھا۔ آپ جب حویلی کے اندر تھیں تو میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ آپ کو یہ غلط قدم اٹھانے کا مشورہ دینا میرے فرض میں شامل نہیں تھا، اس لیے اندر میں نے آپ کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا لیکن اب آپ خود اپنی مرضی سے حویلی سے باہر قدم نکال چکی ہیں تو اس میں بھی میری مرضی یا میرے ساتھ دینے کا دخل نہیں ہے مگر اس سے آگے میرا فرض بنتا ہے کہ میں آپ کا اس وقت تک ساتھ دوں جب تک آپ کو میری ضرورت ہے، میں آپ کے تحفظ کی خاطر اپنی جان تک لڑا دوں گا اگر خدانخواستہ کہیں میں ایسا نہ کر پایا اور اللہ سائیں نہ کرے آپ کو کوئی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا تو اس کا دکھ اپنی جگہ، لیکن میرا ضمیر مجھے یہ ملامت تو نہیں کرے گا کہ آپ نے اس غلط راہ کا انتخاب میرے ساتھ دینے کی حوصلہ افزائی پر اختیار کیا تھا۔ اس لیے میں آپ کے کمرے سے نہیں بلکہ حویلی سے باہر آکر آپ کا انتظار کر رہا تھا کہ شاید میرے ساتھ نہ دینے کی حوصلہ شکنی سے آپ اپنا ارادہ بدل لیں۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو میں باہر موجود ہوں۔'' کادو بہت دھیمے لہجے میں، ٹھہر ٹھہر کر ماروی کو تمام صورتِ حال بتا کے خاموش ہو گیا۔

ماروی اس کی بات سن کر ششدر رہ گئی۔ زندگی کے اس عجیب موڑ پر کادو جیسے عام خدمت گار کا یہ انوکھا فلسفہ بہت آسان اور سمجھ میں آنے والا تھا۔ آج اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ نہ صرف مضبوط بازو رکھتا ہے بلکہ مضبوط ذہن اور شعور بھی رکھتا ہے۔

ماروی کے لبوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی پھر دونوں آگے بڑھے کہ سامنے ایک بیل گاڑی موجود تھی جو خالی تھی۔ ماروی نے اپنے گرد اچھی طرح چادر لپیٹ لی تھی۔ دونوں بیل گاڑی میں سوار ہوئے، کادو نے چابک لہرا کے بیلوں کی پیٹھ پر مار کے انہیں متحرک کیا تو وہ آگے بڑھنے لگے۔ دور مشرق کی سمت سویرا پھوٹ رہا تھا۔

☆☆☆

''یہی تھا وہ ظالم انسپکٹر صاحب! میں اس بھیڑیے کو کیسے بھول سکتی ہوں۔'' سمانہ نے ہتھکڑی میں جکڑے یارو کو دیکھتے ہی اشارہ کیا اور یارو اسے خوفناک نظروں سے گھورنے لگا۔

تھانے لاتے ہی انسپکٹر ولی نے یارو کی مکمل شناخت کے لیے ایک سپاہی کو بھیج کر سمانہ کو بلوا لیا تھا۔ تصدیق کر لینے کے بعد سمانہ کو واپس گھر بھیج دیا گیا۔ انسپکٹر ولی نے اپنے ایک ہاتھ میں پکڑے ہوئے سیاہ رول کو دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹھپکتے ہوئے یارو کی طرف گھور کے کہا۔

''یہ ظلم تم نے کیوں اور کس کے کہنے پر کیا تھا؟''

''میں نے کسی کے کہنے پر کوئی ظلم نہیں کیا ہے انسپکٹر صاحب!'' یارو نے ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ بولا۔ انسپکٹر ولی کو اس سے اسی جھوٹ کی توقع تھی۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر چند قدم چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سیاہ رول کو اس کی ٹھوڑی پر ٹکا کے چہرہ اوپر کیا اور پُرتپش لہجے میں بولا۔

''میں ذرا اور ٹائپ کا پولیس والا ہوں، پہلے تو یہ بات تم جان لو۔ دوسرے یہ کہ جس کی ''راتب نوازی'' کا تمہیں غرور ہے، میری گرفت سے تمہیں وہ بھی نہیں چھڑا سکے گا۔''

''یہ تمہاری خام خیالی ہے انسپکٹر۔'' یارو نے گھمنڈ سے کہا اور سر جھٹک کے اپنی ٹھوڑی پر ٹکا انسپکٹر ولی کا سیاہ رول ہٹا دیا۔ اس کی اس حرکت اور ڈھٹائی پر انسپکٹر ولی کو بھی غصہ آگیا، اس نے پُرغیظ انداز میں وہی سیاہ رول بڑے زور سے یارو کے پیٹ میں گھونپا۔ تکلیف کی شدت سے یارو کے حلق سے 'اوغ' کی آواز برآمد ہوئی اور وہ رکوع کے مل جھکتا چلا گیا۔ انسپکٹر ولی نے ہونٹ بھینچ کر اپنی دائیں ٹانگ کا گھٹنا اس کے جھکے ہوئے چہرے پر مار دیا۔ وہ عقب میں الٹ گیا اور فرش پر گر پڑا۔ انسپکٹر ولی نے آگے بڑھ کر اپنا دایاں پیر اس کی گردن پر رکھ کے دبایا تو یارو کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں برآمد ہونے لگیں۔

''میں تم جیسے ہڈی خور کتوں کی گردن دبوچنے اور انہیں خاک چٹانا جانتا ہوں، ذلیل انسان! تو نے ان دونوں معصوموں کی بڑی بے رحمی سے جان لی تھی، اسی بے رحمی کے ساتھ تجھے میں ماروں گا، بول! کس کے کہنے پر تو نے یہ سفاکانہ کھیل کھیلا تھا؟'' انسپکٹر ولی پُرغیظ لہجے میں دہاڑا۔

''انسپکٹر! تو نہیں بچے گا۔'' یارو خاک چاٹتے ہوئے دانت بھینچ کر بولا۔ اس دھمکی پر انسپکٹر ولی آپے سے باہر ہو گیا، اس نے یارو پر لاتوں اور ڈنڈوں کی بارش کر دی۔ ایس آئی صادق سومرو نے انسپکٹر کو سنبھالا اور کان میں ہولے سے کہا۔

''سر جی! ہمیں عدالت سے ریمانڈ لینا ہے۔ ابھی یہ ٹھیک نہیں رہے گا۔''

انسپکٹر ولی غضب ناک انداز میں ہانپ رہا تھا۔ صادق سومرو نے سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ وہ یارو کو وہاں سے لے جائیں۔ یارو جاتے جاتے بھی چلّانے لگا۔

''انسپکٹر! سب جانتا ہوں تو اس دو ٹکے کی چھوکری کی عاشقی معشوقی میں یہ سب کر رہا ہے، دیکھ لوں گا میں تم دونوں کو...''

دو سپاہیوں نے اسے لے جا کر لاک اپ میں بند کر دیا۔

کالی بھیڑیں کہاں نہیں ہوتی ہیں، یہاں بھی موجود تھیں۔ یارو نے اس کے ذریعے آج والے واقعے کے

www.kahopakistan.com

بارے میں اسے ساری باتیں وڈیرے تک پہنچانے کے لیے پیغام دے کر بھیج دیا۔

وڈیرے رئیس کو اپنے خاص کارندے کا یہ پیغام ملا تو اس کے چہرے پر سفاکانہ چمک ابھر آئی۔

''منشی۔''

''حاضر سائیں وڈا۔''

''کمشنر لعل بخش سے بات کراؤ۔''

''برابر سائیں وڈا۔'' منشی نے دست بستہ کہا پھر دونوں ہاتھ طاق میں رکھے ہوئے فون کی جانب بڑھا۔ ریسیور کان سے لگا کر نمبر ملایا اور ٹیلی فون سیٹ اٹھا کے ریسیور اسے تھماتے ہوئے مؤدبانہ بولا۔ ''سائیں بھوتار! کمشنر صاحب لائن پر ہیں۔''

''ہالو بابا، کمشنر صاحب! کیسے ہو؟ ادھر وڈیرا رئیس خان عرض کرتا پڑا ہے۔'' وڈیرے نے ریسیور کان سے لگا کے بھاری اور گونج دار آواز میں کہا۔ دوسری طرف سے کمشنر لعل بخش کی جوابا دوستانہ آواز ابھری۔

''سائیں... سائیں... بھلی کرے... بڑی مہربانی، یاد کرنے کا شکریہ... حکم کرو سائیں کیسے یاد کیا؟''

''اڑے بابا حکم کیسا، ہم تو عرض کرنے والے ہیں، پر تم سے ملے بہت دن ہو گئے ہیں، کبھی آؤ ناں بابا کرم پور، ادھر کوئی شکار وکار ہی ہو جائے آج کل تو کاچھو میں کالے بھٹ تیتروں کا موسم ہے۔''

''ضرور آئیں گے وڈیرا سائیں! ہم تو آپ کی مہمان نوازی کے دل سے قائل ہیں۔''

''اچھا یار! ایک چھوٹا سا کام تھا تم سے۔''

''ہاں... ہاں... حکم کرو وڈیرا سائیں!''

''یار! ادھر نور واہ گاؤں کا....... تھانہ ہے وہاں تمہارا کوئی عاشق مزاج انسپکٹر ولی آیا ہوا ہے، احمد بخش باری کی کوئی بیٹی ہے سانہ، اس کے عشق میں پڑ کے ہمیں قانون پڑھانے کی کوشش کر رہا ہے ہمارا آدمی ہے یار محمد عرف یارو، اسے پکڑ کر لے گیا ہے اور ماورائے قانون اس بے چارے کے ساتھ مار پیٹ کر رہا ہے تاکہ اپنی محبوبہ سانہ کے سامنے سرخرو ہو سکے۔ آپ کو تو معلوم ہے یہ چھوٹے موٹے مسئلے تو ہمارے گھر کی لونڈیاں ہیں مگر جہاں قانون کی بات آتی ہے تو ہم ہاتھ باندھ لیتے ہیں اس لیے کہ قانون کا احترام تو ہم سب پر لازم ہے نا بابا!'' وڈیرے نے بڑی مکاری اور خوب مرچ مصالحہ لگا کے اپنی بات کی۔ آخر میں اپنی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے پولیس کمشنر کو یہ بھی کہا۔

''اگر آپ سے یہ کام نہیں ہو سکے تو بابا! ہمیں بتا دینا ہم اپنے منسٹر میر عرض محمد خان سے بات کریں گے۔ آخر کو ہمارا گوٹھ ان کا بہت بڑا ووٹ بینک کہلاتا ہے۔ وہ ہماری بات رد نہیں کرے گا۔''

''ارے نہیں... نہیں... وڈیرا سائیں! اتنے چھوٹے سے کام کے لیے اتنے بڑے آدمی کو زحمت کیوں دیتے ہو۔ منسٹر صاحب کیا کہیں گے کہ میں ان کے آدمی کا اتنا سا کام بھی نہیں کر سکا۔ ابھی آپ کا آدمی آ جاتا ہے، کیا نام بتایا تھا اس کا؟'' دوسری طرف سے پولیس کمشنر لعل بخش نے مرعوب ہوتے ہوئے کہا۔

''یار محمد ولد میر محمد۔'' وڈیرے نے بتایا اور کمشنر سے تسلی لے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

''مجھے احساس ہوتا ہے، شاید میں نے آپ کو جوش دلا کے ایک بڑے خطرے میں ڈال دیا ہے۔'' نازک اندام سانہ نے انسپکٹر مہر ولی سے نہایت شرمندگی سے کہا۔

''اگر خدانخواستہ وڈیرے کے آدمیوں نے آپ کو نقصان پہنچا دیا تو... میں...'' اس کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔ انسپکٹر ولی بڑے غور سے اس کی بات سننے کے بجائے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا، یہ وہ چہرہ تھا جسے ڈھونڈنے اور دیکھنے کی تمنا اس کی بوڑھی ماں کو بھی جو لاڑکانہ میں بیٹھی اپنے اکلوتے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کی شدت سے منتظر تھی۔ انسپکٹر ولی کو سانہ کی خوب صورتی اور خوش سلیقگی کے علاوہ جو بات پسند آئی، وہ اس کا پُرجوش انداز تھا۔ اس کی شخصیت سے متاثر ہونے کا وہ پہلا دن تھا جب باری احمد بخش کے ہاں اس کے بیٹے ارباب علی کے قتل کی تفتیش کے لیے گیا تھا۔ مگر احمد بخش نے وڈیرے کے خوف سے بیٹے کی لاش کو ہی پہچاننے سے انکار کر دیا۔ مگر اس کی بیٹی سانہ نے بے خوف ہو کے ساری حقیقت خود آگے بڑھ کر انسپکٹر ولی کے گوش گزار کر دی تھی اور اس دن کے بعد سے انسپکٹر ولی نے سانہ کی تیز و تند گفتگو سننے کے بعد وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے بھائی ارباب علی کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے گا۔

آج وہ سانہ اور اس کے دونوں بوڑھے ماں باپ کو حفاظت کے خیال سے اپنی کسٹڈی میں لے چکا تھا نہ صرف یہ بلکہ یارو کو بھی لاک اپ کر کے .... تفتیش شروع کر دی تھی۔

کبھی کبھار انسپکٹر ولی کو کیس سے متعلق کچھ باتیں پوچھنا پڑتی تھیں تو اسے سانہ کو بار بار تھانے بلانا اچھا نہیں لگتا تھا اس لیے آج وہ خود اس کے گھر چلا آیا۔

اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اس وقت سانہ کے ماں باپ گھر پر نہیں تھے، وہ اکیلی تھی۔ انسپکٹر ولی دروازے سے ہی واپس لوٹنے لگا تو سانہ نے اسے بہ اصرار اندر بلا لیا۔

سانہ نے آج سادہ سا پھول دار جوڑا پہن رکھا تھا جو اس کے سرو قد جسم پر اچھا لگ رہا تھا۔ لمبے گھنے بال کھلے ہوئے تھے اور چہرے کی دلکشی اور رنگت نکھری نکھری نظر آ رہی تھی۔ ایک قدرتی خوشبو تھی اس کے وجود کی جو انسپکٹر ولی کو بے خود کیے دے رہی تھی۔

ابھی کیس کے سلسلے میں سانہ سے بات کرنا چاہی تھی کہ اس نے پہلی بار آج انسپکٹر ولی کے سامنے اپنے خدشے کا اظہار کر ڈالا۔ اپنے لیے سانہ کو تشویش زدہ اور متفکر پا کر انسپکٹر ولی کو اپنائیت کا احساس ہوا۔ تاہم وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''اگر تمہیں میری اتنی فکر تھی تو پھر مجھے وڈیرے رئیس کے خلاف اکسایا کیوں تھا؟''

انسپکٹر ولی نے محض شوخیِ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے اس سے یہ بات کہی تھی۔ دل پسند و ناپسند کا حق تو رکھتا ہے اور انسپکٹر ولی سانہ کے لیے یہ حق استعمال کر چکا تھا۔ اسے غریب باری کی یہ شریف النفس اور نازک سی بیٹی پسند آ گئی تھی۔ اسے اس کی شخصیت میں سادگی نظر آئی تھی۔ ایک پُروقار سادگی جو اپنے اندر کشش حسن بھی رکھتی۔

اس کی بات پر سانہ نے اپنی گھنیری پلکیں اٹھا کے لمحہ بھر کو مخمور نظروں سے انسپکٹر ولی کی طرف دیکھا اور سر جھکا کے ہولے سے بولی۔ ''شاید میں نے غلط کیا تھا۔'' اس کے اعتراف پر انسپکٹر ولی چند قدم اس کی جانب بڑھا۔ وہ دونوں اس وقت گارے مٹی والی دیواروں کے اس دو کوٹھری نما کمروں کے گھر کے کچے صحن میں کھڑے تھے۔ وہ سانہ سے گہرے لہجے میں بولا۔

''نہیں تم نے مجھے حقیقت سے آگاہ کر کے بالکل ٹھیک کیا تھا مجھے تمہاری یہ جرأت پسند آئی تھی۔''

''ولی... لیکن... مجھے اب ڈر لگتا ہے۔'' سانہ کے لہجے میں خوف تھا۔

''کیسا ڈر؟''

''وڈیرا اور اس کے حواری بہت بے رحم اور خطرناک ہیں۔''

''تو پھر؟'' ولی نے گویا اسے اکسایا۔

اپنا ہی بھائی بند ہے

ہم یہ تو نہیں کہتے کہ سبھی پولیس والے ایسے ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ بھی دیکھا ہے کہ کسی پولیس والے کی کسی دوسرے پولیس والے سے شکایت کی جائے تو وہ سوکھا سا منہ بنا کر کہتا ہے۔ ''یہ تو اپنا ہی بھائی ہے، میرے بھائی۔''

میاں نوشاہی نے شاہی چھوڑ کر ایک چھوٹا سا دفتر قائم کر لیا۔ جہاں رات دن تاش ہوتے اور سگریٹ پہ سگریٹ پی جاتی۔ بھوک لگتی تو میاں نوشاہی کو ناشتے دان یاد آتا۔ ناشتے دان کو کھولتے تو پتا چلتا کہ ایک کتا ان کا آدھے سے زیادہ کھانا اڑا چکا ہے۔

کئی روز تک مسلسل یہی ہوتا رہا اور میاں نوشاہی کو بھوکا رہنا پڑا تو وہ بھاگے بھاگے پولیس اسٹیشن پر گئے۔ اپنی روداد اور کتے کا حلیہ بتایا۔

رپورٹ درج کرنے والے نے میز پر قلم رکھ دیا۔

''مجھے افسوس ہے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔'' اس نے کہا۔ ''تم جس کتے کا ذکر کر رہے ہو وہ پولیس کا سراغ رساں کتا معلوم ہوتا ہے۔ اپنا ہی بھائی بند ہے میرے بھائی!''

آفتاب احمد، حیدر آباد

''وہ آپ کو... اللہ سائیں نہ کرے، کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔''

''میری کیوں فکر کرتی ہو تم؟ ہم پولیس والے تو ہر وقت اپنے سر سے کفن باندھے رکھتے ہیں۔ مجرموں کو پکڑتے، مارتے ہیں... اور مرتے بھی ہیں۔ اگر میں تمہارے بھائی کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی جد و جہد میں مر جاؤں تو...''

''رب سائیں نہ کرے۔'' سانہ نے بے اختیار یہ کہہ کر اپنا ہاتھ ولی کے ہونٹوں پر رکھ دیا اور ولی اس کے نرم و نازک ہاتھ اور اس کے لمس کی مہک سے بے خود سا ہو گیا اور اس کے ہاتھ کو چوم لیا۔

دو دلوں میں موجود رمزِ وفا کا عقدہ محض ایک بوسے نے کھول کے رکھ دیا اور دونوں ایک دوسرے کو گم صم انداز میں دیکھتے چلے گئے۔ پھر سانہ نے دھیرے سے ہاتھ اپنا کھینچ لیا۔ اس کے چہرے پر شرم کی لالی کھلنے لگی تھی۔

انسپکٹر ولی کو دیر ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ سانہ کو تسلی دے

www.kahopakistan.com

کر لوٹ آیا۔
تھانے پہنچا تو پولیس کمشنر افضل بخش کا فون آ گیا۔

''یس سر! انسپکٹر میر ولی تھانہ نور واہ۔'' اس نے مؤدبانہ کہا۔

''ولی! یار محمد ولد میر محمد کو تم نے لاک اپ کر رکھا ہے؟'' دوسری جانب سے سرد لہجے میں پوچھا گیا۔

''یس سر۔''

''کس جرم میں؟''

''سر! اس پر ایک غریب ہاری احمد بخش کے بیٹے ارباب علی اور اس کی بیوی مومل کے دہرے قتل کا الزام ہے۔''

''کوئی ٹھوس ثبوت ہے اس کے خلاف؟'' پوچھا گیا۔

''بالکل ہے سر!''

''کیا مقتول کے ماں باپ یا بھائی نے یار محمد کے خلاف رپورٹ لکھوائی تھی؟''

''نو سر۔''

''تو پھر کیا فرشتوں نے اس کے خلاف رپورٹ کی تھی جو تم نے یار محمد کو گرفتار کر لیا؟'' دوسری طرف سے طنز میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ ''اور میں نے سنا ہے تم نے یار محمد پر ماورائے قانون تشدد بھی کرنا شروع کر دیا ہے؟ میں پوچھتا ہوں آخر تم ایک بے گناہ کے ساتھ ایسا سلوک کر کے کس کو اپنی دلیری دکھانا چاہ رہے ہو؟'' کمشنر کا لہجہ آخر میں درشت ہو گیا۔

انسپکٹر ولی پریشان سا ہوا مگر دوسرے ہی لمحے پورے اعتماد سے بولا۔ ''سر! یار محمد عرف یارو کے خلاف مقتول ارباب علی کی بہن سمانہ نے رپورٹ کی تھی جو اس کی چشم دید...''

''میری بات سنو۔ یہ کیس پورے محکمے کے لیے جگ ہنسائی کا باعث بن جائے گا۔ محض تمہاری عاشق مزاجی کے باعث، سمجھے تم؟'' کمشنر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''جی سر۔'' انسپکٹر ولی گومگو سے لہجے میں بولا۔ دوسری جانب سے کمشنر کی فیصلہ کن آواز ابھری۔ ''مسٹر ولی! یار محمد کو اچھوڑ دو، یہ میرا حکم ہے۔''

''سوری سر! میں یہ نہیں کر سکتا کیونکہ میرے پاس اس کے خلاف چشم دید گواہ موجود ہیں اور...'' انسپکٹر ولی کی بات درمیان میں رہ گئی کیونکہ دوسری طرف سے اچانک رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

اگلے دن انسپکٹر ولی کے ٹرانسفر کے آرڈر جاری ہو چکے تھے اور جہاں اس کا تبادلہ کیا گیا تھا، وہ ایک دور افتادہ گوٹھ کا تھانہ تھا۔

انسپکٹر ولی کے تبادلے وغیرہ کے بعد اس کی جگہ جس انسپکٹر کو بھیجا گیا تھا، اسے پہلا سبق یہی پڑھایا گیا کہ وڈیرے کی اوطاق میں جا کے ضرور حاضری دے اور وہ کب کی یہ حاضری دے کر جا چکا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ یارو کو بھی بڑے عزت و احترام کے ساتھ وڈیرے کے پاس چھوڑ گیا تھا جیسے لاک اپ کے اندر کوئی قیدی نہ ہو، وڈیرے کی امانت ہو جو اسے اب لوٹا دی گئی تھی۔

نور واہ تھانے کا چارج چھوڑنے کے بعد ولی سمانہ سے ملا، وہ اسے یہاں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، خود سمانہ متفکر تھی۔ ولی نے اسے تسلی دی کہ وہ شہر جاتے ہی پہلا کام یہ کرے گا کہ اپنی ماں کو اس کے رشتے کے لیے یہاں لے کر آئے گا اور سادہ سی رسم کی ادائیگی کے بعد اسے بیاہ کے لے جائے گا، بس! تھوڑے دن انتظار کرے۔

مگر اسی رات وڈیرے رئیس کا شیطانی ٹولہ حرکت میں آ گیا... یار محمد نے اپنے چار مسلح ساتھیوں سمیت ہاری احمد بخش کے گھر پر شب خون مارا۔ کھلے صحن میں چارپائی بچھائے ہاری احمد بخش لیٹا ہوا تھا، پاس کی چارپائی پر اس کی بیوی اور سمانہ اندر کوٹھری نما کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔ ان سب نے اجرکوں کے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔

''خبردار! کسی کو ہلاک نہیں کرنا ہے، کوئی جان سے نہ جانے پائے۔'' یارو نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں اپنے ساتھیوں کو تاکید کی اور پھر ظلم و بربریت کا کھیل شروع ہو گیا۔

بندوقوں کی نال سے ٹہوکا دے کر پہلے ہاری احمد بخش اور اس کی بیوی کو جگایا گیا۔ دونوں بوڑھوں کی خوف سے گھگی بندھ گئی۔

''خبردار! جو ذرا سی بھی آواز نکالی۔'' ایک گماشتے نے غرا کے کہا۔ ادھر یارو اپنے دو ساتھیوں سمیت کوٹھری کی طرف بڑھا، ایک لات مار کے دروازہ گرا دیا۔ سامنے چارپائی پر سمانہ سوئی ہوئی تھی اور دروازہ ٹوٹنے کی آواز سے ہراساں ہو کے اٹھ بیٹھی۔ پھر تین مسلح ڈھاٹا پوشوں کو دیکھ کر اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ یارو نے اس کی گردن دبوچ لی، وہ غش کھا کے چارپائی پر گر گئی۔ یارو نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ ہاری احمد بخش اور اس کی بیوی ہاتھ جوڑ کے داد و فریاد کرنے لگے۔

''تمہیں اللہ سائیں کا واسطہ، ہم غریبوں پر رحم کرو۔''

''تم کیا سمجھتے تھے کہ ایک دو ٹکے کے پولیس انسپکٹر کے پیچھے لگ کے تم وڈیرے بھوتار کو نیچا دکھا دو گے؟'' شیطانی ٹولے کے ایک کارندے نے زہرخند لہجے میں کہا۔

''ہم سے بھول ہو گئی، ہم سے غلطی ہو گئی، ہمیں معاف کر دو۔'' اس بار دونوں غریب بوڑھے میاں بیوی نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

ٹھیک اسی وقت اندر کوٹھری نما کمرے سے سمانہ کی گھٹی گھٹی چیخوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ہاری احمد بخش کے اوسان خطا ہونے لگے اور وہ اپنے سر پر مسلط شیطانی ٹولے کی پروا کیے بغیر چارپائی سے بدک کر اٹھا۔

''میری بچی!'' کہہ کر کوٹھری کی جانب لپکا تو ایک کارندے نے اپنی بندوق کا کندا اس کے سر پر دے مارا۔ ہاری احمد بخش تیورا کے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ بیٹی کی عزت کو تار تار ہوتا دیکھ کر سمانہ کی ماں چیخ مار کے بولی۔

''شیطانو! چھوڑ دو میری بچی کو، اللہ سے ڈرو۔'' وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ صدمے کی شدت سے اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

یارو، سمانہ کی عزت تار تار کر کے انتقام لینے کے بعد، باہر آیا اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ دو ساتھی کوٹھری میں داخل ہوئے اور چارپائی پر نیم بے ہوش سمانہ کو اٹھا لیا۔ تھوڑی دیر بعد یہ لوگ پیچھے گھر کے تینوں مکینوں کو اٹھائے باہر نکلے۔ پیٹرول چھڑک کے سرکنڈوں کو آگ لگانے کے بعد جیپوں میں روانہ ہو گئے۔

اگلے دن صبح گوٹھ کرم پور کی گلیوں میں لوگوں نے بڑا وحشیانہ اور عبرت انگیز منظر دیکھا۔ گوٹھ کے سارے لوگ جانتے تھے کہ ہاری احمد بخش نے وڈیرے سے ٹکر لینے کی کوشش چاہی تھی اور ایک پولیس انسپکٹر کے کہنے پر یہ گوٹھ بھی چھوڑ دیا تھا مگر آج انہوں نے ان کا بھیانک انجام دیکھا۔

ہاری احمد بخش، اس کی بیوی، بیٹی سمانہ، ننگے سر، ننگے پاؤں دھول اڑاتی گلیوں میں چیختے چلاتے دوڑ رہے تھے اور ان کے پیچھے پانچ خون خوار شکاری کتے دوڑ رہے تھے جبکہ یارو کی سرکردگی میں شیطانی ٹولہ جیپ میں قہقہے لگاتا ہوئی فائرنگ کرتا، ساتھ چلا آ رہا تھا۔

ان تینوں بدنصیبوں نے کسی کا دروازہ کھٹکھٹانا اور پناہ لینے کی کوشش بھی چاہی... مگر سب نے اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے دروازہ کھولا تو ان کا بھی یہی حشر ہوگا۔ سب سے پہلے احمد بخش اور اس کی بیوی خون خوار شکاری کتوں کی زد میں آئے تھے، دونوں بوڑھے زمین پر چیخیں مارتے ہوئے گرے اور تین کتوں نے انہیں بری طرح بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔ سمانہ کے پیچھے دو کتے دوڑ رہے تھے اور وہ ہذیانی انداز میں چیخیں مارتی ہوئی دوڑ رہی تھی اور مدد کے لیے چلاتی بھی جا رہی تھی۔

''لوگو! تمہیں اللہ سائیں کا واسطہ! میری مدد کرو۔ تم بھی بیٹیوں والے ہو، دروازہ کھولو، مجھے ان کتوں سے بچاؤ۔''

مگر کسی نے گھر کا دروازہ پناہ کے لیے نہیں کھولا۔

بالآخر ایک موقع پر سمانہ بھی خون خوار شکاری کتوں کی زد میں آ گئی، پھر دیکھتے ہی دیکھتے کتے سمانہ کے نرم و نازک وجود پر ٹوٹ پڑے۔

ظلم و بربریت کا یہ کھیل وڈیرے کے شیطانی ٹولے نے اس وقت تک کھیلا جب تک کہ انہیں اس بات کا یقین نہیں ہو گیا کہ اب ظلم سہنے والے محض گوشت کے نچڑے ہوئے لوتھڑوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

☆☆☆

پولیس کی ملازمت سے بددل ہونے کے بعد انسپکٹر ولی نے استعفیٰ دے دیا۔ وہ اب حیدرآباد میں ہی کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے وہ گوٹھ نور واہ جا کے سمانہ کو اپنی دلہن بنا کے لانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو ساری بات بتائی، وہ خوشی سے نہال ہو گئی کہ اب وہ بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کی آرزو پورا ہوتے دیکھ سکے گی۔

دونوں ماں بیٹے لاری میں سوار ہو کے گوٹھ نور واہ پہنچے تو ولی پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ اس کی متاعِ عزیز کو تو گوٹھ کرم میں بڑی بے دردی کے ساتھ ظلم کی سولی پر چڑھا دیا گیا اور کسی نے بھی وڈیرے رئیس خان کے خلاف آواز تک بلند کرنے کی جرأت نہیں کی۔ لوگوں کی بے حسی اور پولیس کی چشم پوشی میں ظلم و بربریت کا یہ کھیل کھلی آنکھوں سے دیکھا گیا تھا مگر کوئی ایسا نہ تھا کہ وڈیرے یا اس کے حواریوں کے خلاف آواز بھی بلند کرنے کی ہمت کرتا۔

ولی کو سمانہ کی یوں بیدرد موت کا اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ حواسوں سے باہر ہو گیا اور سیدھا نور واہ تھانے میں غصے سے بھرا ہوا داخل ہوا جہاں کبھی وہ خود انسپکٹر کے عہدے پر فائز رہ چکا تھا۔ اندر موٹی توند والا، کالے سے رنگ کا تھانہ انچارج موجود تھا اور وڈیرے کی اوطاق سے آئے ہوئے ''راتب'' کے مزے اڑا رہا تھا۔ اس کی میز پر شکاری پرندوں کے بھنے ہوئے سالم پٹھور رکھے ہوئے تھے دیگر پولیس والے بھی وہ چبانے میں اس کے ساتھ مصروف تھے۔

www.kahopakistan.com

ولی نے اندر داخل ہو کے ان سب کو وڈیرے کا نوالہ ہوا راتب چباتے دیکھا تو ساری حقیقت جان کے یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اب سر پھوڑنے کا کوئی فائدہ نہیں، اس تھکے میں لوگوں کی آنکھیں بند کر دی جاتی ہیں۔ دل پتھر کر دیے جاتے ہیں۔ ظلم اور ظالم کے خلاف کوئی آواز اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا تو پھر... ظلم کی اس کہانی کا انت کیسے ممکن ہو؟ کون سا وہ طریقہ ہے جو وڈیرے اور اس کے خوف ناک حواریوں کے شیطانی کرتوتوں کو دنیا والوں کے سامنے لائے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ واپس حیدر آباد آ گیا۔ اس نے عزم کر رکھا تھا کہ وہ سانحہ کا بدلہ وڈیرے اور اس کے حواریوں سے لے کر رہے گا۔

وہ دن رات اس تانے بانے میں الجھا رہنے لگا کہ وہ آخر وڈیرے کی شیطانی طاقت اور قوت کے قلعے کو کس طرح مسمار کرے؟ تب اس کے ذہن میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال ابھرا۔ جب اس نے وڈیرے کی طاقت کے عوامل پر غور کیا تو اس کی سمجھ میں یہ بات آنے لگی کہ وڈیرا رئیس خان کی طاقت کا راز درحقیقت خود اس کے گوٹھ کے اپنے ڈرے سہمے لوگ تھے جو اس کے ہاری بھی تھے، اس کی رعایا بھی تھے۔ وہ وڈیرے کے خلاف آواز بلند نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہاں سکون کی زندگی بسر کرنا تھی، پھر بھلا کون اس کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت کر کے اپنا گھر بار اور سکون تباہ کرتا۔ تو پھر...

ولی کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

دنیا کے سامنے وڈیرے کے کرتوتوں کو عیاں کس طرح کیا جا سکے... بالآخر ولی کو وہ راستہ نظر آ ہی گیا۔ وہ بہت پُرعزم اور پُرجوش نظر آنے لگا۔

☆☆☆

صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی گورکھ ہاؤس کی بنیادیں تک لرز گئی تھی۔ حویلی کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک پُرخوف سنسنی دوڑ گئی۔ یہ انکشاف کسی بم کی طرح پھٹا تھا کہ وڈیرا رئیس خان کی جواں سال کنواری بیٹی ماروی گورکھ ہاؤس کے ایک معمولی اور ادنیٰ نوکر قادر بخش عرف کادو کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ ماروی کی ماں مراداں کو سکتہ ہو گیا۔ ایک بیٹا لاپتا تھا۔ بیٹی نوکر کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس کی حالت بھی اب اپنی سوکن حاکماں خاتون جیسی ہو گئی جو اپنی بدنصیب بیٹی مورزادی کے عبرت ناک انجام کے بعد گم صم رہنے لگی تھی۔ جاننے والے جانتے تھے کہ وہ اپنے شوہر کو بددعائیں دیا کرتی ہے۔ ادھر وڈیرے رئیس خان کا مارے طیش کے برا حال تھا۔ اس نے فوراً یارو کو طلب کیا۔

''یارو!''

''حاضر سائیں وڈا!''

''مجھے وہ دونوں مردہ چاہئیں۔''

''ہاؤ سائیں! برابر... ایسا ہی ہو گا۔''

یارو نے وڈیرے کی بات پر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر مؤدبانہ انداز میں کہا۔ کمرے میں چہار سو خاموشی طاری تھی۔

☆☆☆

جس بیل گاڑی میں وہ دونوں سوار تھے وہ قادر بخش کے دوست رحمت اللہ کی تھی، جس کا گاؤں کرم پور سے بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا جو شہر جانے والی پختہ سڑک کے قرب و جوار میں ہی واقع تھا۔ رحمت اللہ، قادر بخش کا راز دار دوست تھا۔ دونوں بچپن کے دوست تھے۔ رحمت اللہ کے ماں باپ پہلے کرم پور میں ہی رہتے تھے چونکہ ان کے زیادہ تر عزیز رشتے دار دوسرے گاؤں میں رہائش پذیر تھے اس لیے چند ماہ قبل رحمت اللہ کے والدین بھی اس گاؤں میں ہجرت کر گئے تھے جس کا نام محمد پور تھا۔

گاؤں تبدیل ہونے کے باوجود دونوں کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ تانگے بیل گاڑیاں چلتی تھیں، دونوں ایک دوسرے سے ملنے کے لیے آتے جاتے رہتے تھے۔ قادر بخش نے اسے اپنے اس اہم راز سے آگاہ کر دیا۔ رحمت اللہ کو تشویش تو ہوئی مگر جانتا بھی تھا کہ جذبۂ الفت کب کسی خطرے کو خاطر میں لاتا ہے۔ لہٰذا اس نے بھی دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے ان دونوں کی مدد کا فیصلہ کر لیا مگر قادر بخش کی خودداری اپنے دوست کو کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ تاہم رحمت اللہ نے اتنا تو ضرور کر دیا کہ ان کے لیے بیل گاڑی کا بندوبست کر دیا تھا۔ اب منصوبہ یہی تھا کہ وہ پہلے محمد پور پہنچتے اور پھر وہاں سے سہ پہر کے وقت ایک مسافر بس سے شہر کی جانب روانہ ہونا تھا۔

چنانچہ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد گوٹھ محمد پور کی حدود میں داخل ہو گئے۔ رحمت اللہ ان کا منتظر تھا۔ وہیں اس نے ایک نسبتاً ویران جگہ پر ایک سرکنڈوں کی بنی چھوٹی سی جھونپڑی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ وہاں اس نے ان دونوں کے کھانے پینے کا بھی انتظام کیا پھر ماروی کی طرف ایک نظر ڈالی۔ اسے حیرت ہوئی کہ قادر بخش کے مقابلے میں ماروی کے چہرے پر ذرا بھی تشویش و تفکر کے تاثرات نہ تھے۔

''قادر بخش! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ سائیں تمہیں اور میری ہونے والی بھابی کو کامیاب کرے، سُکھی رہو، آباد رہو مگر یار قادر بخش! تم کسی دور شہر کی طرف نکل جاؤ۔ میں تمہیں خوف زدہ نہیں کرنا چاہ رہا مگر تم دونوں کا معاملہ انتہائی حساس اور نازک ہے بلکہ ایسا کرو تم صوبہ پار نکل جاؤ۔''

''ہاں، رحمت اللہ ارادہ میرا یہی ہے کہ بلوچستان یا سرحد کی طرف نکل جاؤں، تمہارا شکریہ تم نے اس آڑے وقت میں ہماری مدد کی۔'' قادر بخش نے ممنون لہجے میں کہا تو رحمت اللہ دوستانہ مسکراہٹ سے بولا۔

''کیسی باتیں کرتے ہو یار، شکریے کی کیا بات ہے؟'' پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اچھا تم مانی ٹکر کھاؤ میں شہر جانے والی لاری میں تمہارے لیے دو سیٹیں رکھوا کے آتا ہوں، تمہیں تو پتا ہے ایک ہی لاری جاتی ہے شہر کو، نیچے اوپر بھری ہوتی ہے۔'' وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔ جھونپڑی میں اب قادر بخش اور ماروی تنہا رہ گئے۔ کھانا اچھا تھا مگر بے دلی سے کھایا گیا۔ ماروی کی نگاہیں قادر بخش کے چہرے پر جم کر رہ گئیں، قادر بخش نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ نگاہوں کا ملاپ ہوا تو مرتعش ہونٹوں پر ان کہے الفاظ، جذبۂ احساس تلے بے زبان خاموش بہت کچھ کہہ گئے۔

''تم پچھتا رہی ہو؟'' قادر بخش نے ہولے سے پوچھا۔

''کیوں؟ بھلا کوئی منزل پا کے پچھتاتا ہے؟'' ماروی کے نرم ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''کیا میں واقعی تمہاری منزل ہوں؟'' قادر بخش کے لہجے میں حیرت تھی اور آنکھوں میں تفاخر کی چمک۔

''سب کچھ داؤ پر لگا کے... اسی لیے تو تمہارے ساتھ ہوں اور تم...'' ماروی نے بھی پوچھ لیا۔ ''تم میرے ساتھ ان حالات میں رہتے ہوئے کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''میں۔'' قادر بخش نے گہری سانس لی۔ ''میں تو زیادہ خوش قسمت ہوں، میں نے تو کچھ بھی داؤ پر نہیں لگایا اور مجھے تمہاری صورت میں جیسے ساری دنیا مل گئی۔'' ماروی کو اس کا لہجہ تپش دیتا ہوا محسوس ہوا۔ ایسی تپش، جس میں محبت بھری حلاوت گھلی ہوئی تھی۔ وہ اسے بڑی چاہ سے اور پُرخلوص لہجے کی تمام تر گہرائیوں سے، اسے اپنی ساری دنیا کہہ رہا تھا۔ اپنی قیمتی زندگی کو اس کی خاطر داؤ پر لگا کے کہہ رہا تھا، میں نے تو کچھ بھی داؤ پر نہیں لگایا۔

''کیا تم نے اپنی زندگی میری خاطر داؤ پر نہیں لگائی قادر بخش؟''

''میری زندگی اب میری کہاں رہی، وہ تو کسی کی امانت بن گئی۔'' قادر بخش اپنی ''ساری دنیا'' کو آنکھوں میں بھر کے بولا۔

''اور یہ امانت... مجھے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہے۔'' گہرے جذبات لیے ماروی نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

یارو اپنے شیطانی ٹولے سمیت پاگل کتے کی طرح کادو اور ماروی کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اس نے قریب کے گوٹھ ہی نہیں بلکہ چھوٹے بڑے گاؤں، دیہاتوں میں شیطانی بگولے کی طرح گردش شروع کر دی تھی۔ اس کے ایک ساتھی نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''یارو سائیں! ہمیں گاؤں گوٹھوں کے بجائے ان دونوں کو شہر میں تلاش کرنا چاہیے۔''

''میرے ذہن میں یہ بات ہے۔'' یارو نے خون خوار آنکھیں سکیڑ کے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اتنی جلدی ان دونوں کا شہر روانہ ہونا اتنا آسان نہیں ہے، ابھی وہ دونوں قریب کے دیہاتوں کی ہی خاک چھان رہے ہوں گے۔''

''پر یارو سائیں! قریب کے گاؤں گوٹھوں کی ہم بھی خاک چھان چکے ہیں۔ ہمارے پاس تیز رفتار جیپ ہے اور وہ یہاں کہیں آس پاس ہوتے تو اب تک نظر میں آ چکے ہوتے۔'' ایک دوسرے ساتھی نے رائے دی تو تیسرے نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

''وڈا خان! ٹھیک کہتا ہے سائیں! ہمیں اب شہر کا رخ کرنا ہو گا۔'' یارو ان کی رائے پر غور کرنے لگا۔

☆☆☆

وہ کلین شیو تھا۔

حالانکہ اس سے پہلے اس کی داڑھی مونچھیں بہت گھنی ہوا کرتی تھیں۔ سر کے بال بھی بڑے ہوتے تھے مگر اب وہ بھی اس نے بالکل چھوٹے کرا لیے تھے گویا نصف سے زیادہ اس کی شخصیت کے مقابلے میں بدل گئی تھی۔ کوئی غور سے دیکھتا تو اور بات تھی۔ وہ عام سی شلوار قمیص میں ملبوس تھا، اس کے دائیں کندھے پر ایک چھوٹا سا بیگ جھول رہا تھا۔ جس کے اندر ایک عدد ڈیجیٹل کیمرا، ایک نوٹ بک دو تین قلم اور چند چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ شہر سے دوپہر دو بجے والی مسافر بس سے گوٹھ کرم پور کی طرف روانہ ہوا تھا۔

یہ مہر ولی تھا، سابقہ تھانہ انچارج نورواہ... مگر اب وہ ایک مشہور اخبار کا کرائم رپورٹر تھا، اسی اخبار کا ایک نجی پرائیویٹ ٹی وی چینل بھی تھا۔ پولیس کی ملازمت سے بددل ہونے کے بعد ہی اس لائن کا انتخاب کیا۔ اسے شاید ہتھیار سے زیادہ قلم کی افادیت کا راز معلوم ہو گیا تھا اور وہ اس قلم کے ہتھیار کو بروئے کار لاتے ہوئے وڈیرے رئیس خان اور اس کے خونی

www.kahopakistan.com

حواریوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا عزم رکھتا تھا۔ جو انسانیت کے ہی دشمن نہیں اور نہ جانے کتنی بے گناہ معصوم جانوں سے بھی ظلم و بربریت کا کھیل کھیل چکے تھے جس میں سائنہ اور اس کے بوڑھے ماں باپ بھی شامل تھے۔ ولی، سائنہ کو کیسے بھول سکتا تھا جو وڈیرے اور اس کے خونی حواریوں کی سفاکی کا شکار ہو چکی تھی۔

بس میں بیٹھا، ولی انہی خیالوں میں گم تھا۔ اس نے گویا شیروں کی کچھار میں گھس کر ان کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی تھی۔ اس مقصد کے لیے وہ کرم پور جا رہا تھا۔ وڈیرے رئیس خان کی جاگیر میں گھس کر وہ اپنے کیمرے کی آنکھ میں بے گناہ، غریب اور معصوم انسانوں کے ساتھ ہونے والے ظلم کے لرزہ خیز مناظر محفوظ کرنا چاہتا تھا، جو بظاہر تو بے حس تھی مگر اس کی بے حسی انسانی کی آنکھ جیسی بے حس نہ تھی۔ جو زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ ہی رہتی تھی۔ جو ظلم کا کھیل دیکھتی ضرور تھی مگر یہ کسی کو دکھائی نہ دیتی تھی جبکہ کیمرے کی آنکھ یہ مناظر کسی سے نہیں چھپاتی تھی۔ ولی کا ارادہ گوٹھ کرم پور میں چند روز رہنے کا بھی تھا۔

☆☆☆

ٹھیک تین بجے یہ دونوں شہر جانے والی بس میں سوار ہو کے گوٹھ محمد پور سے بھی بخیریت روانہ ہو گئے۔ شہر سے گاؤں گوٹھوں کی طرف چلنے والی یہ مسافر بسیں بہت سست رفتار اور کھٹارا سی ہوا کرتی ہیں۔ ان کا کرایہ بھی بہت کم ہوا کرتا ہے جبکہ ایک شہر سے دوسرے شہر جانے والی لگژری ائر کنڈیشنز کوچیں بھی چلا کرتی تھیں جن کے کرائے بہت زیادہ ہیں۔

بہرحال قادر بخش اور ماروی مسافر بس میں بیٹھے شہر کی جانب محوِ سفر تھے۔ اچانک ایک بنجر اور ویران مقام پر بس میں خرابی پیدا ہو گئی، بس رک گئی، بس ڈرائیور، کنڈیکٹر اور ایک ہیلپر لڑکے کے ساتھ نیچے اتر آئے اور بس کی خرابی دور کرنے میں مصروف ہو گئے۔ گرمی بلا کی تھی کچھ مسافر بھری پری بس سے کھلی ہوا کے لیے نیچے اتر آئے۔ قادر بخش بھی نیچے اتر آیا تھا اور اب بیڑی پی رہا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک مقام پر درختوں کا خاصا بڑا جھنڈ تھا، لوگ اس کے سائے میں آ گئے۔ سڑک دور تک ویران تھی۔ کبھی کبھار کوئی گاڑی یا ٹرک وغیرہ وہاں سے گزرتا تو ذرا دیر تک ساکت ماحول ارتعاش کی زد میں آ جاتا۔

یہی وہ وقت تھا جب یارو اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ بغیر ہڈ والی جیپ میں قریب سے گزر رہا تھا کہ ایک حواری کی نگاہ جھنڈ تلے کھڑے مسافروں کے ساتھ بیڑی پیتے ہوئے، قادر بخش پر پڑ گئی۔ ساتھی حواری نے فوراً یارو کی توجہ ”مطلوبہ“ شکار کی جانب دلائی، جیپ یارو ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ شکار کو بھانپتے ہی اس کی آنکھوں میں ازلی خون خواری امڈ آئی اور وحشتوں سے بھرا چہرہ جوشِ غیظ سے مزید مکروہ نظر آنے لگا اور اس جوش میں آ کر اس نے یک دم بریک لگا دیے۔ ویران سڑک پر تیز رفتار جیپ کے ٹائر زور سے چرچرائے تو وہاں کھڑے بہت سے مسافر لوگوں کی توجہ اس کی جانب مبذول ہو گئی، ان میں قادر بخش بھی شامل تھا۔ ایک ہی نظر پڑنے پر اس نے بھیڑیا صفت یارو اور اس کے تینوں شیطانی حواری ساتھیوں کو پہچان لیا۔ اس کے پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی اور پل کے پل اس نے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی۔ ادھر سوئے اتفاق جوش میں بریک لگانے کے باعث سڑک پر جیپ کا توازن بگڑا اور سامنے شہر کی طرف سے آنے والی ایک اور مسافر بس سے جیپ ٹکراتے ٹکراتے بچی مگر اس میں دوسری بس کے ڈرائیور کی پھرتی اور ہوشیاری کا زیادہ دخل تھا۔ جس نے اپنی بس کو بروقت بریک لگا دیے تھے اندر بیٹھے مسافروں کو البتہ اچانک بریک لگنے کے باعث زبردست جھٹکا ضرور لگا۔ ان میں ولی بھی شامل تھا۔ وہ بس کی اگلی نشست پر براجمان تھا۔ اس نے ایک بغیر ہڈ کی جیپ کو بس سے ٹکراتے اور پھر رکتے دیکھا تھا۔ یارو اور اس کے تینوں ساتھی حواری کب اس کی نگاہ سے بچ سکتے تھے۔ بالخصوص ولی، یارو کو تو وہ ایک ہی نظر میں پہچان گیا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں یکلخت تیز ہو گئیں۔ پہلے وہ یہی سمجھا کہ شاید یہ لوگ اس مسافر بس کو لوٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں مگر جب اس نے جیپ کو سڑک کنارے پہلے سے کھڑی، ایک دوسری مسافر بس کی طرف بڑھتے دیکھا تو ٹھٹکا۔ وہ تیزی سے نیچے اتر آیا۔ ٹھیک اسی وقت اس نے دوسری بس سے ایک جوان مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ویرانے کی طرف بے تحاشا دوڑتے دیکھا۔ جوان مرد نے مٹیالے رنگ کی صدری نما قمیص پہن رکھی تھی۔ جس کے کالر بڑے تھے جبکہ جوان لڑکی نے جامنی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا، وہ خاصی شوخ اور خوب صورت تھی، اس کے کان سے جھولتا ہوا سفید رنگ کے نگینے والا جھمکا بھی نظر آیا۔ ولی کا فوراً ماتھا ٹھنکا۔ وہ بھلا کیسے نہیں سمجھتا کہ ایک بار پھر وڈیرے رئیس خان کے یہ بھیڑیا صفت حواری یقیناً اس کے ایما پر ضرور کوئی ظالمانہ کھیل کھیلنے والے تھے۔

یارو نے پستول نکال لیا اور کریہہ انداز میں چیختے ہوئے منہ پھاڑ رہا تھا۔ قادر بخش بس میں سوار ہوا اور پھرتی کے ساتھ ماروی کا ہاتھ پکڑ کے دوسرے دروازے سے نیچے

اترنے لگا تب تک یارو قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے پستول کا دستہ لہرایا جو قادر بخش کے بائیں آنکھ سے چھو گیا کیونکہ قادر بخش نے بروقت جھکائی دے کر نہ صرف خود کو اس ضرب سے بچایا بلکہ یارو کے سینے پر زوردار لات بھی رسید کر دی تھی۔ وہ اپنے عقب میں آتے ہوئے ساتھیوں پر جا پڑا۔ تاہم پستول کے ٹھوس دستے کی ضرب سے قادر بخش کی بائیں آنکھ کے قریب سے خون کی باریک سی لکیر نمودار ہو گئی۔

بہرطور، قادر بخش ماروی کا ہاتھ پکڑے بنجر علاقے کی طرف دوڑا۔ ادھر ولی جو پہلے ہی ان سب کی بھاگم دوڑی سے بہت کچھ سمجھ گیا تھا، ایک خیال ذہن میں آتے ہی بس سے اترا۔ اس نے یارو اور اس کے تینوں ساتھیوں کو اس نوجوان جوڑے کے تعاقب میں دوڑتے دیکھا۔ ولی نے فوراً قریب کھڑی یارو کی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ چابی اگنیشن سوئچ میں موجود تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے پھرتی سے جیپ اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ وہ سمجھ گیا تھا اس بے گناہ معصوم نوجوان جوڑے کی جان خطرے میں ہے اور یہ چاروں خونی بھیڑیے ان کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ وہ جیپ فل اسپیڈ میں دوڑاتا ہوا دوسری جانب سے گھما کے کچے میں اتر گیا اور پلک جھپکتے ہی اس دوڑتے ہوئے نوجوان جوڑے کے سامنے آ کر ایک جھٹکے سے بریک لگا دیے۔ قادر بخش اور ماروی ہانپتے ہوئے ٹھٹک کے رک گئے۔

”جلدی آ جاؤ، ورنہ یہ بھیڑیے تم دونوں کو مار ڈالیں گے۔“ ولی ان کی طرف دیکھ کر چلایا۔ قادر بخش کے چہرے پر لحظہ بھر کو تذبذب کے آثار ابھرے اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ ماروی کو لے کر جلدی سے جیپ میں سوار ہو گیا۔

ولی نے جیسے ہی جیپ آگے بڑھائی، فضا میں گولیاں چلنے کے چار پانچ دھماکے ہوئے اور پھر ساتھ ہی ایک سماعت شکن دھماکا بھی ہوا۔ یہ ٹائر برسٹ ہونے کا تھا۔ جیپ کی باڈی سے گولیاں لگنے کے علاوہ کسی گولی نے ٹائر کو بھی برسٹ کر دیا تھا۔

ولی پریشان ہو گیا۔ جان اس کی بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اس نے جیپ روک دی۔ عقب میں دیکھا۔ یارو اور اس کے تینوں خونی حواری دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔

”اس طرف بھاگو... پرانی عمارت کی طرف۔“ ولی نے قادر بخش اور ماروی سے چیخ کر کہا۔ چند قدموں کے فاصلے پر انہیں مٹیالے رنگ کی پرانی سی عمارت نظر آ رہی تھی۔ یہ تینوں اسی سمت دوڑے۔ قادر بخش اور ماروی یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ آخر یہ اجنبی شخص کون ہے جو ان کے ساتھ اپنی جان بھی خطرے میں ڈالے ہوئے ہے؟ مگر ابھی یہ سوچنے اور پوچھنے کا وقت نہ تھا۔ صرف اور صرف جان بچانے کا وقت تھا۔

”رک جاؤ کادو۔ اب تم نہیں بچ سکتے۔“ دفعتاً یارو عقب سے حلق کے بل دہاڑا۔ مہر ولی ان کے ساتھ دوڑتے دوڑتے دونوں کے پیچھے ہو گیا، اسی وقت عقب سے تلے اوپر گولی چلنے کے تین چار دھماکے ہوئے، ولی کے ایک پاؤں میں دو گولیاں پیوست ہو گئیں۔ وہ چیخ مار کے گرا۔ بیگ اس کے کندھے پر جھول رہا تھا۔ اس کی چیخ سن کر قادر بخش کو فکر ہوئی مگر وہ تب تک اس خستہ عمارت کے کھنڈر میں ماروی کو لے کر داخل ہو چکا تھا۔ ولی زخمی ہو کے گر پڑا۔ یارو اور ان کے تینوں ساتھیوں نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی۔ یہ شخص ان کے لیے غیر اہم تھا، وہ اصل شکار کے پیچھے اندر داخل ہوئے، اندر نیم تاریکی تھی۔ اس بوسیدہ عمارت کی سالخوردہ چھتوں اور دیواروں کے روزنوں سے روشنی کی کرنیں اندر پڑ رہی تھیں۔ وہ چاروں اندر پہنچ کر رکے اور خوں خوار نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگے۔ شکار غائب تھا۔ یارو نے اپنے تینوں حواریوں کو شکار کی تلاش میں پھیلا دیا اور خود ایک شکستہ دروازے والی چوکھٹ کی طرف بڑھا۔ دفعتاً اسے اپنے ایک ساتھی کی چیخ سنائی دی۔ وہ ٹھٹکا اور چیخ کی سمت مڑا۔ اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک ابھری۔ قادر بخش جانے کہاں سے اچانک نمودار ہو کر اس کے ایک ساتھی پر پل پڑا تھا اور اس کا سر دیوار پر دے مارا تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی ابھی اپنے پستول سے اس کا نشانہ لینے ہی لگا تھا کہ قادر بخش نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ایک پتھر اٹھا کر اسے دے مارا جو اس کی پیشانی پر لگا۔ وہ چیخ مار کے زمین پر بیٹھ گیا۔ یارو نے موقع دیکھتے ہی گولی چلا دی۔ جو قادر بخش کے بازو میں لگی۔ قادر بخش کے حلق سے کراہ آمیز چیخ بلند ہو گئی۔ اس نے ایک طرف چھپنے کے لیے دوڑ لگائی۔ دوسرا فائر ہوا، قادر بخش زمین پر گر پڑا۔ ٹھیک اسی وقت ایک تاریک گوشے سے ماروی چیخ مار کے سامنے آ گئی اور زمین پر گرے کراہتے ہوئے قادر بخش سے لپٹ گئی۔

یارو اور اس کے ساتھی ملک الموت کی طرح ان کے سروں پر آن پہنچے۔

ادھر ولی جس کی ایک ٹانگ گولیاں لگنے کے باعث بری طرح زخمی ہو چکی تھی، بہ مشکل گھسیٹتا ہوا سینے اور کہنیوں کے بل اندر داخل ہوا اور ایک آڑ کے پیچھے ہو گیا۔ اس کی نظروں نے سفاک شکاریوں کو شکار پر جھپٹتے دیکھ لیا تھا۔ وہ ان کی مدد کرنے سے تو قاصر تھا مگر ایک کام وہ ان سفاک

www.kahopakistan.com

SCAN DOT

شکاریوں کی قبر کھودنے کے لیے کرسکتا تھا۔ اس نے فوراً اپنے شولڈر بیگ سے ہینڈی کیم نکال لیا... اور ان کی مووی بنانے لگا۔

یارو اور اس کے دو ساتھیوں نے قادر بخش اور ماروی پر پستول تان رکھی تھیں۔ یارو کی آنکھوں سے سفاکی مترشح تھی۔ زمین پر گرے، قادر بخش نے اپنے سر پر مسلط بے رحم یارو سے التجا کی۔

''مجھے مارو مگر اسے جانے دو۔'' اس کا اشارہ ماروی کی طرف تھا۔

مگر بے رحم یارو کو وڈیرے رئیس خان کے حکم پر عمل کرنا تھا اس نے ایک گولی قادر بخش کے سر میں اتار دی اور دوسری ماروی کے سر میں پیوست کر دی۔ دونوں آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گئے۔

ذرا فاصلے سے زخمی ولی اپنے ہینڈی کیم سے یہ دردناک منظر کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر چکا تھا۔ ''کام'' نمٹانے کے بعد سفاک بھیڑیوں کا یہ ٹولہ واپس پلٹ گیا۔ ان کے جانے کے بعد ولی سینے اور کہنیوں کے بل گھسٹتا ہوا ان دونوں بدنصیبوں کی لاشوں کے قریب آیا۔ بڑے کرب سے ان دونوں کو دیکھا۔ اگرچہ قادر بخش اور ماروی دونوں اس کے لیے اجنبی تھے مگر ولی کو خوب اندازہ تھا کہ یہ دونوں بھی وڈیرے رئیس خان کے روایتی جبر اور ظلم کا ہی نشانہ بننے والے بدنصیب انسان تھے۔ ولی اس بار مطمئن تھا کہ وہ وڈیرے رئیس خان اور اس کے خونی حواری یارو کی قبر کھود چکا ہے۔ اس نے اپنی زخمی ٹانگ کا جائزہ لیا۔ دونوں گولیاں گوشت چیر کر پار ہو گئی تھیں۔ ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ذرا دیر بعد وہ اپنے سیل فون کا نمبر ملا رہا تھا۔

ملک بھر کے ٹی وی چینلز پر ولی کی ریکارڈ کی ہوئی یہ فلم چل رہی تھی۔

ظلم و بربریت کا یہ عبرت ناک منظر دیکھ کر ملک کا نہ صرف باشعور اور اہل دل طبقہ چیخ اٹھا بلکہ بات اعلیٰ حکام اور این جی اوز تک جا پہنچی۔ ہر طرف سے اس کھلی شرمناک اور انسانیت سوز بربریت کی مذمت کی جا رہی تھی اور حکومت پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ مجرم گرفتار کیے جائیں۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی حرکت میں آ گئے۔ چنانچہ حکومتی مشینری کو حرکت میں آنا پڑا اور باقاعدہ ایک تفتیشی کمیٹی قائم کی گئی۔ ولی نے جب دیکھا کہ آگ پوری طرح بھڑک کر لوہا گرم کر چکی ہے تو وہ کچھ مزید معلومات کے ساتھ تفتیشی کمیٹی تک جا پہنچا۔ اس کے بعد وہی ہوا جیسا ولی کا منصوبہ تھا۔

پولیس اور رینجرز کی بھاری نفری گوٹھ کرم پور میں وارد ہوئی اور وڈیرے رئیس خان اور یارو سمیت اس کے سارے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ وڈیرے کو عین گرفتاری کے وقت ہارٹ اٹیک ہو گیا اور پھر وہ جانبر نہ ہو سکا۔

☆☆☆

گوٹھ کرم پور کے قبرستان میں وڈیرے رئیس خان کے جسدِ خاکی کو دفنا دیا گیا۔ اس کے جنازے میں گنتی کے چند لوگ تھے۔ اب کون اس مردہ وجود سے بھلا خوف کھاتا۔ ڈرنے والوں کے دل سے خوف نکلا تو چھپی ہوئی نفرتیں ابلنے میں کہاں دیر لگتی ہے۔ وڈیرے کی میت کو لحد میں اتارنے والا اس کا بڑا بیٹا شہزادہ خان تھا۔

اگلے دن شہزادہ خان، باپ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا تو اسے زبردست جھٹکا لگا۔ وڈیرے کی لاش قبر سے باہر تھی اور قبر کھلی پڑی تھی۔ اسے حیرت ہوئی، وہ کچھ سمجھ نہ پایا۔ بہرطور اس نے دوبارہ باپ کی کفن پوش لاش کو قبر میں رکھ کر مٹی برابر کر دی۔

اگلے روز وہ گیا تو لاش پھر قبر سے باہر تھی۔ مسلسل تین چار روز یہی ہوتا رہا۔ بالآخر ایک رات تنگ آ کر شہزادہ خان باپ کی لاش کو کندھے پر ڈال کے رازداری کے ساتھ گورکھ ہاؤس کے تہ خانے میں لے آیا اور وہیں قبر کھود کے باپ کی لاش کو دفنا دیا اور پھر تہ خانے کا دروازہ بند کر کے اوپر آ گیا۔

وہ سخت الجھن میں تھا، یہ کیسا معاملہ تھا؟ کیا یہ خدا اور ایک گناہ گار بندے کے بیچ کا معاملہ تھا؟ کیا یہ کسی کی بددعا کا اثر تھا؟ ایک طرف شہزادہ خان کی ماں حاکماں خاتون جب معمول آنکھیں موندے کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

اگر شہزادہ خان قریب جا کر ماں کی بڑبڑاہٹ کے الفاظ کو غور سے سنتا، اسے یہ الفاظ سنائی دے جاتے۔

''اے ظالم! تجھے دو گز زمین بھی نصیب نہ ہو... تیرے جنازے کو... تیری لاش کو زمین بھی قبول نہ کرے۔''

چند روز بعد شہزادہ خان کو خیال آیا کہ تہ خانے جا کر باپ کی قبر کو ایک نظر دیکھ لے... کیا خبر اس بار اس کی لاش قبر سے باہر نہ ہو۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ تہ خانے کے اندر پہنچا، دروازہ کھولا اور بے اختیار جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ وڈیرے رئیس خان کی لاش وہاں بھی قبر سے باہر پڑی تھی۔

شہزادہ خان نے زیرلب کچھ پڑھا اور تہ خانے کا دروازہ پوری قوت سے بند کر دیا بھی نہ کھولنے کے لیے۔

www.kahopakistan.com

www.kahopakistan.com